Rs. 60/-
خصوصی شمارہ
اجتہاد و تقلید
ملت کا ترجمان
ماہنامہ
جام نور
دہلی
APRIL 2007
انٹرویو
اجتہاد و تقلید پر برصغیر کے مختلف مکاتب فکر
کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات
اجتہاد و تقلید پر برصغیر کے مختلف مکاتب فکر
کے نمائندوں کا دلچسپ تحریری مباحثہ
تقلید رحمت یا زحمت!
وہابیائی تحریک
فقہ حنفی پر غیر مقلدین کے اعتراضات کا ایک تنقیدی جائزہ
فقہ و اصول کی تدوین کی طرف اہل علم کا التفات
تقلید فقہی حقیقت نوعیت اور ضرورت
سعودی حکومت کے نظریات و عمل کا دائرہ اور برصغیر کے غیر مقلدین
امام اعظم اور عمل بالحدیث
امام اعظم ابوحنیفہ کا علمی مقام اور اجتہادی خدمات
تقلید شوق یا ضرورت؟
شاہ ولی اللہ اور مسئلہ تقلید
تقلید کی مخالفت ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ
تقلید امت کا اجماعی موقف
تقلید سے اجتہاد تک
برصغیر کے اہل حدیث اور عالم عرب کی جماعت سلفیہ
ایک تقابلی مطالعہ
شافعی
مالکی
حنبلی
حنفی
شریعت محمدی

فیض العارفین حضرت علامہ شاہ غلام آسی پیا حسنی

بانی: رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری نور اللہ مرقدہ

ربیع الاول - ربیع الآخر ۱۴۲۸ھ

عام شمارہ :	15/=
زر سالانہ :	170/=
قیمت پاکستان میں :	20/=
بیرون ملک (ہوائی ڈاک)	30$ امریکی ڈالر
	20£ پونڈ
لائف ممبر شپ (اندرون ملک)	5000/=
لائف ممبر شپ (بیرون ملک)	300$ امریکی ڈالر

مراسلت وترسیل زر کا پتہ

ملت کا ترجمان
ماہنامہ جام نور دہلی
۴۲۲ مٹیا محل، جامع مسجد دہلی
Tele Fax: 011 23281418

MILLAT KA TARJAMAN
JAAM-E-NOOR Monthly
422 Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi - 6
Ph : (Off) 011- 23281418, 9313783691
E-mail: editor@jaamenoor.com
E-mail: info@jaamenoor.com
website: www.jaamenoor.com

ڈرافٹ پر صرف MILLAT KA TARJAMAN JAAM-E-NOOR Monthly لکھیں

پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر غلام ربانی نے اسٹار آفسیٹ پرنٹنگ پریس 2229/A احاطہ جن بی، رودگران، لال کنواں، دہلی سے طبع کرا کر آفس "ماہنامہ ملت کا ترجمان جام نور" 422 مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-۶ سے شائع کیا

انتساب

ان مجتہدین امت کے نام جنہوں نے اصول شریعت وضع کر کے امت کے لیے بے شمار آسانیاں پیدا کر دیں

ان بلند قامت علما کے نام جنہوں نے ائمہ اربعہ کی تقلید پر اتفاق کر کے شیرازۂ ملت کو متحد رکھا

اور

ان محققین کے نام جو نئے حالات میں شریعت کے انطباق کے لیے مخلصانہ کوشاں ہیں

خوشتر نورانی

مشمولات

اداریہ

باب (۱)

باب (۲)

انٹرویو

اجتہاد وتقلید پر برصغیر کے مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات

تحریری مباحثہ

اجتہاد وتقلید پر برصغیر کے مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں کا دلچسپ تحریری مباحثہ

خوشتر نورانی☆

وہابیائی تحریک

جس نے اُمت کی مذہبی و سیاسی وحدت کا خاتمہ کر ڈالا

پہلا منظر:۔۔ریاض سعودیہ عربیہ میں ایک برطانوی فیشن اسٹور ہے، جس کا نام "Harvey Nichols" ہے، اس کے پارٹنر ایک سعودی پرنس ہیں، اس اسٹور کے سلیز پرموٹر کی حیثیت سے ہندوستان سے سید زبیر احمد علیگ ارض حرم کی زیارت کی آرزو لیے گئے اور کئی سال وہاں مقیم رہے، وہاں رہ کر سعودی معاشرے کی بدکرداری، عریانیت، فحاشی، جنسی بے راہ روی، مغربی آقاؤں کی سیاسی غلامی، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، عدم مساوات اور مادّہ پرستی کے جو مناظر دیکھے، وہ ان کے لیے ناقابل یقین تھے۔شاید اسی لیے انہوں نے اپنے مجروح جذبات کے شعوری مشاہدے میں دوسرے مسلمانوں کو شامل کر کے ان کی آنکھوں سے مملکتِ اسلامیہ کے مقدس پردے کو ہٹانے کے لیے ناقابلِ تردید حوالوں پر مشتمل ایک نہایت عبرتناک آپ بیتی بنام ''یادِ حرم'' لکھی، جس کا یہ اقتباس خاص طور پر ہمارے اداریے کا حاصل ہے:

''سعودی مملکت کو اسلامی مملکت کہنا سراسر اسلام کا مذاق اڑانا ہے اور اسلام کے ساتھ ناانصافی ہے، یہ حکومت فی الحقیقت یزیدی حکومت ہے......انہی نام نہاد مسلم حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی، نفس پرستی اور اقتدار کی ہوس کی وجہ سے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا، اسرائیل کا ناپاک وجود عمل میں آیا، یہود و نصاریٰ کی فوجیں وصیتِ رسول ﷺ کو پامال کرتی ہوئی جزیرۃ العرب میں داخل ہوئیں۔لاکھوں مسلمان شہید کیے جارہے ہیں، فلسطینی، افغانی و عراقی عوام بالخصوص اور یوروپی ملتِ اسلامیہ بالعموم ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔جب پاسبانِ حرم ہی ہر جگہ ذلیل و رسوا کیے جارہے ہوں تو حرم کی حرمت و تقدس کیا معنی رکھتا ہے؟''۔(ص:۱۱،۱۲)

اگر اس اقتباس کو پڑھ کر آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ اس اقتباس سے ہمارے عنوان کو کیا مناسبت؟ تو میں آپ کو یاد دلا دوں کہ اس مملکتِ اسلامی کی سیاسی زمام اسی ابن سعود اور مذہبی زمام اسی شیخ نجد کی مطلق العنان نسلوں کے ہاتھوں میں ہے جنہوں نے آج سے تقریباً ڈھائی سو برس قبل خالص توحیدی اور اسلامی مملکت کی تشکیل کی غرض سے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے کر ریگزارِ عرب میں ایک طوفان برپا کیا تھا، توسل و استعانت، تعظیم انبیاء و اولیاء اور تقلید کو شرک و کفر کہہ کر لاکھوں مسلمانوں اور علمائے اسلام کا خون ناحق بہایا تھا اور اساطینِ امت کی قبروں پر بے دردی سے بلڈوزر چلائے تھے، اسی کے نتیجہ میں آج ایک ایسی مملکتِ اسلامی کا ظہور ہوا ہے جہاں ہر پل اسلامی روح کو تڑپا تڑپا کر مارا جارہا ہے.....ع

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

اٹھارہویں صدی میں آلِ شیخ اور آلِ سعود کے سیاسی و مذہبی معاہدے نے جزیرۂ عرب میں جو آگ لگائی تھی اگر وہ وہیں سرد ہوگئی ہوتی تو اسے سیاسی انارکی اور مذہبی دہشت گردی کی تاریخ کا ایک بدترین باب سمجھ کر بند کر دیا جاتا، لیکن اس آگ نے آج پورے عالمِ اسلام کو مذہبی و سیاسی سطح پر اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔حکومت انگلشیہ نے جزیرۂ عرب سے ترکی فوجوں کے انخلاء اور خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے لیے آلِ سعود سے معاہدہ کر کے جو اپنی اطاعت اور محکومی لکھوائی تھی وہ ہمیشہ کے لیے عالم اسلام کا مقدر بن گئی اور پھر جس اسلامی ریاست نے بھی مغربی حکومتوں کی محکومی سے انکار کیا کشت و خون سے لالہ زار کر دی گئی اور اس کے اقتصادی اور معاشی ذرائع کی کمر توڑ دی گئی۔عالم اسلام کے خلاف مغربی طاقتوں کے ظلم و بربریت کے لیے آج بھی سعودی عرب اپنی وفاداری اور غلامی کا ثبوت پیش کر رہا ہے اور انہیں اسلامی ممالک پر حملے کے لیے بنیاد Base فراہم کر رہا ہے، افغانستان، عراق، فلسطین، چیچنیا اور البانیہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔دوسری طرف شیخ نجد نے توحید کے نام پر مسلمانوں کو ایمان کا جو تنگ دائرہ دیا تھا، اس ایمانی دائرے میں مٹھی بھر ہی لوگ آتے تھے جو لیلائے نجد کے فیضان سے موحد ہو چکے تھے، بقیہ دنیا کے وہ کروڑوں مسلمان اسلام سے باہر نکل کر کفر و شرک کے صنم کدہ میں آگئے، جو عہد رسالت اور عہد صحابہ سے چلے آرہے موروثی عقائد اور رسوم و روایات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور اساطین امت کے اجماعی موقف

☆k_noorani@yahoo.com

''تقلید'' پر گامزن رہتے ہوئے کتاب وسنت کی پاس داری کررہے تھے-مختصر یہ کہ مغرب سے آل سعود کی سیاسی معاہدۂ غلامی نے جہاں اسلامی ریاستوں کے اتحاد کو کمزور کر کے اپاہج اور بے دست وپا بنادیا ہے وہیں آل شیخ کی نظریاتی تحریک نے ملت میں کئی فرقوں کو جنم دیا، جو فرقے ایک دوسرے سے پیدا ہوئے اور مذہبی تشدد میں ہر دوسرا پہلے والے کو مات دیتا گیا، انہی فرقوں میں آج عالم عرب میں سلفیہ (وہابیہ) اور برصغیر میں اہل حدیث (غیر مقلدین) کے نام سے معروف ہیں- یہ بھی وقت کا ایک مضحکہ خیز المیہ ہے کہ اپنی عددی قوت سے خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے بھی انھیں ملت اسلامیہ کی نمائندگی کا دعویٰ ہے اور انتشار وافتراق کی ایک مسلسل، معلوم اور مربوط تاریخ رکھتے ہوئے بھی یہ اتحاد ملت پر نعرہ زن ہیں- حالاں کہ ملت کے زخمی وجود کو کرید کرید کر آج انھوں نے ایک ایسے ناسور کی شکل دے دی ہے، جو مندمل ہونے کا نام نہیں لیتا-

دوسرا منظر:-اٹھارہویں صدی میں دو غیر مقلدین ابن سیف نجدی اور محمد حیات سندھی کی تعلیمی وفکری تربیت کے نتیجے میں شیخ نجد کی متشددانہ تحریک ابن تیمیہ کے فکری منہج پر شروع ہوئی، جس منہج نے چودھویں صدی عیسوی میں پہلی بار اسلام کے آٹھ سو سالہ متوارث منہج میں سیندھ لگا کر اہل اسلام میں غیر مقلدیت کا بالکل نیا اور غیر فطری شوشہ چھوڑا، ابن تیمیہ کا نظریہ اس وقت اس لیے پھل پھول نہ سکا کہ اس کے ہاتھ میں صرف دوات وقلم تھے، لیکن اس نظریے کو جب ابن عبدالوہاب نے اپنایا تو اس کے ایک ہاتھ میں بے لگام قلم تھا تو دوسرے ہاتھ میں ابن سعود کی دی ہوئی ننگی تلوار، جس نے جزیرۂ عرب میں انتشار وافتراق اور ظلم وعدوان کی ایک نئی تاریخ رقم کی- شیخ نجد نے جزیرۂ عرب میں جو آگ لگائی تھی اس کی لپٹیں خلیجی ممالک تک تو پہنچ گئی تھیں، لیکن برصغیر ابھی محفوظ تھا، مگر ہندوستان کے کچھ لوگوں نے شیخ نجد کے فکری بطن سے جنم لینے والے معروف غیر مقلد عالم قاضی شوکانی کی شاگردی اختیار کی، اس تحریک کی آنچ برصغیر تک پہنچ گئی- یہ وہ دور تھا جب تحریک آزادیِ ہند اپنے پورے شباب پر تھی اور اسلامیانِ ہند متحد ہو کر برطانوی حکومت کے انخلاء کا منصوبہ بنا رہے تھے- اٹھارہویں صدی میں آل سعود اور آل شیخ نے اقتدار کی ہوس میں ترکی کی اسلامی حکومت کے خلاف انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی طاقتوں سے معاہدہ کر کے عرب کے خوش گوار ماحول میں زہر گھول دیا اور برصغیر میں اسی تحریک کے پروردہ برطانوی حکومت سے ساز باز کر کے برصغیر کی اجتماعی تحریک آزادی کو ناکام کرنے کی کوششیں کیں، یہاں تک کہ غیر مقلد عالم محمد حسین بٹالوی نے برطانوی سامراج کے خلاف علمائے ہند کے دیے گئے فتویٰ جہاد کو حرام قرار دیا اور اس مسئلے پر اپنے برطانوی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے **الاقتصاد فی مسائل الجهاد** نام کی کتاب تصنیف کی- برصغیر کے مسلمانوں میں افتراق وانتشار کی یہ پہلی باضابطہ کوشش تھی- عرب میں ظلم وعدوان کا بدترین کردار اور برصغیر کے سواد اعظم کے خلاف اس تحریک کے چند علماء کی غداری نے ان کے لیے ہندوستان میں عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، اسی وجہ سے انھوں نے حکومت انگلشیہ سے اپیل کی کہ ان کا نام بدل کر وہابی سے ''اہل حدیث'' رجسٹرڈ کر لیا جائے- (دیکھیے اشاعۃ السنۃ: شمارہ ۲ رجلد نمبر ۱۱) بعد میں انہوں نے اپنے آپ کو اہل حدیث اور سلفی کہلا کر دنیا کو یہ تاثر دینا چاہا کہ ان کا شجرۂ شریعت عہد رسالت سے مربوط ہے، حالاں کہ پہلے انہوں نے اپنے آپ کو موحد کہا، پھر محمدی، پھر غیر مقلد، پھر وہابی اور پھر اہل حدیث اور سلفی کہلانے لگے، اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ایسی کوئی بھی مثال نہیں پیش کی جاسکتی کہ کسی مذہبی جماعت کو اپنی شناخت رجسٹرڈ کرانے کے لئے کسی عیسائی اور فرنگی حکومت کی مہر کی ضرورت پڑی ہو اور اس نے اتنے نام اور رنگ وروپ بدلے ہوں-

تیسرا منظر:- یہ حقیقت واضح ہے کہ اہل حدیث کا قبلۂ فکر شیخ نجد ہیں اور قبلہ نما شاہ اسمٰعیل اور اہل دیوبند کے قبلۂ حاجات بھی شیخ نجد ہیں اور قبلہ نما شاہ اسمٰعیل، یہ دونوں مکاتب فکر ایک عرصے تک ہم خیال، ہم پیالہ اور ہم نوالہ رہے اور ان دونوں پر ہی فیضان آل سعود کی بارش ہوتی رہی، جس کے نتیجے میں ان کے ادارے، مدارس، تنظیمیں اور افراد راتوں رات آسمان سے باتیں کرنے لگے- بات وہاں سے خراب ہوئی جب اہل دیوبند پر آل سعود کی نوازشات کے دروازے کچھ زیادہ ہی کشادہ ہونے لگے تو ہندوپاک کے اہل حدیث نے اس دروازے کو بند کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب عربی میں لکھی، جس کا نام **الديوبندية عقائدها و فكرها** رکھا اور جزیرۂ عرب میں اپنے قبلۂ فکر کی بارگاہ میں پیش کر دیا- اس کتاب میں اہل حدیث نے اس راز سربستہ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ان کے عقائد بھی وہی ہیں جو بریلویوں کے ہیں، یہ حنفی مقلد ہیں اور اپنے بزرگوں سے استعانت اور استغاثہ کے قائل بھی، اس طرح یہ دورخے عقائد کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں- بات غلط بھی نہیں تھی، پھر کیا تھا اہل دیوبند پر انعام واکرام کی بارش روک دی گئی اور حلقۂ دیوبند قحط سالی سے گزرنے لگا- گہری نیند میں سوتے شخص کے تاریک کمرے میں اچانک تیز روشنی کر دی جائے تو

وہ سمجھتا ہے کہ آفتاب نکل آیا ہے، اس انتشار، اختلال اور ہواس باختگی کے وقت اسے، بقول رشید احمد صدیقی ''دیو میں پری کا حسن و جمال معلوم ہوتا ہے، عجوز ہفتاد سالہ پر نازنین شانزدہ سالہ کا دھوکہ ہوتا ہے اور دیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگتا ہے''۔ اہل دیو بند کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، برسوں پہلے سواد اعظم سے کٹ کر اپنی الگ راہ بنانے کی پاداش میں انہیں عومی برگشتگی کا جو سامنا رہا، اگر آل سعود نے سہارا نہ دیا ہوتا تو انہیں اپنا وجود بھی سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ جہاں عوامی چندے کے لالے پڑے ہوں وہاں ریال اور ڈالر کی بارش ہونے لگے تو پھر ظاہر ہے کہ آل شیخ کا تشدد بھی سحاب رحمت اور آل سعود کا ظلم و جبر بھی ناصحانہ اور پدرانہ شفقت کے سوا اور کیا لگیں گے؟ اب حال یہ ہے کہ جماعت اہل حدیث اور اہل دیو بند سوتن کے رول میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں اور ان کے آپسی بیان، رد اور جواب الجواب پر مشتمل درجنوں کتابیں دستیاب ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے آپسی اختلافات کی بنیاد ماڈی منفعت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دونوں کے لٹریچر کے مطالعے کے بعد آپ پر بھی یہ واضح ہو جائے گا کہ دونوں ہی آل شیخ اور آل سعود پر اپنی مسلکی دعویداری کی بڑھ چڑھ کر دلیل پیش کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کو ان سے الگ کرنے کی کوشش میں سرگرم ہیں، جب کہ دونوں کی جہت قبلہ اور مرکز عقیدت ایک ہی ہے۔ حسب ذیل تین اقتباسات ملاحظہ ہوں:

الديوبندية عقائدها و فكرها میں اہل دیو بند کے بارے میں اہل حدیث لکھتے ہیں:

''یہ علمائے دیو بند بریلویوں سے خائف رہتے ہیں، بلکہ ان کے سامنے کانپتے رہتے ہیں اور محمد بن عبدالوہاب کو گالیاں دیتے ہیں اور انھیں بُرا بھلا کہتے ہیں''۔

اسی ''الدیو بندیہ'' کے جواب میں دیو بند کے ایک پرانے فارغ ابوبکر غازی پوری نے وقفة مع اللا مذهبية فى شبه القارة الهندية لکھی، اس کتاب کی تقریظ میں نورالدین نوراللہ اعظمی قاسمی کہتے ہیں کہ:

''آج کل اس ٹولے (اہل حدیث) کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی جماعت سلفیہ میں ان کا انضمام ہو جائے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کے بزرگوں نے اس جماعت کے لئے بطور شعار جو عقائد وضع کیے ہیں وہ اس آرزو کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ بن رہے ہیں، مگر یہ آرزو اس قدر زرخیز اور گھر بار ہے کہ اس کے لئے تقیہ بھی کرنا پڑے تو سودا سستا ہے''۔ (ص:۱۴)

ایک جگہ اور فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عربوں کو جو زبردست اقتصادی خوشحالیوں کا خزانہ مرحمت فرمایا ہے اور اس خزانے کے ساتھ دعوت اسلام اور عقیدۂ توحید کی نشر و اشاعت کے سچے جذبے سے جوش مارتا ہوا دل ان کے سینوں میں رکھا ہے، مزید جود و سخا کے محبوب وصف سے بھی حصۂ وافر عطا کیا ہے''۔ (ص:۱۶)

قارئین ان تینوں اقتباسات کے بین السطور سے میرے دعوے کی تصدیق کریں گے۔

چوتھا منظر:۔ نجدی تحریک کا اگر سرسری مطالعہ بھی کیا جائے تو بات واضح ہو جائے گی کہ جن مسائل کو لے کر امت میں فتنہ کھڑا کیا گیا، قتل و غارت گری کی گئی اور مسلمانوں کو خانوں میں بانٹا گیا ان میں اکثر اصولی نہیں، فروعی تھے، خواہ وہ توسل و استعانت ہو یا پھر دوسرے فقہی مسائل۔ یہ تمام مسائل خیر القرون سے امت مسلمہ کے معمول رہے، جن پر علماء کا اجماع ہوا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''سب سے بہتر زمانہ میرا ہے، پھر اس کے بعد کا زمانہ، پھر اس کے بعد کا زمانہ''۔ انہی زمانوں میں ائمۂ اربعہ پیدا ہوئے اور پردہ فرما گئے، گویا خیر القرون میں پیدا ہوئے اور خیر القرون میں وصال فرمائے اور ان چاروں کے مأخذ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس ہی تھے جو عہد رسالت اور عہد صحابہ میں بھی تھے، جن کے اصول و ضوابط پر اعتبار کرتے ہوئے دنیا کے کروڑوں مسلمان صدیوں سے ان کی تقلید اور علماء اتباع کرتے رہے، لیکن شیخ نجد اور ان کے متبعین کے نزدیک ایسا کرنے والے چودہ سو سال کے سارے مسلمان (جن میں کبار محدثین و مفسرین بھی ہیں، اولیاے صالحین بھی ہیں اور غوث و اقطاب بھی) کافر ہیں، جو فوت ہو گئے وہ کفر پر مرے اور جو زندہ ہیں وہ واجب القتل ہیں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آج بھی دنیا کے نناوے فیصد مسلمان ائمۂ اربعہ میں کسی نہ کسی کے مقلد و متبع ہیں، جو ان کے عقیدے اور تحریک کے مطابق کفر و شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں اور واجب القتل ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب سارے مسلمان ہی واجب القتل ٹھہرے تو پھر یہ بات بات پر کس امت کے اتحاد کے لیے نعرہ زن رہتے ہیں؟ برسوں

پہلے اس تحریک نے امت میں جو انتشار وافتراق کا بیج بویا تھا آج اس کے نتیجے میں ملت اسلامیہ ہر شعبہ میں زوال سے دوچار ہے، عالم اسلام کی وحدت ٹوٹ چکی ہے، مشرق وسطی کے مسلمان زخموں سے چور چور ہیں، مسلمانوں کی اقتصادی قوت ورلڈ بینکوں میں گروی رکھی ہوئی ہے اور علوم نبویہ میں تحریف کا سلسلہ جاری ہے تاکہ روح محمدی مسلمانوں کے جسموں سے نکال دی جائے- ایسے میں آج وقت تھا کہ فروعی مسائل پر ایک دوسرے کے جیب وگریباں پر ہاتھ ڈال کر اپنی مردانہ قوت آزمانے کی بجائے ملت کے امہات المسائل پر مسلمان اپنی نگاہ مرکوز رکھیں، لیکن برسوں پہلے جس بھیانک اور ناقابل تلافی جرم کا ارتکاب کرکے انھوں نے ملت کو انحطاط سے دوچار کیا تھا، اسے آج بھی یہ دہرانے پر مصر ہیں اور احیاے سنت کے نام پر رفع یدین، قرأت خلف الامام، آمین بالجہر، آٹھ رکعت تراویح، ننگے سر نماز اور طلاق کے عدد و معدود جیسے فروعی مسائل پر مرنے مارنے کو تیار ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ دین کی متقشفانہ اور متشددانہ تعبیر کرنے والے یہ جنتی کبار محدثین، مفسرین اور ائمۂ مجتہدین کا علمی قد ناپنے کے لئے بھی ہمیشہ تیار رہتے ہیں- پوری دنیا بالخصوص برصغیر کا گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ اور شہر شہران کی بتائی ہوئی دین کی سیاسی اور مادی تعبیر میں اس قدر الجھ گیا ہے کہ انہیں اسلام کا چودہ سو سالہ علمی وفکری سرمایہ سمندر کا حُباب لگنے لگا ہے، جس کا نہ کوئی وزن ہے، نہ جہت ہے اور نہ اس میں کوئی استقرار، ایسے میں آج ان سے یہ سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا امت کو وحدت کی ایک لڑی میں پرونے کا یہی محمدی منہج ہے؟ اور کیا دوسری صدی ہجری سے آج تک ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کے علاوہ اسلام کی وہ تمام قد آور شخصیتیں دین کی صحیح تشریح نہ کرسکیں جن کی صدیوں سے امت تقلید واتباع کرتی چلی آرہی ہے؟

پردہ گرتا ہے:- یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح ہے کہ ہر شخص اپنے مسلک، عقائد ونظریات کی پیروی اور تبلیغ حق اور صحیح سمجھ کر کرتا ہے کہ ان عقائد میں کسی طرح کا تضاد اور منافقت نہیں ہے، مگر آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہابیائی تحریک یا بلفظ دیگر اہل حدیثیائی تحریک نے جن امور کو زوال امت سے تعبیر کرکے قتل وغارت گری اور تکفیری مہم چلائی تھی اور آج بھی وہ اس تحریک میں سرگرم عمل ہیں، انہیں امور کے وہ خود بھی بڑے سچے پکے عامل ہیں، بس فرق ہے تو اتنا کہ دنیا کے کروڑوں مسلمان خیر القرون کے ائمۂ مجتہدین کی تقلید واتباع کرتے ہیں اور یہ آٹھویں صدی ہجری کے بعد کے سخت گیر علماء، مثلاً ابن تیمیہ، ابن قیم اور قاضی شوکانی کے پکے مقلد ہیں جنھوں نے سواد اعظم سے یکسر ہٹ کر دین کی ایک نئی تعبیر پیش کی- استعانت کے یہ قائل ہیں، استغاثہ یہ کرتے ہیں اور توسل ان کا عمل ہے- مشتے نمونہ ازخروارے، چند مثالیں حاضر ہیں:

تقلید کو شرک سے تعبیر کرنے والے یہ اہل حدیث بہت سے مسائل میں ابن تیمیہ کو اپنا امام تسلیم کرتے ہوئے ان کی پیروی کرتے ہیں، مثال کے طور پر شدِ رحال، آٹھ رکعت تراویح اور تین طلاق کے مسائل کو لے لیجیے- عہد رسالت سے لے کر آٹھ سو سالوں تک علماء، حدیث شد رحال کا مفہوم (جس میں مسجد نبوی، مسجد حرام اور مسجد قدس کے سفر کے لیے کہا گیا ہے) یہی سمجھتے رہے کہ ان تینوں مسجدوں کی زیارت کی تاکید کی گئی ہے، لیکن ان مقامات کی تاکید کا مطلب دوسرے مقامات کی زیارت کی نفی نہیں ہے، مگر آٹھ سو سالوں کے بعد ابن تیمیہ نے اس حدیث کا مفہوم یہ نکالا کہ مزارات ومقابر اور آثار کی زیارت حرام بلکہ شرک وکفر ہے- ابن تیمیہ کے اس نظریے کی تقلید اور تبلیغ آج تک غیر مقلدین اہل حدیث کررہے ہیں- اب ان سے کون پوچھے کہ تقلید جامد کا بدترین جرم کرکے جو شرک وہ کررہے ہیں، ایسے میں انھیں کس مقتل میں لے جاکر قربان کیا جائے؟ اسی طرح حدیث عائشہ، جس میں آٹھ رکعت صلوۃ اللیل کا ذکر ہے، عہد رسالت سے لے کر آج تک صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور کبارِ علماء نے یہی سمجھا کہ اس سے مراد تہجد کی رکعتیں ہیں، لیکن آٹھ سو سال کے بعد ابن تیمیہ نے اسے تراویح کی رکعت مان کر امت مسلمہ کے سامنے پہلی بار اس حدیث کا بالکل اجنبی مفہوم پیش کیا- اس کے بعد سے لے کر آج تک غیر مقلدین اہل حدیث آٹھ رکعت تراویح پر نہ صرف عامل ہیں بلکہ بیس رکعت پڑھنے پر لڑنے مارنے پر آمادہ ہیں- تقلید کا اتنا جنون تو ہمارے موروثی مقلدین کے یہاں بھی نہیں ہے کہ وہ امام اعظم کے کسی قول کو ترک کرنے پر اپنی آستینیں چڑھالیں- اسی طرح وقوع طلاق میں عدد کا مسئلہ ہے، عہد صحابہ سے آٹھ سو سالوں تک خیر القرون کے تمام اجلۂ محدثین، مفسرین، شارحین اور بعد کے ادوار کے علماء تین طلاق کو تین ہی مانتے رہے، لیکن آٹھ سو سالوں کے بعد ابن تیمیہ نے تین طلاقوں کو تین ماننے سے انکار کرتے ہوئے تین پر ایک طلاق کا شوشہ چھوڑا- اس کے بعد سے آج تک تمام غیر مقلدین اسی نظریے کی تقلید سختی سے کرتے چلے آرہے ہیں، شاید اسی پس منظر میں ایک مشہور غیر مقلد عالم نواب وحید الزماں نے کہا تھا کہ:

''ہمارے اہل حدیث بھائیوں نے ابن تیمیہ، ابن قیم اور شاہ ولی اللہ اور مولوی اسمٰعیل صاحب کو دین کا ٹھیکدار سمجھ رکھا ہے جہاں کسی مسلمان نے ان بزرگوں کے خلاف کسی قول کو اختیار کیا بس اس کے پیچھے پڑ گئے اور برا بھلا کہنے لگے- بھائیو! ذرا غور تو کرو اور انصاف کرو جب تم نے ابوحنیفہ، شافعی کی تقلید چھوڑی تو ابن تیمیہ اور ابن قیم اور شوکانی جو ان سے بہت متاخر ہیں ان کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟''-

(حیات وحید الزماں، بحوالہ تقلید، ص:۱۵)

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

اللہ کے نبیوں اور ولیوں سے توسل، ان سے مدد چاہنا اور ان کی بارگاہ میں استغاثہ کرنا صدیوں سے علماء، صوفیہ اور امت اسلامیہ کا معمول تھا اور ہے، لیکن اس معمول کو ابن تیمیہ، ابن عبدالوہاب نجدی اور ان کے پیروکار شرک وکفر کہتے ہیں اور اسی استعانت وتوسل کو لے کر سعودیہ میں شیخ نجد نے ابن سعود کی مدد سے تمام کبار صحابہ، محدثین، امہات المومنین اور اولیاے کاملین کی قبروں پر بے رحمی سے بلڈوزر چلا کر برابر کر دیا، جب کہ درونِ خانہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے اماموں سے توسل بھی کرتے ہیں، استغاثہ بھی کرتے ہیں اور استعانت بھی- مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خاں اپنے آقاؤں کو پکارتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں:

''قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے　　　ابن قیم مددے قاضی شوکاں مددے

حیرت ہے کہ اللہ کے مقرب نبیوں اور ولیوں سے استغاثہ کیا جائے تو وہ شرک ٹھہرے اور ماضی قریب کی متنازع ترین شخصیتوں سے یہی غیر مقلدین استعانت چاہیں تو وہ عین اسلام ہو جائے؟ خدایا! یہ کیسی دو پیانگی اور دورخی شریعت ہے؟

بات کچھ نہیں بس اتنی سی ہے کہ سواد اعظم نے اپنی طبیعتوں کو مزاج محمدی کے مطابق ڈھال کر ائمۂ مجتہدین کے بتائے ہوئے خطوط پر قرآن وسنت کی پاسداری کرتے رہے اور ان لوگوں نے اپنے مزاج وطبیعت کے مطابق دین کو ڈھال کر دنیا کے سامنے اس کا ایک ایسا نیا جغرافیہ پیش کیا جس کی پیچیدگیوں میں الجھ کر آج تک وہ خود اپنا نشان منزل تلاش نہ کر سکے ہیں اور شاید یہی بنام ''توحید'' ان کے سیاسی اور مادّی ڈرامے کا ڈراپ سین ہے-

---

اہل حدیث/ غیر مقلدین کی اسی دو پیانگی کو بے نقاب کرنے اور اہل سنت کو بیدار کرنے کے لیے ہم نے یہ خصوصی شمارہ نکالنے کا ارادہ کیا -اس سلسلے میں اس سعودی لٹریچر نے مزید مہمیز کا کام کیا جو عوام وخواص اور طلبہ واساتذہ میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے اور اس میں بیک وقت انتشار امت پر مرثیہ خوانی بھی ہوتی ہے، اتحاد کی آرزو بھی ہوتی ہے اور ائمہ مجتہدین کی توہین وتذلیل اور عامۃ المسلمین کی تکفیر بھی- اس کے لیے جب ہم نے اپنی ٹیم سے مشورہ کیا تو سب نے یہ کہا کہ اپنی پوری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارا اسلوب معروضی ہو اور ہمارا مقصد مخالفین کی زباں بندی کی بجائے اصل مسئلے کی علمی توضیح وتفہیم- خصوصی شمارے کو متوازن بنانے کے لیے موافقین ومخالفین کی آراء اور انٹرویوز بھی شامل کیے گئے تا کہ قارئین کے سامنے بحث کا ہر پہلو آ جائے، اس کے باوجود اگر بعض حضرات اس نیک کوشش کو افتراق وانتشار کا نام دیں تو ہم انہیں معذور سمجھیں گے، کیونکہ ایسے لوگ ریت پر اتحاد امت کا محل تعمیر کر رہے ہیں- ھَدانا اللہ وَ ایّاھم

اس خصوصی شمارہ میں ہمارے کرم فرماؤں نے قدم قدم پر ہماری معاونت کی- تعاون کی نوعیتیں مختلف تھیں، کسی نے اس خصوصی شمارے میں مضمون لکھ کر تعاون کیا، کسی نے نہ لکھنے کا عذر پیش کر کے تعاون کیا، کسی نے اشتہارات دیکر تعاون کیا، کسی نے واہ واہ کر کے تعاون کیا، کسی نے ناگواری کا اظہار کر کے تعاون کیا، بہر حال ہم ان تمام حضرات کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں- جی چاہتا ہے کہ میں اپنے عزیز دوست مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری، مولانا قمر احمد اشرفی، مولانا سجاد عالم مصباحی، مولانا ذیشان احمد مصباحی، مولانا ملک الظفر سہسرامی اور مولانا منظر الاسلام ازہری کا بھی خصوصی شکریہ ادا کروں، لیکن میں ایسا کرونگا نہیں، کیونکہ شکریہ ان کا ادا کیا جاتا ہے جو مہمان ہوتے ہیں اور یہ لوگ تو میزبان ہیں- آخر میں، میں مولانا انیس اشرفی، مولانا امجد علی قادری، مولانا ذوالفقار برکاتی، مولانا علاء الدین رضوی اور ڈاکٹر غلام جابر مصباحی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ممبئی کی سرزمین پر اس نمبر کی اشاعت کے لیے خصوصی توجہ فرمائی- ☆☆

باب ۱

تفہیم وتعبیر

قاضی فضل احمد مصباحی☆

قیاس و اجتہاد کی حقیقت و ضرورت

یہ امر مسلم ہے کہ ہر حکومت کیلئے قوانین وضوابط کا مجموعہ ضرور ہوتا ہے جس کے ماتحت حکومت کا نظم ونسق برقرار رہتا ہے۔ لیکن سر دست ہم روئے زمین پر انسانی حکومت کی نہیں، خدائی حکومت کی بات کرتے ہیں اور خدا کی زمین پر سلامتی کا راستہ صرف اسلام ہے، یہ وہ دین ہے جو دنیا سے آقا اور غلام، گورے اور کالے، عربی اور عجمی کی تمیز مٹاتا ہے اور عدل وانصاف کے تقاضے صرف اس آئین کی بالا دستی سے پورے ہو سکتے ہیں جو طاقتور اور کمزور، ادنی اور اعلی، امیر اور غریب کا امتیاز مٹا سکتا ہے۔ اسلامی حکومت اور دین الہی کے قوانین کا پہلا مجموعہ قرآن عظیم ہے اور اس کی تفصیلات کا دوسرا مجموعہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

قرآن کریم اور احادیث کریمہ کی روشنی میں جو مسائل مسلمانوں کی راہ عمل معین کرنے کیلئے مرتب ہوئے ہیں انہی مسائل کے مجموعہ کا نام فقہ ہے، فقہ میں ان کے علاوہ ایسے مسائل شرعیہ بھی ملیں گے جو قرآن کریم اور احادیث کریمہ میں صراحۃً موجود نہیں، بلکہ وہ یا تو اجماع سے ثابت ہیں یا پھر قیاس واجتہاد کے ذریعہ اخذ کیے گئے ہیں۔ بایں ہمہ اجماع اور قیاس کی بنیاد قرآن کریم کے شہ پاروں اور احادیث کریمہ کے ذخائر میں ضرور ملے گی۔

الغرض اسلامی حکومت اور نظام مملکت کا سارا دارومدار کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجماع امت اور قیاس پر ہے۔

یوں تو فقہ اسلامی کا اصل ماخذ قرآن کریم وسنت اور اجماع ہی ہیں کہ یہی مثبت حکم ہیں اور قیاس کو بھی ضمناً ماخذ میں شمار کر لیا گیا ہے، گو کہ یہ مثبت حکم نہیں مظہر حکم ضرور ہے۔ اس وقت چونکہ قیاس واجتہاد ہی ہماری فکری وقلمی جولانگاہ ہے، اس لیے ذیل میں ہم صرف قیاس واجتہاد کی حقیقت وضرورت کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

قیاس واجتہاد کی حقیقت:۔ سطور بالا میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ فقہ اسلامی میں قیاس کی حیثیت چوتھے درجہ کی ہے۔ قیاس کا معنی لغت میں اندازہ کے ہیں، چنانچہ عرب میں کہا جاتا ہے ''قس النعل بالنعل'' نعل کا نعل کے ساتھ اندازہ کرو۔ اور اصطلاح شرع میں فرع کو اصل کے ساتھ حکم وعلت میں برابر کر دینے کو قیاس کہا جاتا ہے۔ اصل کو مقیس علیہ اور فرع کو مقیس اور جو چیز قدرے مشترک طور پر دونوں میں پائی جاتی ہے اسے علت مشترکہ اور جو اثر مرتب ہوتا ہے اسے حکم کہتے ہیں۔

قیاس واجتہاد میں کوئی فرق نہیں بلکہ یہ ایک ہی شئی کے دو نام ہیں۔ جیسا کہ امام شافعی علیہ الرحمہ کی مشہور کتاب ''الرسالہ'' میں ہے۔

"قال فما القیاس؟ اهو الاجتهاد؟ ام هما مفترقان؟ قلت هما اسمان لمعنی واحد"

(الرسالة، الجزو الثالث، القیاس)

مشہور حنفی فقیہ امام سرخسی کے نزدیک قیاس کو مجازاً اجتہاد کہہ دیا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"ویسمی ذلک اجتهاداً مجازاً ایضا لان ببذل المجهود یحصل هذا المقصود۔"

(اصول السرخی، الجزء الثانی ص ۱۴۳)

قیاس کی حجیت:۔ صحابہ کرام، تابعین عظام، ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین نے ہر زمانہ میں قیاس پر عمل کیا ہے اور غیر منصوص مسائل میں قیاس واجتہاد ہی کے ذریعہ حکم شرع کو ظاہر وواضح کیا ہے، البتہ اصحاب ظواہر کے نزدیک قیاس اس قابل نہیں کہ اس کے ذریعہ منصوص کا حکم غیر منصوص تک متعدی کیا جا سکے۔ اور جہاں تک حکم شرع کا مسئلہ ہے تو قیاس کو اس میں کوئی دخل نہیں، بلکہ اس باب میں قیاس پر عمل بالکل باطل ہے۔ اصحاب ظواہر میں سب سے پہلا شخص جس نے صحابہ وتابعین اور مجتہدین صالحین کے خلاف قول کیا ابراہیم نظام ہے۔ اس شخص نے سلف صالحین کو محض اس لیے طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا کہ سلف صالحین قیاس سے استدلال کرتے تھے اور اسے شرعی دلیل جانتے تھے۔ پھر بغداد کے بعض متکلمین نے ابراہیم نظام کے قول کا اتباع کیا لیکن ان لوگوں نے

☆Jamia Arabia Zia-ul-Uloom,Kachchi Bagh, Varanasi(U.P)

سلف صالحین پر تبرا بازی سے اجتناب کرتے ہوئے یہ کہا کہ صحابہ کرام نے قیاس کے ذریعہ جو احکام اور فیصلے اخذ فرمائے وہ درحقیقت احکام نہیں، بلکہ دو فریق کے درمیان صلح ومصالحت کے لیے اپنی رائے کا اظہار ہے، جس کا حکم شرع سے کوئی علاقہ نہیں۔لہذا صحابہ کرام کے اس اظہار رائے کو قیاس کی حجت ہونے کی دلیل بنانا درست نہیں۔

اس کے بعد ایک ایسا شخص آیا جو شریعت کے مسائل سے بالکل غافل، بلکہ علما کی زبان میں کہیں تو متجاہل، جس کا نام داؤد اصبہانی ہے، اس نے اس کی زحمت ہی گوارہ نہ کی کہ علمائے ماسبق نے کیا کہا ہے اوران کی مراد کیا ہے، یکلخت قیاس پر عمل کو باطل قرار دیا اور کہہ دیا کہ قیاس حجت ہے ہی نہیں اور نہ احکام شرع میں اس پر عمل جائز ہے۔ بعد کے زمانے میں جن لوگوں نے داؤد اصبہانی کا اتباع کیا انہیں اصحاب ظواہر کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض نے ذرا ہمت جٹائی اور افترا پردازی اور بہتان طرازی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے مذہب کو حضرت قتادہ مسروق وابن سیرین رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے اجلۂ تابعین سے منسوب کردیا، العیاذ باللہ۔ اس کی پوری تفصیل اصول السرخسی اور فقہ اہل العراق وحدیثہم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نظام کے افکار وخیالات: ۔ابراہیم نظام مذہبا معتزلی تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف براہمہ کے اقوال نظام کو بہت پسند تھے، لیکن تلوار کے خوف سے ان کے اظہار کی جسارت نہ کرتا تھا، یہاں تک کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات مثلا انشقاق قمر، کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، انگلیوں کے درمیان سے چشمہ کا بہہ نکلنا، ان سب کا انکار اس لئے کیا کہ انکار نبوت کی راہ ہموار ہوجائے۔ اس کی نشو ونما اچھے ماحول میں نہ ہوئی اور نشست وبرخاست بھی کچھ اچھے لوگوں کے ساتھ نہ تھی۔ جس کا اثر اس کے ذہن ودماغ پر پڑا اور بہت سے بنیادی عقاید کا انکار کردیا۔ (الفرق بین الفرق ص:۷۹/۸۰)

نظام کے تعلق سے علماء کی رائے: ۔منکرین قیاس کے موسس اول ابراہیم نظام باوجودیکہ مذہبا معتزلی تھا، اس کے گندے عقائد کی وجہ سے اکثر معتزلیوں نے بھی اس کی تکفیر کی۔ رہے اہل سنت وجماعت کے وہ علماء ومشائخ جنہوں نے نظام کی تکفیر کی وہ حد شمار سے باہر ہیں۔ کتاب ''فقہ اہل العراق وحدیثہم'' کے محشی ''الفرق بین الفرق'' کے ص۸۰تا۹۱ سے اخذ کرتے ہوئے بطور اختصار لکھتے ہیں۔

اکثر معتزلہ نظام کی تکفیر پر متفق ہیں، جاحظ وغیرہ مٹھی بھر قدریہ نے اس کا اتباع کیا۔ لیکن انہوں نے بھی بعض گمراہیوں میں اس کی مخالفت کی اور کچھ نے مزید گمراہیوں کا اضافہ کردیا۔ اکثر مشائخ معتزلہ نے اس کی تکفیر کی۔ انہی میں اس کے ماموں ابوالہذیل ہیں، جنہوں نے اپنی مشہور کتاب ''الرد علی النظام'' میں اس کی تکفیر کی۔ جبائی نے بھی متعدد مسائل میں اس کی تکفیر کی، جس کی تفصیل ابومنصور بغدادی نے لکھی ہے۔ نظام کے رد میں اس کی ایک کتاب بھی ہے۔ نظام کی تکفیر کرنے والوں میں اسکافی کا نام بھی ہے جس نے نظام کی تکفیر میں کتاب لکھی اوراس کے بیشتر مسائل میں اس کی تکفیر کی، رہی وہ کتابیں جو نظام کی تکفیر میں اہل سنت نے لکھیں تو ان کی تعداد خدا ہی کو معلوم۔ شیخ ابوالحسن اشعری کی نظام کی تکفیر میں تین کتابیں ہیں۔ قلانسی کے متعدد کتب ورسائل ہیں اور قاضی ابوبکر باقلانی کی ایک ضخیم کتاب ہے، جس میں نظام کے متعدد اصول کا رد کیا گیا ہے۔''

حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمہ نے بھی ''المستصفی'' ج۲، ص۲۴۶/۲۴۷، مبحث قیاس کے اوائل میں ''نظام معتزلی'' کی خباثت کا ذکر کیا ہے۔

مثبتین قیاس کے دلائل: ۔جمہور علماء جو قیاس کو حجت اور دلیل شرع مانتے ہیں وہ اپنے موقف پر تین قسم کے دلائل قائم کرتے ہیں۔ (۱) کتاب (۲) سنت (۳) دلیل معقول۔ ان تینوں قسم کے دلائل کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ان کے کلام میں پایا جاتا ہے، یہاں ان سب کا احاطہ مضمون کی طوالت کا باعث ہوگا، اس لئے ہم یہاں قدر معتد بہ حصہ کے بیان ہی پر اکتفا کریں گے۔

کتاب: (۱) اللہ تعالی کا ارشاد ہے ''**فاعتبروا یااولی الابصار**'' (آل عمران) اے بصیرت والو عبرت حاصل کرو۔

اس آیت میں ''اعتبار'' کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اعتبار کا معنی شئی کے حکم کو اس کی نظیر کی طرف لوٹا دینا ہے، یہی وجہ ہے کہ جس اصل سے اس کے نظائر کو ملا دیا جاتا ہے اسے عبرت کہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے۔

''ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار''

اعتبار کے اسی مفہوم کا نام قیاس ہے، تو ثابت ہوگیا کہ اس آیت میں قیاس کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''ولو ردوہ الی الرسول واولی الامر منهم لعلمه الذین یستنبطونه منهم۔''

اس آیت میں استنباط کا معنی قیاس کے ذریعہ نص سے علت کا استخراج ہے، اب یہ استخراج علت یا تو اس لئے ہوگا کہ نص کے حکم اس کے نظائر تک متعدی کر دیا جائے اور یہی عین قیاس ہے یا اس لئے کہ اس سے طمانیت قلب حاصل ہو جائے، اور طمانیت قلبی اسی وقت حاصل ہوگی جب اس علت اور لم پر انسان مطلع ہو جائے جو نص میں حکم کی بنیاد ہے۔ اور ایسا اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت طاہرہ کو آنکھوں کا نور اور شرح صدور بنایا۔ ارشاد ہے۔ ''افمن شرح الله صدره للاسلام فهو علی نور من ربه۔'' (الزمر)

جس طرح آنکھ موجود چیز کو بینائی سے دیکھتی ہے، ٹھیک اسی طرح قلب غیر موجود چیز کو غور و فکر سے دیکھتا اور ادارک کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو غور وفکر سے کام نہیں لیتا اس کے بارے میں اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے۔ ''فانها لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔'' (الحج)

پھر آنکھ سے دیکھ کر کسی چیز کے بارے میں آدمی کو جو اطمینان حاصل ہوتا ہے، خبر کے ذریعہ سن کر اتنا اطمینان نہیں ہوتا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''لیس الخبر کالمعاینة۔'' (خبر مشاہدہ کی طرح نہیں ہے۔)

یہی معاملہ رویت قلب کا بھی ہے کہ جب معنی منصوص میں غور وفکر کرنے کے بعد اس پر اطلاع پا جائے تو مکمل انشراح صدر اور طمانیت قلب حاصل ہو جاتا ہے، تو اس غور وفکر سے روکنا اور یہ کہنا کہ نص میں حکم کی علت اور سبب کی تلاش وجستجو میں نہ پڑو، ایک طرح سے اس انشراح صدر اور طمانیت قلب کا حاصل کرنے کے ذریعہ کو ختم کر دینا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''لعلمه الذین الآیة'' سے ثابت ہے۔

شبہ: ۔ استخراج واستنباط بلفظ دیگر قیاس واجتہاد موجب علم نہیں ہے، بلکہ مجتہد مخطی بھی ہوتا ہے اور مصیب بھی، پھر یہ کہنا کیسے درست ہوگا کہ مجتہد معانی نصوص میں غور وفکر کر کے علم واطمینان حاصل کر لیتا ہے۔

ازالہ شبہ: ۔ یہ صحیح ہے کہ قیاس موجب علم نہیں ہے مگر اجتہاد کے ذریعہ بظاہر ایسا علم حاصل ہو جاتا ہے جو اطمینان قلب کا باعث ہو، اگر چہ اجتہاد سے اس بات کا یقینی علم حاصل نہیں ہوتا کہ یہی حق ہے۔ یعنی قیاس سے من حیث الظاہر علم حاصل ہوتا ہے اور بس۔ چنانچہ اصول سرخسی ۲، ص ۱۲۹ میں ہے۔

اگر کوئی سوال کرے کہ یہ درست کیسے ہو سکتا ہے، جبکہ قیاس کو تو خود آپ بھی موجب علم نہیں مانتے؟ مجتہد کبھی خطا پر ہوتا ہے اور کبھی درستگی پر؟ تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اجتہاد سے مجتہد کو بظاہر ایسا علم ضرور حاصل ہو جاتا ہے، جس سے اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر چہ وہ اجتہاد کے ذریعہ یہ نہیں جانتا کہ قطعی طور پر حق کیا ہے؟ اس کی نظیر خدا کے اس فرمان میں موجود ہے: فان علمتموهن مؤمنات ۔ کیوں کہ اس میں ظاہری علم ہی مراد ہے۔

الرسالة ،الجزء الثالث کے مبحث قیاس میں ہے۔

''وعلم اجتهاد بقیاس علی طلب اصابة فذلک حق فی الظاهر عندقایسه لا عند العامة من العلماء ولا یعلم الغیب فیه الا الله۔''

سنت: ۔ (۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحالت صوم عورت کے بوسہ کے تعلق سے حکم شرعی دریافت فرمایا تو اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا۔

''ارایت لو تمضمضت بماء ثم مججته اکان یضرک''، یعنی بھلا بتاؤ تو سہی کہ اگر تم پانی سے کلی کرو پھر اسے پھینک دو تو کیا یہ تمہارے روزہ کو نقصان پہنچائے گا؟

اس حدیث شریف میں قیاس کی تعلیم دی گئی ہے کہ منہ میں پانی داخل کرنے سے پینے کا راستہ کھل جاتا ہے، باوصف اس کے پینا نہیں پایا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح روزہ کی حالت میں بوسہ لینے سے قضاء شہوت کے راستے کھل جاتے ہیں، لیکن صرف اسی سے قضاء شہوۃ نہیں ہو جاتی ہے۔ تو جس طرح منہ میں پانی داخل کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا جب تک کہ حلق کے نیچے نہ اترے بوسہ لینے سے بھی روزہ فاسد نہ ہوگا۔ جب تک انزال نہ ہو جائے۔

(۲) قبیلۂ خثعم کی ایک عورت نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے والد بہت ضعیف ہیں، سواری پر سفر نہیں کر سکتے ہیں، ان پر حج فرض ہو گیا ہے، کیا میں ان کی طرف سے حج ادا کروں؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا۔

''ارایت لو کان علی ابیک دین اکنت تقضینه؟

فقالت نعم قال فدین الله احق -'' یعنی اگر تیرے باپ پر قرض ہوتا تو تم اسے ادا کرتی؟ کہاں ہاں! فرمایا تو اللہ کا دین ادائیگی کے زیادہ لائق ومناسب ہے۔

یعنی جو حج ان کے ذمہ باقی ہے وہ دین ہے، لہذا اس کی طرف سے حج بدل ادا کرو۔ اس حدیث میں قیاس کی تعلیم اور رائے پر عمل کرنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''الھرۃ لیست بنجسۃ لانھا من الطوافین علیکم والطوافات -''

یعنی بلی کا جوٹھا ناپاک نہیں ہے، یہ تو تمہارے گھروں میں چکر لگانے والے جانوروں میں سے ہے۔

اس حدیث میں بھی قیاس کی تعلیم ہے کہ وہ وصف جو تخفیف حکم میں موثر ہے وہ طواف ہے اور عموم بلوی اور ضرورت کی وجہ سے ان جیسے جانوروں کے جوٹھے کو ناپاک نہیں کہا جائے گا۔

(۴) جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف مبلغ اور قاضی بنا کر بھیج رہے تھے، آپ نے حضرت معاذ سے فرمایا! اے معاذ کس چیز سے فیصلہ کروگے؟ حضرت معاذ نے جواب دیا اللہ تعالی کی کتاب یعنی قرآن کریم سے، حضور نے ارشاد فرمایا اگر تم نے کتاب اللہ میں اس مسئلہ کا حل نہ پایا تو کیا کروگے؟ حضرت معاذ نے عرض کیا اس وقت رسول اللہ کی سنت سے مسئلہ کا حل نکالوں گا، پھر حضور نے پوچھا اگر تم نے رسول کی سنت میں بھی اس کا حل نہ پایا تو کیا کروگے؟ حضرت معاذ نے فرمایا اس وقت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کے قول کو درست قرار دیتے ہوئے فرمایا۔

''الحمد لله الذی وفق رسول رسوله لما یرضی به رسوله -'' (اللہ تعالی کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق بخشی جس سے اس کے رسول راضی ہیں۔)

دلیل معقول: -قیاس کے حجت ہونے پر عقلی دلیل یہ ہے کہ ''اعتبار'' یعنی امثال میں غور وفکر بنص قرآن واجب ہے۔ یعنی کفار تکذیب اور عداوت رسول کی وجہ سے قتل وجلا وطنی پر مجبور ہوئے، تو اب اس میں غور وفکر کا حکم ہوا کہ اے بصیرت والو تم اپنے حالات کے درپے رہے تو تمہیں بھی قتل وجلاوطنی میں مبتلا ہونا پڑے گا، جس طرح وہ کفار مبتلا ہوئے اور قیاس شرعی اسی تامل کی نظیر ہے کہ حکم عقوبت کو علت عداوت کی وجہ سے ان کفار معہودین سے ہر بصیرت والے کے حال کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ جس طرح مقیس علیہ سے حکم کو مقیس تک متعدی کر دیا جاتا ہے۔ تو اس طور پر قیاس کی حجیت دلیل معقول سے ثابت ہوگئی۔

منکرین قیاس کے دلائل: - جو لوگ قیاس کے منکر ہیں اور اسے حجت شرعیہ نہیں مانتے وہ بھی اپنے موقف پر تین طرح سے دلائل قائم کرتے ہیں۔ (۱) کتاب (۲) سنت (۳) دلیل معقول۔

کتاب: - (۱) اللہ عز وجل کا ارشاد ہے۔

''اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتٰب یتلیٰ علیھم'' (العنکبوت)

(کیا انہیں کافی نہیں ہے کہ ہم نے ان پر ایسی کتاب اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔)

اب اگر کسی مسئلہ میں قیاس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ کا حکم وہاں کافی نہیں ہے، اور یہ فرمان الہی کے خلاف ہے۔

(۲) ارشاد الہی ہے۔

''ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شئ -'' (النحل) یعنی ہم نے تم پر ایسی کتاب اتاری جس میں ہر چیز کا روشن بیان ہے۔

نیز ارشاد ہے: ''ما فرطنا فی الکتٰب من شئی -'' (الانعام)

نیز ارشاد ہے: 'ولا رطب ولا یابس الا فی کتب مبین -'' (الانعام)

ان آیتوں میں اس بات کا واضح بیان ہے کہ تمام چیزیں کتاب اللہ میں اشارۃ دلالۃ اقتضاء نصاً موجود ہیں۔ اور قیاس کی طرف مراجعت کا معنی یہ ہے کہ وہ حکم کتاب اللہ میں موجود نہیں۔ حالانکہ یہ بات اللہ عز وجل کے ارشاد کے واضح خلاف ہے۔

(۳) ارشاد الہی ہے۔

''یاایھا الذین آمنوا لاتقدموا بین یدی الله ورسوله -'' (الحجرات)

نیز ارشاد ہے: ''ومن لم یحکم بما انزل الله فاولیک هم الکافرون -'' (المائدة)

ان آیتوں کا مفاد یہ ہے کہ اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو، اور جس نے اللہ کے نازل کیے ہوئے کلام کے مطابق حکم اور فیصلہ نہ کیا وہی کافر ہیں- تو اب اجتہاد و قیاس کے مطابق عمل کرنا اللہ اور اس کے رسول پر سبقت لے جانے کے مترادف ہے- یوں ہی قیاس کے مطابق حکم کرنا اللہ عزوجل کے نازل کردہ احکام کے علاوہ حکم کرنا ہے جو کفر و فسق ہے-

احادیث کریمہ: -(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا-

"لم یزل بنو اسرائیل علی طریقة مستقیمة حتی کثر فیهم اولاد السبایا فقاسوا مالم یکن بما قد کان فضلوا واضلوا-" (یعنی بنی اسرائیل سیدھے راستے پر قائم تھے یہاں تک کہ ان میں قیدیوں کی اولاد زیادہ ہوگئی تو انہوں نے گذشتہ چیزوں پر آئندہ چیزوں کا قیاس کیا، خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا-)

(۲) حضرت ابو ہریرہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- **"تعمل هذه الامة برهة بالکتاب ثم برهة بالسنة ثم برهة بالرایی فاذا فعلوا ذلک ضلوا-"**

یعنی یہ امت کبھی کتاب اللہ کے مطابق عمل کرے گی، کبھی سنت کے مطابق پھر کبھی قیاس واجتہاد کے مطابق عمل کرے گی- جب وہ ایسا کریں تو وہ گمراہ ہوگئے-

(۳) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا-

"ایاکم واصحاب الرای فانهم اعداء الذین اعیتهم السنة ان یحفظوها فقالوا برأیهم فضلوا واضلوا-"

یعنی تم قیاس کرنے والوں سے بچو کہ وہ دین کے دشمن ہیں، وہ سنت کو تو اپنے حافظہ میں محفوظ نہ رکھ سکے اور قیاس واجتہاد سے کہنا شروع کردیا- خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کردیا-

دلیل معقول: - قیاس کے منکرین اپنے دعوی پر جو عقلی دلائل قائم کرتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں-(۱) دلیل عقلی من حیث الدلیل (۲) دلیل عقلی من حیث المدلول-

دلیل عقلی من حیث الدلیل: - یہ ہے کہ قیاس کی اصل میں شبہ ہے، اس لئے کہ جس وصف وعلت کے ذریعہ حکم کو متعدی کیا جاتا ہے وہ علت بذات خود منصوص نہیں ہے-

دلالت النص، اشارۃ النص، اقتضاء النص کسی سے وہ ثابت بھی نہیں ہے- اور قیاس واجتہاد کے نتیجہ میں جو حکم ایجاب یا اسقاط، تحلیل یا تحریم کی صورت میں ہوگا وہ محض حق اللہ ہوگا اور اس بات کی قطعی کوئی گنجائش نہیں کہ حق اللہ کو ایک ایسے طریقہ سے ثابت کیا جائے جس میں شبہ موجود ہو- کیوں کہ صاحب حق کمال قدرت سے متصف ہے اور اس کی شان اس سے بہت بلند و بالا ہے کہ عجز اس کی طرف منسوب ہو، یا وہ اپنے حق کے اثبات میں ان چیزوں کا محتاج ہو جن میں شبہ ہے- اور قیاس میں اس قسم کے شبہ کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ قیاس بالاتفاق علم یقینی کا افادہ نہیں کرتا، اور جب قیاس سے علم یقینی کا افادہ نہیں ہوتا تو وہ بحکم قرآن منہی عنہ ہوگا- جیسا کہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے-

"ولا تقف مالیس لک به علم-" (بنی اسرائیل)

جس کا تجھے علم نہیں اس کی ٹوہ میں نہ پڑو-

"ولا تقولوا علی الله الا الحق-" (النساء)

اللہ کے بارے میں سچی بات ہی کہو-

دلیل معقول من حیث المدلول: -احکام شرع اللہ کی طاعت وعبادت ہی کے لیے ہیں اور طاعت وعبادت کی معرفت میں قیاس واجتہاد کو کوئی دخل نہیں، یہی وجہ ہے کہ قیاس واجتہاد سے اصل عبادت کا اثبات جائز نہیں- اور ایسا اس لئے ہے کہ اللہ کی طاعت، اظہار عبودیت اور انقیاد وتسلیم ہی میں منحصر ہے- اور جو حکم تعبدی ہوتا ہے مقتضائے قیاس پر اس کی بنیاد نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ بطور ابتلا ہوتا ہے- چنانچہ ہمیں ایسے بھی احکام ملتے ہیں جن کا قیاس واجتہاد سے اصلا ادراک نہیں ہوتا، جیسے نماز میں رکعتوں کی تعداد، عقوبات میں سزاؤں کی مقدار، بلکہ بعض احکام تو ایسے ہیں جو یکسر قیاس واجتہاد کے خلاف جاتے ہیں اور جب صورت حال یہ ہے تو احکام کی معرفت قیاس واجتہاد سے کیوں کر ممکن ہے؟ ایسی صورت میں قیاس پر عمل کرنا عمل بالعلم نہیں عمل بالجہل کہلائے گا-

منکرین کے دلائل کا جواب: -منکرین کا استدلال میں اللہ تعالی کے اس قول "ولم یکفهم" کو پیش کرنا درست نہیں، اس لئے کہ ہم کتاب اللہ کو کافی ووافی یقیناً مانتے ہیں لیکن قیاس واجتہاد کے ذریعہ استخراج کردہ حکم اگر کتاب اللہ میں نصا وصراحۃ موجود نہیں مگر اشارۃ ضرور موجود ہوتا ہے چونکہ قیاس واجتہاد اسی اعتبار کا نام ہے جس کا حکم

آیت کریمہ "فاعتبروا الایہ" میں دیا گیا ہے-تو ظاہر ہو گیا کہ جو حکم قیاس واجتہاد کا نتیجہ ہو وہ کتاب اللہ کے حکم کے موافق ہی ہو گا- اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قیاس واجتہاد کے ذریعہ جو حکم شرع ظاہر ہو گا وہ اللہ عزوجل کے قول "تبیانا لکل شئی" کے تحت داخل ہو گا، اور وہ حکم کتاب اللہ میں نصا یا دلالۃ، اشارۃ یا اقتضاء ضرور موجود ہو گا کہ یہ قیاس واجتہاد اسی اعتبار کا دوسرا نام ہے جس کا حکم خود اللہ عزوجل نے دیا ہے-اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قیاس واجتہاد پر عمل اللہ اور اس کے رسول پر سبقت لے جانے کے مترادف نہیں ہے، بلکہ درحقیقت وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی بجا آوری ہے، اور اس طریقہ پر چلنا ہے جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو دی ہے-یعنی احکام شرع سے باخبر ہونے کا کیوں کہ ہم غیر منصوص مسائل میں علت موثرہ کے ذریعہ حکم ثابت کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ علت ہمارے قیاس واجتہاد سے موثر نہیں ہوتی بلکہ وہ اللہ عزوجل ہے کے موثر بنانے سے موثر ہے-ہمارے قیاس واجتہاد کا صرف اتنا دخل ہے کہ اصل کے منجملہ اوصاف میں سے علت موثرہ کو منتخب کر کے اس کی تاثیر فرع میں ظاہر کر دیتے ہیں ہاں! البتہ منکرین نے یہ کہہ کر کہ "عمل بالقیاس باطل ہے" خود اپنے لئے اللہ اور اس کے رسول پر تقدیم وسبقت کا اشارہ دے دیا ہے، اس لیے کہ یہ لوگ اپنے اس قول کو "عمل بالقیاس باطل ہے-نص میں صراحۃ کہیں نہیں دکھا سکتے اور استنباط کو یہ جائز ہی نہیں قرار دیتے کہ اس کے ذریعہ نص کے اشارہ پر اطلاع ہو سکے تو ان لوگوں کا یہ قول بلا دلیل رہ گیا، اور احکام میں یہ بلا دلیل عامل ٹھہرے-الامان والحفیظ-

اور جہاں تک ان احادیث کا سوال ہے جنھیں منکرین نے بزعم خویش اپنے موقف کی تائید میں ذکر کیا ہے تو ان میں حقیقۃ علی الاطلاق قیاس واجتہاد کی مذمت نہیں بیان کی گئی ہے بلکہ ان سے مراد یہ ہے کہ وہ قیاس واجتہاد مذموم ہے جو خواہش نفس کی متابعت میں ہو یا وہ رائے مذموم ہے جس سے مقصود نص کا رد وانکار ہو، لیکن وہ قیاس واجتہاد جس سے ہمارے بیان کردہ طریقہ کے مطابق اظہار حق مقصود ہو وہ مذموم نہ ہو گا-چنانچہ اصول سرخسی میں ہے-

"واما عمر رضی اللہ عنہ فالقول عنہ بالرأی اشھر من الشمس وبہ یتبین ان مرادہ بذم الرأی عند مخالفۃ النص او الاعراض عن النص فیما فیہ نص والاشتغال بالرأی الذی فیہ موافقۃ ھوی النفس والی ذلک اشار فی قولہ اعیتھم السنۃ ان یحفظوھا-"

(اصول السرخی ج ۲ ص ۱۳۳)

(حضرت عمر کی قیاس کرنے کی بات اظہر من الشمس ہے، اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ رائے کی خدمت سے ان کی مراد ایسی رائے ہے جو نص کے مخالف ہو یا نص ہوتے ہوئے اس سے اعراض کرنے اور ہوائے نفس کی موافقت میں قیاس واجتہاد میں مشغول ہونے کی مذمت ہے-اس کی طرف ان کے ارشاد اعیتھم السنۃ میں اشارہ بھی ہے-)

یوں ہی بعض منکرین قیاس نے یہ جو کہا ہے کہ صحابہ کرام کا قیاس واجتہاد پر عمل الزام حکم کے لیے نہ تھا بلکہ یہ دو فریق کے درمیان مصالحت کی صورت کا اظہار تھا، یہ بات بالکل بے بنیاد ہے بلکہ خلاف واقعہ ہے- اس لیے کہ صحابہ کرام نے جہاں بھی صلح ومصالحت کی صورتیں نکالیں ہیں وہاں اس کی صراحت بھی کر دی ہے اور جہاں صلح ومصالحت کا لفظ مذکور نہیں یا وہاں بطور خاص لفظ قضاء وحکم مذکورہ ہے تو اس سے مراد الزام حکم ہی ہے، اور کیوں نہ ہو کہ عمل بالقیاس کی بعض صورتیں بصورت فتاوی تھیں-اور ہمارے زمانے میں مفتی مستفتی کو حکم مسئلہ بتاتا ہے، شاذ ونادر ہی ایسا ہوتا ہو گا کہ مفتی مسئلہ کا حکم نہ بتا کر صلح ومصالحت کی دعوت دیتا ہو، ٹھیک یہی صورت حال زمانہ صحابہ میں بھی تھی، لہٰذا صلح ومصالحت والی بات علی العموم درست نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں صحابہ کرام کا قیاس واجتہاد ان مسائل میں بھی ہوا ہے جہاں دو فریق میں باہم خصومت کا کوئی مسئلہ ہی نہیں، جیسے عبادات، طلاق، عتاق وغیرہ-تو جن لوگوں نے یہ کہا کہ صحابہ کرام کا قیاس بطور صلح تھا یہ اختراعی بات ہے-جیسا کہ اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۳۴ میں ہے-

"ومن قال منھم ان القول بالرأی کان من الصحابۃ علی طریق التوسط والصلح دون الزام لحکم فھو مکابر جاحد لما ھو معلوم ضرورۃ لان الذین نقلوا الینا ما احتجو بہ من الرأی فی الاحکام قوم عالمون عارفون بالفرق بین القضاء والصلح فلایظن بھم أنھم اطلقوا لفظ القضاء فیما کان طریق الصلح بان الم یعرفوا لفرق بینھما او قصدوا التبلیس -

(جو یہ کہتے ہیں کہ صحابہ کا قیاس کرنا بطور صلح ومفاہمت تھا، الزام

حکم کے لیے نہیں تھا تو وہ مکابر و مجاحد ہے- کیوں کہ بدیہی طور سے یہ معلوم ہے کہ جن لوگوں نے صحابہ کے اجتہادات ہم تک نقل کر کے پہنچائے ہیں، وہ قضاء وصلح میں فرق سے آگاہ وآشنا تھے، اس لیے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکے اور صلح کو قضا کہہ دیا اور نہ یہ کہہ سکتے کہ انہوں نے تلبیس سے کام لیا-

دلیل معقول کا جواب یہ ہے کہ قیاس واجتہاد کے ذریعہ حکم ظاہر ہوگا تو وہ ہمارے نزدیک حق ہوگا، اگر چہ عنداللہ اس کا حق ہونا ہمیں یقینی طور پر معلوم نہ ہو جیسے وہ شخص جس پر جہت قبلہ مشتبہ ہو تو بعد تحری جس طرف رائے جمے اس طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اس پر لازم ہوگا اور اس صورت میں یہ قطعاً ضروری نہیں کہ حقیقت میں جہت قبلہ بھی وہی ہو- حق العباد اور حق اللہ میں فرق ساقط الاعتبار ہے کہ آخر جو جہت قبلہ مطلوب ہے وہ بھی خالص حق اللہ ہی ہے مگر اس کے لئے علم یقینی حقیقی ضروری نہیں-

اب رہ گئی یہ بات کہ بعض احکام عقل وقیاس کے خلاف ہوتے ہیں، وہاں قیاس واجتہاد کی گنجائش کیوں کر ہوگی؟ تو اس سلسلہ میں ہمارا موقف بالکل صاف اور بہت ہی واضح ہے کہ اگر امر غیر معقول المعنیٰ ہو تو وہاں بذریعہ قیاس حکم کو متعدی کرنا جائز نہیں، بلفظ دیگر وہاں عمل بالقیاس جائز ہی نہیں لہذا اس کے ذریعہ استحالہ پیش کرنا اور قیاس و اجتہاد کا یکسر انکار کرنا حق وصداقت سے بہت دور ہے-

یہاں تک ہم نے مثبتین ومنکرین کے اقوال ودلائل قدرے شرح وبسط کے ساتھ پیش کر دیے اور ساتھ ہی منکرین کے دلائل کا منصفانہ تجزیہ بھی پیش کر دیا- اب قارئین کے لئے یہ فیصلہ کرنا بڑا آسان ہے کہ حق کس جماعت کے ساتھ ہے-

قیاس کب حجت ہے؟:- یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ قیاس ہر جگہ اور ہر حال میں حجت ہے، بلکہ قیاس کی صحت کے لئے کافی ووافی شرائط ہیں- پھر قیاس واجتہاد ہر کس وناکس کا وظیفہ نہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ عالم کتاب وسنت ہو، جو احکام فرائض وواجبات کی شکل میں ہیں ان سے باخبر ہو، ناسخ ومنسوخ، اقوال سلف، اجماع امت، اختلاف ناس اور زبان عرب کا عالم ہو، ساتھ ہی کامل غور وفکر سے کام لے- اس وقت اجتہاد وقیاس حجت ہے اور اس پر عمل واجب ہے- چنانچہ امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

قیاس وہی کرے، جس کے پاس آلۂ قیاس موجود ہو، اور یہ کتاب اللہ کا علم ہے، جس میں فرض وادب، ناسخ ومنسوخ، عام وخاص اور توجیہ کی معرفت شامل ہے، اسی طرح محتمل آیتوں کی سنت رسول سے تاویل کی اہلیت ہو- اور اگر سنت میں نہ ملے تو اجماع مسلمین سے اس کی تاویل کرے اور اگر اجماع بھی نہ ہو تو قیاس کرے اور کسی کے لیے بھی قیاس کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ مذکورہ بالا امور سے واقف نہ ہو- یعنی سنت رسول، ارشادات سلف، اجماع واختلاف اور زبان عرب- اسی طرح سالم العقل ہو، مشتبہ امور میں فرق کرنے والا ہو اور پورے غور وفکر کیے بغیر عجلت میں رائے نہ قائم کرتا ہو، مخالفین کی باتیں سننے سے گریز نہ کرتا ہو، اس لیے کہ مخالف کی باتیں بسا اوقات مشتبہ کرنے والی ہوتی ہیں- (الرسالہ الجزء الثالث، بحث القیاس)

اجتہاد اور عصر حاضر کے غیر مقلدین:- غیر مقلدین زمانہ شعوری یا لاشعوری طور پر نظام معتزلی کی تقلید میں گرفتار ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اجتہاد وقیاس کی وجہ سے ائمۂ مجتہدین کی شان میں گستاخی کا محاذ کھول رہے ہیں- اس کے باوصف میاں نذیر حسین دہلوی جو غیر مقلدوں کے امام ہیں وہ قیاس واجتہاد کو حجت اور اقوال ائمہ کو حق وصواب قرار دیتے ہیں- حالاں کہ ان کی یہ بات پوری جماعت اہل حدیث کے لئے خاصی حیران کن ہے- وہ اپنے ایک فتویٰ میں رقم طراز ہیں:

''جیسے ائمۂ اربعہ کا قول ضلالت نہیں ہو سکتا، ایسے ہی کسی مجتہد کا مذہب بدعت نہیں ٹھہر سکتا، جو ایسا کہے وہ خبیث خود بدعتی اور رہبان پرست ہے-''

ائمۂ اربعہ کے علاوہ وہ کون مجتہدین ہیں جن کا قول ضلالت نہیں، اس کی وضاحت بھی میاں نذیر حسین نے خود ہی کر دی ہے- لکھتے ہیں:

''امام الحرمین، حجۃ الاسلام غزالی، وکیا ہراسی وابن سمعان وغیرہم ائمہ محض انتساب میں شافعی تھے اور حقیقتاً مجتہد مطلق-''

پھر مزید لکھتے ہیں: ''بے شک جو منصف مزاج ہے وہ ہرگز امام شعرانی کے منصب کامل واجتہاد میں کلام نہیں کر سکتا-''

میاں نذیر حسین دہلوی کا یہ قول ان غیر مقلدین کے لئے تازیانۂ عبرت ہے جو اجتہاد وقیاس کو باطل اور تقلید کو شرک وبدعت قرار دیتے ہیں، بلکہ ایک طرح سے ان لوگوں کے لئے یہ دعوت فکر بھی ہے کہ ''اجتہاد وقیاس'' کا حجت ہونا ہی حق وصواب ہے اور اسے باطل کہنا گمرہی وضلالت ہے- ☆☆☆

مفتی آل مصطفیٰ مصباحی☆

اجتہاد ومجتہدین کے مختلف طبقات

اجتھاد وقیاس کی شرعی حیثیت مانی جاتی ہے اور یہ فقہ کے ان چار دلائل واصول میں سے ہے جو فقہ کی بنیاد واساس ہیں اور جن پر فقہی احکام و مسائل کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ شریعت کے وہ چاروں دلائل علی الترتیب کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور قیاس مجتہد ہیں۔ اجتہاد وقیاس کی حیثیت پورے طور پر گو کہ اصل کی نہیں، فرعیت کی بھی ہے، لیکن اس کا فرعی ہونا اسی لحاظ سے ہے کہ اس کا بنیادی ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ مستند ارباب لغت نے جہاں اجتہاد کا لغوی معنی بیان فرمایا ہے اسی ضمن میں اس کے مرادی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے کتاب وسنت کو ماخذ ومرجع بھی قرار دیا ہے۔

اجتھاد وقیاس کا معنی:۔ اجتہاد از روئے لغت جہد، بمعنی ''طاقت ومشقت'' سے ماخوذ ہے، بعض لوگوں نے اس کے مفہوم میں مشقت و طاقت اٹھانے میں انتہا کو پہنچنا بھی بتایا ہے، تاج العروس میں ہے:

الجهد بالفتح الطاقة، قال ابن الأثير وهو بالفتح المشقة، و قيل المبالغة و الغاية، و بالضم الوسع و الطاقة. الاجتهاد افتعال من الجهد و الطاقة وفى التهذيب الجهد بلوغک غاية الأمر الذى لايألوا على الجهد فيه (۱)

لسان العرب للامام علامہ ابن منظور (۶۳۰ھ ۷۱۱ھ) میں اجتہاد کا مرادی مفہوم یہ بتایا ہے کہ حاکم کے پاس پیش آنے والے معاملے کو بطور قیاس کتاب وسنت پر پیش کرنا نہ کہ اپنی ذاتی رائے جو کتاب وسنت کی روشنی میں نہ ہو، علامہ ابن منظور اپنی شہرۂ آفاق لغت میں لکھتے ہیں:

الاجتهادو التجهد...... بذل الوسع و فى حديث معاذ اجتهد برأى...... الاجتهاد بذل الوسع فى طلب الأمر و هو افتعال من الجهد الطاقة و المراد به رد القضية التى تعارض للحاكم بطريق الكتاب و السنة و لم يرد الرأى الذى رآه من قبل نفسه من غير حمل على كتاب او سنة (۲)

اور اصطلاح اصول میں اجتہاد نام ہے کسی قضیہ کا حکم شرعی ظنی کے حاصل کرنے میں طاقت صرف کرنے۔ الاجتهاد بذل الطاقة من الفقيه في تحصيل حكم شرعى ظنى (۳)

اور قیاس کا معنی ہے اندازہ کرنا، علی یا لام کے صلہ کے ساتھ ہو تو ''نمونہ پر اندازہ کرنے'' کے معنی میں آتا ہے (۴) اور شریعت میں کسی فرع شی کو اصل مسئلہ کے ساتھ حکم وعلت میں لاحق کرنے کو کہتے ہیں القياس فى اللغة التقدير و فى الشرع تقدير الفرع بالاصل فى الحكم و العلة (۵)

اجتھاد وقیاس کی حجیت:۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ جب کسی مسئلے میں قرآن کریم یا سنت ثابتہ کوئی قطعی اور دوٹوک فیصلہ صادر فرمادے تو پھر کسی کے لئے اجتہاد وقیاس کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اجتہاد کی ضرورت وہاں پیش ہوتی ہے جہاں قرآن وسنت میں صریح و منطوق اور واضح و قطعی حکم نہ ملے اور اجماع امت بھی نہ ہو، ایسی صورت میں اجتہاد وقیاس کا حجت شرعیہ ہونا صحابۂ کرام وتابعین اور ہر زمانے کے علمائے امت کے نزدیک مسلم ہے — اور یہ چاروں مکاتب فکر حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور ان سے منسلک اہل سنت و جماعت کا اتفاقی مسئلہ ہے۔ یہ اتفاق کرنے والے حدیث پاک کے مطابق ''ملت واحدہ'' کے حامل اور ''ما أنا عليه و أصحابى'' کے صحیح مصداق ہیں۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اجتہاد وقیاس کسی حکم مستقل کے اثبات کے لئے نہیں ہوتے بلکہ دراصل قرآن وسنت میں جو احکام عام عقلوں کے لحاظ سے غیر ظاہر ہیں، متعلقہ پیش آمدہ مسئلے میں انھیں ظاہر کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ بلفظ دیگر یہ مظہر حکم ہیں نہ کہ مثبت حکم، اس لئے عامۂ اصولیین نے فرمایا:

القياس حجة من حجج الشرع يجب العمل به عند انعدام مافوقه من الدليل فى الحادثة و هذا مذهب جميع

☆Jamia Amjadia Razvia,Po.Ghosi,Distt.Mau(U.P)

الصحابة و التابعين و علماء الكرام في كل عصر خلافا لبعض اهل الاهواء كالشيعة و الخوارج(٦)

احادیث و آثار میں تو حجیت قیاس و اجتہاد پر ایسے واضح اور کثیر وافر دلائل موجود ہیں جن کا انکار دعویٔ اسلام و ایمان رکھتے ہوئے نہیں کیا جا سکتا- خود قرآن کریم میں اس کے ثبوت پر دلائل موجود ہیں-

حدیث معاذ: - حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث تو زبان زد خواص اور بڑی واضح ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ ابن جبل کو یمن کا قاضی و حاکم بنا کر بھیجا تو بطور امتحان آپ نے جو سوال فرمایا اور حضرت معاذ نے جواب عرض کیا وہ حدیث کی متعدد کتابوں میں مذکور ہے- ترمذی، ابوداؤد، دارمی میں یہ حقیقت مروی ہے- حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

كيف تقضي اذا عرض لك قضاء قال اقضي بكتاب الله، قال فان لم تجد في كتاب الله قال فبسنة رسول الله ﷺ، قال فان لم تجد في سنة رسول الله قال أجتهد برائي ولا آلو، قال فضرب رسول الله ﷺ علىٰ صدره و قال الحمد الذي وفق رسول رسول الله لما يرضىٰ به رسول الله (٧)

ترجمہ: - حضور اقدس ﷺ نے فرمایا جب تمہیں کوئی معاملہ در پیش ہو تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا، فرمایا اگر تم اللہ کی کتاب میں نہ پاؤ؟ عرض کیا تو رسول اللہ ﷺ کی سنت کی روشنی میں فیصلہ کروں گا- فرمایا اگر رسول اللہ کی سنت میں بھی نہ پاؤ؟ عرض کیا: اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہ کروں گا- راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے سینے پر اپنا دست کرم مارا اور فرمایا حمد ہے اللہ عز و جل کی جس نے رسول اللہ کے رسول کو اس کی توفیق دی جس سے اللہ کے رسول راضی ہیں-

رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو سوال کیا اور انھوں نے جو جواب عرض کیا وہ کسی کی وساطت سے نہیں بلکہ براہ راست اور بالمشافہ ہوا، اجتہاد و قیاس اگر کوئی شجر ممنوعہ ہوتا تو صاحب شریعت علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام حضرت معاذ کے اظہار اجتہاد پر نکیر فرماتے، ناراضگی ظاہر کرتے، منع فرماتے مگر نہ نکیر فرمائی، نہ منع کیا بلکہ آپ نے حضرت معاذ کے اس جواب کی تقویت و تائید فرماتے ہوئے ان کے سینے پر دست مبارک سے تھپکی دی اور شکر الٰہی بجالا کر خوشی و مسرت کا اظہار فرمایا-

حدیث خثعميه: - قبیلہ خثعم کی ایک عورت جس کا نام اسماء بنت عمیس ہے حضور اقدس ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے باپ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان پر حج واجب ہے مگر وہ سواری پر بیٹھنے کی بالکل طاقت نہیں رکھتے تو کیا میں اگر ان کی جانب سے حج کروں تو یہ کافی ہوگا، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

أرأيتِ لو كان علىٰ ابيكِ دين فقضيتِ أما كان يجزيك فقالت بلىٰ فقال عليه السلام فدين الله أحق بالقضاء.

بھلا بتاؤ تو کہ اگر تمہارے باپ پر قرض ہو اور تم اسے ادا کرو تو کیا یہ کافی نہ ہوگا؟ اس عورت نے کہا کیوں نہیں، تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا اللہ کا دین (قرض) ادا کئے جانے کے زیادہ لائق ہے-

غور کیجیے تو درج بالا حدیث پاک میں علتِ جامعہ کی بنیاد پر اجتہاد کرنے کا واضح اشارہ موجود ہے کہ اس ارشاد رسول میں شیخ فانی کے حق میں حج کو حقوق مالیہ سے ملحق کیا گیا- حقوق مالیہ کو مقیس علیہ اور حقِ حج کو مقیس قرار دیا گیا- اس قسم کی روایت صحیح بخاری و نسائی میں بھی ہے، امام نسائی نے حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو روایت نقل فرمائی ہے اس میں یہ ہے کہ سائل مرد تھا جس نے اپنے باپ کے بدلے حج کرنے کی اجازت طلب کی تھی- تو حضور ﷺ یہ ارشاد فرمایا:

افرأيت لو كان عليه دين فقضيته أكان مجزأ قال نعم قال فحج عن ابيك(٨)

اور نسائی ہی میں فضل بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت میں یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنی ماں کے بدلے حج کرنے کی بابت پوچھا جس پر حضور اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا- الغرض ان متعدد واقعات میں ایک چیز قدرے مشترک کے طور پر مستفاد ہے کہ "اجتہاد و قیاس" نہ صرف جائز و روا ہے، بلکہ اہل فہم و ارباب علم کو اجتہاد کی ترغیب و تلقین بھی کی گئی ہے-

امام بخاری نے کتاب الاعتصام میں جو باب باندھا ہے اس باب سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے، "باب من شبه أصلاً معلوماً بأصل مبين قد بيّن الله حكمها ليفهم به السائل" یہ باب ہے اس

بارے میں کہ جو کسی معلوم قاعدہ واصل کو ایسے قاعدے سے تشبیہ دے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا ہے تاکہ سائل اسے سمجھ لے۔)

پھر درج بالا مضمون کی حیثیت ذکر کی ہے، اس سے دین و شریعت میں سوجھ بوجھ رکھنے والا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اجتہاد و قیاس شجر ممنوعہ نہیں، اس کی تائید درج ذیل اثر سے بھی ہوتی ہے۔

اثر ابن مسعود: ۔حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما فقہاء صحابہ میں سے ہیں اور بڑی عظمتِ شان کے مالک ہیں، ان سے پوچھا گیا ایک عورت کا انتقال ہوگیا جب کہ اس عورت کا نہ مہر مقرر ہوا تھا اور نہ زن وشوہر میں قربت ہوئی تھی تو ایسی عورت کو کتنا مہر ملے گا؟ اس تعلق سے دوسرے صحابہ بھی ایک مہینہ تک غور وفکر کرتے رہے پھر حضرت عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا۔

أجتهد فيها برائي فان كان صواباً فمن اللّٰه و ان كان خطأً فمن ابن ام عبد (كنى به عن نفسه) فقال أرى لها مهر مثل نساء ها، لاوكس ولا شطط. (۹)

نسائی کی روایت میں ہے: سأقول فيها بجهد رائي فان كان صواباً فمن اللّٰه وحده لاشريك له و ان كان خطأً فمني و من الشيطان — و اللّٰه و رسوله منه براء أرى ان اجعل لها صداق نساء ها لاوكس ولاشطط ولها ميراث و عليها العدة اربعة أشهر و عشراً قال و ذلك بسمع اناس من اشجع فقاموا فقالوا نشهد انك قضيت بما قضى به رسول اللّٰه ﷺ في امراة منّا يقال لها بروع بنت و اشق قال فمارئي عبداللّٰه فرح فرحةً يومئذٍ الا باسلامه. (۱۰)

ابوداؤد کی روایت میں بھی یہی مضمون ہے، اس کے اخیر میں یہ ہے:

ففرح ابن مسعود فرحاً شديداً حين وافق قضاء ه قضاء رسول اللّٰه ﷺ. (۱۱)

ان سب روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا:

اس مسئلے میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اگر یہ اجتہاد درست ہو تو یہ من جانب اللہ ہے جو وحدہ لاشریک ہے اور اگر اس میں غلطی ہو تو یہ میری جانب سے ہے اور شیطان کی جانب سے، اللہ اور اس کے رسول اس سے بری ہیں۔ پھر فرمایا، اس عورت کے لیے مہر مثل (اس جیسی عورتوں کا مہر) کا حکم کرتا ہوں جس میں کمی ہو نہ زیادتی، اور اس پر عدت بھی ہے اور اس کے لیے میراث بھی، راوی کہتے ہیں قبیلۂ اشجع کے کچھ لوگ وہاں موجود تھے انھوں نے کھڑے ہو کر یہ گواہی دی کہ اے عبداللہ ابن مسعود آپ نے جیسا فیصلہ کیا رسول اللہ ﷺ نے بھی ہمارے قبیلے کی ایک عورت بروع بنت واشق کے متعلق ایسا ہی فیصلہ فرمایا تھا۔حضرت عبداللہ ابن مسعود اس سے بہت خوش ہوئے، وجہ یہ تھی کہ ان کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق ہوا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود نے یہ حکم صحابۂ کرام کی موجودگی میں دیا اور اپنے قیاس واجتہاد سے دیا، کسی نے انکار نہیں فرمایا، بلکہ اس فیصلے کی تائید بھی اسی مجلس میں ہوگئی۔ کیا منکرین قیاس واجتہاد کے لئے اب انکار کی کوئی گنجائش باقی ہے۔

اثر عبدالرحمٰن: ۔ نئے پیش آمدہ مسئلے میں اجتہاد کی شرعاً اجازت ہی کی بناء پر اجلۂ صحابۂ کرام نے حضور اقدس ﷺ کی ظاہری حیات کے بعد نہ صرف یہ کہ اجتہاد فرمایا، بلکہ اجتہاد کرنے کا حکم بھی دیا۔ تاکہ جن کے اندر مجتہدانہ صلاحیت ہے وہ پیش آمدہ قضیہ میں اجتہاد سے کام لیں اور شرعی حکم و فیصلہ صادر فرمائیں۔ اس تعلق سے اثر عبدالرحمٰن ابن یزید میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کا یہ واضح ارشاد موجود ہے، جب لوگوں نے ان سے بکثرت سوالات شروع کئے تو فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ نہ ہم یہاں ہوں گے نہ میرا فیصلہ ہوگا، پھر فرمایا:

من عرض له منكم قضاء بعد اليوم فليقضى بما في كتاب اللّٰه فان جاء ه امر ليس في كتاب اللّٰه فليقض بما قضى به نبيهٗ ﷺ، فان جاء ه امر ليس في كتاب اللّٰه و قضى به نبيه ﷺ فليقض بما قضى به الصالحون فان جاء ه امر ليس في كتاب اللّٰه وماقضا به نبيه ﷺ ولاقضابه الصالحون فليجتهد برائه و لايقول اني أخاف و اني أخاف فان الحلال بين و الحرام بين و بين ذلك أمور مشتبهات فدع مايريبك الى مالايريبك، قال ابو عبدالرحمن هذا لحديث حديث جيد جيد". (۱۲)

ترجمہ: جب آج کے بعد کسی کے سامنے قضا کا کوئی معاملہ درپیش ہو تو وہ کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کرے، اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جو کتاب اللہ میں نہ ملے تو رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر ایسا مسئلہ ہو جو نہ تو کتاب اللہ میں ملے نہ ہی رسول اللہ کا

فیصلہ ملے تو نیکوکار اہل علم نے جو فیصلے کیے ہیں اس کے متعلق فیصلہ کرے اور اگر کتاب اللہ، سنت رسول اللہ و اقوال صلحاء میں بھی نہ ملے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے- اور یہ نہ کہے کہ میں خوف کھاتا ہوں، میں ڈرتا ہوں، کیوں کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور حلال و حرام کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، تو جس میں شک ہو اسے چھوڑ کر غیر مشکوک کو اپناؤ—

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے اجتہاد و قیاس کا بھرپور ثبوت فراہم ہوتا ہے علم و دیانت کے ساتھ غیر مقلدین بھی اگر غور کریں تو حقیقت واضح ہو جائے گی- اس حدیث کے تعلق سے ابو عبدالرحمٰن کہتے ہیں یہ حدیث بہت عمدہ ہے- اگر غور کیجیے تو واضح ہوتا ہے کہ جن معاملات میں ابھی وحی نازل نہ ہوئی تھی ان میں خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اجتہاد فرمایا جس کی ایک طویل تفصیل ہے، احادیث پر گہری نظر رکھنے والے اچھی طرح اخذ کر سکتے ہیں-

محققین اہل فقہ و اصول نے قرآن کریم کی بعض آیتوں سے قیاس و اجتہاد پر بطور اشارۃ النص استدلال فرمایا ہے، قرآن مجید میں فرمایا، فاعتبروا یا أولی الأبصار ،اعتبار کا معنی ہے شئی کو اس کی نظیر کی طرف پھیرنا، تو آیت کا معنی یہ ہوا کہ شئی کو اس کی نظیر پر قیاس کرو- یہ قیاس عام ہے، حکم عام ہے، جس کے عموم میں اصول پر فروع شرعیہ کا قیاس بھی داخل ہے کیوں کہ مورد اگرچہ خاص ہے جو کفار کی عقوبتوں سے متعلق ہے مگر حکم عام ہے- اجتہاد و قیاس کے منکرین پہلے صرف شیعہ و خوارج تھے مگر اب غیر مقلدین وہابیہ بڑی شد و مد سے انکار کرتے ہیں-

منکرین اپنے دعوی کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم کے بارے میں ہے، "تبیاناً لکل شئی " قرآن میں ہر چیز کا روشن بیان ہے تو پھر قیاس کی کیا ضرورت ہے؟ نیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی اسرائیل کے قیاس کی مذمت کی جیسا کہ دارمی و بزار کی روایت میں ہے، پھر یہ کہ جسے حکم کی علت قرار دیا جاتا ہے وہ مقام شک میں ہے یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہی علت حکم ہے—

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ قیاس کتاب و سنت کے حکم کا مزاحم ہوتا تو یہ دلیل دی جاری ہو سکتی تھی، قیاس و اجتہاد تو کتاب اللہ کے حکم کا مظہر و کاشف ہے- اسرائیلیوں کے قیاس کی مذمت اس لئے کی گئی کہ ان کا قیاس تعنت و سرکشی کے طور پر تھا اور مجتہدین کا قیاس حکم شرعی کے اظہار کے لئے، اور جہاں تک علتِ حکم کے شبہ کی بات ہے تو ہمارے خلاف نہیں کیوں کہ ہم قیاس سے ثابت شدہ حکم کو واجب عمل مانتے ہیں نہ کہ فرض اعتقادی-

مذکورہ بالا حوالوں سے واضح و واشگاف ہے کہ قیاس و اجتہاد حجت شرعیہ ہیں جس کی پشت پر قرآن و احادیث کی مہریں ثبت ہیں- لہٰذا اجتہاد کو قرآن و سنت کے معارض سمجھنا ایک باطل نظریہ ہے—

شرائط اجتہاد: - اجتہاد کی بنیادی شرط یہ ہے کہ مجتہد کو احکام سے متعلق قرآنی آیات و نصوص کا بھرپور علم ہو، لغوی و شرعی معنی کے ساتھ اس کے تمام وجوہ سے واقفیت ہو، ناسخ و منسوخ کا پورا علم رکھتا ہو، اسی طرح احکام سے متعلق سنت رسول اللہ کا علم اسانید و اقسام کے ساتھ تفصیلاً ہو، قیاس کے وجوہ و طرق اور شرائط سے بھی بھرپور واقفیت ہو، نیز نحو و صرف، معانی و بلاغت وغیرہ میں پوری مہارت ہو "و شــرط الاجتهاد ان يحوى علم الكتاب معانيه اللغوية و الشرعية و وجـوهـه التـى قـلنا من الخاص و العام و الامرو النهى، وعـلـم السنة بـطـرقها المذكورة فى اقسامها و ان يعرف وجوه القياس بطرقها و شرائطها". (۱۳)

ایسے اجتہادی صفت کے حامل مجتہد کو احکام کے استخراج و استنباط کی اجازت ہے کہ وہ اپنے غالب رائے سے حکم کا استنباط کرے مگر اس کا یہ اجتہادی حکم یقینی نہ ہوگا ظنی ہوگا اور خطا و صواب دونوں کا احتمال رکھے گا، اس لیے علمائے اصول نے فرمایا:

و حـكـم الاصابة بغالب الراى دون اليقين حتى قلنا ان المجتهد يخطى و يصيب (۱۴)

البتہ اگر مجتہد استخراج حکم میں خطا بھی کر جائے جب بھی اسے اجتہادی جد و جہد کا ایک اجر ملے گا اور استنباط کردہ مسئلہ کے صحیح و درست ہونے کی صورت میں دو اجر ملے گا - ایک اصابت رائے کا دوسرے اجتہادی کاوش کا— یہ حکم حضور اقدس ﷺ کے درج ذیل ارشاد گرامی سے ماخوذ ہے:

"اذا حـكـم الـحـاكم فاجتهد و أصاب فله أجران، و اذا حكم فاجتهد و أخطأ فله اجر واحد (۱۵)

اس حدیث سے اجتہاد میں خطا و صواب دونوں کے احتمال کا ثبوت ہوتا ہے اور ساتھ ہی اجتہاد کے جواز کا بھی—

مجتہدین کے طبقات:- مجتہد فقہا کے چھ طبقات ہیں:

(۱) مجتہد مطلق مستقل/ مجتہد فی الشرع: یہ وہ حضرات ہیں جو شرائطِ اجتہاد کا جامع ہونے کی وجہ سے تمام اجتہادی احکام کے استخراج کا ملکۂ راسخہ رکھتے ہیں اور استنباطِ مسائل کے لئے قواعد و اصول وضع کرتے ہیں- یہ اصول وفروع کسی میں تقلید کے محتاج نہیں ہوتے جیسے سراج الامہ کاشف الغمہ سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۸۰ھ/۱۵۰ھ) سیدنا امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۹۰ھ/ ۱۷۹ھ) سیدنا امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۱۵۰/۲۰۴ھ) سیدنا امام احمد ابن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۱۶۴ھ/۲۴۱ھ)

یہ وہ چار ائمۂ مطلق اور مجتہد فی الشرع ہیں جن کی پوری دنیا کے اہل سنت پیروی و تقلید کرتے ہیں- امام اعظم کی تقلید کرنے والے کو حنفی، امام شافعی کی تقلید کرنے والے کو شافعی، امام مالک کی تقلید کرنے والے کو مالکی، امام احمد ابن حنبل کی تقلید کرنے والے کو حنبلی کہتے ہیں- یہ وہ چار ائمۂ مذاہب ہیں جن کی پیروی و تقلید کرنے والے سواد اعظم اہل سنت و جماعت ہیں اور یہی فرقہ ناجیہ ہے- اس کے علاوہ فرقے جہنمی ہیں-

علامہ سید احمد طحطاوی فرماتے ہیں:

و هذه الطائفة الناجية قد اجتمعت اليوم فى مذاهب اربعة و هم الحنفيون و المالكيون و الشافعيون و الحنبليون رحمهم الله و من كان خارجاً عن هذه الأربعة فى هذاالزمان فهو من أهل البدعة و النار. (۱۶)

''اور یہ فرقہ ناجیہ فی زمانہ چار مذاہب میں جمع ہوگیا ہے جنہیں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کے نام سے جانا جاتا ہے تو جو اس زمانے میں ان چاروں میں سے کسی کی تقلید نہ کرے وہ بدعتی اور جہنمی ہے—

(۲) مجتہد فی المذھب/ مجتہد مطلق غیر مستقل:- یہ وہ مجتہد مطلق ہیں جو اصول و قواعد میں مجتہد فی الشرع کی تقلید کرتے ہیں اور فروعی مسائل میں خود استنباط و استخراج پر قدرت رکھتے ہیں، کسی کی تقلید نہیں کرتے، فروعی مسائل میں اپنے استاذ کے مقررہ قواعد کی روشنی میں احکام کا استخراج فرماتے ہیں- جیسے قاضی الشرق والغرب حضرت امام ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ (م۱۸۳ھ) حضرت امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م۱۸۹ھ) حضرت عبداللہ ابن مبارک (م۱۸۱ھ) و جملہ تلامذۂ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو متقدمین اصحاب حنفیہ کہلاتے ہیں—

(۳) مجتہد فی المسائل:- یہ وہ حضرات ہیں جو اصول و فروع دونوں میں اپنے امام کے مقلد ہوتے ہیں اور اصول وفروع کسی میں امام کی مخالفت کی طاقت نہیں رکھتے اور وہ مسائل جن میں امام سے کوئی صریح روایت نہیں ان کا استنباط اپنے امام کے اصول موضوعہ اور مسائل متخرجہ کو سامنے رکھتے ہوئے کرتے ہیں—

اس میں اکابر متاخرین حنفیہ کا طبقہ ہے جیسے ابوبکر احمد خصاف (م۲۶۱ھ) امام ابوجعفر طحاوی (م۳۲۱ھ) ابوالحسن کرخی (م۳۴۰ھ) شمس الائمہ حلوانی (م۴۵۶ھ) شمس الائمہ سرخسی (م۴۸۳ھ) فخر الاسلام بزدوی (م۴۸۲ھ) فخر الدین قاضی خان (م۵۹۲ھ) وغیرھم-

(۴) اصحاب تخریج:- جو اجتہاد و استنباط مستقل کی قدرت تو نہیں رکھتے یہاں تک کہ امام کے غیر مصرح مسائل کو بھی اصول موضوعہ اور مسائل متخرجہ سے معلوم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے— البتہ امام کے قول مجمل کی تفصیل اور قولِ محتمل کی تعیین اپنی فہم ورائے سے کرنے کی قدرت رکھتے ہیں- جیسے ابوبکر رازی الجصاص (م۳۷۰ھ) اور ان کے ہم رتبہ فقہاء علیہم الرحمۃ والرضوان-

(۵) اصحاب ترجیح:- یہ وہ حضرات ہیں جو فقاہت میں اصحاب تخریج کی بہ نسبت کم درجے کے حامل ہیں، یہ حضرات اپنے امام سے منقول چند روایات میں سے بعض کو ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں— مثلاً وہ کہتے ہیں: هـذا أولـىٰ، هـذا أصح رواية. هـذا أوضح، هذا أوفق للقياس، هذا أرفق للناس،

جیسے ابوالحسن قدوری (م۴۲۸ھ) علامہ برہان الدین مرغینانی صاحب ھدایہ (م۵۹۳ھ) وغیرہما-

(۶) اصحاب تمیز:- یہ وہ حضرات ہیں جو ظاہر الروایۃ، ظاہر مذہب اور روایت نادرہ میں فرق کرنے کی قدرت رکھتے ہیں- اسی طرح قول ضعیف اور قول قوی اور اقویٰ میں امتیاز کرسکتے ہیں- نیز مقبول ومردود اقوال میں فرق کر سکتے ہیں جیسے اصحاب متون معتبرہ جیسے صاحب کنز عبداللہ ابن احمد نسفی (م۷۰۱ھ) صاحب مختار عبداللہ ابن محمود موصلی (م۶۸۳ھ) وغیرہما—

راقم نے فقہاء کے درج بالا طبقات کی مختصر تفصیل خاتم الفقہاء علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ (م۱۲۵۲ھ) کے مقدمہ شامی

''شرح عقود رسم المفتی'' سے اخذ کی ہے۔ بعض علماء نے بعض حضرات مجتہدین کو ان کے مراتب عالیہ کے پیش نظر نیچے درجے کے بجائے اوپر درجے میں شامل فرمایا ہے جس پر بحث و گفتگو کی گنجائش ہے لیکن اختصار کی خاطر میں نے صرف علامہ شامی کی تصریح ذکر کی۔

اس طرح علامہ شامی نے ایسے مقلدین کو فقہاء کے ساتویں طبقے میں شمار فرمایا جن کے اندر اجتہاد کی صلاحیت نہ ہو، وہ صرف نقل اقوال سے فرماتے ہوں چوں کہ ہم نے مجتہدین کے طبقات کا عنوان دیا ہے اس لئے اس طبقہ کا خصوصی ذکر نہیں کیا، بعض حضرات نے طبقۂ فقہاء کی تعداد پانچ بھی بتائی ہے جس سے ان کی مراد ایسے فقہاء ہیں جو اجتہاد مطلق کے درجے پر فائز نہیں اور اصحاب تمیز کے درجے سے کمتر درجے میں نہیں۔

ماخذ و مراجع

(۱) تاج العروس جلد دوم ،ص:۳۳۰، للامام محب الدین محمد مرتضی الحسینی الواسطی الحنفی
(۲) لسان العرب للامام علامہ ابن منظور ۶۳۰ ھ-۷۱۱ ھ ص:۳۹۶ ج ۲
(۳) فواتح الرحموت ج ۲، ص: ۴۰۴-مطبوعہ بیروت
(۴) عامہ لغت
(۵) نور الانوار، ص: ۲۸۸، باب القیاس
(۶) فصول الحواشی، ص: ۳۱۷ باب القیاس
(۷) مشکوٰۃ ص ۳۲۴، باب العمل فی القضاء
(۸) نسائی، ج ۲ ص: ۲۵۹، کتاب آداب القضاء
(۹) ترمذی ابوداؤد، نسائی، دارمی
(۱۰) نسائی، ج ۲ ص: ۳۷،۴۷، کتاب النکاح
(۱۱) ابوداؤد ج ۱ ص: ۲۸۸ کتاب النکاح، ترمذی، ج ۱، ص: ۱۳۶ ابواب النکاح وابواب الرضاع مطبوعہ مجلس برکات مبارکپور
(۱۲) نسائی، ج ۲ ص: ۲۶۰ کتاب آداب القضاء
(۱۳) نور الانوار، ص: ۲۵۰ فواتح الرحموت
(۱۴) فواتح الرحموت، نور الانوار
(۱۵) مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم، ص: ۳۲۴، باب العمل فی القضاء
(۱۶) حاشیۃ الطحطاوی علی الدر ج ۴، ص: ۱۵۳

☆☆

مفتی محمود اختر قادری☆

عہد رسالت میں اجتہاد کا وجود

کلام الٰہی اور احادیث نبویہ کی روشنی میں ائمہ مجتہدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا قیاس واجتہاد فرمانا ایک اجماعی مسئلہ ہے، لیکن اسے باطل قرار دینا اور بدعت سیئہ وگمراہی ٹھہرانا ایسے لوگوں کا شیوہ ہے جو ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے لوگوں کے اقوال پر ایسا عقیدہ رکھتے ہیں اور ایسی اندھی تقلید کرتے ہیں گویا ان کے نزدیک ان کے اقوال نصوص قطعیہ کا درجہ رکھتے ہیں، بلکہ بسا اوقات ان کے اقوال کے مقابل نص قطعی کو بھی رد کرنے سے دریغ نہیں کرتے - یہ لوگ سیدھے سادھے، کم علم، صحیح العقیدہ مسلمانوں کو بہکانے اور ورغلانے کے لیے اس کذب وافترا سے ذرہ برابر بھی نہیں شرماتے کہ ائمہ مجتہدین کا اجتہاد، بدعت وبے اصل ہے، قرآن وسنت سے نہ اس کی اجازت ہے اور نہ ہی عہد رسالت وعہد صحابہ میں اس کی کوئی نظیر ملتی ہے- غیر مقلدین کے اس دعوے کی قلعی کھولنے کے لیے نیز صحیح العقیدہ مسلمانوں کے اطمینان قلبی اور عقیدہ کے استحکام وثبات کی خاطر یہاں ہم دلائل وبراہین سے ثابت کریں گے کہ عہد رسالت میں بھی بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اجتہاد کی اجازت تھی اور انہوں نے بوقت ضرورت اجتہاد وقیاس فرمایا، جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرزنش فرمانے یا ناراضگی ظاہر کرنے کی بجائے تائید وتصویب فرمائی اور خطا واقع ہونے کی صورت میں اس کی نشاندہی فرمائی اور صحابہ کرام کو اجتہاد سے قطعاً منع نہ فرمایا-

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اجتہاد وقیاس کی ابتدا عہد رسالت کے بعد ہوئی ہے، عہد رسالت میں نہ اجتہاد ہوتا تھا نہ ہی اجتہاد کی ضرورت تھی، کیونکہ وہ نزول وحی کا دور تھا اور صحابہ کرام تمام تر احکام ومسائل کو کتاب اللہ اور احادیث کی تصریحات سے جان لیتے تھے تو انہیں قیاس واجتہاد کی ضرورت ہی کیا تھی-

یہ خیال اس حد تک تو صحیح ہے کہ اجتہاد کی ضرورت عہد رسالت کے بعد ہوئی اور اہل اجتہاد نے اس منصب کو باقاعدہ عمدہ طور پر نبھایا بھی یہاں تک کہ مستقبل میں پیدا ہونے والے مسائل میں انہوں نے مسلمانوں کو مستقل اجتہاد سے مستغنی بھی کر دیا، لیکن یہ سمجھنا کہ عہد رسالت میں اجتہاد کی کسی اعتبار سے نہ ضرورت تھی نہ ہی اجتہاد ہوا صرف ایک تخمینی خیال ہے واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں-

ہاں! اس موقع پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اجتہاد وقیاس کے لیے کتاب وسنت کی بھرپور معرفت ایک بنیادی شرط ہے ''مسلم الثبوت'' میں ہے:

'' شرائط الاجتهاد معرفة الكتاب متنا ومعنى وحكما ومعرفة السنة معنى وسندا'' الخ (فواتح الرحموت، ص: ۲۰۳)

یعنی کتاب اللہ کی عبارت ومعنی اور حکم کا جاننا نیز احادیث رسول کے معنی وسند کا جاننا اجتہاد کے شرائط میں سے ہے، تاکہ مجتہد کا اجتہاد کسی حکم منصوص کے خلاف نہ ہو، لہٰذا زمانہ رسالت میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنفس نفیس تشریف فرما ہونا بمنزلہ نص ہے کہ تمام احکام شرع کا حل آپ سے حاصل ہوسکتا تھا تو اگر آپ کے ہوتے ہوئے قیاس یا اجتہاد کی اجازت دی جائے تو ایک بڑا فساد یہ لازم آئے گا کہ معرفت احکام کے قریب تر اور قوی ترین ذریعہ کو چھوڑ کر کسی ایسے طریقہ کا اختیار دیا جارہا ہے جس میں احتمال خطا بھی موجود ہے-

اس سوال پر معمولی غور کے بعد بھی یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ عہد رسالت میں اجتہاد کی اجازت دینے میں اس خرابی کا احتمال تو اس وقت ہوتا جب کہ احتمال خطا باقی رہ جاتا اور یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ وحی کا سلسلہ جاری ہو اور خطائے اجتہاد پر تنبیہ نہ کی جائے-

علاوہ ازیں وحی معرفت احکام کیلئے قوی ترین ذریعہ اسی وقت ہے جبکہ معرفت وحی کا موقع ہو اور حکم دریافت کرنے والے صحابی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوں، لیکن اگر صحابی بارگاہ رسالت سے اتنی بعید مسافت پر ہوں کہ مسئلہ دریافت کرنے کا انہیں موقع ہی نہ ملے تو ان

☆Kanara Masjid,Haji Ali,Juice Centre,Mumbai(M.S)

کے لئے قوی ترین اور قریب تر وسیلہ معرفت قیاس واجتہاد ہی ہے اور احتمالی خطا بھی مضر نہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عہد رسالت کے اجتہادات میں احتمال فساد سے تحفظ کے ساتھ ہی ساتھ صحابہ کرام کی اجتہادی تربیت کا عظیم فائدہ بھی مضمر ہے جس کے نتیجے میں فقہ کا مستقبل نہایت تابناک ہوگیا اسی لئے رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم نے صاحب لیاقت صحابہ کرام کو مخصوص حالات میں اجتہاد کی اجازت دے رکھی تھی چنانچہ حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالی علیہم اجمعین کو صراحتاً اجازت تفویض فرمائی (اصول لسرخسی ج:۲ص:۱۳۰)

اجتہاد صحابہ: -ہماری معلومات کے مطابق صحابہ کرام کی اجتہادی تربیت تین حصوں میں تقسیم کردی گئی تھی (الف) مشاورت (ب) اجتہاد بوقت ضرورت- (ج) نصوص احکام کی تاویل-

ان میں سے ہرایک کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

(الف) مشاورت: -رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب رائے صحابہ سے بعض ایسے امور میں مشورہ فرماتے تھے جن سے حکم شرع بھی متعلق ہوتا تھا- قرآن حکیم میں اس مشاورت کا حکم اس طرح دیا گیا، **وشاورهم فى الامر** قرآن حکیم کا یہ حکم اس بات کی دلیل ہے کہ بوقت مشاورت صحابہ کرام کو اپنے قیاس واجتہاد کی روشنی میں مشورہ دینے کا پوراحق حاصل تھا- یہ الگ بات ہے کہ ان مشوروں میں سے کسی ایک ہی کو ترجیح دے کر ماسوا کو خطا یا غیر اولی قرار دے دیا جاتا-

چنانچہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہما سے دریافت فرمایا کہ ان قیدیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ نے عرض کیا کہ آپ کی قوم وقبیلہ کے لوگ ہیں میری رائے میں انہیں فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے اس سے مسلمانوں کو قوت بھی پہنچے گی اور کیا عجب ہے کہ اللہ تعالی ان لوگوں کو اسلام نصیب کرے- حضرت عمر سے دریافت فرمایا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں! قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں میری وہ رائے نہیں جو ابوبکر کی ہے، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کفر کے سردار اور سرپرست ہیں، میری رائے یہ ہے کہ آپ ان پر ہمیں مقرر فرمائیں، تو علی کو عقیل پر مسلط فرمائیں کہ وہ اس کی گردن ماریں اور مجھے میرے فلاں رشتہ دار پر مقرر فرمائیں کہ میں اس کی گردن ماردوں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق کا قول پسند فرمایا یعنی فدیہ ہی لینے کی بات طے پائی اور جب فدیہ لیا گیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

'ماكان لنبي ان يكون له أسرىٰ حتى يثخن في الارض (الى قوله تعالى) حلالا طيبا. (الانفال:۶۷)

کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کرے جب تک زمین میں ان کا خون خوب نہ بہائے-

یونہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہما فرماتے ہیں کہ جب مسلمان مدینہ طیبہ آئے تو جمع ہوکر نماز کا اندازہ لگا لیتے تھے، نمازوں کی اذان نہیں دی جاتی تھی، ایک دن صحابہ کرام نے اس سلسلہ میں مشورہ کیا بعض نے کہا کہ عیسائیوں کے ناقوس کی طرح ناقوس بنالو، بعض نے کہا کہ یہود کے بگل کے مثل بگل بناؤ، تب حضرت عمر نے فرمایا کہ کسی کو نماز کی منادی کرنے کے لیے کیوں نہیں مقرر کررہے ہو؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يـا بلال قم فنـاد بالصلوة. (بخاری ج ا ص ۸۵/ مسلم، ارص:۱۶۴)

اس مشاورت میں حضرت عمر نے اپنے اجتہاد سے یہود ونصاری کا طریقہ اعلان اختیار کرنا ناپسند فرمایا اور اعلان نماز کا مشورہ بھی اپنے اجتہاد سے دیا، پھر حضور نے اسے پسند بھی فرمایا-

(ب) اجتہاد بوقت ضرورت: -صحابہ کرام کو کسی سفر میں یا کسی اور جگہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما نہ ہوتے فوری اجتہاد کی ضرورت پیش آتی کیونکہ بعد مسافت اور حکم کی عجلت کی وجہ سے انہیں فوراً دربار رسالت سے مراجعت کا موقع نہ مل پاتا تھا اس لیے صحابہ کرام کو ایسے مواقع پر اجتہاد کی اجازت تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ کو یمن کا والی اور قاضی مقرر کرتے وقت ارشاد فرمایا:

"كيف تقضى اذا عرض لك قضاء قال اقضى بكتاب الله قال فان لم تجد فى كتاب الله قال بسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فان لم تجد فى سنة رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم قال اجتهد برائى

ولا الو قال فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم بصدري وقال الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يرضى به رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم"۔

(ترمذی، ج: ۱ ص ۱۵۹، باب ماجاء في القاضي كيف يقضي ابوداؤد ص: ۱۶۰باب الاجتهاد)

جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے گا تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا، کتاب اللہ سے، فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو، عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے، فرمایا اگر سنت میں بھی نہ پاؤ تو، عرض کیا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں غفلت کو دخل نہ دوں گا'' معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بطور تحسین) میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ، اللہ کا شکر ہے کہ جس نے رسول اللہ کے قاصد کو وہ توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔

اب ذیل میں بوقت ضرورت صحابہ کرام کے اجتہاد کی چند نظیریں پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہما فرماتے ہیں کہ غزوۂ احزاب کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بھی نماز عصر نہ پڑھے مگر قبیلۂ بنی قریظہ میں، تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ وقت عصر ہوگیا، ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم بنی قریظہ ہی میں پہونچ کر نماز پڑھیں گے، بعض نے کہا کہ ہم یہیں نماز پڑھیں گے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ نہیں تھی کہ بنی قریظہ سے پہلے اگر وقت آجائے تو بھی نہ پڑھنا، جب یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی گئی تو آپ نے کسی کو بھی ملامت نہ کی۔

(بخاری، ج:۲، ص:۵۹۱ کتاب المغازی)

جن صحابہ کرام نے راستہ میں نماز نہیں پڑھی تھی، ان کا اجتہاد یہ تھا کہ یہاں ''نہی'' حقیقت پر محمول ہے، لہذا خروج وقت میں کوئی حرج نہیں اور وقت سے تاخیر کر کے نماز پڑھنے کی جو''نہی'' وارد ہے وہ ''نہی اول'' ہے اور یہ ''نہی ثانی'' ہے اور ''نہی ثانی'' کو ''نہی اول'' پر ترجیح ہوتی ہے، گویا یہ نہی ایک مخصوص وقت کے لیے نسخ ہے اور وہ صحابہ کرام جنہوں نے راستہ ہی میں نماز عصر ادا کر لی تھی، ان کا اجتہاد یہ تھا کہ یہاں 'نہی' حقیقت پر محمول نہیں ہے بلکہ بنی قریظہ کی جانب تیزی اور سرعت کے ساتھ پیش قدمی کرنے کا اشارہ و کنایہ ہے۔

اس اختلاف پر مطلع ہونے کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی بھی ملامت نہیں فرمائی، یہ اس پر دلیل ہے کہ مجتہد پر کوئی گناہ نہیں، خواہ مصیب ہو یا خاطی، بلکہ ان دونوں اجتہادات میں سے کسی ایک کا انکار نہ فرمانا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ مجتہد کو اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرنا واجب ہے، اگر چہ اس کے اجتہاد میں خطا واقع ہو، کیونکہ قاعدہ کے مطابق اس موقع کے دونوں اجتہادوں میں سے ضرور ایک ہی صواب ہوگا اور دوسرا خطا، مگر چونکہ یہ حکم مخصوص موقع ہی کے لیے تھا اور وہ موقع باقی نہ رہا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی خطاء اجتہادی کا اظہار بھی ضروری نہ سمجھا، لہذا یہاں اس سوال کی گنجائش نہیں کہ حضور نے کسی کی خطا کا اظہار کیوں نہ کیا؟

(۲) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں'' دو شخص سفر میں گئے، نماز کا وقت آگیا اور ان کے پاس پانی بھی نہ تھا، لہذا انہوں نے پاک مٹی سے تیمم کر کے نماز ادا کر لی پھر وقت ہی میں پانی دستیاب ہوگیا تو ان میں سے ایک نے وضو کر کے نماز کا اعادہ کر لیا، اور دوسرے نے اعادہ نہیں کیا، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر یہ ماجرا ذکر کیا، تو جنہوں نے وضو کر کے اعادہ نہیں کیا تھا ان سے آپ نے فرمایا "اصبت السنة و اجزا تک صلا تک" تو نے سنت پالی اور تیری نماز صحیح رہی، اور جن صاحب نے وضو کر کے نماز کا اعادہ کر لیا تھا ان سے فرمایا "لک الا جر مرتين" تجھے دوہرا ثواب ہے۔

اس حدیث میں ایک صحابی نے یہ اجتہاد کیا کہ تیمم کر کے نماز ادا کر لینے کے بعد وقت ہی میں پانی مل جانے پر وضو کر کے اعادہ نہیں ہے، کیونکہ آیت تیمم مطلق ہے، اس میں بعد ادائے صلاۃ پانی ملنے یا نہ ملنے کی کوئی شرط نہیں ہے۔

دوسرے صحابی کو یہ شبہ ہوا کہ ''تیمم کا جواز پانی نہ ملنے کی صورت میں ہے'' گو اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ پورے وقت میں پانی ملنا متعذر ہونے کی صورت میں تیمم ہے، اس لیے تقاضائے احتیاط یہی ہے کہ نماز کا اعادہ کر لیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اول کی تصویب کے ساتھ دوسرے کو بھی سراہا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ مجتہد کو جب دلیل سے واضح

نتیجہ نہ ملے تو احتیاطی پہلو پر عمل کرے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ''مجتہد کو اگر دوہرا کام کرنا پڑے تو دوہرے اجر کا اس وجہ سے مستحق ہوا کہ اس نے دونوں عمل ایک ہی نیت سے کیے تھے''لکل امری مانوی''

(۳) حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالی عنہما فرماتے ہیں ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالی عنہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا ''میں حالت جنابت میں پانی نہ پاؤں تو کیا کروں؟ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے امیر المومنین! کیا آپ کو یاد نہیں؟ کہ ہم اور آپ سفر میں تھے (اور ہم دونوں کو جنابت لاحق ہوئی) آپ نے نماز نہیں پڑھی اور میں نے مٹی میں خوب لوٹ لگائی پھر نماز ادا کر لی، میں نے حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا '' انما کان یکفیک ھکذا فضرب النبی ﷺ بکفیہ الارض و نفخ فیھما ثم مسح بھما وجھہ و کفیہ'' تم کو اس طرح کافی تھا، پھر حضور نے اپنے دونوں مبارک ہاتھ زمین پر مارے اور ان پر پھونک ماری پھر انہیں منہ اور ہاتھ پر پھیر لیا (بخاری ج:اص: ۴۸، مسلم ج:ا ص:۱۶۱، ابوداؤد ج: اص:۵۳ طحاوی ج:اص:۶۷)

اس حدیث سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین قیاس واجتہاد کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے اس گمان پر توقف کیا کہ تیمم صرف وضو کا نائب ہے، جنابت کے لیے جائز نہیں، اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے یہ قیاس فرمایا کہ وضو کے بدلے میں وضو ہی کی ہیئت پر تیمم کا حکم ہے تو غسل کے بدلے میں غسل ہی کی ہیئت پر تیمم ہوگا۔

لہذا اس بنیاد پر پورے جسم پر خاک مل لی۔ لیکن سرکار نے اس پر سرزنش نہیں فرمائی۔ جس سے واضح وظاہر ہے کہ مجتہد کا اجتہاد اگر صواب ودرست نہ ہو، اسے ملامت نہ کی جائے گی اور اس اجتہاد پر عمل کرنے سے اعادہ بھی لازم نہیں۔

(فتح الباری ج:اص:۳۳، اشعۃ اللمعات ج:اص:۲۶۳)

حدیث مذکور کی شرح میں امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں ''ویستفاد من ھذا الحدیث وقوع اجتھاد الصحابۃ فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' اس حدیث سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی صحابہ کرام کا اجتہاد واقع ہے۔ (فتح الباری ج:اص:۳۰۳)۔

(ج) نصوص احکام کی تاویل:۔ اجتہاد کی تعریف اس طرح کی گئی ہے ''الاجتھاد بذل الطاقۃ من الفقیہ فی تحصیل حکم شرعی ظنی (مسلم الثبوت مع فواتح الرحموت ۲۰۳)

یعنی حکم شرعی ظنی کی تحصیل میں فقیہ کا پوری کوشش کرنا اجتہاد ہے۔

اس تعریف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احکام شرعیہ کے تعلق سے بعض نصوص قرآنیہ کی تاویل وتخصیص بھی اجتہاد ہی میں داخل ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ عہد رسالت میں صحابہ کرام سے اس طرح کے اجتہادات وقوع پذیر ہوئے ہیں یا نہیں؟

حالانکہ انہیں تفصیل وتاویل دریافت کرنے کے مواقع میسر تھے، پھر بھی ان کے یہاں نصوص کی تاویلات کی مثالیں نظر آتی ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں کثرت سوال سے روک دیا گیا تھا، چنانچہ ارشاد ربانی ہے ''یایھا الذین امنوا لا تسئلوا من اشیاء ان تبدلکم تسؤ کم'' اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھو جو تم پر ظاہر کی جائیں تو تمہیں بری لگیں۔

لہذا یہ حضرات وقت ضرورت تاویل وتخصیص وغیرہ میں اجتہاد کا عمل جاری رکھتے تھے، اور اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں انہیں ملکہ حاصل ہو جائے اور اس کام میں ان کی مکمل تربیت بھی ہو جائے۔ کیونکہ بعض تاویلات کی تصویب بارگاہ رسالت سے ہو جاتی اور بعض کی خطا ظاہر کر دی جاتی اور بعض کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا جو تصویب ہی کے زمرے میں آتی ہے۔

یہاں ذیل میں اب ہم صحابہ کرام سے احکام شرعیہ سے متعلق تاویل نصوص کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں، ان مثالوں سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نصوص قرآنیہ میں صحابہ کرام کی اجتہادی تاویلات میں سے کس کو بارگاہ رسالت سے تصویب ملی اور کس کو خطا قرار دیا گیا۔

(۱) حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''غزوہ ذات سلاسل کی ایک سرد رات میں مجھے احتلام ہو گیا، مجھے خوف ہوا کہ کہیں غسل کرنے سے ہلاک نہ ہو جاؤں، لہذا تیمم کر کے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھا دی۔ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کیا۔

آپ نے فرمایا، اے عمرو! تم نے جنابت کی حالت میں اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھادی؟ میں نے غسل نہ کرنے کا سبب بیان کیا، اور عرض پرداز ہوا کہ اللہ تعالی کا یہ ارشاد گرامی میں نے سنا ہے:

"ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما" (۲۹/۴)

اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو بیشک اللہ تم پر مہربان ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضحک فرمایا اور کچھ کہا نہیں (ابوداؤد ج:ا ص:۵۶)

یعنی عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ

"ولا تقتلوا انفسکم"

کو عموم اطلاق پر جاری رکھ کر تیمم کا جواز اخذ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس استنباط واجتہاد کو رد نہ فرمایا بلکہ تبسم فرمایا اور یہ استنباط واجتہاد کے صحت کی تائید وتصویب ہے۔

اس حدیث سے بالکل واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں اجتہاد جائز تھا جیسا کہ اس حدیث کی شرح میں امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:" وفیہ جواز الا جتہاد فی زمن النبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم" اور یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اجتہاد جائز تھا۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں گئے، تو ہم میں سے ایک شخص کو پتھر لگنے سے سر میں زخم ہوگیا، پھر اسے احتلام ہوگیا تو اس نے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ کیا تم میرے لئے تیمم کی اجازت پاتے ہو؟ ان لوگوں نے کہا، تمہارے لئے تیمم کی اجازت نہیں پاتے، تم پانی پر قادر ہو۔ لہذا انہوں نے غسل کیا، جس کی وجہ سے ان کی وفات ہوگئی۔

جب ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کو اس واقعہ کی خبر دی گئی۔ آپ نے فرمایا

"قتلوہ قتلھم اللہ الا سئلوا اذا لم یعلموا فان شفاء العی السوال انما کان یکفیہ ان یتیمم ویعصب علی جرحہ خرقۃ ثم یمسح علیھا وغسل سائر جسدہ۔

انہیں خدا غارت کرے، اسے انہوں نے مار دیا، جب جانتے نہ تھے تو پوچھ کیوں نہ لیا، کیونکہ بے علمی کا علاج پوچھ لینا ہی ہے، اسے تیمم کافی تھا اور اپنے زخم پر کپڑا لپیٹ کر اس پر ہاتھ پھیر لیتا اور باقی جسم دھوڈالتا۔ (ابوداؤد ج ا ص ۵۶)

جن لوگوں نے زخمی صحابی کو غسل کا حکم دیا تھا انہوں نے آیت کریمہ فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا

(تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو) کا مطلب اپنے اجتہاد سے یہ اخذ کیا کہ آیت کے ظاہر الفاظ کا معنی یہ ہے کہ جواز تیمم کے لیے پانی کا نہ ملنا شرط ہے، اور جب تک پانی موجود ہے تو انہیں تیمم کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اس اجتہاد کا حاصل یہ ہے کہ "لم تجدوا ماءً" کا یہی معنی لیکر زخمی صحابی کو غسل کا حکم دیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاویل کو رد فرمادیا کہ پانی نہ ہونے ہی کے ساتھ تیمم کا جواز خاص نہیں، بلکہ اگر پانی موجود ہو مگر استعمال میں ہلاکت یا مرض کا پورا خطرہ بھی ہے تو بھی تیمم جائز ہے۔

یعنی لم تجدوا ماءً سے لغوی معنی مراد نہیں ہے پانی پر قدرت نہ ہونا مراد ہے خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ پانی مفقود ہے یا یہ کہ پانی کے استعمال سے شدت مرض یا ہلاکت کا خطرہ ہے۔ چنانچہ حضرت عمرو بن عاص نے بھی یہی سمجھا تھا اور حضور نے اپنے تبسم سے اس کی تائید بھی فرمادی تھی۔ صحابہ کرام سے اس قسم کے اجتہادات کی مثالیں حدیث کی کتابوں کو تلاش کرنے کے بعد وافر مقدار میں جمع کی جاسکتی ہیں۔

صحابہ کی اجتہادی تربیت کے ضمن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث بھی پیش کی جاسکتی ہیں جن میں احکام شرع کا بیان اجتہاد کے انداز میں کیا گیا ہے اس سلسلہ میں دو حدیثیں بطور ثبوت ذکر کرتے ہیں۔

(ا) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ قبیلۂ جہینہ کی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی مگر وہ حج نہ کرسکی اور اس کا انتقال ہوگیا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ تو سرکار نے فرمایا" حجي عنھا أرأيت لو كان على امك دين اكنت قاضية اقضوا الله فالله احق بالوفاء" اس کی جانب سے حج کرو بتاؤ کہ اگر تمہاری ماں پر کوئی قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا نہ کرتیں؟ تو اللہ کا فریضہ ادا کرو کہ (اوروں سے) ادائیگی میں اللہ کا حق ظاہر ہے۔ (بخاری شریف ج ا ص ۲۵۰)

حج بدل کی ادائیگی واجب ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کو بطور نظیر ذکر فرمایا کہ جو کام اپنے ذمہ آئے اس کی ادائیگی

لازم ہوتی ہے جیسے لوگوں کا قرض تو اللہ کا جو قرض بندے پر ہے اس کی ادائیگی اور زیادہ اہم ہے۔

(۲) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے نشاط میں روزہ کی حالت میں بوسہ لے لیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری دی اور عرض کیا کہ آج مجھ سے ایک بہت بڑی بات ہوگئی ہے کہ روزہ کی حالت میں میں نے بوسہ لے لیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أرأیت لو تمضمضت بماء وانت صائم فقلت لا بأس بذالک فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ففیم.

تم بتاؤ کہ اگر روزہ کی حالت میں پانی سے کلی کر لیتے تو کیا ہوتا میں نے عرض کیا اس میں کوئی حرج نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس میں کیوں (حرج ہوگا) (طحاوی کتاب الصوم ج ا ص ۳۴۴) بوسہ کے مفسد صوم نہ ہونے پر پانی سے کلی کرنے کو بطور نظیر پیش فرمایا کہ جس طرح پانی سے کلی کرنا روزہ کے فساد کا سبب نہیں ہے اسی طرح منہ سے بوسہ لے لینا بھی مفسد صوم نہیں علت مشترکہ یہ ہے کہ دونوں میں منافی صوم (کھانا پینا اور جماع) کا معنی نہ پایا گیا۔

کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان نظائر کے ساتھ ساتھ احکام کا ذکر اسی لئے فرماتے تھے کہ باصلاحیت صحابہ کو نظائر وعلل کے ذریعہ اجتہاد کرنے کا طریقہ ہاتھ آجائے، بارگاہ رسالت کی کامیاب ترین تربیت سے فیض یاب ہونے والے صحابہ کرام نے عہد رسالت کے بعد تمام نئے پیدا ہونے والے مسائل میں بے انکار نکیر اجتہاد وقیاس سے کام لیا اور اپنے تلامذہ واصحاب کو باضابطہ اجتہاد کی تربیت بھی دی جس کا سلسلہ فقہ کی تدوین وتہذیب، تفصیل وتبویب اور اصول استنباط کے تعین تک پہنچا اور احکام شرع کے اصول وفروع کا عظیم ترین خزانہ اجتہاد ہی کی بدولت پردۂ غیب سے منصۂ شہود پر آیا۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مقدس میں اجتہاد کی تربیت نہ دی گئی ہوتی تو اجتہاد کی شرعی راہیں متعین کرنا تقریباً متعذر ہوتا بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عہد رسالت میں صحابہ کا اجتہاد کرنا اجتہاد کے دلیل شرعی ہونے کا علمی ثبوت بھی ہے اور بعد والوں کے لیے اجتہاد کے قواعد وشرائط کی قیمتی دستاویز بھی ہے۔ ☆☆☆

مفتی ارشاد احمد ساحل سہسرامی (علیگ) ☆

فقہ واصول کی تدوین کی طرف اہلِ علم کا التفات

عہد رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سنہرے اور بابرکت دور کو دنیا نے جب الوداع کہا تو اسلام بحر و بر کی وسعتوں کو اپنی سعادتوں سے ہم کنار کرنے کے لیے بے تاب تھا- جیش اسامہ کی روانگی نے عراق وایران کی سرحدیں مملکت اسلام میں ضم کرنے کی طرح ڈالی اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گرامی دور خلافت تک خاصے ممالک اسلام کی آغوش رحمت میں آگئے- توسیع کا یہ سلسلہ دراز رہا اور عہد عباسیہ میں مسلم سلطنتیں ہر قابل رشک نعمت سے سرفراز ہو چکی تھیں-

تہذیب وثقافت کا انضمام اور ملک وقوم کے تبادلے اپنے ساتھ بہت سے وسائل بھی لاتے ہیں اور مسائل بھی- مسائل و وسائل کے ہجوم بہت سی طرفہ سامانیوں کا سرچشمہ ہوتے ہیں- زبان پرسان چڑھتی ہے، نت نئے الفاظ درآمد ہوتے ہیں، نئی تہذیبیں جنم لیتی ہیں، افکارنو کا ہجوم ہوتا ہے، نئے نویلے آداب وفنون سے آگاہی ہوتی ہے- نیا سماج، نئے لوگ، نیا ماحول، نیا انداز، سب کچھ نیا نیا سا، اس اچھوتے ماحول میں اسلام اور اہل اسلام کو جذب [Adjust] ہونے کے لیے فکر وعمل کے طور طریقوں میں خاص تراش خراش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے- یہی ضرورت نئی اصطلاحات، نئے فنون، نئے علوم وآداب کی ایجاد و تدوین کی اصل محرک ہوتی ہے-

اسلام دین فطرت ہے، اس لیے اس کے اصول ومبادی اور قوانین وآداب ہر قدم پر مزاج فطرت کا خاصا خیال رکھتے ہیں، اسلام صرف ان پہلوؤں سے دامن کشاں گزرتا ہے، جن سے فطرت کا پاکیزہ صحن آلودگیوں کا شکار ہوتا ہو- فطرت کی مثبت حوصلہ افزائی اور منفی گوشوں پر قدغن اسلام کا ایسا دلکش امتیاز ہے، جو اپنے آپ میں منفرد ہے، اسلام کائنات کی ہر خوبی کو اپنا سرمایہ سمجھتا ہے- الحکمة ضالة المومن /الحکیم فحیث وجدھا فھو احق بھا (مشکوۃ، کتاب العلم، رواہ ابو ہریرہ) اسلام کی اسی کشادہ قلبی نے اسے آفاقی وسعتیں عطا کی ہیں-

اسلام جب حرا کی آغوش سے نکل کر پھیلا تو اس کی کرنوں نے نہاں خانۂ دل روشن کر دیے- آفتاب رسالت کی موجودگی میں کسی فن کے حضور زانوے ادب تہہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی- وحی الوہیت اور نطق نبوت ہر مسئلے کا شافی علاج تھی- البتہ دور دراز کے علاقوں میں تبلیغ اسلام کے لیے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دو صورتیں تجویز کی تھیں- کتاب وسنت سے براہ راست استفادہ یا پھر ان کی روشنی میں مسئلے کا عقلی استنباط جس نے آگے چل کر اسلامی فنون بالخصوص فقہ و اصول کی تدوین کے لیے راہیں ہموار کیں-

یہاں پر ایک سوال سطح ذہن پر ابھرتا ہے کہ کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے فقہ واصول کی تدوین اور ان کے قواعد کے انضباط کی ضرورت کیا ہے؟ قرآن حکیم میں ہر خشک وتر کا بیان ہے، سارے اصول وضوابط موجود ہیں- قرآنی اصول کی جامع تشریحات احادیث مبارکہ میں مکمل طور سے ملتی ہیں- اللہ اور رسول نے ہر ہر قدم پر امت مسلمہ کو رہنما اصول دیے ہیں تو پھر ایک نئے فن کی تدوین اور اس کے ہاتھوں میں امت مسلمہ کی زمام دینے کی ضرورت کیا ہے؟ حبل اللہ کے ہوتے ہوئے، کسی عبقری کی نیازمندی کا قلادہ اپنی گردن میں کیوں ڈالا جائے؟ کتاب وسنت کے سرچشمہ شیریں کے ہوتے ہوئے کسی اور سمت رخ کرنے کا جواز کہاں پیدا ہوتا ہے؟ یہ سوالات ہماری ایمانی حس کے تقاضے ہو سکتے ہیں- ان کا واضح اور مفصل جواب کثیر صفحات اور وسیع اوقات چاہتا ہے- لیکن ذیل کی چند سطروں میں اس کی واجبی وضاحت ضرور پیش کی جائے گی-

یہ جہان فطرتاً تغیر پذیر اور مائل بہ ارتقا ہے- کائنات کا یہ ارتقائی سفر اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک اس کی قبائے وجود مکمل طور سے تارتار نہ ہو جائے- کل یوم فی شان (رب کائنات ہر دن ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے) کی جلوہ گری کائنات کے ذرے ذرے میں سمائی ہوئی ہے- جو ساں کل تھا، وہ آج نہیں، جو آج ہے وہ کل نہیں

☆C/o.Masha Allah Cottage,Jamalpur,Aligarh(U.P)

رہے گا- معاشرے کے دہرے دہرے دہرے وجود میں یہ تبدیلیاں اور ترقیاں بہت واضح انداز سے محسوس کی جاسکتی ہیں- یہاں تک کہ مظاہر فطرت جوایک سے دکھتے چلے آرہے ہیں، ان کی جلوہ گری بھی ایک سی نہیں ہوتی - بوڑھا سورج بظاہر اسی مشرق سے نکلتا ہے اور اسی مغرب میں ڈوبتا ہے- لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ اس کی جائے طلوع ہر دن بدلتی رہتی ہے اور مقام غروب بھی ہر دن تبدیل ہوتا رہتا ہے- سرد و گرم موسم، لمبی اور چھوٹی رتیں، مہ و نجوم اور بادلوں کی آنکھ مچولیاں، چاند اور سورج کی داغداریاں (گہن)، رتوں کی بھیگتی سوکھتی پلکیں، حکومتوں کے بدلتے زاویے، ثقافتوں کے تبادلے، سمٹتی پھیلتی سرحدیں، فطرت کا اصول درشاتی ہیں، قانون قدرت کا مزاج سمجھاتی ہیں، حرکت وعمل پر آمادہ رکھتی ہیں، زمانے کی سیدھی رفتار کا ساتھ دینے پر مہمیز کرتی ہیں- یہ بتاتی ہیں کہ انجماد و تعطل کا زندگی سے بھر پور اس شاداب ہنستی بولتی کائنات سے دور کا واسطہ نہیں- جو فطرت کا یہ مزاج نہیں سمجھے گا، اس کی گھومتی بدلتی تیز رفتار کا ساتھ نہیں دے گا، وہ پس منظر میں چلا جائے گا اور زمانہ اس سے دامن جھٹک کر بہت برق رفتاری سے آگے بڑھتا چلا جائے گا- چاہے وہ شخص ہو یا تحریک، مذہب ہو یا تمدن، علم ہو یا انداز عمل- اسلام جب دین فطرت ہے تو وہ فطرت کی ان رواں دواں تبدیلیوں اور تغیر آشنا مزاج سے دامن کش کیسے ہوسکتا ہے؟ اسلام تو قیامت تک اس دنیا کا ہمدم و ہم ساز سدا بہار رہنما مذہب ہے، اس لیے اس کا انجماد و تعطل سے بھلا کیا ربط ہوسکتا ہے؟ ہاں! اس کی اپنی ٹھوس، غیر متزلزل اور مستحکم بنیادیں ہیں، اس کا اپنا دلکش و پاکیزہ دائرہ کار ہے- وہ دنیا کے دامن میں نہیں سمٹتا بلکہ دنیا کو اپنی مقدس آغوش میں سمیٹتا ہے-

اس تغیر مآب کائنات کے پس منظر میں اب دنیاوی اصول و قوانین کی حدیں، ماہیتیں اور کیفیتیں ملاحظہ کیجیے- کسی ملک کا قانون ہو، ہر نصف صدی کے بعد اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہوتی ہے- کئی دفعات نکالنی پڑتی ہیں- بہت سی شقیں داخل کرنی ہوتی ہیں اور کسی میں جزوی ترمیم (Amendment) جگہ پاتی ہے، حالات اور کیفیات کے منظر نامے جوں جوں تبدیل ہوتے ہیں، اصول و قوانین کے کینوس بھی رخ بدلتے رہتے ہیں- قوانین کی یہ توسیعاتی کیفیت ایسی روشن ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی-

اب اسلام کے قانونی رخ کو دیکھتے ہیں تو اس پر الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الا سلام دینــاً (المائدۃ:۵) ترجمہ: آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو منتخب کرلیا) کی مہر ثبت ملتی ہے- اس کے جتنے اصول وضوابط تھے، مکمل ہو چکے، دین تکمیل کے مرحلے سے گزر چکا، کتاب وسنت کا لازوال سرچشمہ امت مسلمہ اور سعید دنیا کی پیاس بجھاتا رہے گا- ہر خشک و تر کتاب وسنت کی وسعتوں میں سما چکے- اب اس ضابطۂ خالق کائنات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکے گی- پھر قدرت کے ان اصولوں کا کیا ہوگا، جنہیں تبدیلیاں ہی راس آتی ہیں، یہ تغیر پذیر کائنات اسلام کے غیر متبدل اور اٹل مزاج کا ساتھ کیسے دے سکے گی؟ آئے دن طوفانوں کی مانند جو مسائل امنڈتے رہتے ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ اسلام عرب سے نکل کر، بحر و بر کی وسعتوں میں پھیلے گا تو یہ بھانت بھانت کے سماج، بولیاں، روایتیں، رسمیں، تہذیبیں اسلام سے کس طرح مانوس ہوں گی- کیا اسلام کائنات کی ان تمام رنگا رنگیوں کو دفن کر دے گا یا انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر چلے گا- نئے سماج، نئے وقت اور نئے حالات کی تبدیلیوں کو اسلام کی میزان پر کیوں کر تولا جاسکے گا- اگر مزاج اور ماحول کی ان تبدیلیوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو دنیا اس کی تقدس مآب آغوش میں کیسے سما سکے گی- اس طرح کے نہ جانے کتنے سوالات ہیں جو دماغ کی زیریں سطح پر ابھرتے رہتے ہیں- جبکہ اسلام ابدی اور لافانی مذہب ہے، اسے ہر زمانے کی قیادت کرنی ہے-

غرض بے ثبات دنیا کی بوقلمونی، حالات کی رنگا رنگی، زمانے کی تبدیلیاں فطرت کے تیکھے نقوش ہیں، جنہیں بہر صورت رونما ہونا ہے اور اسلام کی عالمگیر ابدیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے- ایک مسلسل تغیرات کا خواہاں ہے اور دوسرا مکمل استقلال کا، دونوں قدرت کے بنائے ہوئے اصول ہیں، جن کی نہ تغلیط ہوسکتی ہے، نہ انہیں توڑا جاسکتا ہے- اسلام کے شاداب اور مستحکم اصول اور یہ نگار خانہ کائنات دونوں قیامت تک سدا بہار رہیں گے- پھر ان دونوں کو ہم آہنگ کرنے کی صورت کیا ہے؟ اس خلیج کو پاٹنے، اس گیپ (Gap) کو ختم کرنے اور ان دونوں مختلف جہتوں کو مانوس کرنے کی صرف ایک راہ ہے، جسے اجتہاد کہتے ہیں اور اسی نشان منزل کی توجہ کے لیے فقہ واصول کی تدوین عمل میں آئی- بات ذرا مبہم سی رہ گئی- کتاب وسنت کے ارشادات سے اعتبار دیتے ہوئے

اسی کی مختصر وضاحت پیش ہوتی ہے۔

کتاب اللہ میں یقیناً ساری چیزوں کا بیان ہے لیکن اس کے اصول جامع، مختصر اور گہرے گہرے ہیں، جن تک ہم آپ تو کجا حضرات صحابہ بھی رسول محتشم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تشریح کے محتاج تھے۔سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورۂ بقرہ کی تعلیم ڈھائی سال میں حضور سے مکمل فرمائی۔تکمیل کے بعد خوشی میں احباب کی شاندار ضیافت کا اہتمام فرمایا۔حضرت فاروق اعظم خود فصیح عرب تھے، انہیں قرآنی متن کو سمجھنے کے لیے کسی کے تعاون کی ضرورت ہی کیا تھی، پھر آپ حضور سے ڈھائی سال ڈھائی پارے کی تعلیم میں کیا سیکھتے رہے، کیا صرف لفظوں کے معانی؟ نہیں بلکہ وہ اسرار قرآنی اور رموز ربانی جو نور الٰہی سے روشن دلوں کو عطا ہوتے ہیں، انہیں اسرار کے گہرے قرآنی سمندر کی نشاندہی یہ حدیث پاک فرماتی ہے کہ اگر سارے سمندر روشنائی اور سارے درخت قلم بنا دیے جائیں اور ان سے قرآن حکیم کے اسرار وعجائب قلم بند ہوں پھر بھی وہ ختم نہ ہوں گے۔اگر قرآن حکیم کا معاملہ صرف متن کے ظاہری رخ تک محدود ہوتا تو پھر اس کے عجائبات لامحدود کیسے ہو سکتے تھے۔قرآن حکیم اسرار ومعانی کا ناپیدا کنار سمندر ہے، جس کی شناوری ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔اس کے لیے ایک مخصوص معیار کا علم، نور الٰہی سے روشن سینہ، مشکوٰۃ نبوت کی جاں بخش ضیاؤں سے مستیزی اور خاص کر توفیق الٰہی سے سرفرازی ضروری ہے، جبھی وہ قرآن میں چھپے کائنات اور ماورائے کائنات کے اسرار دریافت کر سکتا ہے۔یہ معیار فقہائے صحابہ کو حاصل تھا، جو ارشادات نبوت کے قیمتی خزانوں کے امین ہیں، اسی لیے اسلام کا یہ مسلّم اصول ہے کہ قرآن حکیم کو صرف متن قرآن اور لفظوں کی پرکھ سے نہیں سمجھا جا سکتا۔اس کے لیے احادیث مبارکہ کی پرنور رہنمائی ضروری ہے۔اس کے بغیر جو قرآن کو سمجھنا چاہے، گمرہی اس کا مقدر ہے۔

اب احادیث مبارکہ کی معنوی گہرائی کی سمت توجہ کی جائے تو ہمیں یہ ارشاد رسالت جگمگاتا نظر آتا ہے: اوتیت بجوامع الکلم۔ مجھے مختصر اور جامع کلمات کا معجزہ عطا کیا گیا۔معجزہ وہی چیز ہوتی ہے جو مافوق الفطرت ہو، جو دوسروں کا مقدور نہ ہو، جسے حضور نے بطور امتیاز پیش فرمایا ہو۔اس کا صاف مطلب ہے کہ حضور کے ارشادات معانی ومفاہیم کی گہری تہیں رکھتے ہیں، جو بیک نگاہ منکشف نہیں ہو سکتیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مبارک بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے علم کے دو برتن حاصل کیے ہیں، ایک کو بیان کرتا ہوں، اگر دوسرا بیان کروں، تو میرا یہ گلا کاٹ دیا جائے۔(بخاری شریف ۱/۲۳) ارشادات نبوت کی تفہیم کے لیے ان نفوس قدسیہ کی تشریحات مطلوب ہیں، جن کی پرنور نگاہیں جمال نبوت کے دیدار سے جگمگ جگمگ کرتی ہیں، جن کے دل انوار نبوت سے روشن روشن ہیں، جن کی سماعتیں الفاظ نبوت کی لذت چشیدہ ہیں، جنہوں نے براہ راست مہبط وحی سے وحی ناطق اور غیر ناطق کو سنا، سمجھا اور دل میں بسایا ہے، جو بارگاہ رسالت کے مزاج شناس تھے، اگر حضرات صحابہ کی رہنمائی کے بغیر کوئی احادیث کے سرچشمے سے فیض اٹھانا چاہے تو ٹھوکریں اس کا مقدر ہیں۔کیوں کہ اہل محفل ہی میر محفل سے کماحقہ، واقفیت رکھتے ہیں، یونہی افکار صحابہ کے ذخائر ان کے حاضر باش، حضرات تابعین کے توسط سے سمجھیں۔

کوئی بھی قانون ایسا جامع نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک دوسرے کے سارے حالات ومعاملات، وسائل ومسائل کا حکم واضح کر سکے، چہ جائیکہ وہ سارے زمانوں کے حالات اور معاملات کا احاطہ کر سکے۔قانون، ہمیشہ ایک کسوٹی ہوتا ہے، حالات اور معاملات کو اس پر پیش کر کے پرکھا جاتا ہے، اس پیش کش اور اس کے نفاذ کے لیے کارپردازان قانون کو فکر وتدبر اور سلیقہ مندی سے کام لینا پڑتا ہے۔قانون کی سطح عموماً سپاٹ ہوتی ہے۔لیکن وہی قانون دیرپا اور رائج ہو پاتا ہے، جس کے اندر Flexibility ہوتی ہے اور زمانے کے مزاج کو ایک حد تک ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے نفاذ کی کوشش کی جاتی ہے۔بے لوچ اور کرخت، یک رخا مزاج رکھنے والا قانون یا تو خود ٹوٹ جاتا ہے یا پھر اسے توڑ دیا جاتا ہے۔اسلام ابدی اور لازوال مذہب ہے اور قیامت تک کے دردمندوں کا چارہ ساز، اس لیے اس کے سارے اصول فطرت سے ہم آہنگ اور اس کے مزاج کا خاصا خیال رکھتے ہیں، ان میں نرم خوئی، لچک داری اور ہر حال اور ماحول میں ضم (Adjust) ہونے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے، ان میں بے تکاپن اور کرختگی نہیں ہے۔لیکن اسے ہر حال، ماحول اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے نافذ کرنے کے لیے اعلیٰ اسلامی شعور کی ضرورت ہے، جو ان جامع اصولوں اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے نافذ کرنے کے لیے اعلیٰ

اسلامی شعور کی ضرورت ہے، جو ان جامع اصولوں سے نئے نئے مسائل کے احکامات برآمد کر سکے-اسی شعور کی قوت کو ملکۂ اجتہاد کہتے ہیں-قرآن وسنت میں دین اسلام کی تکمیل کا یہی مطلب ہے کہ اسلام کے سارے بنیادی احکام اورلازمی اصول مکمل ہو چکے-الحلال ما احل اللہ والحرام ما حرم اللہ و ماسکت عنہ فھو معفو عنہ (حلال وہ چیز ہے جسے اللہ نے حلال ٹھہرایااورحرام وہ چیز ہے جسے اللہ نے حرام ٹھہرایااور جس کے بارے میں کوئی حکم وارد نہیں ہے، وہ مباح ہے) ان بنیادی اصولوں میں کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی-لیکن ماحولیات کے بدلاؤ سے جو حالات رونما ہوتے ہیں، ان کی اسلامی اصولوں کی روشنی میں تفہیم ضرور ہوسکتی ہے-فقہ واصول یہی کارنامہ انجام دیتے ہیں، ملکۂ اجتہاد یہی فرض ادا کرتا ہے، فقہا الگ سے ہٹ کر کچھ نہیں کہتے-وہ نور خدا سے منوردل رکھتے ہیں، علم لدنی کے شرف سے سرفراز ہوتے ہیں، اسلامی اصول ومصادر کا گہرا شعور رکھتے ہیں، وہ نت نئے حالات کو کتاب وسنت کے معیار پر پیش کر کے ان کی زیریں سطحوں سے اس کا شرعی حکم برآمد کر لیتے ہیں، جہاں تک عام نگاہوں کی رسائی نہیں ہوتی، جیسے دنیاوی ایجادات کرنے والے افراد کائنات فطرت کا گہرا مشاہدہ کر کے عام نگاہوں سے چھپے راز دریافت کر لیتے ہیں، پھر انہیں عوام کے لیے مفید بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں-ساری دنیا اس سے بے تکلف فائدہ اٹھاتی ہے-لیکن ایسے موجدین، خالق نہیں ہوتے بلکہ منتظم ہوتے ہیں-اس لیے ان کی ایجادات بھی قدرت کا کرشمہ ہی کہی جائیں گی اور اللہ کی ملکیتیں ہی شمار ہوں گی-البتہ ایسے موجدین مادی دنیا کے قائد اور محسن ضرور سمجھے جائیں گے-یونہی ائمہ مجتہدین شریعت کا گہرا شعور رکھنے کی وجہ سے نت نئے معاملات کی تفہیم کا فریضہ اسلام کی سطح سے انجام دیتے ہیں-شریعت کے مصادر کی روشنی میں انہوں نے ایسے اصول ایجاد کیے ہیں، جن کی روشنی میں حالات ومعاملات کا اسلامی فہم آسان ہو جاتا ہے، اور پوری دنیا ان کے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں اسلامی قوانین پر سہولت کے ساتھ عمل پیرا ہو جاتی ہے-اہل دنیا کو خود احکام اخذ کرنے اور استنباط کرنے کی زحمتیں گوارہ نہیں کرنی پڑتیں، نہ وہ اس کے اہل، یہ ائمہ مجتہدین اس ترتیب واستنباط کے سبب شارع نہیں ہو جاتے، بلکہ شریعت کے خادم ہی رہتے ہیں-البتہ اعلیٰ سطح کی اسلامی خصوصیات کے سبب وہ امت کے لیے آسانی کا سبب بنتے ہیں، اس لیے امت مسلمہ میں انہیں ایک خصوصی امتیاز نصیب ہوتا ہے اوراس کی بدولت وہ اسلامی قائد، رہنما، امام اور قابل اقتدا شخصیت شمار ہوتے ہیں اور یہ بات بالکل ظاہری ہے کہ امتیازات چاہے وہ جس رخ کے ہوں، بہر طور قابل تقلید واحترام ہوتے ہیں اور ایسے افراد قبول عام سے بہرطور سرفراز ہوتے ہیں-اس لیے ائمہ مجتہدین کی تقلید کو دین سے جدا کسی فکر کی پیروی سمجھنا عقل وفہم کا دیوالیہ پن ہے-حضرات ائمہ جیسے افراد تو امت مسلمہ کا انتخاب ہوتے ہیں اور قرآن حکیم کے ارشاد کی روشنی میں امت کے رہنما، ارشاد ربانی ہے:

فلو لا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین و لینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (التوبۃ : ۱۲۲) تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں، اس امید پر کہ وہ بچیں-ایسے فقیہ افراد کو قرآن حکیم نے قائدانہ منصب عطا کیا ہے-

احادیث مبارکہ میں ایسی خوبیوں والے افراد کو بہت سراہا گیا ہے-حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین (مشکوٰۃ کتاب العلم) جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دین کی سمجھ اور فقاہت عطا کر دیتا ہے-

دوسری جگہ ارشاد ہے: **نعم الرجل الفقیہ فی الدین ان احتیج الیہ نفع و ان استغنی عنہ اغنی نفسہ**- کتنا اچھا ہے وہ شخص جو دین کا فقیہ ہو، اگر کوئی اس کے پاس دینی حاجت لے کر حاضر ہو تو وہ اس کی مدد کرے اور اگر اس سے دنیا بے نیازی کا معاملہ رکھے تو وہ بھی اپنے آپ کو بے نیاز بنا لے-تیسری حدیث پاک میں ہے: **فقیہ واحدا اشد علی الشیطان من الف عابد** (رواہ ابن عباس مشکوٰۃ، العلم) ایک فقیہ شیطان کی جان پر ہزار عابد سے زیادہ گرانبار ہے-

یہ امتیازات اللہ اور رسول کی بارگاہ سے ایک فقیہ اور مجتہد کو عطا ہوئے ہیں، اس لیے ان کی ذوات قدسیہ یقیناً قابل احترام اور لائق تقلید ہیں-

اصول دین کی تفہیم کے لیے نئے نئے اچھے اچھے طریقے ایجاد کرنا، جن سے مقاصد دین پورے ہوتے ہوں، مطلوب شریعت بھی

ہے، معروف حدیث جریر بن عبداللہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے:

من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شئ (مشکوٰۃ، کتاب العلم ص: ۲۵)

جو شخص اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کرے، اس ایجاد کا ثواب ملے گا اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے، ان سب کا مجموعی ثواب اس موجد کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا اور لطف یہ ہے کہ ان پر عمل پیرا لوگوں کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ ایسے فنون و آداب، اطوار و عادات کو برتنا جو نئے ہوں، لیکن دین سے متعلق ہوں، اس کے مقاصد کی تکمیل میں مفید ہوں اور ان سے اسلام کے کسی متعین اصول کی نفی نہ ہوتی ہو، فرمان رسول اور مزاج شریعت کے مطابق ہے، یہی وہ بنیادی ہدایت ہے جو اسلام کے بنیادی اصولوں کو حالات زمانہ کے اعتبار سے ایڈجسٹ کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اور زمانے کے تغیرات کو بہت سہولت، نرمی Flexebility اور سلیقے سے برتتی ہے۔ قرآن حکیم کی جمع و ترتیب، علوم قرآن اور فنون حدیث کی تدوین یہ سب کچھ بعد کی چیزیں ہیں اور مخلصین اسلام کی پاکیزہ ذہنوں کی ایجاد۔ حضرات ائمہ مجتہدین اس حدیث کے بہترین مصداق ہیں، وہ امت مسلمہ کے سامنے ایسے بہتر طریقے پیش کر گئے، جن کی برکتوں سے ہزار سال کے بعد بھی دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ اگر وہ اور ان کے یہ عظیم الشان کارنامے نہ ہوتے تو آج امت مسلمہ کس مشقت سے دوچار ہوتی، ہم آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے، لیکن ائمہ مجتہدین کی یہ ایجاد فنون کتاب وسنت کے سرچشمے سے ہی مستفاد ہے۔ جس طرح قرآن حکیم کی جمع و ترتیب، احادیث مبارکہ کی تدوین عہد رسالت کے بعد کی چیزیں ہیں لیکن ان کا سرا عہد رسالت میں موجود تھا۔ کیونکہ خود حضور قرآن حکیم کو چمڑوں پر، کھجور کی چھالوں پر لکھواتے باضابطہ کاتبین وحی متعین تھے، جو حضور کی بیان فرمودہ ترتیب کے مطابق آیات و سور کو لکھتے جاتے۔ کتابت حدیث کا بھی قرآن جیسا نہ سہی لیکن اہتمام ضرور تھا، اس لیے بعد میں جمع قرآن اور تدوین حدیث کا کارنامہ منشائے نبوت کے مطابق تھا اور خود ان کے پس پردہ الٰہی مشیت اور ایزدی تائید کارفرما تھی۔ ٹھیک اسی طرح فقہ واصول اور اجتہاد و تقلید کا نقطہ آغاز بھی عہد رسالت کی ہی دین ہے اور ان کی جڑیں کتاب وسنت کے سمندروں سے پانی لیتی ہیں۔

یہ حدیث اہل علم کے درمیان کافی شہرت رکھتی ہے کہ ۱۰ھ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو ارشاد فرمایا: معاذ! تم امت مسلمہ کے مسائل کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ عرض کی: یارسول اللہ! کتاب اللہ کی روشنی میں، حضور نے فرمایا: اگر وہ حکم صراحتاً اس میں نہ ملے تو؟ عرض کیا: آپ کے ارشادات کی روشنی میں، فرمایا: اگر میری حدیث میں بھی تمہیں وہ حکم دستیاب نہ ہو تو؟ عرض کیا: یارسول اللہ! اجتهد برائی ولا آلو۔ میں بے تکلف کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ رسول محتشم کا چہرہ اس جواب سے کھل اٹھا، حضرت معاذ کے مبارک سینے پر دست کرم پھیرتے ہوئے فرمایا:

الحمد الله الذی وفق رسول رسول الله لما يرضیٰ به رسول الله ۔ اللہ تعالیٰ کا بے پناہ شکر و احسان کہ اس نے اپنے رسول کے ترجمان کو ایسی اچھی فکر کی توفیق دی، جس سے اس کا رسول راضی ہے۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم (مشکوٰۃ۔ کتاب الامارہ)

اس حدیث کا روشن مفہوم یہی ہے کہ فقہ و اجتہاد وقت کی ضرورت ہے اور اسلام کی تفہیم کا شاندار ذریعہ، جسے بارگاہ نبوت کی بھرپور تائید حاصل ہے اور اسی کے ذریعہ اسلام کے مستحکم اصول ہر زمانے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان بنتے ہیں۔ یہی نرمی اسلامی قوانین کو قبول دوام اور ہر ماحول میں انضمام کا سہرا عطا کرتی ہے۔

عہد رسالت کے بعد عہد صحابہ کی روش بھی فقہ واصول کی بنیاد میں مستحکم کرتی نظر آتی ہے۔ سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں صحابی رسول حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (گورنر) کو ایک طویل فرمان بھیجا، جس میں یہ ہدایت بھی تھی:

الفهم الفهم فی ما يختلج فی صدرک مما لم يبلغک فی القرآن والسنة۔ اعرف الأمثال والا شباه ثم قس الامور عند ذلک فاعمد الیٰ احبها الیٰ الله واشبهها بالحق فی ماتریٰ (تاریخ علم فقہ مفتی سید عمیم الاحسان، ڈھاکہ ص: ۱۲) اچھی طرح سمجھ کر فیصلہ کرو بالخصوص اس مسئلہ میں جو تمہارے

دل میں تردد کا سبب بن رہا ہو، قرآن وسنت سے وہ بات تم کو معلوم نہ ہوئی ہو، ایسے موقع پر ملتے جلتے ایک دوسرے سے مشابہ مسائل کو پہچانو پھر اس وقت مسائل میں قیاس سے کام لو اور جو جواب تم کو اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور حق سے زیادہ قریب نظر آئے، اس کو اختیار کرو۔

علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین (تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین کے طریقوں کی پیروی لازم ہے) کی روشنی میں ان دونوں بیانات سے خوب اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات ائمہ نے فقہ واصول کی تدوین کر کے اپنے لیے اور ساری امت کے لیے کیسی سعادت کا سامان کیا ہے اور امت مسلمہ کی کیسی دستگیری فرمائی ہے۔

فقہ و اصول کتاب وسنت کے عصری تقاضوں کی کیسی خدمت کرتے ہیں اور ان پر کتاب وسنت کا فیض بار سائبان کس طرح سایہ کناں ہے۔ اس کا اندازہ اسی بات سے کیجیے کہ فقہ و اصول کی چار بنیادیں ہیں (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ (۳) اجماع (۴) اور قیاس۔ ان میں کتاب وسنت تو بنیادی مصادر ہیں اور اجماع و قیاس کتاب وسنت کی تائید سے مزین اور مستفاد۔ اجتہاد صرف اس صورت میں ہوتا ہے، جب کسی مسئلے کا حکم کتاب وسنت میں صراحتاً نظر نہ آئے تو نظائر و امثال پر اس مسئلے کو پیش کر کے اس کا شرعی حکم دریافت کر لیتے ہیں۔ اس لیے فقہ واصول کی تدوین اور ایجاد منشائے شریعت کی تکمیل کی خاطر مشیت الٰہی کی تائید سے عمل میں آئی۔ اس کے بغیر اسلامی احکام کی مکمل تفہیم ناممکن ہے۔ حضرت امام سلیمان اعمش رضی اللہ تعالیٰ عنہ زبردست محدث اور حضرت امام اعظم کے استاذ ہوتے ہیں۔ حضرت امام اعظم آپ سے بہت مانوس تھے، ایک مرتبہ آپ حضرت اعمش کی محفل میں حاضر تھے، کسی شخص نے حضرت امام اعمش سے کچھ مسائل دریافت کیے، انہوں نے امام اعظم سے پوچھا کہ آپ ان مسائل کے بارے میں کیا کہتے ہیں، حضرت امام اعظم نے ان سب مسائل کے شرعی احکام بیان فرما دیے۔ اما اعمش نے حیرت سے پوچھا: یہ کہاں سے کہتے ہو؟ فرمایا: آپ ہی کی بیان کردہ ان احادیث سے اور وہ احادیث سندوں کے ساتھ بیان فرما دیں۔ امام اعمش نے فرما: بس بس! میں نے آپ سے جتنی حدیثیں سو دن میں بیان کیں، آپ نے وہ سب ایک دن میں سنا ڈالیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ ان احادیث پر عمل کرتے ہیں۔ اے گروہ فقہا: تم طبیب ہو اور ہم محدثین عطار اور اے نوجوان! تم نے دونوں (حدیث اور فقاہت) کو حاصل کیا۔ (الخیرات الحسان ص: ۶۷)

جس طریقے سے قرات قرآنی کے لہجوں میں اختلاف کی وجہ سے اہل عجم کا اس آسمانی صحیفے میں الجھنا تدوین قرآن کا سبب بنا، حضرات صحابہ کا تسلسل کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونا اور ان کے رواۃ میں اختلاف تدوین حدیث کا باعث تھا، وضع حدیث کے فتنے سے احادیث کے سرمائے کو محفوظ کرنے کے لیے اسماء الرجال کا فن مدون ہوا۔ اسی طرح کتاب وسنت کے معانی کی تفہیم میں اختلاف۔ فقہائے صحابہ کے فتاویٰ میں اختلاف اور کتاب وسنت سے مسائل کے استنباط کے طریقوں میں اختلاف نے ایسی فضا پیدا کی، جس کی وجہ سے اسلام کے ہمدردوں کو ایسے اصول استنباط وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، جن کی روشنی میں آسانی کے ساتھ مسائل کے احکام دریافت کیے جا سکیں اور درست فیصلے تک پہنچا جا سکے۔

حضرات تابعین کی اخیر صفوں نے فقہ واصول کی تدوین کی سمت توجہ فرمائی اور اس کاروان سعادت کی سرخیل، امام الائمہ، سراج الامۃ کاشف الغمۃ، سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات قدسی صفات ہے، جن کے نور باطن سے آج بھی دنیا درخشانیوں کی سوغات حاصل کر رہی ہے۔ حضرت امام مزنی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

''ابو حنیفة اول من دون علم الفقه و افرده بالتالیف من بین الاحادیث النبویة و بوبه فبدأ، با لطهارة ثم بالصلوة ثم بسائر العبادات ثم المعاملات الی ان ختم الکتاب بالمواریث و قفاه فی ذلک مالک بن انس وقفاه ابن جریج و هشام

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تدوین فقہ میں اولیت کا مقام حاصل ہے جنہوں نے اس علم کو احادیث نبویہ سے اخذ کر کے الگ ممتاز فن کی شکل عطا کی اور اس کے ابواب متعین کیے۔ سب سے پہلے باب طہارت کے مسائل رقم کیے، پھر نماز کے پھر ساری عبادات کے ان کے بعد معاملات کے، یہاں تک کہ میراث کے مسائل پر فقہی ابواب کا اختتام فرمایا۔ اسی طرز تدوین و ترتیب کو بعد میں حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر حضرت ابن جریج اور حضرت ہشام قدس سرہما نے اختیار فرمایا (تاریخ علم الفقہ۔ عمیم الاحسان)

فقہی مسائل کے استنباط اور اس فن کی تدوین کا انداز شورائی تھا،

کسی ایک فقہی باب کے مسائل اٹھائے جاتے ، ایک ایک مسئلہ قرآن وحدیث کے معیار پر پرکھا جاتا - گرما گرم بحثیں ہوتیں ، اس محفل بحث و استنباط میں ہرایک کوشمولیت کی اجازت نہیں بلکہ اسلامی علوم کے اعلیٰ ماہرین اور نور باطن سے سرفراز ایسے تقدس مآب چالیس افراد اس تدوین بورڈ میں شامل تھے جو اپنی نظیر آپ تھے اور ہرایک درجۂ اجتہاد پر فائز - قول فیصل حضرت امام اعظم کا ہوتا ، اس مجلس تدوین کے استناد کے لیے مشہور محدث حضرت وکیع بن الجراح کا یہ بیان کافی ہے -

"کیف یقدر ابو حنیفة ان یخطی ومعه مثل ابی یوسف و زفرومحمد فی قیاسهم و اجتهاد هم و مثل یحییٰ بن ابی زائدة وحفص بن غیاث و حبان ومندل فی حفظهم للحدیث و معرفتهم به والقاسم بن معن یعنی ابن عبد الرحمن بن عبد الله بن مسعود فی معرفته باللغة والعربیة وداؤد بن نصیر الطائی و فضیل بن عیاض فی زهد هما وور عهما فمن کان اصحابه هؤلاء وجلسائه لم یکن لیخطئی لانه ان اخطا ردوه الیٰ الحق (جامع المسانید ص:۳۳) امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کام میں غلطی کیسے باقی رہ سکتی ہے ، جبکہ واقعہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ ابو یوسف ، زفر اور محمد جیسے لوگ قیاس واجتہاد کے ماہر موجود تھے اور حدیث کے باب میں یحییٰ بن زکریا زائدہ ، حفص بن غیاث حبان اور مندل جیسے ماہرین حدیث ان کی مجلس میں شریک تھے اور لغت وعربیت کے ماہرین میں قاسم بن معن یعنی عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود کے صاحبزادے جیسے حضرات شریک تھے - اور داؤد بن نصیر طائی اور فضیل بن عیاض جیسے لوگ تقویٰ وورع اور زہد و پرہیز گاری رکھنے والے موجود تھے ، تو جس کے رفقائے کار اور ہم نشین اس قسم کے لوگ ہوں ، وہ غلطی نہیں کرسکتا - کیوں کہ غلطی کی صورت میں صحیح امر کی طرف یہ لوگ یقیناً واپس کردیتے ہوں گے -

فقہ واصول دونوں کی تدوین کا آغاز ساتھ ہی ہوا کیونکہ اصول کی روشنی میں ہی مسائل کا استخراج ہوتا ہے لیکن ممتاز فن کی حیثیت سے اصول نے اپنی شناخت ذرا بعد میں بنائی - حضرت امام اعظم کے ممتاز مجتہد تلامذہ سیدنا امام ابو یوسف اور امام محمد نے اصول فقہ کے باب میں تحریریں چھوڑی ہیں - حضرت امام مالک نے بھی موطا میں اس فن کے بعض قواعد کی جانب واضح اشارات دیئے ہیں - لیکن اصول فقہ کے باب میں ممتاز تصنیف کی شکل میں حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تحریر فرمودہ ''الرسالۃ'' سامنے آیا ، جسے خاصی شہرت ملی ، یہاں تک کہ ابن خلدون جیسے محقق کو یہ گمان ہوگیا کہ اس فن کی تدوین کا سہرا حضرت امام شافعی کے سر ہے - وہ لکھتے ہیں :

''اصول فقہ پر سب سے پہلے امام شافعی نے قلم اٹھایا اور اپنا مشہور الرسالۃ قلم بند کیا ، جس میں اوامر ونواہی ، بیان وخبر ، نسخ وعلۃ القیاس کے حکم وغیرہ پر بحثیں کیں ، پھر فقہائے حنفیہ نے مبسوط کتابیں تالیف کیں ، جن میں اصول فقہ کے قواعد وضوابط وضاحت وتفصیل کے ساتھ مقرر و مدون کیے اور دوسری طرف متکلمین نے بھی اسی طرح کی کتابیں تصنیف کیں ....غرض فقہائے حنفیہ کو فقہی باریکیوں پر دسترس اور مسائل فقہیہ سے اصول فقہ کے قواعد وقوانین اخذ کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے - (تاریخ افکار وعلوم اسلامی - راغب طباخ ۲/۳۰)

لیکن مشہور شافعی مورخ ابن خلکان اس فن کی تدوین کا سہرا حضرت امام ابو یوسف کے سر باندھتے ہیں - ان کا بیان دیکھیے :

''سب سے پہلے انہوں نے (امام ابو یوسف) فقہ حنفی سے متعلق اصول فقہ کی تحریری بنیاد رکھی اور مسائل کا املا کرایا اور ان کی اشاعت ہوئی اور تمام اطراف اور بلاد وامصار میں امام ابوحنیفہ کا علم پھیل گیا (تاریخ افکار وعلوم اسلامی راغب طباخ -۲/۳۳)

حضرات محققین نے خوب فرمایا :

''فقہ کی کاشت سیدنا عبداللہ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی حضرت علقمہ نے اس کی آبیاری کی ، حضرت ابراہیم نخعی نے اس کھیتی کو کاٹا ، حضرت حماد نے اس کی بھوسی اتاری ، حضرت امام اعظم نے اسے باریک پیسا ، حضرت امام ابو یوسف نے اسے گوندھا اور حضرت امام محمد بن حسن شیبانی نے اس کی روٹیاں پکائیں - اب ساری امت ان روٹیوں سے شکم سیر ہورہی ہے'' (فتاویٰ ملک العلماء ص:۲۴)

اجتہاد و تدوین فقہ کے سارے معاملات محض کتاب وسنت کی تفہیم اور مسائل حیات کی اسلامی تشریح اور تحلیل کے لیے عمل میں لائے گئے اور کتاب وسنت کی روشنی میں احکام شریعت بتائے گئے - البتہ خدا داد شعور شریعت اور تفقہ کی نعمت سے ضرور استفادہ رہا ، اس لیے یہ کارنامے تو ان بزرگوں کے ہیں - لیکن یہ سارے احکام علوم نبوت کا فیضان اور کتاب وسنت اور شریعت کے احکام ہی شمار ہوں گے - ان کی

پیروی اللہ اور رسول کے حکم کی پیروی ہی کہی جائے گی- انہیں اسلام سے الگ کسی غیر کی اقتدا سمجھنا سراسر نادانی ہے اور اسلامی فہم وشعور سے بے گانگی- حضرات ائمہ اسی لیے تو ہمارے مقتدا اور مقدس پیشوا ہیں کہ یہ حضرات بارگاہ خدا اور رسول سے زیادہ قرب رکھتے ہیں- ان کا قرب الٰہی دیکھنا ہے تو حضرت امام اعظم کی حیات مبارکہ کا روشن ورق ہی ملاحظہ کرلیں- آپ حضور کی بشارت ہیں، سارے ممتاز محدثین کے بالواسطہ یا بلا واسطہ استاذ ہیں- آپ کے تلامذہ میں چالیس ایسے جلیل الشان تھے جو منصب اجتہاد پر فائز تھے اور قرب خدا کی اعلیٰ منزلیں رکھتے تھے- آپ نے چالیس سال تک عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی، چالیس سال اس طرح روزہ دار رہے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوسکی- رمضان مقدس میں اکسٹھ ختم قرآن کرتے- ایک ختم دن میں، ایک رات میں اور ایک پورے مہینے کی تراویح میں- آپ سو۱۰۰ بار خواب میں رب تبارک وتعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوئے- قاضی بغداد عمارہ بن حسن نے آپ کو اخیر غسل دیا- غسل دیتے جاتے اور یہ کہتے جاتے تھے، واللہ تم سب سے بڑے فقیہ، سب سے بڑے عابد، سب سے بڑے زاہد تھے، تم میں تمام خوبیاں جمع تھیں، تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا ہے کہ وہ تمہارے مرتبے کو پہنچ سکیں- (نزہۃ القاری ۱/۱۶۳) اجلۂ اولیائے کرام جیسے حضرت ابراہیم بن ادھم، حضرت شقیق بلخی، حضرت معروف کرخی، حضرت بایزید بسطامی، حضرت فضیل بن عیاض، حضرت عبداللہ بن مبارک ولی، حضرت وکیع بن جراح، حضرت شیخ الاسلام ابوبکر بن وراق، حضرت سلطان الہند خواجہ سید معین الدین حسن چشتی اجمیری سنجری حنفی رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے آپ کی اقتدا کو باعث فخر جانا- آپ جلیل الشان تابعی ہیں جنہوں نے متعدد صحابہ کرام کی زیارت کا شرف حاصل کیا- اسی تقدس اور طہارت کا اثر تھا کہ آپ کی دینی فکر اور شرعی خدمات کو ایسا قبول عام حاصل ہوا کہ دو تہائی اسلامی دنیا آپ سے شرف نیاز رکھتی ہے اور حنفی کا لقب ان کے لیے باعث افتخار اور دین ودنیا کا سرمایۂ سعادت ہے- صاحب مجمع البحار بین الاقوامی شہرت یافتہ ہندی شافعی محدث اور فقیہ علامہ محمد طاہر فتنی (م۹۸۶ھ) نے ''المغنی'' میں بہت پیاری بات فرمائی ہے-

''فلو لم یکن للّٰہ سر خفی فیہ لما جمع لہ شطر الاسلام او ما یقاربہ علی تقلیدہ حتی عبداللہ بفقہہ و عمل برائہ الی یو منا ما یقارب اربع مائۃ و خمسین سنۃ و فیہ اول دلیل علی صحتہ'' (المغنی ص: ۸۰)

اگر اس مذہب حنفی میں اللہ تعالیٰ کی قبولیت کا راز پوشیدہ نہ ہوتا تو نصف یا اس کے قریب مسلمان اس مذہب کے مقلد نہ ہوتے- ہمارے زمانے تک، جس کو امام صاحب سے تقریباً ساڑھے چار سو برس کا عرصہ ہوتا ہے، ان کی فقہ کے مطابق اللہ وحدہٗ کی عبادت ہورہی ہے اور ان کی رائے پر عمل ہورہا ہے- یہ اس مذہب کے عند اللہ مقبول اور صحیح ہونے کی شاندار دلیل ہے''-

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ (م:۱۵۰) کے علاوہ امام مالک بن انس (م۱۷۹ھ) امام محمد بن ادریس شافعی (م۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) حضرت سفیان ثوری (م:۱۶۱ھ) امام لیث بن سعد (م ۱۷۵ھ) امام ابوثور (م:۲۴۰ھ) امام عبد الرحمٰن بن عمر اوزاعی (م: ۱۵۷ھ) نامور مجتہد فقہاء گزرے ہیں، یہ سبھی ائمہ قرآن وحدیث کے بہترین شناور، احادیث طیبہ کے زبردست ماہر، علم وادب کے امام، زہد وتقویٰ کے نورانی منارے ہیں، جن سے دنیا ہر سطح پر رہنمائی حاصل کرتی رہی- یہ بے نفس بزرگ کوئی ایسی بات دین واسلام کے تعلق سے کیسے فرما سکتے ہیں، جو قرآن وحدیث کے خطوط سے ہٹ کر ہو، جبکہ ان کا امتیاز ہے کہ مخلوق خدا میں سب سے زیادہ خشیت الٰہی انہیں کا حصہ ہے- انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء- حضرت امام اعظم کا صاف ارشاد ہے: اذا صح الحدیث فھو مذھبی جب کوئی حدیث صحت سند کے ساتھ دستیاب ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے- حضرت امام شافعی نے مکہ معظمہ میں ایک مرتبہ فرمایا:

''جو چاہو، مجھ سے دریافت کرو، میں تمہیں کتاب اللہ سے اس کی خبر دوں گا'' (فضائل قرآن مشمولہ کنز الایمان ص: ۹۰) حضرت امام غزالی ایک فقیہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فقیہ وہ ہے جو دنیا سے دل نہ لگائے اور آخرت کی طرف ہمیشہ راغب رہے، دین میں کامل بصیرت رکھتا ہو، طاعات پر مداومت اپنی عادت بنالے، کسی حال میں بھی مسلمانوں کی حق تلفی برداشت نہ کرے، مسلمانوں کا اجتماعی مفاد ہر وقت اس کے پیش نظر ہو، مال کی طمع نہ رکھے، آفات نفسانی کی باریکیوں کو پہنچانتا ہو، عمل کو فاسد کرنے والی چیزوں سے بھی باخبر ہو، راہ آخرت کی گھاٹیوں سے واقف ہو، دنیا کو حقیر سمجھنے کے

ساتھ ساتھ اس پر قابو پانے کی قوت بھی اپنے اندر رکھتا ہو، سفر وحضر اور جلوت وخلوت میں ہر وقت دل پر خوف الٰہی کا غلبہ ہو (احیاء العلوم)

ایک غیر مجتہد فقیہ کے جب یہ اوصاف مطلوب ہیں تو پھر مجتہد فقیہ کے لیے اوصاف کی کیسی کوالیٹی مطلوب ہوگی، اس کا ہر باشعور شخص اندازہ کرسکتا ہے، اس لیے ان ائمہ کرام کے سارے معاملات اللہ اور رسول کی رضا میں گم ہیں-وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے-گفتۂ او گفتہ اللہ بود، ان کا امتیاز ہے-یہ حضرات یا تو قرآن حکیم سے نور لیتے ہیں یا حدیث پاک سے روشنی-پھر اپنی بصیرت آشنا ژرف نگاہی سے علوم شریعت کی غواصی کر کے امت مسلمہ کے لیے آسانیاں فراہم کرتے ہیں-ان کی اقتدا ایسے نفوس قدسیہ کی پیروی ہے جس کی دعا ہر نماز میں کی جاتی ہے:اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم یہ انعامات الٰہیہ سے سرفراز حضرات ہیں، جن کی اقتدا کا ہمیں حکم دیا گیا ہے-واتبع سبیل من اناب الی و کونوا مع الصادقین اسی گروہ کے اشارے ہیں، اس لیے ان کی اطاعت دراصل حکم الٰہی کی تعمیل ہے-وہ بے نصیب لوگ ہیں جو ان حضرات سے دامن کشاں گزرتے ہیں-

یہاں اس گوشے کی وضاحت کر کے اپنی بات مکمل کرتا ہوں کہ جب کتاب وسنت کے سرچشمے قیامت تک تازہ اور رواں دواں ہیں تو پھر قرن اول اور ثانی کے ائمہ مجتہدین کی پیروی ہی کیوں کی جائے-بعد کے دور میں بھی تو اہل اجتہاد پیدا ہوں گے جو دور حاضر کے نت نئے مسائل کو اپنی خداداد صلاحیتوں کی روشنی میں حل کرتے ہیں-ساری دنیا چار فقہی مذاہب حنفی شافعی مالکی حنبلی میں ہی کیوں محدود رہے-اس سلسلے میں پہلے یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ دوسری صدی ہجری میں صرف چار فقہی مذاہب ہی نہیں تھے اور حضرات ائمہ مجتہدین میں ائمہ اربعہ کا ہی شمار نہیں ہوتا تھا بلکہ بیسوں اکابر اسلام ایسے تھے جو منصب اجتہاد پر فائز تھے بلکہ کئی ایک دیگر ائمہ کے مذاہب پھیلے بھی-کوفہ میں حضرت سفیان ثوری، مصر میں امام لیث، بغداد میں ابوثور، اندلس اور دمشق میں امام اوزاعی کے متبعین پائے جاتے تھے لیکن ان حضرات ائمہ کو تسلسل کے ساتھ متبعین دستیاب نہیں ہو سکے کہ ان کا مذہب ہمارے دور تک پہنچتا، نہ ان کے افکار کو ان کے اخلاف نے تحریری طور سے منضبط کیا، اس لیے ان ائمہ کے فقہی مسائل رفتہ رفتہ زمانے کی تہوں میں گم ہوتے چلے گئے-جب ان کے ذخائر افکار اور مستنبط مسائل ساری ضروریات حیات اور اسلامی گوشوں کو محیط ہو کر محفوظ ہی نہیں رہے تو بھلا امت اسے اپنائے گی کیسے؟ جبکہ رائج چاروں فقہی مذاہب اپنی مکمل تفصیلات کے ساتھ سارے فقہی ابواب پر محیط ہو کر اب بھی جوں کے توں محفوظ ہیں، بلکہ آئے دن ان کے ذخائر میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے-بلا مبالغہ ہر فقہی مذہب کی تفصیلات اور تشریحات پر مشتمل اب تک لاکھوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس لیے ساری صحیح العقیدہ دنیا ان چاروں مذاہب کے دائرے میں سمٹی سمٹائی ہے-

رہ گئی قرآن وحدیث کی شاہراہ سعادت تو وہ قیامت تک ہر زمانے میں امت کے لیے کشادہ ہے، اس کا در کبھی بند نہیں ہوا-لیکن ان سمندروں سے تب وتاب والے گہر ہائے ثمین نکالنے والے اہل ظرف عرصے سے مفقود ہیں-ان کی مجتہدانہ شناوری کے لیے جس معیار کا علمی شعور چاہیے وہ اہل نظر کی نگاہ میں تیسری صدی ہجری کے بعد سے دستیاب نہیں-اگر رب قادر کوئی ایسا بندہ پیدا کردے، جو ان تمام گوشوں پر حاوی ہو جو اجتہادی صلاحیت کے لیے درکار ہوتے ہیں تو وہ بے تکلف اجتہاد کرسکتا ہے-

حضرت ائمہ مجتہدین عہد رسالت سے قرب کی بدولت جو انشراح صدر رکھتے تھے، اس کے دستیاب ہونے کی تو اب کوئی صورت ہی نہیں ہے، لیکن کتاب وسنت کی جیسی واقفیت اور علوم وآداب کے جن گوشوں کی ابھی ابھی نشاندہی ہوئی، کیا اب کوئی ایسا نظر آتا ہے، جو ان فنون وآداب سے واجبی سی واقفیت بھی رکھتا ہو چہ جائیکہ ان میں اسے مہارت کی گیرائی حاصل ہو، پھر بہت سے ایسے علوم ہیں، جو زمانے کی تہوں میں دفن ہو کر رہ گئے اور اہل علم انہیں اپنے سینوں میں لے کر قبر کی آغوش میں جا سوئے، خود حدیث پاک اس بات کی نشاندہی فرماتی ہے کہ جوں جوں قیامت کا زمانہ قریب آتا جائے گا، علم کی گہرائی کم ہوتی جائے گی-ارشاد رسالت ہے:

ان الله لایقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد و لکن یقبض العلم بقبض العلماء (مشکوۃ شریف:ص:۲۵)

اللہ تعالیٰ بندوں سے علم کی گہرائی کو یوں نہیں ختم کرے گا کہ ان کے دلوں سے علم چھین لے بلکہ جیسے جیسے جید علماء دنیا سے اٹھتے جائیں گے، ان کا علم بھی ان کے ساتھ رخصت ہوتا جائے گا (پھر بعد میں ان کا

کوئی جانشین اور ان جیسا علم والا نہیں پیدا ہوگا- اس طور سے علم کی گہرائی رفتہ رفتہ ختم ہوتی جائے گی)

جب اجتہاد کی بنیادی شرطیں ہی مفقود ہیں تو پھر اجتہاد کا جواز ہی کیا رہ جاتا ہے؟ لیکن پھر دوسرا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ جب اجتہاد امکانی سطح پر نہ سہی، عملی سطح پر ہی گم ہے تو پھر نت نئے پیش آنے والے مسائل کا کیا ہوگا، انہیں کون حل کرے گا؟ یہاں تو پھر وہی جمود نکل آیا جسے دور کرنے کے لیے فقہ واصول کی تدوین ہوئی تھی اور اسلامی قوانین کا Flexibile رخ سامنے آیا تھا- اس کی توضیح یہ ہے کہ مجتہد مطلق کی شرطیں تو صدیوں سے مفقود ہیں لیکن ائمہ کے متعین کردہ اصول استنباط کی روشنی میں آنے والے مسائل کی تشریح کرنے والے اصحاب بصیرت پیدا ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے، جو اپنی مومنانہ فراست سے امت کے درد کا علاج پیش فرماتے رہیں گے- اسی لیے اہل نظر نے فقہائے کرام کے سات طبقات متعین کیے ہیں:

۱- مجتہد فی الشرع / مجتہد مطلق مستقل: یہ فقہائے اسلام کا وہ طبقہ ہے جنہیں اصولی قواعد کی تاسیس، کتاب وسنت، اجماع اور قیاس سے فرعی احکام کے استنباط کی ذاتی سطح پر استعداد حاصل ہو، اور وہ اصول وفروع میں کسی کی تقلید کے محتاج نہ ہوں- جیسے سراج الامۃ امام اعظم ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعی (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) وغیرہ)

۲- مجتہد فی المذہب / مجتہد مطلق غیر مستقل:- یہ ایسے فقہاء ہوتے ہیں جن میں مجتہد مطلق کی ساری صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں لیکن وہ خود کو اصول میں کسی مجتہد مطلق کا تابع رکھتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے اصول کی روشنی میں کتاب وسنت، اجماع اور قیاس سے مسائل کے استخراج کی صلاحیت رکھتے ہیں- یعنی اصول میں مقلد ہوتے ہیں اور فروع میں مجتہد- جیسے حضرت امام ابو یوسف (م ۱۸۳ھ) امام محمد (م ۱۸۹ھ) امام عبد اللہ بن مبارک (م ۱۸۱ھ) وغیرہ تلامذۂ امام اعظم قدست اسرارہم-

۳- مجتہد فی المسائل / مجتہد مقید:- ایسے فقہاء اس زمرے میں آتے ہیں جو اصول وفروع دونوں میں مجتہد مطلق کے تابع ہوں اور ان کے وضع کردہ اصول وفروع کی روشنی میں ایسے مسائل کا استنباط کر سکتے ہوں، جن کے بارے میں ائمہ مذہب سے کوئی روایت نہیں ملتی- جیسے امام ابو بکر خصاف (م ۲۶۱ھ) امام ابو جعفر طحاوی (م ۳۳۱ھ) امام ابو الحسن کرخی (م ۳۴۰ھ) شمس الائمہ حلوائی (م ۴۵۶ھ) شمس الائمہ سرخسی (م ۵۰۰ھ) امام فخر الاسلام بزدوی (م ۴۸۲ھ) امام فخر الدین قاضی خاں (م ۵۹۳ھ)

۴- اصحاب تخریج:- حضرات فقہاء کا یہ طبقہ اجتہاد و استنباط مستقل کی قدرت نہیں رکھتا، البتہ ائمہ مذہب کے وضع کردہ سارے اصول وفروع پر گہری نگاہ ہوتی ہے، جس کی روشنی میں یہ مجمل کی تشریح، محتمل کی تعیین مثالوں کے حوالے سے کر سکتے ہیں- حضرت امام ابو بکر احمد بن علی رازی (۳۷۰ھ) اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں-

۵- اصحاب ترجیح:- یہ حضرات اصحاب تخریج سے کمتر فقاہت کے حامل ہوتے ہیں اور ائمہ مذہب سے منقول روایات میں سے اصول وفروع کی روشنی میں بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں- جیسے امام ابو الحسن قدوری (م ۴۲۸ھ) صاحب ہدایہ امام ابو الحسن علی بن ابی بکر فرغانی مرغینانی (م ۵۹۳ھ) وغیرہ-

"ھذا اولیٰ، ھذا اصح، ھذا اوضح، ھذا اوفق للقیاس، جیسے اقوال ان کی پہچان ہوتے ہیں-

۶- اصحاب تمیز:- فقہاء کا یہ گروہ مذہب کے قوی اور ضعیف، مقبول اور مردود اقوال میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے- ظاہر الروایہ اور نادر روایات کے درمیان امتیاز کی قدرت ان میں موجود ہوتی ہے، جیسے اصحاب متون معتبرہ مثلاً صاحب مختار، صاحب وقایہ، صاحب مجمع وغیرہ-

۷ مقلد محض:- جن میں مذکورہ بالا کوئی صلاحیت موجود نہ ہو، ایسے حضرات کا ذاتی قول قابل عمل نہیں ہوتا، بس یہ ائمہ مذہب کے اقوال نقل کر سکتے ہیں، جیسے موجودہ دور کے بیشتر صاحبان فقہ-

(فتاویٰ ملک العلماء: ۲۵-۲۶)

ان میں ایسے ایسے افراد شامل ہیں، جن کی جوتیوں کی خاک بھی آج کے غیر مقلدین کو نصیب نہیں لیکن ان سب فضائل و کمالات کے باوجود یہ حضرات، ائمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی کے مقلد ہی رہے- خود حضرت امام بخاری جنہیں چھ لاکھ احادیث مبارکہ ان کے رجال اور اسناد کی ساری جزئیاتی تفصیلات کے ساتھ یاد تھیں، سیدنا امام شافعی کے مقلد تھے، تو یہ غیر مقلد حضرات بخاری شریف کی تین ساڑھے تین ہزار احادیث کی زیارت کر کے اجتہاد کے دعویدار کیوں کر بن سکتے ہیں؟ یہاں حضرت علامہ ارشد القادری کا یادگار جملہ یاد آتا ہے کہ" حضرت امام

بخاری، بخاری شریف لکھ کر بھی مقلد ہی رہے اور یہ غیر مقلد صاحبان بخاری شریف کو الماریوں میں سجا کر مجتہد بنے پھرتے ہیں"- غیر مقلدین کی فکری بے بسی اس بات سے بھی نمایاں ہے کہ وہ جو بھی کہتے ہیں، وہ انہیں حضرات ائمہ میں کسی کا قول ہوتا ہے- اگر واقعی دعوائے اجتہاد رکھتے ہیں تو ان حضرات ائمہ سے جدا گانہ کوئی ممتاز حکم دلیل سے ثابت کر دکھائیں- شاخ و بن سے جدا ہو کر پتے کی بے بسی ایسی ہی ہوتی ہے-

علامہ سید محمد طحطاوی حنفی نے اپنے حاشیہ درمختار میں بجا تحریر فرمایا:

هذه الطائفة الناجية قدا اجتمعت اليوم فی مذاهب اربعة وهم الحنفيون والمالكيون و الشافعيون و الحنبليون رحمهم الله تعالىٰ و من كان خارجا عن هذه الاربعة فی هذا الزمان فهو من اهل البدعة و النار (حاشيه الطحطاوی علی الدرر ۱۵۳/۴ ، کتاب الذبائح)

امت کا نجات یافتہ طبقہ اب حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی چار مذاہب میں منحصر ہے- جو اس زمانے میں اس چار گروہ سے خارج ہو وہ بد مذہب ہے اور جہنم کا مستحق"-

اللہ تعالیٰ ہمیں دین وشریعت کی فہم، پختہ شعور، حسن ادب اور گرامی توفیق سے سرفراز فرمائے اور ہدایت یافتہ حضرات کی صفوں میں باقی رکھے- آمین ☆☆☆

مولانا یٰسین اختر مصباحی☆

تقلیدِ فقہی: حقیقت، نوعیت اور ضرورت

کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ دینِ اسلام کی مذہبی و علمی اور عملی تعبیر و تشریح ہیں۔ عقائد و مبادی اور احکام و مسائل کے سرچشمے ہیں اور پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جملہ احوال و قضایا اور شعبہائے حیات میں اُسوہ وقدوہ اور نمونہ کامل ہیں جن کا ہر قول و فعل و عمل صحابۂ کرام اور قیامت تک کی امتِ مسلمہ کے لئے دلیل وحجتِ شرعی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک دین اسلام ایک ہی ہے اور یہی دین اسلام قیامت تک کے لئے اللہ کا محبوب اور منتخب دین ہے۔ لیکن ہر صاحبِ شریعت پیغمبر کو اللہ نے جس شریعت مطہرہ سے نوازا وہ بعد میں اختلافِ زمان و مکان کی وجہ سے مشیتِ الٰہی کے مطابق تغیر پذیر ہوتی رہی جب کہ شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اس نے یہ امتیاز واختصاص بخشا ہے کہ اس کے بعد اب کوئی شریعت جدیدہ نہیں اور یہی شریعتِ محمدی اپنے کمال و جامعیت کی بنیاد پر جہاں مسلمانانِ عالم کے لئے واجب الاتباع ٹھہری وہیں اپنی زندگی و تابندگی اور تازگی و شادابی کے لحاظ سے بقائے دوام کی خلعت سے بھی سرفراز ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذلك۔

سنتِ رسول کے ساتھ سنتِ خلفائے راشدین کی اطاعت واتباع ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اسی طرح صحابۂ کرام کی جماعتِ مبارکہ بھی عدول ومقتدائے شریعت وامت ہے، جس پر آیات واحادیث کی بے شمار ھدایات ناطق وشاھد ہیں اور ساری امتِ مسلمہ کا اسی کے مطابق اعتقاد وعمل ہے اور اسی پر اس کا اجماع بھی ہے۔ اس سفینۂ نوح پر جو سوار ہوا وہ ساحلِ مراد کو پہنچا اور جس نے ان نجوم ھدایت کی روشنی میں اپنا سفر حیات شروع کیا وہ کامیابی وکامرانی کے ساتھ اپنی منزل مقصود سے ہم کنار ہوا۔

تعقل، تفکر، تدبر اہلِ اسلام کے لئے بموجب ھدایات و ارشادات کتاب وسنت ہر عہد وقرن میں ضروری ہے اور ان کا یہ دینی و شرعی واجتماعی فریضہ ہے کہ اسرار ورموزِ حیات وکائنات میں غور وخوض کر کے ان کی گتھیاں سلجھائیں اور انسانی معاشرہ کی صلاح وفلاح کے لئے وہ تمام تر تدابیر بروئے کار لائیں جن کی انہیں کچھ بھی ضرورت و حاجت محسوس ہو اور بنی نوعِ انسان کے حق میں کسی بھی جہت سے، جس امر مطلوب کی کوئی بھی افادیت واہمیت متصور ہو۔ لیکن تحقیق وتفحص واکتشاف وایجاد اور اقدام وعمل کے ہر مرحلے میں قدم قدم پر اس کی رعایت اور اس کا التزام ہر مسلمان کے اوپر واجب ہے کہ اسلام وشریعتِ مطہرہ نے جو اصول وقواعد وضوابط مقرر فرما دیے ہیں اور جو ھدایات جاری فرما دی ہیں ان کی کسی طرح خلاف ورزی نہ ہو اور الحاد واعتزال وانحراف وضلال وتجاوز وخروج سے اپنے آپ کو ہر قیمت پر محفوظ رکھا جائے۔

مہد سے لحد تک عقائد وعبادات ومعاملات کے جو دائرے اسلام و شریعت مطہرہ نے متعین کر دیے ہیں ان کی پابندی فرض شرعی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم وصحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی اطاعت واتباع سے کسی مسلمان کو کسی حال میں مفر نہیں۔ اسی طرح کتاب وسنت سے ثابت وواضح احکام ومسائل میں کسی کی ذاتی رائے اور قیاس آرائی کا کوئی دخل نہیں۔ نہ ہی ان کے اندر کسی بڑے سے بڑے عالم وفقیہ ومجتہد کو مجال دم زدن وجراَتِ این وآں وجسارتِ چنیں وچناں کی کوئی گنجائش ہے۔

عقائد میں کسی مجتہد کی تقلید جائز نہیں نہ ہی عباداتِ توقیفیہ میں کسی طرح کی تقلید کا کوئی دخل ہے۔ یعنی کتاب وسنت سے ثابت اور منصوص احکام میں تقلید کا کوئی جواز نہیں۔ نہ عہد رسالت وعہد صحابہ میں زمانہ مابعد کی اصطلاحی تقلید فقہی کا نام تھا نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی۔ کیوں کہ ان کے اقوال واعمال براہ راست وحی ربانی اور مشکاۃ نبوت سے مستنیر ہوا کرتے تھے۔ ہاں! صحابۂ کرام کے مراتب ومدارجِ علم و فہم متفاوت تھے اس لئے اعلم وافقہ صحابۂ کبار سے دیگر صحابۂ کرام مسائلِ شرعیہ میں رجوع کیا کرتے تھے اور ان کے بیان کردہ احکام و مسائل کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔

اعلم وافقہ کی طرف رجوع وسوال کا حکم خود رب کائنات نے دیا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے:

☆Darul Qalam, Qadri Masjid Road, Jogabai Ext. Okhla, New Delhi

فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ. (سورة النحل. آیت. ۴۳)

تو اے لوگو! علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں۔

اور تفقہ کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

وَ مَاکَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا کَآفَّةً. فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْھُمْ طَآئِفَةٌ لِیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَھُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَیْھِمْ لَعَلَّھُمْ یَحْذَرُوْنَ. (سورة التوبه. آیت ۱۲۲)

اور مسلمانوں سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب نکلیں تو کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں اس امید پر کہ وہ بچیں۔

اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

اِنما شفاء العیّ السوال. (ابو داؤد) مرضِ جہل کا علاج سوال ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو دعا دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اللھم فقّھه فی الدین و علّمه التاویل. (الحدیث)

اے اللہ! انھیں دین کی فقاہت اور تفسیر و تاویل کا علم عطا فرما۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بارگاہ رسول کی ملازمت اور کثرتِ اکتساب کی وجہ سے جلیل القدر صحابۂ کرام کے درمیان اپنی دینی بصیرت اور تفقہ کے باب میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود کے بارے میں فرمایا:

لاتسئلونی مادام ھذا الحِبر فیکم. (مشکوٰة بروایت بخاری)

جب تک یہ عالم و فقیہ تمہارے درمیان موجود ہیں اس وقت تک مجھ سے نہ پوچھو۔

کتاب و سنت اصل مصادر شریعت ہیں اور انہیں کی روشنی میں قیاسِ مجتہد کو بھی علما و فقہاے اسلام نے مصادر شریعت میں شمار کیا ہے جس کی تائید مندرجہ ذیل حدیث نبوی سے ہوتی ہے۔

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو حاکم یمن بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوقتِ روانگی سوال فرمایا کہ تمہارے پاس کوئی معاملہ فیصلہ کے لئے لایا جائے گا تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ حضرتِ معاذ نے عرض کیا کہ کتاب اللہ سے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اس میں نہ پاؤ تب کیا کرو گے؟ عرض کیا کہ سنتِ رسول سے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اس میں بھی نہ پاسکو تب کس طرح فیصلہ کرو گے؟ اس وقت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

اجتھد برائی و لاآلو. قال فضرب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم علیٰ صدرہٖ و قال. الحمد لِلّٰه الذی وفق رسولَ رسولِ اللّٰه لمایرضیٰ به. (ابواب الاحکام للجامع الترمذی. ج ۱. و دارمی و مشکوٰة)

اس وقت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اللہ کا حمد و شکر ہے جس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس کی توفیق دی جس سے اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) راضی ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ظاہری کے بعد لاتجتمع امتی علیٰ الضلالة (الحدیث) اور دیگر ارشادات کی روشنی میں عہد تابعین و تبع تابعین ہی میں علما و فقہاے اسلام نے اجماعِ امتِ مسلمہ کو بھی مصادر شریعت میں شامل کرلیا۔ اس طرح (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ (۳) قیاس شرعی (۴) اجماع امت۔ یہ چار مصادر شریعت (ادلۂ اربعہ) قرار پائے اور سوادِ اعظم نے فقہا و مجتہدینِ امت کے علم و فضل، ان کی دینی و ایمانی فہم و فراست، ان کی دیدہ وری و نکتہ رسی، ان کے ورع و تقویٰ، ان کے حزم و احتیاط، اور ان کی خدا ترسی و مآل اندیشی پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے وضع کردہ اصول وضوابط و کلیات و جزئیات کو جملہ احکام و مسائلِ غیر منصوصہ میں حرزِ جاں بنایا اور درجہ بہ درجہ و عہد بہ عہد انہیں قبول کرتے اور ان کے مطابق عمل کرتے چلے آرہے ہیں کہ یہی ہدایتِ صراطِ مستقیم و اتباعِ سبیلِ مؤمنین اور ادوارِ مابعد کی اصطلاحی تقلیدِ ائمۂ مجتہدین ہے۔

مختلف علوم و فنون کی طرح رفتہ رفتہ فقہ اسلامی کے بھی اصول و قواعد مرتب ہوتے گئے اور تفصیلی دلائل کے ساتھ احکام شرعیہ فرعیہ کے جاننے کو علم فقہ کہا جانے لگا اور اصول فقہ کی یہ اصطلاحی تعریف کی گئی کہ:

العلم بالقواعدِ الکلیة التی یتوصل بھا الیٰ استنباطِ الاحکامِ الشرعیةِ العملیة من ادلّتھا التفصیلیة.

کتاب و سنت کی روشنی میں مقاصدِ شریعت یعنی حفظ دین و نفس و نسل و عقل و مال ان فقہا و مجتہدین کا مطمحِ نظر ہے اور ان کی ساری کدو کاوش اسی محور کے گرد ہمیشہ گردش کرتی رہی ہے۔ مجتہدین کے بھی

طبقات (۱) مجتہدین فی الشریعہ (۲) مجتہدین فی المذھب (۳) مجتہدین فی المسائل (۴) اصحاب تخریج (۵) اصحاب ترجیح (۶) اصحاب تمییز نے انھیں مقاصدِ شریعت کی تکمیل کی راہ میں اپنی دینی وعلمی وفکری واجتہادی توانائیاں صرف کیں اور اپنی عمرعزیز کو اسی تفقہ و اجتہاد کے لئے وقف کر دیا۔ نمبر۲ سے نمبر۶ تک کے مجتہدین حقیقی طور پر مجتہدین فی الشریعہ کے مقلدِ فقہی قرار پاتے ہیں۔ اور انھیں کی طرف ان سب مجتہدین اور دیگر مقلدین کا انتساب ہوتا ہے۔

استخراج مسائلِ شرعیہ کا کام اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ کہ یہ شریعت جاوداں اور پیہم رواں دواں ہے اور ہر عہد و عصر کے مسائل وقضایا کو حل کرنے کی اس کے اندر بھرپور صلاحیت موجود ہے، مگر المیہ یہ ہے کہ آج آخری درجۂ اجتہاد کے حاملین یعنی اصحابِ تمییز کا ملنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ باب اجتہاد بند نہیں ہوا ہے مگر اس کا اہل بھی تو کوئی ہو؟ تعبیر کی غلطی سے اچھے خاصے حضرات کہتے نظر آتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے تو موجودہ علما کو بھی اجتہاد کرنا چاہیے۔ جس سے ان کا مقصد اس کے سوا عموماً کچھ نہیں ہوتا کہ نئے حالات و مسائل کا شریعت کی روشنی میں کوئی حل ڈھونڈھنا چاہیے۔ ان کی یہ خواہش صد فی صد درست ہے مگر انہیں چاہیے کہ لفظِ اجتہاد کی بجائے لفظ استخراج کا استعمال کریں تا کہ ان کا لفظ ان کی بات اور ان کا مافی الضمیر صحیح طور پر اور صحیح تناظر میں واضح ہو سکے۔

مذکورہ طبقات میں سے کسی طبقہ میں بلکہ آخری طبقہ (اصحاب تمییز) میں بھی کسی موجودہ عالم ومفتی وفقیہ کے شامل نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طبقۂ مقلدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور ان کے لئے تقلیدِ فقہی ہر حال میں واجب ہے۔ کیوں کہ دو دو چار کی طرح یہ حقیقت روشن ہے کہ جو شخص مجتہد نہیں وہ مقلد ہے۔ اور تقلید ہی میں اس کے لئے عافیت اور راہِ نجات ہے۔

جو شخص علم طب سے واقف نہیں وہ طبیب نہیں۔ جو علم سے نابلد ہے وہ عالم نہیں۔ یہ بات ایک عام آدمی بھی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ سمندر کے اندر موتیوں کی کمی نہیں ہوتی ہے مگر انہیں سمندر کی تہ سے باہر وہی شخص نکال سکتا ہے جو ماہر غوطہ خور ہو۔ ورنہ جسے غوطہ خوری نہ آتی ہو وہ موتیوں کی طلب میں سمندر کے اندر چھلانگ لگا کر اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

تقلیدِ فقہی کا تعلق صرف ابواب فقہ سے ہے۔ اور احکام ومسائلِ غیر منصوصہ میں ہی اس کا وجود و وجوب ہے۔ باقی علوم وفنون اسلامیہ و عربیہ اور عصری علوم وفنون میں ہر عالم ومحقق اپنی استعداد ولیاقت و صواب دید کے مطابق جو کچھ کرنا چاہے اور جس شعبۂ علم وفن میں آگے بڑھنا چاہے اس کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ ڈاکٹری، انجینئرنگ، سائنس وغیرہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ تحقیق وریسرچ کرے اور اونچے سے اونچے درجہ پر فائز ہو تو یہ اس کی بڑی کامیابی اور قابل رشک ترقی ہے۔ جس پر علما وفقہائے اسلام کی جانب سے کوئی قدغن اور کوئی پابندی نہیں۔ بس صرف اتنی شرط ہے کہ حدودِ شریعت سے اس کے قدم آگے نہ بڑھنے پائیں۔

لغوی طور پر اپنی گردن میں قلادہ ڈالنے کو تقلید کہا جاتا ہے جب کہ اصطلاحی طور پر تقلید فقہی کی تعریف یہ ہے۔ احکام ومسائلِ شرعیہ غیر منصوصہ میں کسی امام مجتہد کی تحقیق کو بلا دلیل وحجت مان لینے کا نام تقلید ہے۔ چنانچہ علمائے متقدمین نے صراحت ووضاحت کے ساتھ اپنی مستند کتب ورسائل میں یہی بات تحریر فرمائی ہے جن میں سے چند عبارات درج ذیل ہیں۔

التقلید عبارة عن قبول قول الغیر بلاحجة و لادلیل.
(التعریفات للسید الشریف-الجرجانی)

التقلید اتباع الرجلِ غیرہ فیما سمعه یقول او فی فعله علیٰ زعم انهٗ محقق بلانظرٍ فی الدلیل. (نور الانوار بحث تقلید و حاشیه حسامی باب متابعة الرسول ﷺ)

التقلید هو قبول قولِ بلاحجة (المستصفیٰ جلد دوم للامام الغزالی)

التقلید العمل بقولِ الغیر من غیر حجةٍ. (مسلم الثبوت لمحب الله البهاری)

ظاہر ہے کہ جو عالم مجتہد نہیں ہوگا وہ مقلد ہی ہوگا اور اسے تقلید فقہی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جس طرح مختلف علوم وفنون کے ماہرین اپنے علم وفن کے تعلق سے جو تحقیق بیان کریں وہ ان کی علمی وفنی تحقیق کا نتیجہ ہوتا ہے جسے دنیا کے کروڑوں انسان بلاچون وچرا تسلیم کرتے ہیں اور کوئی جاہل وعامی شخص اگر کج بحثی پر آمادہ ہوتا ہے تو اسے ہر عاقل انسان ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ صدیوں پیشتر کے جلیل القدر علما وفقہائے اسلام بھی تقلید فقہی کے قائل اور اس پر عامل تھے جن کی عظمت و فضیلتِ دینی وعلمی پر شرق وغرب کے مسلمان متفق ہیں۔ عالم اسلام کے

بڑے بڑے علما و فقہا و فضلا کا اگر آج جائزہ لیا جائے تو ان میں ایسے افراد و اشخاص صحیح معنوں میں نادر الوجود ہیں جنھیں کلیات و جزئیاتِ فقہ پر عبور ہو۔ اور بڑے بڑے دار الافتاء کے نامور مفتیانِ کرام بھی معرفتِ دلائلِ تفصیلیہ کے بعد اجرائے فتویٰ کرنے والے اصحاب فتویٰ نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت ناقلینِ فتاویٰ سے زیادہ نہیں ہے۔

ائمۂ مجتہدین فی الشریعہ یعنی امام ابوحنیفہ و امام شافعی و امام مالک و امام احمد بن حنبل رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مرتبہ و مدون فقہی اصول و ضوابط اور ان کی تاصیل و تفریع کو اسلامی بلاد و امصار میں شروع ہی سے اتنا شرف قبول حاصل ہوا کہ سوادِ اعظم نے انھیں میں سے کسی ایک کی تقلیدِ فقہی پر اتفاق کر لیا اور تقریباً ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزرا کہ اسی پر اس کا اجماع بھی ہو گیا۔ مارآہ المسلمون حسناً فهو عندالله حسن (اثر ابن مسعود) کا یہ ایک بہترین نمونہ اور جلوۂ حق نما ہے جس کے اندر سوادِ اعظم کا اصل چہرہ صاف عیاں اور ہر طرح نمایاں ہے۔

چودھویں صدی ہجری کے ایک عظیم و جلیل فقیہ و مفتی مگر مقلدِ حنفیت کی زبانی فقہ اسلامی کی حقیقت سن کر اور اسے سمجھ کر قارئین کرام بھی اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوں گے کہ اجتہاد تو بڑی چیز ہے آج کل تفقہ بھی ایک جنس نایاب سے کم نہیں ہے۔

فقاہت کیا چیز ہے اور تفقہ فی الدین کب حاصل ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں فقیہ اسلام امام احمد رضا بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) رقم طراز ہیں:

''فقہ یہ نہیں کہ کسی جزئیہ کے متعلق کتاب سے عبارت نکال کر اس کا لفظی ترجمہ سمجھ لیا جائے۔ یوں تو ہر اعرابی ہر بدوی فقیہ ہوتا کہ ان کی مادری زبان عربی ہے۔

بلکہ فقہ بعد ملاحظۂ اصولِ مقررہ، وضوابطِ محررہ، و وجوہِ تکلم، و طرقِ تفاہم، و تنقیحِ مناط، و لحاظِ انضباط، و مواضعِ یسر و احتیاط، و تجنبِ تفریط و افراط، و فرقِ روایاتِ ظاہرہ و نادرہ، و تمیزِ درایاتِ غامضہ و ظاہرہ، و منطوق و مفہومِ صریح و محتمل، و قولِ بعض و جمہور و مرسل و معلل، و وزنِ الفاظِ مفتین، و سبرِ مراتبِ ناقلین، و عرفِ عام و خاص، و عاداتِ بلاد و اشخاص، و حالِ زمان و مکان، و احوالِ رعایا و سلطان، و حفظِ مصالحِ دین، و دفعِ مفاسدِ مفسدین، و علمِ وجوہِ تجریح، و اسبابِ ترجیح، و مناہجِ توفیق، و مدارکِ تطبیق، و مسالکِ تخصیص، و مناسکِ تقیید، و مشارعِ قیود، و شوارعِ مقصود، و جمعِ کلام، و نقدِ مرام، و فہمِ مراد کا نام ہے۔

کہ تطلعِ تام، و اطلاعِ عام، و نظرِ دقیق، و فکرِ عمیق، و طولِ خدمتِ علم، و ممارستِ فن، و تیقظِ وافی، و ذہنِ صافی، معتادِ تحقیق، مؤید بتوفیق کا کام ہے۔

اور حقیقۃً وہ نہیں مگر ایک نور کہ رب عز و جل بمحض کرم اپنے بندہ کے قلب میں القا فرماتا ہے:

وَ مَا یُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ مَا یُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ. (ص ۱۴. ابانة المتواری (۱۳۳۱ھ) مطبوعه بریلی)

آج جو لوگ فقہائے اسلام سے بے نیاز ہو کر اجتہاد کے دعویدار ہیں ان کا جائزہ لیجیے تو مذکورہ مراتب و مدارج کجا؟ صحیح عربی دانی کے حامل بھی نہ ملیں گے۔ چند مشکل آیات و احادیث اور اشعارِ عرب پیش کر کے دیکھیے، صحیح ترجمہ و تفہیم سے بھی قاصر نظر آئیں گے۔

فقہا و مجتہدین اسلام کے احکام اجتہادیہ اور مسائل مستنبطہ میں اگر اختلاف زمان و مکان اور ضرورت و حاجت وغیرہ کی بنیاد پر تغیر و تبدیلی کی جائے تو ایسا کرنا روا ہے مگر اس کے لئے مشق و ممارست اور درک مہارت رکھنے والے فقہائے اسلام ہی ماذون و مجاز ہیں اور یہ کام نہ ہر کس و ناکس کا ہے نہ عام علما و مفتیانِ کرام کا ہے۔ یہ ضابطہ فتاویٰ رضویہ جلد ا۔ میں اس طرح مذکور ہے۔

''اختلاف زمانہ، ضرورت، تعامل وغیرہ جن وجوہ سے قول دیگر پر فتویٰ مانا جاتا ہے وہ در حقیقت قولِ امام ہی ہوتا ہے۔''

''چھ باتیں ہیں جن سے قولِ امام بدل جاتا ہے۔ لہٰذا قولِ ظاہر کے خلاف عمل ہوتا ہے۔ اور وہ چھ باتیں (۱) ضرورت (۲) دفع حرج (۳) عرف (۴) تعامل (۵) دینی ضرورت و مصلحت کی تحصیل (۶) کسی فسادِ موجود یا مظنون بہ ظن غالب کا ازالہ۔ ان میں بھی حقیقۃً قولِ امام ہی پر عمل ہے۔''

جو حضرات تقلیدِ فقہی کو غیر ضروری بلکہ باطل قرار دیتے ہیں وہ عموماً دو قسم کے افراد ہوتے ہیں۔ (۱) مذہب و مسلک ابن حزم ظاہری و ابن تیمیہ حرانی کے متبعین و مقلدین (۲) جدید تعلیم یافتہ مگر علم دین سے نابلد طبقہ۔

پہلی قسم کے حضرات کا دعویٰ کچھ ہے اور عمل کچھ ہے۔ ان کی طرف سے ترک تقلید کا دعویٰ ہوتا ہے جب کہ عمل یہ ہے کہ وہ اپنے مذکورہ

ائمہ کے متبع نہیں بلکہ مقلدِ محض ہوتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے افراد اپنی تجدد پسندی اور روشن خیالی کے زعم میں ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو سنجیدہ کم اور مضحکہ خیز زیادہ ہوتی ہیں اور علم و بصیرت و فقہ و افتا سے ان کی دوری و نا آشنائی ایک ایک جملہ سے عیاں ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح کے افراد ائمہ مجتہدین پر طعن و تشنیع اور سوادِ اعظم کی تنقید و مذمت کر کے اختلاف و انتشارِ امت و ملت میں اضافہ کا سبب بننے کے سوا کچھ اور نہیں بن سکے ہیں۔ جس تقلید کے خلاف انھوں نے ہنگامہ خیزی و معرکہ آرائی کی اس سے الگ ہٹ کر انھوں نے کون سے کارنامے اور کون سی خدمات انجام دی ہیں اس کا بھی ساری امت کو علم ہے۔ مقلدین سے زیادہ اس طرح کے غیر مقلدین کتاب و سنت سے کتنے قریب اور ان پر کتنے عامل ہیں اور اپنی خواہشات و ہوائے نفس کو چھپانے کے لئے کس طرح وہ کتاب و سنت کی آڑ لیتے ہیں اس حقیقت سے بھی ساری امت مسلمہ شرق سے غرب تک اچھی طرح واقف و باخبر ہے۔

عام مسلمانوں کی بات ہی کیا ہے کہ انھیں ہر مسئلۂ شرعیہ میں کسی عالم دین کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور یہی حال عام علمائے کرام کا بھی ہے کہ انھیں جزئیاتِ فقہ پر مشتمل ان کتب فقہیہ کے مطالعہ پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جو مقلد علما و فقہا ہی نے تحریر فرمائی ہیں۔ معدودے چند حضرات جو براہِ راست اور ہمہ وقت فقہ و افتا سے وابستہ رہتے ہیں ان کا جائزہ لینے پر آخری طبقۂ مجتہدین یعنی اصحاب تمییز میں انھیں شمار کیا جانا بھی اتنا مشکل اور دقت طلب امر ہے کہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں سوادِ اعظم اور ان کے موجودہ علما و فقہائے صغار و کبار اگر تقلید فقہی کو اپنے حق میں لازم و واجب سمجھتے ہیں تو یہ ان کی عین سعادت و سلامت روی ہے۔ اور اسی میں امتِ مسلمہ کے لئے خیر و برکت و امن و عافیت و صلاح و فلاح بھی ہے۔ اس لئے سوادِ اعظم کو اسی جادۂ اعتدال و صراطِ مستقیم پر ہمیشہ گامزن رہنا چاہیے۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے:

اتبعوا السوادَ الاعظم فانه من شذ شذ فی النار. (ابن ماجه)

سوادِ اعظم کی پیروی کرو، کیوں کہ جو اس سے الگ ہوا وہ جہنم میں گیا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہم اہل سنت و جماعت کو اپنے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و خلفائے راشدین و صحابۂ کرام کی سنت کی اطاعت و اتباع اور ائمۂ مجتہدین کے نقوشِ قدم پر چلتے رہنے کی ہمیشہ توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

ڈاکٹر امجد رضا امجد☆

تقلید اُمّت کا اجماعی موقف

دررہ عشق وسوسۂ اہرمن بس است
ہشدار گوش دل بہ پیام سروش را

تقلید کو ہر زمانے میں امت کے اجماعی موقف کا درجہ حاصل رہا ہے، اس پر علوم دینیہ کی پوری تاریخ شاہد ہے یہی وجہ ہے کہ اس اجماعی موقف پر جب بھی کسی طبقے نے ''توحید خالص'' کے جوش احیا میں قدغن لگانا چاہا ہے اور اس سے انکار کی راہ اپنائی ہے تو اسے شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری میں جب فرقہ ظاہریہ کے امام ابوداؤد ظاہری نے تقلید سے انکار کا نظریہ اپنایا تو انہیں اہل سنت سے خارج قرار دیا گیا۔ چنانچہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں: ''داؤد ظاہری ومتابعانش را از اہل سنت شمردن در چہ مرتبہ از جہل وسفاہت است۔'' (النهي الاكيد عن الصلاة وراعدي التقليد: امام احمد رضا) چوتھی صدی میں علامہ ابن حزم نے تقلید سے انکار کیا تو ان کی کتابیں جلادی گئیں یا دریا برد کردی گئیں۔ کچھ اسی طرح آٹھویں صدی ھجری میں جب ابن تیمیہ اور ابن قیم نے تقلید پر کلام کیا تو ان کی بھی مخالفت ہوئی اور انہیں ''سیئ العقل'' اور الا ان فی عقله شيئا کہہ کرامت کو ان سے ہوشیار کردیا گیا۔

تقلید شخصی کی روایت یوں تو باضابطہ دوسری صدی میں قائم ہوئی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا رشتہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ،صحابہ سے جڑا ہوا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''لان الناس لم يزالوا من زمن الصحابة الى ان ظهرت المذاهب الاربعه يقلدون من اتفق من العلماء من غير نكير يعتبر انكاره ولو كان ذالك باطلا لانكروه یعنی'' عہد صحابہ سے ظہور مذاہب اربعہ تک علماء کرام میں سے جس پر بھی اتفاق ہوتا لوگ ان کی تقلید کرتے رہے۔ اور یہ عمل بغیر کسی اعتراض کے برابر جاری رہا اگر تقلید باطل ہوتی تو وہ لوگ ضرور اس کی مخالفت کرتے''

(عقد الجید ،ص:۳۳)

اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ نے تقلید کو الہام الٰہی سے تعبیر کیا ہے چنانچہ آپ غایۃ الانصاف ،ص ۶۷ رمیں فرماتے ہیں:

وبالجملة فالتمذهب للمجتهدين سر الهمه الله تعالىٰ العلماء وجمعهم عليه من حيث يشعرون ولايشعرون ۔ ''خلاصہ کلام یہ کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید ایک راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علمائے کرام کے دل میں ڈال دیا ہے''۔

حضرت شاہ صاحب قبلہ کی اس عبارت کو اگر بڑے کینوس پر پھیلا کر دیکھا جائے تو اس میں تقلید کی پوری عملی تاریخ سمٹی ہوئی نظر آئے گی جس کی تفصیل کتب اسماء الرجال اور دیگر معتمد کتب مثلاً الجواہر المضیہ ،تہذیب التہذیب ،تہذیب الاسماء واللغات للنووی، تذکرۃ الحفاظ، تاریخ بغداد، جامع البیان والعلم وفضلہ، مفتاح السعادہ، تاریخ الخلفاء للسیوطی، تاریخ ابن خلدون وغیرہ میں موجود ہے۔ حضرت شاہ صاحب کو ماننے کا دعویٰ کرنے کے باوجود عام غیر مقلدین ان کے نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ خیر القرون سے چوتھی صدی تک تقلید کا وجود نہیں تھا اور یہ کہ تقلید چوتھی صدی کی بدعت ہے مگر ان مذکورہ کتابوں میں یہ صراحت موجود ہے کہ چوتھی صدی سے قبل بھی امام معین اور مذہب متعین کی تقلید رائج تھی۔ اور اس وقت کے ان مقلدین میں جلیل القدر علماء مفسرین ،محدثین اور قاضی القضاۃ حضرات تک شامل تھے۔ تفصیل کے لئے ان کتابوں سے رجوع کریں۔

تقلید ائمہ اور اجماع امت :- خیر القرون سے ظہور مذاہب اربعہ تک امت میں کئی ایک مجتہد مطلق ہوئے اور ایک خاص مدت تک سبھوں کی تقلید ہوتی رہی جن میں حضرت امام اوزاعی المتوفی ۱۵۷ھ- حضرت امام ابن خزیمہ المتوفی ۳۱۱ھ، امام ابن جریر طبری اور حضرت امام ابوثور المتوفی ۲۴۰ھ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں- چنانچہ علامہ برہان الدین ابراہیم بن علی المالکی اپنی کتاب الدیباج المذہب میں اس تعلق سے تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

☆Idara Sharia, Sultanganj, Patna, Bihar

شام اور جزیرہ اندلس میں حضرت امام اوزاعی کا مذہب غالب تھا اور دو صدیوں کے بعد ان کا مذہب ختم ہوگیا اور وہاں امام مالک کا مذہب غالب آگیا۔ اور امام حسن بصری اور امام سفیان ثوری کے پیروکار زیادہ نہ تھے اور نہ ان کی تقلید کا زمانہ لمبا تھا بلکہ جلد ہی ان کا مذہب ختم ہوگیا۔ باقی رہے امام طبری اور امام ابوثور کے مقلد، تو یہ بھی زیادہ نہ تھے اور نہ ان کی تقلید کا زمانہ لمبا تھا اور امام ابوثور کے مقلد تیسری صدی کے بعد اور امام طبری کے پیروکار چوتھی صدی کے بعد ختم ہوگئے۔

اور پھر اس کے بعد بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی:

"بجز مذاہب اربعہ کے اور سارے مذاہب ختم ہوگئے تب انہیں مذاہب اربعہ کا اتباع سواد اعظم کا اتباع قرار پایا اور ان چاروں مذہب سے نکلنا سواد اعظم سے نکلنے کے مرادف ٹھہرا"۔ (عقد الجید، ص: ۳۸)

مذاہب اربعہ کی تقلید پر اجماع ہوجانے کی شہادت دیتے ہوئے حضرت شاہ پھر لکھتے ہیں: **هذه المذاهب الاربعه المدونة المحررة قد اجتمعت الامة او من يعتد بها منها علىٰ جواز تقليد ها الى يومنا هذا** یعنی تمام امت نے یا امت کے قابل اعتماد افراد نے مذاہب اربعہ مشہورہ کی تقلید کے جواز پر اجماع کرلیا ہے جو آج تک جاری ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ۔ ج: ۱، ص: ۲۳)

علامہ ابن خلدون نے ائمہ اربعہ میں تقلید کے انحصار اور اس پر اجماع امت کی حکمت بڑی وضاحت سے بیان کی ہے۔ چنانچہ وہ مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں:

دیار و امصار میں انہی ائمہ اربعہ کی تقلید منحصر ہوگئی اور ان کے سوا جو امام تھے ان کے مقلد ناپید ہوگئے۔ اور لوگوں نے اختلافات کے دروازے بند کردیئے اور چونکہ اصطلاحات علمیہ مختلف ہوگئیں اور لوگ مرتبہ اجتہاد تک پہنچنے سے رہ گئے اور اس امر کا اندیشہ پیدا ہوگیا کہ اجتہاد کے میدان میں غیر اہل لوگ نہ کود پڑیں اس لئے علمائے زمانہ میں جو محتاط تھے انہوں نے اجتہاد سے اپنا عجز ظاہر کردیا اور اس کے دشوار ہونے کی تصریح فرمادی اور انہی ائمہ مجتہدین کی تقلید کی رہنمائی کرنے لگے لوگ جن کے مقلد ہورہے تھے، اس لیے کہ کبھی ایک امام اور کبھی دوسرے امام کی تقلید کرنے میں دین کھلونا بن جاتا۔ اب صرف نقل مذہب رہ گیا اور بعد تصحیح اصول و اتصال سند بالروایہ ہر مقلد اپنے اپنے امام مجتہد کی تقلید کرنے لگا اور فقہ سے آج بجز اس امر کے کچھ اور مطلب نہیں۔ اور فی زمانہ مدعی اجتہاد مردود اور اس کی تقلید مہجور و متروک ہے اور اہل اسلام انہی ائمہ اربعہ کی تقلید پر گامزن ہوگئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب قبلہ بھی اس اجماع کو مصلحت سے تعبیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں جو پوشیدہ نہیں بالخصوص اس زمانہ میں کہ ہمتیں پست ہوگئیں اور انسانوں میں خواہشات کا غلبہ، اور ہر رائے والا اپنی رائے پر مغرور ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں: **وفى ذلک کلها من المصالح مالايخفىٰ لا سيما فى هذه الايام التى قصرت فيها الهمم جدا و اشربت النفوس الهوىٰ و اعجب كل ذى راى برايه.** (حجۃ اللہ البالغہ)

اجتہاد اور اس کے شرائط: ۔علامہ ابن خلدون اور شاہ صاحب قبلہ نے ائمہ اربعہ میں تقلید کے انحصار کی جو علت و مصلحت بیان کی ہے وہ عجز عن الاجتہاد ہے۔ یہاں فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر اجتہاد کے لئے کس علمی معیار کی ضرورت ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند کردیا گیا اور اس عہد کے بڑے بڑے فقہا و محدثین و علماء و مفسرین اور اولیاء کاملین میں بھی خود کو اجتہاد سے کنارہ کش رکھا اور تقلید ائمہ اربعہ میں ہی عافیت سمجھی۔ اس سلسلے میں اصول فقہ کی درسی اور متداول کتابوں مثلاً نور الانوار، مسلم الثبوت، فواتح الرحموت، التوضیح والتلویح، کتاب الملل والنحل اور منہاج الاصول وغیرہ میں پوری تفصیل موجود ہے۔ یہاں امام عبدالکریم شہرستانی المتوفی ۵۴۸ھ کی کتاب الملل والنحل ج ۱ سے حوالہ ملاحظہ کریں جس میں جامعیت کے ساتھ اجتہاد کی شرطیں بیان کردی گئی ہیں:

اجتہاد کی شرطیں یہ ہیں: (۱) بقدر ضرورت لغت عربیہ کی معرفت ہو اور الفاظ وضعیہ اور استعاریہ اور نص و ظاہر، عام و خاص، مطلق ومقید، مجمل و مفصل، فحوائے خطاب اور مفہوم کلام میں تمیز کرنے کی اہمیت ہو (۲) قرآن کریم کی تفسیر خصوصاً جو احکام سے متعلق ہے کی معرفت ہو (۳) پھر احادیث کی ان کی اسانید اور متون کے ساتھ معرفت اور ناقلین اور رواۃ کے احوال کی معرفت کا احاطہ ہو (۴) پھر حضرات صحابہ کرام تابعین تبع تابعین وغیرہم سلف صالحین کے اجماع کے مواقع کی معرفت تاکہ مجتہد کا اجتہاد اجماع کے خلاف نہ واقع ہو (۵) پھر قیاسات کے مواقع اور استقلال کی کیفیت اور ان میں غور و فکر کرنے کے مواقع کی شناسائی اور ہدایت ہو۔

شرائط اجتہاد میں امام احمد رضا کا موقف: ۔امام احمد رضا

بریلوی نے بھی اپنے رسالہ **الفضل الموھبی فی معنی اذا صح الحدیث فھو مذھبی** میں غیر مقلدین کا رد کرتے ہوئے انتہائی منضبط اور توضیحی انداز میں اجتہاد کے شرائط بیان فرمائے ہیں- اس سے جہاں مرتبہ اجتہاد کی عظمت و اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں خود امام احمد رضا کی فقہی بصیرت اور علم حدیث وفن اسماء الرجال میں مہارت کا پتہ چلتا ہے- چنانچہ آپ ان شرائط کو چار خانوں میں تقسیم کر کے اسے یوں بیان کرتے ہیں-

منزل اول :- نقد رجال کہ ان کے مراتب ثقہ وصدق وحفظ وضبط اور ان کے بارے میں ائمہ شان کے اقوال ووجوہ طعن ومراتب توثیق ومواضع تقدیم، جرح وتعدیل وحوامل طعن ومناشی توثیق ومواضع تحامل وتساہل وتحقیق پر مطلع ہو، استخراج مرتبہ اتقان راوی بنقد روایات وضبط مخالفات واوہام وخطیات وغیرہا پر قادر ہو، ان کے اسامی والقاب وکنی وانساب ووجوہ مختلفہ تعبیر رواۃ خصوصاً اصحاب تدلیس شیوخ وتعیین مبہمات ومتفق ومتفرق ومختلف ومؤتلف سے ماہر ہو، ان کے موالید ووفیات وبلدان ورحلات ولقاء وسماعات واساتذہ وتلامذہ وطرق تحمل ووجوہ اداوتدلیس وتسویہ وتغیر واختلاط وآخذین من قبل وآخذین من بعد وسامعین حالین وغیرہا تمام امور ضروریہ کا حال اس پر ظاہر ہو— ان سب کے بعد صرف سند حدیث کی نسبت اتنا کہہ سکتا ہے کہ صحیح یا حسن یا صالح یا ساقط یا باطل یا معضل یا مقطوع یا مرسل یا متصل ہے-

اس کے بعد دوسری منزل اس طرح بیان کی:

منزل دوم:- صحاح وسنن ومسانید وجوامع ومعاجیم واجزا وغیرہا کتب احادیث میں اس کے طرق مختلفہ والفاظ متنوعہ پر نظر تام کرے کہ حدیث کے تواتر یا شہرت یا فردیت نسبیہ یا غرابت مطلقہ یا شذوذ یا نکارت واختلافات، رفع ووقف وقطع ووصل ومزید فی متصل الاسانید اضطرابات سند ومتن وغیرہا پر اطلاع پائے- نیز اس جمع طرق واحاطۂ الفاظ سے رفع ابہام ودفع اوہام وایضاح خفی واظہار مشکل وابانت مجمل وتعیین محتمل ہاتھ آئے ولہٰذا امام ابوحاتم رازی فرماتے ہم جب تک حدیث کو ساٹھ وجہ سے نہ لکھتے اس کی معرفت نہ پاتے- اس کے بعد اتنا حکم کر سکتا ہے کہ حدیث شاذ یا منکر معروف یا محفوظ مرفوع یا موقوف فرد یا مشہور کس مرتبہ کی ہے- منزل سوم کے تعلق سے فرمایا:

منزل سوم:- اب علل خفیہ وغوامض دقیقہ پر نظر کرے جس پر صدہا سال سے کوئی قادر نہیں- اگر بعد احاطۂ وجوہ اعلال تمام علل سے منزہ پائے تو یہ تین منزلیں طے کر کے صرف صحت حدیث بمعنی مصطلح اثر پر حکم لگا سکتا ہے- تمام حفاظ حدیث واجلہ نقادونا واصلان ذروۂ شاقہ اجتہاد کی رسائی صرف اس منزل تک ہے .... برادران باانصاف انہیں منازل کی دشواری دیکھیں جس میں ابوعبداللہ حاکم جیسے محدث جلیل القدر پر کتنے عظیم شدید مواخذے ہوئے- امام ابن حبان جیسے ناقد بصیر تساہل کی طرف نسبت کیے گئے- ان دونوں سے بڑھ کر امام اجل ابوعیسیٰ ترمذی تصحیح وتحسین میں متساہل ٹھہرے- امام مسلم جیسے جبل رفیع نے بخاری وابوزرعہ کے لوہے مانے-

چوتھی منزل کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

باقی رہی **منزل چہارم** اور تو نے کیا جانا کیا ہے منزل چہارم، سخت ترین منازل دشوار ترین مراحل جس کے سائر نہیں مگر اقل قلائل اس کی قدر کون جانے؎

گدائے خاک نشینی تو حافظا مخروش
کہ نظم مملکت خویش خسرواں دانند

اس کے لیے واجب ہے کہ جمیع لغات عرب وفنون ادب ووجوہ تخاطب وطرق تفاہم واقسام نظم وصنوف معنی وادراک علل وتنقیح مناط واستخراج جامع وعرفان مانع وموارد تعدیہ ومواضع قصر ودلائل حکم آیات واحادیث واقاویل صحابہ وائمہ فقہ قدیم وحدیث ومواقع تعارض واسباب ترجیح ومناہج توفیق ومدارج دلیل ومعارک تاویل ومسالک تخصیص ومناسک تقیید ومشارع قیود وشوارح مقصود وغیر ذلک پر اطلاع تام ووقوف عام ونظر غائر وذہن رفیع وبصیرت ناقدہ وبصر منیع رکھتا ہو-

امام احمد رضا مذکورہ منازل پر گفتگو کے بعد امام شیخ الاسلام زکریا انصاری کا یہ قول نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ کہاں یہ شرائط اور کہاں یہ لوگ؟ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ایاکم ان تبادروا الی الانکار علی قول مجتھد او تخطیئہ الا بعد احاطتکم بادلۃ الشریعۃ بمعرفتکم بمعانیھا وطرقھا یعنی خبردار مجتہد کے کسی قول پر انکار یا اسے خطا کی طرف نسبت نہ کرنا جب تک شریعت مطہرہ کی تمام دلیلوں پر احاطہ نہ کر لو، جب تک تمام لغات عرب جن پر شریعت مشتمل ہے پہچان نہ لو جب تک ان کے معانی اور ان کے راستے جان نہ لو- واین لکم بذالک بھلا کہاں تم اور کہاں یہ

احاطہ (الفضل الموہبی ص ۱۴، بحوالہ میزان الشریعۃ الکبریٰ)

ان شرائط کو لکھنے کے بعد امام احمد رضا نے لکھا ہے کہ جو شخص ان چاروں منازل کو طے کر جائے وہ بھی مجتہد مطلق نہیں مجتہد فی المذہب ہے۔ جیسے مذہب حنفی میں امام ابو یوسف، امام محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہما ــــ اور یہ حضرات بھی بایں جلالت شان اصول میں امام اعظم کے متبع اور مقلد ہیں اور اگرچہ بعض مسائل میں انہوں نے امام اعظم سے اختلاف کیا ہے مگر بقول امام ابو یوسف:

ماخالفته فی شئ قط فتدبرته الارأیت مذهبه الذی ذهب الیه انجیٰ فی الآخرة و کنت ربما ملت الی الحدیث فکان هو ابصر بالحدیث الصحیح منا ۔ یعنی کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں نے کسی مسئلے میں امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خلاف کر کے غور کیا ہو مگر یہ کہ انہیں کے مذہب کو آخرت میں زیادہ وجہ نجات پایا اور بارہا ہوتا کہ میں حدیث کی طرف جھکتا پھر تحقیق کرتا تو امام مجھ سے زیادہ حدیث صحیح کی نگاہ رکھتے تھے۔ (الفضل الموہبی، ص ۱۵)

علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمحتار میں بعض اکابر فقہا کی نسبت تصریح کی کہ یہ حضرات مخالف مذہب درکنار روایات مذہب میں ایک کو راجح بتانے کے اہل نہیں ۔ چنانچہ کتاب الشہادت باب القبول میں ہے **ابن الشحنه لم یکن من اهل الاختیار** ۔ کتاب الزکوۃ باب صدقۃ الفطر میں ہے **البهنسی لیس من اصحاب التصحیح** کتاب النکاح باب الحضانہ میں ہے **صاحب النهر لیس من اهل الترجیح** بلکہ اکابر ارکین مذہب مثلاً امام کبیر علامہ خصاف، امام اجل علامہ ابو جعفر طحاوی، امام ابوالحسن کرخی، امام شمس الائمہ حلوانی، امام شمس الائمہ سرخسی، امام فخر الاسلام علی بزدوی، امام فخر الدین قاضی خاں، امام ابوبکر رازی، امام ابوالحسن قدوری، امام برہان الدین مرغینانی وغیرہ کے متعلق علامہ ابن کمال پاشا کے حوالہ سے نقل کیا کہ **انهم لا یقدرون علی شئ من المخالفة لافی الاصول ولا فی الفروع** (الفضل الموہبی ص ۱۶)

اب تقلید کے مخالفین ہی غور کریں کہ جب ان علوم وفنون کی جامع شخصیتوں کا علم بھی اجتہاد کے باب میں علی فرق مراتب ناکافی ہے تو وہ افراد جو ان عظیم فقہاء کے شاگردانِ شاگرد کی شاگردی اور کفش برداری کی بھی اہلیت نہیں رکھتے وہ کس طرح مجتہد ہونے کا دعویٰ کرتے اور امت کے اجماعی موقف سے انحراف کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ امت کے جن فقہاء ومحدثین ومفسرین نے تقلید کو اختیار کیا اور امام معین کی پیروی کی وہ اجتہاد کی حقیقت اور اس راہ کی دشواریوں سے واقف تھے۔ خشیت الٰہی سے ان کا دل لبریز تھا اس لیے انہوں نے اپنے علم پر غرور کرنے کی بجائے اجتہاد سے اپنے عجز کا اعتراف کیا اور تقلید کی طرف راجع ہو گئے، جیسا کہ علامہ ابن خلدون کے حوالہ سے گزرا۔ اس سلسلے میں ایک اور حوالہ امام شعرانی کی کتاب ''میزان الشریعہ الکبریٰ'' سے ملاحظہ کریں۔ غیر مقلدین کے پیشوا میاں نذیر حسین دہلوی نے اپنے ایک فتویٰ میں حضرت امام شعرانی کے بارے میں لکھا ہے کہ ''بے شک جو منصف مزاج ہے وہ امام شعرانی کے منصب کامل اجتہاد میں شک نہیں کرسکتا''، وہی علامہ شعرانی خود تقلید کے تعلق سے اپنا نظریہ واضح کرتے ہوئے میزان الشریعۃ الکبریٰ میں فرماتے ہیں:

یجب علی المقلد العمل بالارجح من القولین فی مذهبه مادام لم یصل الیٰ معرفة هذا المیزان من طریق الذوق والکشف کماعلیه عمل الناس فی کل عصر یعنی مقلد پر واجب ہے کہ خاص اسی بات پر عمل کرے جو اس کے مذہب میں راجح ٹھہری ہو۔ ہر زمانے میں علماء کا اسی پر عمل رہا ہے۔ (انتھی الاکید، ص ۴۳)

وہی امام شعرانی امام الحرمین، حجۃ الاسلام غزالی وکیاہراسی وابن سمعانی وغیرہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنے شاگردوں کو ایک امام معین کی تقلید کی تعلیم دی اور یہ بھی فرمایا کہ اگر امام معین کے مذہب سے عدول کروگے تو خدا کے حضور تمہارے لیے کوئی عذر نہ ہوگا۔ چنانچہ آپ کے الفاظ ہیں:

بـه صرح امام الحرمین و ابن سمعانی و الغزالی و الکیاهراسی و غیرهم و قالوا لتلامیذهم یجب علیکم التقلید بمذهب امامکم و لاعذرلکم عند الله تعالیٰ فی العدول عنه (الفضل الموہبی، ص ۴۱)

اگر تقلید کے تعلق سے دوسری صدی ہجری سے لے کر آج تک عالم اسلام کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں میں اکثریت مقلدین کی رہی ہے اور آج بھی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمے میں

لکھتے ہیں کہ ''حضرت امام ابوحنیفہ کے مقلد اس وقت عراق، ہندوستان ،چین، ماوراء النہر اور عجم کے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں'' اسی طرح علامہ شکیب ارسلان فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت حضرت امام ابوحنیفہ کی مقلد ہے یعنی سارے ترک اور بلقان کے مسلمان روس اور افغانستان کے مسلمان چین کے مسلمان ہندوستان اور عرب کے اکثر مسلمان شام وعراق کے اکثر مسلمان فقہ میں حنفی مسلک کے حامل ہیں اور شام کے بعض اور حجاز، یمن، حبشہ، جاوا، انڈونیشیا اور کردستان کے مسلمان حضرت امام شافعی کے مقلد ہیں اور مغرب کے مسلمان مغربی اور وسط افریقہ کے مسلمان اور مصر کے کچھ لوگ حضرت امام مالک کے مقلد ہیں اور عرب کے بعض مسلمان اور شام کے بعض باشندے جیسے نابلس اور دومہ کے رہنے والے حضرت امام بن حنبل کے مقلد ہیں''۔ (حاشیہ حسن المساعی)

ان ممالک میں پھیلے ہوئے جلیل القدر مقلد علما ،فقہاء، مفسرین، محدثین، اور مورخین کی فہرست بنائی جائے جن کے تفصیلی حالات طبقات مفسرین ،طبقات المحدثین، طبقات الفقہا، طبقات المورخین، طبقات حنفیہ، طبقات شافعیہ، طبقات حنابلہ، الدیباج المذہب، الجواہر المضیہ اور الفوائد البہیہ میں مذکور ہیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے- تحقیق کے لئے ان کتابوں سے رجوع کیا جائے-

نظریہ تقلید اور ہندوستانی علماء ومشائخ:- عالم اسلام میں تقلید کی عہد بہ عہد تاریخ اس کی ضرورت مصلحت اور دیگر تفصیلات سے قطع نظر جہاں تک ہندوستان کے فقہا ،صوفیہ، علماء اور مفسرین ومحدثین کے تقلیدی نظریات کی بات ہے تو اس سلسلے میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں یہ حقیقت صاف دیکھی جاسکتی ہے کہ انگریزوں کے دور استعمار سے قبل ہندوستان میں غیر مقلدیت کا وجود تک نہ تھا- یہ وبا انگریزوں کے ساتھ ہی ہندوستان میں داخل ہوئی - یہاں اس تعلق سے اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف چند اشارے ملاحظہ فرمائیں:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حوالے سے مختلف عبارتیں اس سے پہلے گزر چکیں کہ وہ تقلید کے حامی تھے اور محض علم نہیں کشف کے ذریعہ انہیں اطمینان کرا دیا گیا تھا کہ مذہب حنفی عمدہ طریقہ اور سنت صحیحہ کے موافق ہے چنانچہ شاہ صاحب اپنی کتاب فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں:

عرفنی رسول اللہ ﷺ ان فی المذہب الحنفی طریقۃ انیقۃ ھی اوفق الطرق بالسنۃ المعروفۃ التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابہ . یعنی مجھے رسول اکرم ﷺ نے بتایا کہ مذہب حنفی عمدہ طریقہ ہے جو ہمارے سنت کے موافق ہے اور جسے امام بخاری وغیرہ کے زمانے میں وضاحت سے جمع کیا گیا-

یہی وجہ تھی کہ آپ نے حنفی مذہب کی حمایت کی اور لوگوں کو اسی پر عامل ہونے کی تعلیم بھی دی اور غیر مقلدیت کے فتنے سے لوگوں کو آگاہ بھی کیا- چنانچہ آپ اپنی کتاب عقد الجید ص ۳۶ پر لکھتے ہیں:

فی الاخذ بھذہ المذاھب الاربعۃ مصحلۃ عظیمۃ وفی الاعراض عنھا مفسدۃ کبیرہ . یعنی ان چاروں مذاہب کے اختیار کرنے میں ایک عظیم مصلحت اور غیر مقلدیت میں بڑا فساد ہے۔

ہندوستان کے ایک جلیل القدر عالم مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی ایک تحریر میں شاہ صاحب کے بیان کردہ اس فساد کی پوری تفصیل موجود ہے چنانچہ مولانا فرنگی محلی اپنی کتاب الآثار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ میں لکھتے ہیں:

ولعمری افساد ھولاء الملاحدۃ وافساد اخوانھم الاصاغر المشھورین بغیر المقلدین الذین سموا انفسھم باھل الحدیث وشتان مابینھم وبین اھل الحدیث قد شاع فی جمیع بلاد الھند وبعض بلاد غیر الھند وخربت بہ البلاد ووقع النزاع والعناد فالی اللہ المشتکی والیہ المتضرع والملتجیٰ بدأ الاسلام غریبا وسیعود غریبا فطوبیٰ للغربا ولقد کان حدوث مثل ھولاء المفسدین والملحدین فی الازمنۃ السابقۃ فی ازمنۃ السلطنۃ الاسلامیہ غیر مرۃ فقابلتھم اساطین الملۃ وسلاطین الامۃ باالصوارم الملکیہ واجروا علیھم الجوازم المنفیۃ فاندفعت فتنتھم بھلاکھم ولما لم تبق فی بلاد ھند فی اعصارنا سلطنۃ اسلامیہ ذات شوکۃ وقوۃ عمت الفتن واوقعت عباد اللہ فی المحن انا للہ وانا الیہ راجعون- یعنی مجھے اپنی زندگی کے خالق کی قسم غیر مقلدین کا فساد برپا کرنا مشہور ہے جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہلاتے ہیں- انہیں محدثین سے کیا تعلق؟ یہ لوگ پورے ہندوستان اور بعض دیگر ممالک میں پھیل چکے ہیں اور ان کی فسادی ذہنیت کی وجہ سے ان ممالک میں فساد ونزاع واقع ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف شکوہ اور عاجزی والتجا ہے-

اسلام کی ابتدا بھی غربت میں ہوئی اور یہ غربت کی طرف ہی لوٹے گا پس غربا کے لیے خوشخبری ہے- بے شک ایسے مفسد وملحد زمانہ گذشتہ میں بھی ظاہر ہوئے لیکن اکابر ملت اور امت کے بادشاہوں نے ان سے قتال کیا اور اس فتنہ کو نابود کر دیا مگر ہمارے زمانے میں جبکہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت ہی باقی نہ رہی تو یہ فتنے عام ہو گئے اور ان کے فتنوں نے اللہ کے بندوں کو مشقتوں میں ڈال دیا-

خود غیر مقلدین کے مشہور عالم محمد حسین بٹالوی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ جو لوگ مجتہد مطلق ہونے کا دعوی کرتے اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر میں بے دین ہو جاتے ہیں- چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

پچیس برس کے تجربے سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں۔ کفر وارتداد اور فسق کے اسباب دنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں مگر دینداروں کے بے دین ہو جانے کے لئے بے علمی کے ساتھ ترک تقلید بڑا بھاری سبب ہے۔ (خیر التنقید ص ۶)

ہندوستان کی اسلامی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ عہد برطانوی عدم تقلید کے حامل علماء کی مسلسل کاوشوں کا عہد ہے اور اس فرقے نے انگریزی حکومت ہی کے سہارے ہندوستان میں اپنے اثرات بد قائم کرنے شروع کئے، جس کے توڑ کے لئے قدرت نے اس عہد میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا جیسی شخصیت کو پیدا فرمایا، جنھوں نے اپنی ۶۴/ سالہ زندگی میں دیگر علمی، ملی اور مذہبی خدمات کے ساتھ، علمی و عقلی محاذ پر نظریہ تقلید کی بھی مدافعت کا حق ادا کر دیا اور اپنی تحریری کاوشوں سے پوری اسلامی دنیا میں بیداری کی لہر پیدا فرما دی۔ اس سلسلے میں آپ کا مجموعہ فتاویٰ (فتاویٰ رضویہ) اور بعض رسائل مثلاً:

(۱) الفضل الموهبي في معنى اذا صح الحديث فهو مذهبي
(۲) النهي الاكيد عن الصلاة وراء عدى التقليد
(۳) النير الشهابي على تدليس الوهابي
(۴) السهم الشهابي على خداع الوهابي
(۵) البارقة الشارقة على معركة المشارقة
(۶) سيف المصطفىٰ على اديان الافتراء
(۷) نشاط السكين على حلق البقر السمين
(۸) المقالة المسفرة عن احكام البدعة المكفرة

اہل تحقیق وطالب حق کے لئے خصوصیت سے قابل توجہ ہیں- آپ کے بعد آپ کے جلیل القدر تلامذہ وخلفاء نے آپ کے مشن کو آگے بڑھایا، اہل توہب کی سازشوں کی نقاب کشائی کی، فتنۂ غیر مقلدیت کے استیصال کے لئے تحریری وتقریری ہر طرح کی جد جہد کی، جس کا حسین ثمرہ ہے کہ آج بھی اس ملک میں مقلدین کی غالب اکثریت ہے- غیر مقلدین حضرات عصبیت سے خالی الذہن ہو کر تھوڑی دیر کے لئے اپنے امام ابن تیمیہ کے قول: اما اجماع الامةفهو في نفسه حق لاتجتمع الامةعلى الضلالة پر غور کریں تو یقیناً انہیں قبولیت حق میں مدد ملے گی اور امت مسلمہ کے درمیان سے ایک بڑا فساد ختم ہو جائے گا-

☆☆☆

محمد سلمان رضا ازہری☆

تقلید کی مُخالفت

ایک علمی و تحقیقی جائزہ

کائنات خلقت کی بوقلمونی: -اس عالم رنگ و بو میں مختلف الخلقت اشیاء پائی جاتی ہیں، خدائے قدوس نے انہیں حسن و جمال سے آراستہ فرمایا ہے-ان کے اندر مراتب و درجات کی کارفرمائی ہے- پہلا درجہ جمادات کا ہے، جن کے اندر نمو کی قوت پائی جاتی ہے نہ ہی احساس و ادراک کی صلاحیت، اس کے بعد نباتات کا مرتبہ ہے، جو بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت تو ضرور رکھتے ہیں، مگر احساس کی قوتوں سے محروم ہوتے ہیں، ان کے اندر ادراک کی قوت نہیں پائی جاتی ہے، وہ ارادی طور پر حرکت کرنے سے عاجز ہوتے ہیں، اس کے بعد حیوانات کا درجہ ہے، جو حساس اور متحرک بالا رادہ ہوتے ہیں، اس کے بعد انسان کا مرتبہ و مقام ہے جو احساس و ادراک کی قوتوں سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ فکر و تدبر کی صلاحیتوں سے بھی سرفراز ہوتے ہیں، جو مجہولات کو ترتیب دے کر معلومات کی بلندیوں پر کمند ڈالنے کی استطاعت رکھتے ہیں-

لیکن اس موقع پر ایک سوال ذہن و فکر کی دہلیز پر دستک دیتا ہے کہ کیا ہر انسان کی قوت فکر ایک درجہ کی ہوتی ہے یا پھر ان میں تفاوت ہوتا ہے؟ کیا ہر انسان مجہولات سے معلومات تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ یا پھر ان میں ایک دوسرے کے دست نگر و محتاج ہوتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ انسان مختلف الاذہان ہوتے ہیں، بعض اپنی فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر چاند کی بلندیوں پر پہنچ کر عیش و راحت کے لیے محل تعمیر کرنے کی سعی پیہم کر رہے ہیں اور بعض اس ہموار زمین پر چلنے کی بھی طاقت نہیں رکھتے - انسان کے افراد میں بعض ذہانت و فطانت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہو کر دوسروں کے لیے رشد و ہدایت کی شمعیں فروزاں کرتے ہیں اور بعض غباوت و سفاہت کی تیرگی میں رہ کر نہ صرف اپنی تباہی کے سامان پیدا کرتے ہیں بلکہ دوسروں کی بھی ہلاکت و بربادی کے اسباب فراہم کرتے ہیں- کچھ اپنی ذکاوت و ذہانت کے باعث گردش لیل و نہار، کواکب و نجوم کی انجمن آرائی اور بزم کہکشاں کا مشاہدہ کر کے خالق کائنات کا پتہ لگا لیتے ہیں اور بعض ایسے یتیم العقل ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے دلائل و براہین کے انبار بھی بے سود ہوتے ہیں-اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر انسان میں یہ صلاحیت نہیں پائی جاتی کہ وہ علوم و معارف کے بحر مواج میں غوطہ زن ہو کر اس کی پنہائیوں سے حکمت و معرفت کے آبدار موتیوں کو برآمد کر سکے، بہ لفظ دیگر ہر انسان قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے مسائل شرعیہ کے استنباط و استخراج کی صلاحیت و قدرت نہیں رکھتا ہے، ہر شخص اجتہاد کے مرتبہ عظمیٰ پر فائز ہونے کی طاقت و قوت نہیں رکھتا ہے- یہی وجہ ہے کہ جمہور علمائے کرام مسائل فرعیہ میں ہر شخص پر نظر و اجتہاد کو واجب و لازم نہیں کرتے ہیں- لیکن اسی ربع سکون پر مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی پایا جاتا ہے، جو عامۂ ناس کو اجتہاد کا مکلف بنانے پر اصرار بے جا کر رہا ہے- اس کا خیال خام یہ ہے کہ ہر مسلمان کے اندر قرآن و حدیث کے فہم و ادراک کی صلاحیتیں موجود ہیں، ان کو سمجھنے کے لیے وہ ائمہ کرام کے محتاج نہیں ہیں، اس کا کہنا ہے کہ جس طرح صحابہ کرام اور تابعین عظام ایک دوسرے کی تقلید نہیں کیا کرتے تھے-اسی طرح اس دور کے مسلمانوں کو بھی کسی کی تقلید نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ تقلید ناجائز و حرام ہے- گویا کہ یہ گروہ عوام الناس کو ''شتر بے مہار'' جیسی زندگی گزارنے کا تصور دے رہا ہے- رہ گیا اس کا یہ دعویٰ کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام ایک دوسرے کی تقلید نہیں کیا کرتے تھے- تو یہ بے مقدار کاتب الحروف- ان شاء اللہ- آئندہ صفحات پر اس کے رخ سے نقاب اٹھانے کی پوری کوشش کرے گا اور انہیں کی تحریر سے ثابت کرے گا-

تقلید کی تعریف اور مکاتب فکر: -اس گروہ کی خامہ تلاشی اور اس کے نظریہ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے سے قبل اصطلاح کے اعتبار سے تقلید کی تعریف سے آگاہ ہونا از حد ضروری ہے، ساتھ ہی یہ بھی جاننا لازم ہے کہ تقلید کا مجال کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں اب تک کتنے مکاتب

☆Jamia Azhar,Islamic Foreign Students City,Al-Abbasia,Cairo, Egypt

فکر عالم وجود میں آئے ہیں؟ تا کہ اس نو پید فرقہ کی حقیقت آفتاب نصف النہار کے مانند روشن و آشکار ہو جائے۔ تقلید کی تعریف کرتے ہوئے علمائے اصولیین فرماتے ہیں: ''**ھو أخذ قول الغیر من غیر معرفة دلیله**'' (اصول الفقہ الاسلامی ۲/۴۰۱، الاحکام للآمدی ۳/۱۶۶ وغیرہما) یعنی تقلید کا مفہوم یہ ہے کہ غیر کے قول کو اس کی دلیل کی معرفت کے بغیر اپنانا اور اس پر عمل کرنا۔ جمہور علمائے کرام کے نزدیک عقائد اور ان مسائل میں تقلید جائز نہیں ہے، جن کا ثبوت دلائل قطعیہ سے ہے۔ البتہ بعض گمراہ فرقے ان میں بھی تقلید کو جائز قرار دیتے ہیں اور بعض تو واجب کہتے ہیں اور نظر و اجتہاد کو ناجائز و حرام ٹھہراتے ہیں (المستصفی ۱۲۳/۲، الاحکام للآمدی ۳/۱۶۷)۔ رہ گئے وہ مسائل فرعیہ جن کا ثبوت دلائل ظنیہ سے ہوتا ہے تو ان میں تقلید کے سلسلہ میں علماء تین گروہ میں منقسم نظر آتے ہیں اور یہی تقلید ہمارے مقالہ کا محور ہے۔

(۱) پہلا گروہ ظاہریہ، معتزلہ بغداد اور اکثر امامیہ کا ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص پر اجتہاد لازم و ضروری ہے اور تقلید ناجائز و حرام ہے۔ چنانچہ ابن حزم ظاہری تحریر کرتے ہیں ''**التقلید کله حرام فی جمیع الشرائع، أولها عن آخرها، من التوحید والنبوة، والقدر والایمان والوعید والامامة والمفاضلة و جمیع العبادات و لأحکام**'' (الاحکام فی اصول الاحکام ۶/۸۶۱)

(۲) اور دوسرا گروہ حشویہ اور تعلیمیہ کا ہے، جو عدم جواز کا قائل ہے، اس کا کہنا ہے کہ ائمہ مجتہدین کے زمانہ کے بعد اب کسی کے لیے اجتہاد جائز نہیں ہے، بلکہ سب پر تقلید واجب ہے (اصول الفقہ الاسلامی ۲/۱۴۰۷، المستصفی ۲/۱۲۳)۔

(۳) اور تیسرا گروہ اعتدال پسندوں کا ہے، بہ لفظ دیگر علمائے اہل سنت و جماعت کا ہے، جن کا نظریہ یہ ہے کہ اجتہاد ناجائز و حرام نہیں ہے کہ جو اجتہاد کی استطاعت و قدرت رکھتے ہوں ان کو بھی اس سے محروم کر کے ان پر تقلید کو واجب و ضروری قرار دے دیا جائے۔ ہاں! جو اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے خواہ وہ عالم ہی کیوں نہ ہوں، ان پر تقلید واجب ہے (اصول الفقہ الاسلامی ۲/۴۰۷، الاحکام للآمدی ۳/۱۷۰، المستصفی ۲/۱۲۴ وغیرہما)۔

تقلید کے بارے میں شیخ ابن تیمیہ کی رائے: ۔ ان تینوں مکاتب فکر کے آراء و نظریات کو ملاحظہ کرنے کے بعد شاید ہی کوئی عاقل یہ قول کرنے میں تردد کا شکار ہو کہ پہلا اور دوسرا گروہ افراط و تفریط سے خالی نہیں اور تیسرا گروہ اعتدال کی راہ پر گامزن ہے، اس نے ہر انسان کو اجتہاد کا مکلّف بنا کر تکلیف مالا یطاق نہیں دیا ہے اور نہ ہی ہر شخص کے لیے تقلید کو واجب و لازم گردان کر اجتہاد کی اہلیت و صلاحیت رکھنے والوں کو اس سے محروم کیا ہے۔ اس لیے جو حضرات اجتہاد کی استطاعت نہیں رکھتے ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مجتہدین عظام کی تقلید کریں۔ البتہ جو صاحب استطاعت ہیں ان پر تقلید حرام ہے۔ شیخ ابن تیمیہ جمہور علمائے اہل سنت کے نظریہ کو اجاگر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''**والذی علیه جماهیر الأمة، أن الاجتهاد جائز فی الجملة، والتقلید جائز فی الجملة، لا یوجبون الاجتهاد علی کل أحد ویحرمون التقلید، ولا یوجبون التقلید علی کل أحد ویحرمون الاجتهاد، وأن الاجتهاد جائز للقادر علی الاجتهاد، والتقلید جائز للعاجز عن الاجتهاد، فأما القادر علی الاجتهاد فهل یجوز له التقلید؟ هذا فیه خلاف، والصحیح أنه یجوز حیث عجز عن الاجتهاد**'' (**مجموعة الفتاویٰ ۱۰/۲۰/۱۱۲**)

یعنی جمہور امت کے نزدیک اجتہاد بھی جائز ہے اور تقلید بھی، وہ نہ تو ہر شخص پر اجتہاد کو واجب اور تقلید کو حرام کرتے ہیں، اور نہ ہی ہر شخص پر تقلید کو واجب اور اجتہاد کو حرام کرتے ہیں، جو اجتہاد کی قدرت و استطاعت رکھتا ہے، اس کے لیے اجتہاد جائز ہے اور جو اجتہاد سے عاجز ہے، اس کے لیے تقلید جائز ہے، لیکن جو شخص اجتہاد پر قادر ہے، اس کے لیے تقلید جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، مگر صحیح یہ کہ جہاں وہ اجتہاد سے عاجز ہو وہاں اس کے لیے بھی تقلید جائز ہے۔

تقلید کی جھوٹی تاریخ اور اس پر تعقب: ۔ شمس و امس کی طرح واضح ہو گیا کہ جمہور جس راہ پر چل رہے ہیں وہی صراط مستقیم ہے، لیکن کچھ لوگ ظاہریہ، معتزلہ بغداد اور امامیہ کے افکار و نظریات سے متاثر ہو کر ہر کس و ناکس کو مجتہد بنانے کی مہم چلا رہے ہیں، انہیں کے آراء و نظریات کو عام کرنے کی سعی لا حاصل کر رہے ہیں اور انہیں کے پر فریب دلائل کا سہارا لے کر بہ الفاظ دیگر انہیں کی تقلید کا پٹہ گلے میں ڈال کر عوام کو خواہشات نفس کا بندۂ بے دام بنانے کی ناپاک کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہم اسلاف کے طریقہ پر عمل پیرا ہیں، جس طرح

وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے، اسی طرح ہم بھی کسی کی تقلید کے قائل نہیں ہیں- کیونکہ تقلید کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں شروع ہوا ہے - چنانچہ سلفی مذہب کے متحرک و فعال اور سرگرم رکن قاضی شوکانی صاحب تحریر کرتے ہیں: ان التقليد لم يحدث الا انقراض خير القرون، ثم الذين يلونهم ، ،ثم الذين يلونهم، و ان حدوث التمذهب بمذاهب الأئمة الأربعة، انما كان بعد انقراض عصر الأئمة الأربعة، و انهم كانو اعلى نمط من تقدمهم من السلف فى هجر التقليد ، و عدم الاعتدادبه، و ان هذه المذاهب انما أحدثها عوام المقلدة لانفسهم من دون أن ياذن بها امام من الأئمة المجتهدين "- (القول المفید فی ادلۃ الاجتہاد والتقلید ص:/ ۱۰۸)

یعنی تقلید کا سلسلہ ائمہ اربعہ کے زمانہ کے بعد شروع ہوا، جبکہ ائمہ اربعہ سلف کے طریقہ پر تھے، یعنی تقلید نہیں کرتے تھے اور ان مذاہب کو عام مقلدوں نے اپنے لیے ائمہ مجتہدین کی اجازت کے بغیر اختیار کر لیا ہے-

شوکانی صاحب کی یہ بات کہ " تقلید کا سلسلہ ائمہ اربعہ کے بعد شروع ہوا ہے" -ان کے نظریہ کے مطابق قابل عمل تو درکنار لائق اعتناء بھی نہیں ہے- کیوں کہ ان کے قول کو دلائل کی پشت پناہی حاصل نہیں ہے- لہٰذا ان کے قول کو بلا دلیل مان لینا گویا ان کی تقلید کرنا ہے جو ان کی نگاہ میں سرتاسر ناجائز و حرام ہے، اس لیے ان کی یہ بات نہ صرف یہ کہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک غیر معتبر ہے بلکہ خود ان کے " مقلدین" کو بھی اس پر عمل نہیں کرنا چاہیے- علاوہ ازیں دلائل و شواہد اس کے خلاف شہادت دے رہے ہیں- چنانچہ شوکانی صاحب کے ہم نوا و ہم خیال ابن قیم صاحب اپنی کتاب میں کچھ ایسے واقعات صحابہ کرام و تابعین عظام کے ذکر کیے ہیں، جو خود ان کے اور شوکانی صاحب کے نظریہ پر بجلی بن کر گرتے ہیں اور طرفہ تو یہ ہے کہ ابن قیم صاحب نے اس پر اپنا تعقب بھی نہیں پیش کیا ہے، جس سے ان کی عاجزی و درماندگی نمایاں ہے:

ابن قیم کا اعتراف حقیقت کہ صحابہ تقلید کرتے تھے: -چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:" ولما كان على رضى الله عنه با ليمن أتاه ثلاثة نفر يختصمون فى غلام، فقال كل منهم: هوا بنى، فاقرع على بينهم، فجعل الولد للقارع وجعل للرجلين ثلثى الدية ، فبلغ النبى صلى الله تعالىٰ عليه وسلم فضحك حتى بدت نوا جذه من قضاء على رضى الله عنه"(اعلام الموقعين ۱/۱۶۴ فصل: الصحابة مجتهدون و يقسيون)

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ جب یمن میں تھے، تو ان کی بارگاہ میں تین اشخاص ایک بچہ کے سلسلہ میں اختلاف کر کے حاضر ہوئے اور ہر شخص اسے اپنا بیٹا کہہ رہا تھا تو آپ نے ان کے درمیان قرعہ اندازی کی اور جس کا نام نکلا بچہ کو اسی کے حوالہ کر دیا، البتہ اس سے دیت کا ثلث حصہ لیا اور ان لوگوں کو دے دیا، جب اس فیصلہ کی خبر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا-

ابن قیم صاحب کی اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس مسئلہ میں کوئی آیت ملی اور نہ ہی کوئی حدیث، اسی لیے انہوں نے اجتہاد فرمایا اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا اور جب اس کی خبر نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کو ملی تو آپ نے انکار نہیں فرمایا- بلکہ رضا کا اظہار فرما- اس سے واضح ہوتا ہے کہ زمانہ رسالت میں صحابہ کرام اجتہاد فرمایا کرتے تھے اور جو حضرات اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے وہ دوسروں کی تقلید کیا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نہ تو اجتہاد سے منع فرماتے اور نہ ہی تقلید کو حرام قرار دیتے-

اور ابن قیم صاحب رقم طراز ہیں:" واجتهد سعاد بن معاذ فى بنى قريظة، وحكم فيهم باجتهاده فصوبه النبى صلى الله عليه وسلم و قال:' لقد حكمت فيهم بحكم الله من فوق السموات والارض" (اعلام الموقعين ۱/۱۶۴ فصل: الصحابة مجتهدون و ليقيسو)

یعنی حضرت سعاد بن معاذ نے بنو قریظہ کے اندر اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی تصویب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ تم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے-

اس روایت سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجتہاد فرماتے تھے اور جن کے اندر اجتہاد کی استطاعت نہیں ہوتی تھی وہ ان کی تقلید کیا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس کی خبر تھی مگر آپ نے اجتہاد و تقلید سے منع نہیں فرمایا- ابن قیم صاحب نے شوکانی صاحب کے ہم خیال ہونے کے باوجود ان کے علاوہ اور بہت سی روایات کو سپرد قرطاس کیا ہے جن سے اہل سنت و جماعت کے موقف

کی تائید وتوثیق ہوتی ہے-(ملاحظہ ہواعلام الموقعین ۱/۱۶۳،۱۶۴فصل: الصحابۃ یجتہدون ویقیسون) لہٰذا شوکانی صاحب کا یہ دعویٰ کہ "تقلید کا آغاز ائمہ اربعہ کے بعد ہوا" ہباءً منثورا ہو گیا-

ابن قیم کی تلوار شوکانی صاحب کی گردن پر: -سلفی مذہب کی نشرواشاعت میں شوکانی صاحب کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے، انہوں نے "کشت غیر مقلدیت" کو اپنے خون پسینہ سے سیراب کیا ہے اوراس کی سرسبزی وشادابی کے لیے اپنی حیات مستعار کو صرف کر دیا، اور تقلید کی مخالفت کے جذبات کی رو میں بہ کراتنے حواس باختہ ہو گئے کہ جو آیات کریمہ کفار ومشرکین کی مذمت میں وارد ہوئی تھیں، ان کو بڑی بے باکی کے ساتھ ائمہ مجتہدین کی تقلید کرنے والے مسلمانوں پر چسپاں کر دیا-مثلاً اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(۱) **واذا قیل لهم اتبعوا ما أنزل الله قالوا بل نتبع ماألفینا علیه آباء نا أو لو کان آباؤ هم لا یعقلون شیئا و لا یهتدون**"-(سورۃ البقرۃ ۱۷۰) ترجمہ: اور جب ان سے کہا جائے، اللہ کے اتارے پر چلو، تو کہیں، بلکہ ہم تو اس پر چلیں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا، کیا اگر چہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں نہ ہدایت (کنز الایمان)

(۲)"**وکذلک ماأرسلنا من قبلک فی قریة من نذیر الاقال مترفو ها انا و جدنا أباء نا علی أمة و انا علی آثارهم مقتدون، قال أو لو جئتکم باهدی مماو جدتم علیه أباء کم**"(**سورۃ الزخرف ۲۳، ۲۴**) ترجمہ:-اور ایسے ہی ہم نے تم سے پہلے جب کسی شہر میں کوئی ڈر سنانے والا بھیجا، وہاں کے آسودوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم ان کی لکیر کے پیچھے ہیں، نبی نے فرمایا اور کیا جب بھی کہ میں تمہارے پاس وہ لاؤں جو سیدھی راہ ہو اس سے جن پر تمہارے باپ دادا تھے-(کنز الایمان)

(۳) **واذا قیل لهم تعالوا الی ماأنزل الله والی الرسول قالوا حسبنا ما و جدنا علیه آباء نا**" (سورۃ المائدۃ ۱۰۴) ترجمہ: اور جب ان سے کہا جائے آؤ اس طرف جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف، کہیں ہمیں وہ بہت ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا (کنز الایمان)

ان آیات کو شوکانی صاحب نے تقلید کی مذمت پر استدلال کرتے ہوئے پیش کیا ہے اور تقلید کے رد وابطال میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے-مگر انہیں کے ہم خیال ابن قیم صاحب عدل وانصاف کے گلے پر چلتی ہوئی چھری دیکھ کر برداشت نہ کر سکے اور ان کی ساری کدوکاوش پر پانی پھیرتے ہوئے صاف لفظوں میں لکھا کہ ان آیات کریمہ میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو احکام خداوندی پر عمل نہ کر کے اپنے آباء واجداد کی پیروی کیا کرتے تھے، جو نہ کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید کرتے ہیں، کیونکہ یہ تقلید تو اجر وثواب کا باعث ہے-چنانچہ وہ ان آیات کو نقل کر کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: **انه سبحانه ذم من أعرض عما أنزله الی تقلید الآباء، وهذا القدر من التقلید هو ما اتفق السلف والأئمة الأربعة علی ذمه وتحریمه، واما تقلید من بذل جهده فی اتباع ما انزل الله وخفی علیه بعضه فقلد فیه من هو أعلم منه فهذا محمود غیر مذموم مأجور غیر مأزور**"-(اعلام الموقعین ۲/۴۳۸)

یعنی اس میں کوئی دورائے نہیں کہ خدائے قدوس نے اس شخص کی مذمت کی ہے، جس نے اپنے آباء واجداد کی تقلید کی اور اس کے نازل کردہ احکامات سے روگردانی کی-اسی تقلید کی حرمت ومذمت پر ائمہ کرام وسلف صالحین متفق ہیں-البتہ جس نے احکام خداوندی کی تحقیق وتلاش میں پوری کوشش صرف کر دی اور صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکا اور اس نے اپنے اس اعلم وافضل کی تقلید کر لی تو یہ محمود ہے، مذموم نہیں-اس پر وہ اجر وثواب کا مستحق ہوگا نہ کی گناہ کا-

ابن قیم صاحب کی اس عبارت سے واضح ہوا کہ سلف صالحین اور ائمہ کرام نے جس تقلید کی مذمت وحرمت پر اتفاق واجماع کیا ہے وہ انسان کا خدائے قدیر کے احکام سے چشم پوشی کر کے اپنے آباء واجداد کی تقلید کرنا ہے نہ کی مجتہدین عظام کی پیروی کرنا ہے-لہٰذا شوکانی صاحب نے سلفی ہونے کے باوجود ان آیات کو تقلید ائمہ پر چسپاں کر کے اسلاف کے اجماع واتفاق سے اختلاف کیا اور خرق اجماع کے جرم کا ارتکاب کیا جو بہر حال ایک سنگین جرم ہے-

شوکانی صاحب کا قابل دید اضطراب: -علمائے اہل سنت و جماعت نے اپنے نظریہ کو دلائل وبراہین سے آراستہ کیا ہے، جو منصف مزاج اور اعتدال پسند حضرات کے دل ودماغ میں اترتے چلے جاتے ہیں اور انہیں صراط مستقیم کی ہدایت ورہنمائی کرتے نظر آتے ہیں-مگر جو ظاہر یہ

معتزلہ بغداد اور امامیہ کے زلفوں کے اسیر ہو چکے ہیں، اور ان کی تقلید کا پٹہ اپنے گلے میں ڈال کر انہیں کو اپنا ماوی و ملجا تسلیم کر لیے ہیں، وہ ان دلائل واضحہ کی ایسی ''پولیوزدہ تاویل'' کرتے ہیں کہ ادنی ذہن وفکر کا مالک ان کی عقل و دانش کا مذاق اڑانے پر مجبور ہو جاتا ہے- مثال کے طور پر علمائے اہل سنت و جماعت تقلید کے وجوب پر استدلال کرتے ہوئے قرآن کریم کی یہ آیت شریفہ پیش کرتے ہیں- قال تعالی: "فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون" (سورۃ النحل ۴۳) ترجمہ: تو اے لوگو! علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں- (کنزالایمان)

اس آیت مبارکہ میں خدائے قدیر نے اپنے ان بندوں کو اہل علم سے دریافت کرنے کا حکم دیا ہے جو زیور علم سے مزین نہیں ہیں، اس سے تقلید کا ثبوت ہوتا ہے، اس لیے غیر مقلدوں کے پیر مغاں قاضی شوکانی صاحب نے اپنے اجتہاد کی ساری قوتوں کو سمیٹ کر بحر توجیہ و تاویل میں کود پڑے اور کشتی غیر مقلدیت کو غرق ہونے سے بچانے کے لیے اپنی سی کوشش کر ڈالی- وہ لکھتے ہیں: ''اس آیت کا نزول خاص سوال کے بارے میں ہوا ہے، جیسا کہ آیت کا سیاق دلالت کر رہا ہے، ابن جریر، بغوی اور اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ ان مشرکین کے رد میں نازل ہوئی ہے، جو حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرتے تھے اور اگر بالفرض ہم یہاں پر سوال عام مراد لے لیتے ہیں، تب بھی (مقلدین کو) مقصود حاصل نہیں ہوگا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ''اہل الذکر'' سے سوال کرنے کا حکم دیا ہے اور ''ذکر'' سے مراد صرف قرآن کریم اور احادیث نبویہ ہیں- لہٰذا صرف اہل قرآن و حدیث سے سوال جائز ہوگا- (ترجمہ ملخصا القول المفید فی ادلۃ الاجتہاد والتقلید ص: ۷)

شوکانی صاحب کی یہ تاویل کتنی مضحکہ خیز ہے وہ محتاج بیان نہیں، کیونکہ اصول میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ خصوصی سبب کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، بلکہ عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے، مگر آں جناب جذبات کی رو میں اس قدر بہہ گئے کہ اصول وضوابط کے بندھنوں کو توڑ دیا تاکہ کسی طرح غیر مقلدیت کی کشتی کو ڈوبنے سے بچا سکیں، لیکن ناکامی مقدر تھی، اس لیے کامیاب نہ ہو سکے، اور یہاں پر تو کہہ دیا کہ سوال خاص ہے، بہ لفظ دیگر خصوص سبب کا اعتبار ہے نہ کی عموم لفظ کا، لیکن جب تقلید کے رد پر قرآن سے استدلال کیے تو چونکہ ان آیات کا نزول کفار کے بارے میں ہوا تھا، اس لیے انہوں نے ان آیات میں عموم لفظ کا اعتبار کیا اور خصوص سبب سے نگاہیں موڑ لیں، گویا کہ وہ اپنے بنائے ہوئے اصول کی زنجیر میں اس طرح جکڑ گئے کہ اس سے چھٹکارا پانا ان کے لیے محال ہو گیا، چنانچہ وہ آیات جو کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئی تھیں، ان کو مسلمانوں پر منطبق کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: "وهي وان كان تنزيلها في الكفار، لكنه قد صح تأويلها في المقلدين لا تحاد العلة، وقد تقرر في الأصول أن الاعتبار بعموم اللفظ لا بخصوص السبب، وأن الحكم يدور مع العلة وجوداً وعدماً،، (القول المفيد ٢٥)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ائمہ کرام کے بنائے ہوئے اصولوں کی تقلید نہ کرنے کی وجہ سے عالم کہلانے والے بلکہ مجتہد گردانے جانے والے اضطراب کا شکار ہو کر ٹھوکریں کھا کھا کر گر رہے ہیں تو عام لوگوں کو اگر مطلق العنان بنا دیا جائے تو پھر ان کا کیا حال ہوگا؟

قاضی شوکانی صاحب زبردست ٹھوکر کھانے کے بعد کہتے ہیں کہ ''اگر بالفرض سوال کو عام مان لیا جائے، تب بھی مقصود حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ ''اہل الذکر'' سے مراد اہل قرآن و اہل حدیث ہیں'' - خدا جانے شوکانی صاحب نے اہل قرآن اور اہل حدیث سے کیا مراد لیا ہے؟ یہ تو ان کے ''مقلدین'' ہی بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے اس سے ان خاص فرقوں کو مراد لیا ہے جو ''اہل قرآن'' اور ''اہل حدیث'' کے نام سے مشہور ہیں یا پھر وہ لوگ مراد ہیں جو قرآن و حدیث کا علم رکھتے ہیں؟

اور ان سے مسائل کے استخراج واستنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ بہر حال اگر پہلی شق کو اختیار کرتے ہیں تو اس کا واضح مفہوم یہ ہوگا کہ غیر مقلدین سے سوال کرو، اور اس پر عمل کر کے ان کی تقلید کرو، گویا شوکانی صاحب ائمہ کرام کی تقلید سے روک کر لوگوں کو اپنا مقلد بنانے کی سعی و کوشش کر رہے ہیں اور اگر شق ثانی کو اپناتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ائمہ کرام و مجتہدین عظام قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتے تھے؟ کتاب اللہ کو سمجھنے کی صلاحیت ان کے اندر نہیں تھی؟ احادیث نبویہ کے فہم وادراک کی قوتوں سے خالی تھے؟ بہ لفظ دیگر احادیث کی روایت و درایت سے نابلد تھے؟ میرے خیال میں ابتدائی درجات کا ایک غبی طالب علم بھی یہ قول کرتے ہوئے شرمائے گا- لہٰذا روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ '' أهل الذكر'' سے مراد وہ علمائے ربانیین ہیں جو مرتبہ اجتہاد پر فائز ہوئے اور انہیں کی تقلید کی جائے گی نہ کہ، ان ہلاکت زدہ

معتزلہ بغداد اور امامیہ کے زلفوں کے اسیر ہو چکے ہیں، اور ان کی تقلید کا پٹہ اپنے گلے میں ڈال کر انہیں کو اپنا ماوی و ملجا تسلیم کر لیے ہیں، وہ ان دلائل واضحہ کی ایسی ''پولیوزدہ تاویل'' کرتے ہیں کہ ادنی ذہن و فکر کا مالک ان کی عقل و دانش کا مذاق اڑانے پر مجبور ہو جاتا ہے- مثال کے طور پر علمائے اہل سنت و جماعت تقلید کے وجوب پر استدلال کرتے ہوئے قرآن کریم کی یہ آیت شریفہ پیش کرتے ہیں- قال تعالی: ''فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون'' (سورۃ النحل ۴۳) ترجمہ: تو اے لوگو! علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں- (کنز الایمان)

اس آیت مبارکہ میں خدائے قدیر نے اپنے ان بندوں کو اہل علم سے دریافت کرنے کا حکم دیا ہے جو زیور علم سے مزین نہیں ہیں، اس سے تقلید کا ثبوت ہوتا ہے، اس لیے غیر مقلدوں کے پیر مغاں قاضی شوکانی صاحب نے اپنے اجتہاد کی ساری قوتوں کو سمیٹ کر بحر توجیہ و تاویل میں کود پڑے اور کشتی غیر مقلدیت کو غرق ہونے سے بچانے کے لیے اپنی سی کوشش کر ڈالی- وہ لکھتے ہیں: ''اس آیت کا نزول خاص سوال کے بارے میں ہوا ہے، جیسا کہ آیت کا سیاق دلالت کر رہا ہے، ابن جریر، بغوی اور اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ ان مشرکین کے رد میں نازل ہوئی ہے، جو حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرتے تھے اور اگر بالفرض ہم یہاں پر سوال عام مراد لے لیتے ہیں، تب بھی (مقلدین کو) مقصود حاصل نہیں ہوگا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ''اہل الذکر'' سے سوال کرنے کا حکم دیا ہے اور ''ذکر'' سے مراد صرف قرآن کریم اور احادیث نبویہ ہیں- لہٰذا صرف اہل قرآن و حدیث سے سوال جائز ہوگا- (ترجمہ ملخصا القول المفید فی ادلۃ الاجتہاد والتقلید ص: ۷)

شوکانی صاحب کی یہ تاویل کتنی مضحکہ خیز ہے وہ محتاج بیان نہیں، کیونکہ اصول میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ خصوصی سبب کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، بلکہ عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے، مگر آں جناب جذبات کی رو میں اس قدر بہہ گئے کہ اصول و ضوابط کے بندھنوں کو توڑ دیا تاکہ کسی طرح غیر مقلدیت کی کشتی کو ڈوبنے سے بچا سکیں، لیکن ناکامی مقدر تھی، اس لیے کامیاب نہ ہو سکے، اور یہاں پر تو کہہ دیا کہ سوال خاص ہے، بہ لفظ دیگر خصوص سبب کا اعتبار ہے نہ کی عموم لفظ کا، لیکن جب تقلید کے رد پر قرآن سے استدلال کیے تو چونکہ ان آیات کا نزول کفار کے بارے میں ہوا تھا، اس لیے انہوں نے ان آیات میں عموم لفظ کا اعتبار کیا اور خصوص سبب سے نگاہیں موڑ لیں، گویا کہ وہ اپنے بنائے ہوئے اصول کی زنجیر میں اس طرح جکڑ گئے کہ اس سے چھٹکارا پانا ان کے لیے محال ہو گیا، چنانچہ وہ آیات جو کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئی تھیں، ان کو مسلمانوں پر منطبق کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: ''وهي وان كان تنزيلها في الكفار، لكنه قد صح تأويلها في المقلدين لا تحاد العلة، وقد تقرر في الأصول أن الاعتبار بعموم اللفظ لا بخصوص السبب، وأن الحكم يدور مع العلة وجوداً وعدماً،، (القول المفيد ۲۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ائمہ کرام کے بنائے ہوئے اصولوں کی تقلید نہ کرنے کی وجہ سے عالم کہلانے والے بلکہ مجتہد گردانے جانے والے اضطراب کا شکار ہو کر ٹھوکریں کھا کھا کر گر رہے ہیں تو عام لوگوں کو اگر مطلق العنان بنا دیا جائے تو پھر ان کا کیا حال ہوگا؟

قاضی شوکانی صاحب زبردست ٹھوکر کھانے کے بعد کہتے ہیں کہ'' اگر بالفرض سوال کو عام مان لیا جائے، تب بھی مقصود حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ ''اہل الذکر'' سے مراد اہل قرآن و اہل حدیث ہیں''- خدا جانے شوکانی صاحب نے اہل قرآن اور اہل حدیث سے کیا مراد لیا ہے؟ یہ تو ان کے ''مقلدین'' ہی بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے اس سے ان خاص فرقوں کو مراد لیا ہے جو ''اہل قرآن'' اور ''اہل حدیث'' کے نام سے مشہور ہیں یا پھر وہ لوگ مراد ہیں جو قرآن و حدیث کا علم رکھتے ہیں؟

اور ان سے مسائل کے استخراج و استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ بہر حال اگر پہلی شق کو اختیار کرتے ہیں تو اس کا واضح مفہوم یہ ہوگا کہ غیر مقلدین سے سوال کرو، اور اس پر عمل کر کے ان کی تقلید کرو، گویا شوکانی صاحب ائمہ کرام کی تقلید سے روک کر لوگوں کو اپنا مقلد بنانے کی سعی و کوشش کر رہے ہیں اور اگر شق ثانی کو اپناتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ائمہ کرام و مجتہدین عظام قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتے تھے؟ کتاب اللہ کو سمجھنے کی صلاحیت ان کے اندر نہیں تھی؟ احادیث نبویہ کے فہم و ادراک کی قوتوں سے خالی تھے؟ بہ لفظ دیگر احادیث کی روایت و درایت سے نابلد تھے؟ میرے خیال میں ابتدائی درجات کا ایک غبی طالب علم بھی یہ قول کرتے ہوئے شرمائے گا- لہٰذا روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ ''اھل الذکر'' سے مراد وہ علمائے ربانیین ہیں جو مرتبہ اجتہاد پر فائز ہوئے اور انہیں کی تقلید کی جائے گی نہ کہ، ان ہلاکت زدہ

-أنها عامة فی کل أولی الأمر من الأمراء والعلماء کماتقدم"(تفسیر ابن کثیر ا/ ۵۱۸)

یعنی علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ "اولوالامر" سے فقہاء اور ائمہ دین مراد ہیں اور یہی مجاہد، عطا، حسن بصری اور ابو العالیہ کا قول ہے اور ظاہر یہ ہے- واللہ اعلم- کہ یہ امراء وعلماء دونوں کو شامل ہے جیسا کہ گزر چکا ہے-

شیخ ابن تیمیہ کی رائے: -اور ابن قیم کے استاذ گرامی شیخ ابن تیمیہ رقم طراز ہیں: قد أو جب الله طاعة الرسول علی جمیع الناس فی قریب من أربعین موضعا من القرآن ،وطاعته طاعة الله، وهی عبادة الله وحده لاشریک له، وذلک هو دین الله وهو الاسلام، وکل من امر الله بطاعته من عالم وامیر ووالد وزوج، فلأن طاعته طاعة الله"

(مجموعة الفتاوی ۱۰/۱۹/۱۴۱)

یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں تقریباً چالیس مقامات پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت وفرماں برداری کو تمام لوگوں پر واجب قرار دیا ہے اور ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور اللہ کی اطاعت اس وحدہ لاشریک کی عبادت وبندگی ہے اور یہی دین اسلام ہے اور ہر اس شخص کی پیروی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے جس کی اطاعت کا خدائے قدیر نے حکم دیا ہے، خواہ وہ عالم ہو یا امیر، والد ہو یا شوہر-

شوکانی صاحب زبردست تناقض کے شکار: -شیخ ابن تیمیہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ کرام ومجتہدین عظام کی تقلید درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے حبیب علیہ التحیۃ والثناء ہی کی اطاعت وفرمانبرداری ہے، کوئی الگ شئ نہیں ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ شوکانی صاحب نے "اولوالامر" کی تفسیر میں جابر بن عبداللہ اور مجاہد کے قول کو راجح قرار دیا ہے، جنہوں نے اس سے علماء مراد لیا ہے- ساتھ ہی اس جسارت سے ان کا منہج تفسیر بھی اجاگر ہوتا ہے وہ یہ کہ "چند اقوال میں جو ان کے نزدیک راجح ہوتا ہے، اس کو وہ مقدم رکھتے ہیں" جیسا کہ انہوں نے "أولی الأمر" کی تفسیر میں "ائمہ" کو مقدم کرکے اسی کو راجح بتایا ہے- لیکن حیرت ہے کہ جب وہ تقلید کے رد وابطال پر کمر بستہ ہوئے ہیں تو وہ جسے "فتح القدیر" میں راجح قرار دے چکے تھے، اسی کو "القول المفید" میں مرجوح بتانے کی کوشش کررہے ہیں- چنانچہ وہ مقلدین کا رد کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں "ومن جملة ما استدلوا به قوله تعالی: " اطیعوا الله و اطیعو الرسول واولی الأمرمنکم" وقالوا: وأولو الأمر، هم العلماء ،اطاعتهم تقلید هم فیما یفتو به، والجواب: أن للمفسرین فی تفسیر " أولی الأمر" قولین أحدهما: أنهم الأمراء والثانی: أنهم العلماء ولاتمنع ارادة الطائفتین من الأیة الکریمة، ولکن أین هذا من الدلالة علی مراد المقلدین، فانه لاطاعة للعلماء ولا للأمراء الا إذا أمروا بطاعة الله علی وفق شریعته، والا فقد ثبت عنه صلی الله تعالیٰ علیه وسلم أنه قال: لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق"(القول المفید ص: ۲۸)

یعنی جواز تقلید کے قائلین اس آیت کریمہ (اطیعوا اللہ......) سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اولوالامر" سے علماء مراد ہیں اور ان کی اطاعت ان کی تقلید ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ "اولوالامر" کے سلسلہ میں مفسرین کرام کے دو قول ہیں- ایک یہ کہ اس سے امراء مراد ہیں، اور دوسرا یہ کہ اس سے علماء مراد ہیں اور آیت کریمہ میں دونوں گروہوں کو مراد لیا جاسکتا ہے- مگر مقلدین کو اس سے ان کا مقصد کہاں حاصل ہورہا ہے؟ کیونکہ علماء اور روساء کی تقلید واطاعت اسی صورت میں ہے- جبکہ وہ شریعت کے مطابق خدائے قدوس کی اطاعت کا حکم دیں، اس لیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ حدیث ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت و فرمانبرداری جائز نہیں ہے-

شوکانی صاحب کی اس عبارت سے دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں:-

(ا) آیت کریمہ میں "اولی الامر" سے امراء وسلاطین کا مراد لینا راجح ہے اور علماء وائمہ کا مراد لینا مرجوح ہے، کیونکہ انہوں نے یہاں پر مفسرین کرام کے اقوال کو ذکر کرتے ہوئے، اسی کو مقدم رکھا ہے، اور "فتح القدیر" کے حوالہ سے ان کا منہج ظاہر ہو چکا ہے کہ ان کے نزدیک جو بات راجح ہوتی ہے، اس کو مقدم کرتے ہیں، جیسا کہ "فتح القدیر" میں انہوں نے "ائمہ" کو مقدم کرکے کہا تھا کہ یہی راجح ہے- ظاہر ہے شوکانی صاحب "اولی الامر" کی تفسیر میں راجح اور مرجوح کے تعین میں زبردست تناقض وتضاد کے شکار ہو گئے ہیں، اس کو ان کا کوئی "نیازمند مقلد" ہی دور کرسکتا ہے-

(۲) شوکانی صاحب نے کھلے لفظوں میں اعتراف کرلیا کہ ائمہ کرام اگر شریعت غراء کی روشنی میں مسئلہ بتائیں تو ان کی تقلید جائز ہوگی اور اگر اسلام کے خلاف کوئی فکر سنائیں، جس سے معصیت لازم آئے تو تقلید ناجائز وحرام ہوگی- لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ائمہ کرام و مجتہدین عظام شریعت کے خلاف احکام بیان کرتے تھے؟ کیا خدائے وحدہ لاشریک کی معصیت و نافرمانی کا حکم دیتے تھے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہ شوکانی صاحب کی طرف سے فقہائے اسلام پر افترا پردازی اور بہتان تراشی ہے، جو کم از کم ان کے شایان شان نہیں، کیونکہ وہ اپنے ''علاقہ'' میں مجتہد گمان کیے جاتے ہیں، علاوہ ازیں ابن قیم کے بارے میں آپ کون سا فتویٰ صادر کریں گے؟ جو ائمہ کرام کی تقلید کو ماں باپ کی اطاعت سے افضل بتا رہے ہیں- اور اگر نفی میں جواب دیتے ہیں تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ آپ نے تقلید کے ردوابطال کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:- اس موقع پر شوکانی صاحب کا کوئی گرویدہ اور نادیدہ عاشق ان کی تقلید کے جذبہ سے سرشار ہوکر یہ کہے کہ مجتہد سے کبھی کبھار اجتہاد میں غلطی بھی ہوتی تھی- لہٰذا جو شخص ان کی تقلید اس مسئلہ میں کرے، جس میں خطا واقع ہوئی ہے، جو شریعت کے خلاف ہے تو گویا کہ وہ معصیت میں تقلید کر رہا ہے، جو ناجائز وحرام ہے-

اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ تعصب و تنگ نظری کی ''وادی تیہہ'' سے باہر نکل کر عدل و انصاف کا عینک لگا کر شیخ ابن تیمیہ کی مندرجہ ذیل عبارت کا گہری نظر سے مطالعہ کریں، حقیقت چلچلاتی دھوپ کی طرح آشکار ہو جائے گی، وہ تحریر کرتے ہیں: **واجتهاد العلماء فی الأحکام کاجتهاد المستدلین علی جهة الکعبة، فاذا صلی اربعة انفس کل واحد منهم بطائفة الی اربع جهات لاعتقادهم ان القبلة هناک، فان صلاة الاربعة صحیحة، والذی صلی الی جهة الکعبة واحد، وهو المصیب الذی له اجران**"- (مجموعۃ الفتاوی ۱۰/۲۰/۱۲۵)

یعنی احکام شرعیہ میں علمائے کرام کا اجتہاد جہت کعبہ کے سلسلہ میں اجتہاد کرنے والوں کی طرح ہے- اگر چار افراد نے چار مختلف جہتوں میں ایک ایک جماعت کے ساتھ نماز ادا کی، اس اعتقاد کے ساتھ کہ قبلہ ادھر ہی ہے تو سب کی نماز صحیح ہوگی، حالاں کہ جہت کعبہ میں ایک ہی نماز ادا کر رہا ہے جو مصیب ہے- جس کے لیے دو اجر ہیں-

اور ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں: **والعالم اذا أفتی المستفتی بما لم یعلم المستفتی انه مخالف لامر الله، فلا یکون المطیع له عاصیاً، واما اذا علم انه مخالف لامر الله فطاعته فی ذلک معصیة الله**" (مجموعۃ الفتاویٰ ۱۰/۱۹/۱۴۱)

یعنی جب عالم نے استفتاء کرنے والے کو ایسا فتویٰ دیا جس کے بارے میں سائل یہ نہیں جانتا ہے کہ یہ احکام خدا کے مخالف ہے، تو اس عالم کی تقلید کرنے والا گنہگار نہیں ہوگا- البتہ مستفتی کو اگر اس بات کا علم ہے کہ یہ شریعت کے مخالف ہے تو ایسی صورت میں اس عالم کی تقلید کرنے والا گنہگار ہوگا-

شیخ ابن تیمیہ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ مقلد کو اگر اس بات کا علم ہے کہ مجتہد سے اس مسئلہ میں غلطی واقع ہوگئی ہے، اس کے باوجود وہ تقلید کر رہا ہے تو وہ گنہگار ہوگا، ہاں اگر وہ اس کے بارے میں نہیں جانتا ہے اور تقلید کر رہا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، بلکہ وہ اجر وثواب کا مستحق ہوگا-

خلاصہ بحث:- غیر مقلدین اس کے علاوہ چند اور لایعنی دلائل کا سہارا لیتے ہیں اور عوام الناس کو ورغلانے کی لاحاصل جدوجہد کرتے ہیں، اگر ان سب کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ کیا جائے تو ان کی حقیقت صدائے بازگشت کے سوا کچھ نہ ہوگی، مگر راقم الحروف اسی پر اکتفا کرتا ہے-

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عامہ ناس پر تقلید واجب وضروری ہے اور ساتھ ہی وہ علمائے کرام جو درجہ اجتہاد تک نہیں پہنچ سکے، ان کے لیے بھی تقلید ضروری ہے، البتہ جو صاحب اجتہاد ہیں، ان کے لیے تقلید حرام ہے، انہیں لوگوں کو ائمہ کرام نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے نہ کہ عوام الناس کو تقلید سے روکا ہے، جیسا کہ ابن قیم اور شوکانی اور ان کے مقلدین گمان کرتے ہیں اور تقلید کے بطلان پر ان کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں- چنانچہ علامہ زرکشی صاحب تحریر فرماتے ہیں: **هذا الذی قاله ممنوع، وانما منعوا المجتهد خاصة عن تقلید هم دون من لم یبلغ هذه الرتبة**" (البحر المحیط ۶/۲۸۰)

یعنی جو یہ کہا گیا ہے کہ ائمہ کرام نے اپنی تقلید سے عوام الناس کو روکا ہے، یہ صحیح نہیں، بلکہ انہوں نے خاص مجتہدین کو منع فرمایا ہے-

☆☆☆

ذیشان احمد مصباحی☆

تقلید سے اجتہاد تک

اگر میں خود کو مقلد کہوں تو مجھے اندر سے اچھا نہیں لگے گا کہ عقل و شعور ہوتے ہوئے میں دوسرے کا متبع بن جاؤں؟ اور اگر یہ کہوں کہ مجتہد ہوں تو میرا ضمیر میرے جھوٹ پر مجھے ملامت کرے گا- موجودہ دنیا میں تقلید واجتہاد کی ساری لڑائی دراصل انہی دو احساسات کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے- جنہیں ضمیر کی ملامت پسند نہیں وہ بخوشی اس کمتر احساس کو قبول کر لیتے ہیں کہ میں دوسرے کا متبع ہوں، اور جن کی انا ما تحتیت کے لیے کسی طور پر راضی نہیں ہوتی انہیں ناچار ضمیر کی ملامت برداشت کرنی پڑتی ہے-

تقلید واجتہاد کی بحث بار بار چھڑنے کی ایک بنیادی وجہ ان کے صحیح مفہوم سے ناواقفی بھی ہے- یہ ناواقفی عموماً مقلدین وغیر مقلدین دونوں میں پائی جاتی ہے- مقلدین مسئلہ تقلید کے تعلق سے بسا اوقات یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ائمہ مجتہدین کا قد فقہ اور تدبر میں ہم سے بہت بلند تھا، اتنا بلند کہ ان کی ہر بات ہمارے لیے حرف آخر ہے اور اب ہمیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ تقلید جامد ہے جو غلط ہے، گویا جس مقصد کے لیے فقہ کی تدوین ہوئی تھی (بدلتے حالات میں شریعت کی تطبیق اور نو پیدا مسائل کا اصولی حل) اب وہ اسی کے منکر ہو جاتے ہیں- غیر مقلدین تقلید کو قرآن وحدیث کے مقابل ایک الگ مصدر شریعت سمجھتے ہیں، اسی لیے مقلدین کے حوالے سے ان کی لن ترانیاں اشراک فی الدین تک پہنچ جاتی ہیں-

اجتہاد کا مفہوم بھی عموماً ذہنوں میں گڈمڈ ہو جاتا ہے، اجتہاد کے لغوی معنی کوشش کرنے کے ہیں- دین کے حوالے سے اس کا مفہوم مسائل شریعت معلوم کرنے کے لیے قرآن وسنت میں گہرا تدبر اور غور و فکر کرنا ہے- اس معنی میں تمام محدثین ومفسرین اور طالبین علوم شریعت مجتہد ہیں، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے طور پر قرآن وحدیث میں غور وفکر کرتا ہے، اجتہاد کا ایک تیسرا مفہوم بھی ہے اور وہ ہے غیر منصوص مسائل کا حکم جاننے کے لیے کتاب وسنت میں غور کرنا اور کتاب و سنت سے ان کی نظیر تلاش کر کے فیصلہ صادر کرنا- حضرت معاذ ابن جبل کا مشہور اجتهد برائی جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا، اسی معنی میں ہے- چوں کہ نئے مسائل ہر دور میں اور ہر خطے میں پیدا ہوتے رہیں گے اس لیے اجتہاد کا یہ تسلسل بھی ہمیشہ قائم رہے گا، فقہا اور اہل علم نے مختلف الفاظ میں اسی اجتہاد کی تعریف کی ہے- اجتہاد کا ایک چوتھا معنی بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی سب سے زیادہ متنازع ہے اور وہ ہے کتاب وسنت کے اسلوب ومزاج، مقاصد شریعت اور احوال امت کو پیش نظر رکھ کر ایسے اصول وضع کرنا، جن کی روشنی میں کتاب و سنت سے مسائل کا استخراج ہو سکے- مثال کے طور پر کتاب وسنت میں بے شمار احکام ہیں- لیکن کون حکم فرض ہے، کون واجب ہے اور کون مستحب؟ ان مسائل کے ادراک کے لیے ایسے اصول کی ضرورت ہے، جن سے صاف طور پر موقف علمی واضح ہو جائے- اجتہاد کو ثابت کرنے والے اور اجتہاد کا انکار کرنے والے عموماً اجتہاد کے ان مختلف مفاہیم کو مد نظر رکھے بغیر ہی بحث طولانی میں الجھ جاتے ہیں- مثلاً کوئی ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کو ثابت کرنے کے لیے حضرت معاذ بن جبل کا قول اجتهد برائی پیش کرتا ہے اور کوئی ان کے اجتہاد کو رد کرنے کے لیے حضرت عمر کا قول ایاکم واصحاب الرأی پیش کرتا ہے، جب کہ دونوں کا یہ مناظرہ أنافی و ادوأنت فی واد کے مصداق ہے-

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة اور فاسئلوا أهل الذكر ان كنتم لا تعلمون جیسی قرآنی آیات اور أجتهد برائی جیسے کلمات احادیث سے نہ اجتہاد وتقلید کو ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی فقہ واجتہاد یا قیاس وتقلید کو کتاب وسنت سے الگ کوئی چیز بتا کر انہیں مسترد کیا جا سکتا ہے- اس طرح کی دلائل سے جو لوگ اپنا موقف ثابت کرتے ہیں، وہ اپنے ضمیر کو اپنی ہی زبان کے خلاف صف آرا پاتے ہیں اور انہیں اس بات کا خوب احساس ہوتا ہے کہ ان کی رائے اپنی ہی رائے کے خلاف ہے-

''اسلام دین فطرت ہے'' جس مسلمان کو اس حقیقت کا عرفان

☆z_almasmisbahi@yahoo.com

حاصل ہو چکا ہے، اسے اس بات کا اعتراف ہے کہ اسلام میں فطرت کے جبری تقاضوں کی تکمیل کے سامان موجود ہیں- اور اسلام کی یہ خوبی نزول وحی الٰہی کے زمانے کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر زمانے اور ہر علاقے میں اسلام کا یہ وصف ہمہ گیریت موجود ہے-قرآن نے خود قرآن کو قرآن (جو ہمارے سامنے موجود ہے) کی شکل میں جمع و مرتب کرنے کا حکم نہیں دیا- نہ کتاب وسنت میں بخاری ومسلم کی تدوین وترتیب اور ان کے احترام و توقیر کا حکم ہے- وقت کے جبر نے تقاضا کیا اور اسلام کی فطرت نے اسے قبول کرلیا- اب یہ بڑی احمقانہ بات ہوگی کہ کوئی یہ کہے کہ ہم اس قرآن کے متبع ہیں جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اس قرآن کے نہیں، جس کو حضرت عثمان نے مرتب کیا- اسی طرح سفاک حجاج ابن یوسف نے قرآن میں اعراب (زبر زیر پیش) لگا کر قرآن کو ایک نئی طرز میں پیش کیا، اب اگر آج کوئی قرآن سے اعراب مٹانے کا مطالبہ کرے اور یہ کہے کہ کتاب وسنت میں حجاج ابن یوسف کے ذریعے لگائے گئے اعراب کے ساتھ قرآن چھاپنے اور پڑھنے کا حکم کہیں بھی موجود نہیں ہے تو اس کی سادگی پر دعا ہی دی جاسکتی ہے-

اجتہاد (اسلامی قانون سازی) اور تقلید (کسی خاص مسلک فقہی کے قوانین کی پیری) بھی اس ذیل میں آتے ہیں- میرا ناقص مطالعہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان چیزوں کو براہ راست کتاب وسنت سے ثابت نہیں کیا جاسکتا اور نہ کتاب وسنت سے الگ بتا کر انہیں رد کیا جاسکتا ہے، حالات کے جبر نے اجتہاد کا پر زور مطالبہ کیا اور امت کے سرخیل ماہر اور عبقری افراد نے آگے بڑھ کر اس مطالبے کو پورا کیا- جو جنتی بندے یہ قسم کھا چکے ہیں کہ جو باتیں کتاب وسنت میں صراحت کے ساتھ ملیں گی، انہیں کا اتباع لازم ہے، ان کے علاوہ ہر بات مسترد کر دینے کے لائق ہے— خواہ وہ امت کا معمول ہو، علما کا اجماع ہو یا اسلاف کا طرز عمل ہو— ایسے افراد ہوش کے ناخن لیں کہ ان کے لیے نہ تو کتاب پر عمل ممکن ہے اور نہ احادیث پر- اسلام میں مسلمانوں کے ساتھ حسن ظن کو بڑی اہمیت دی گئی ہے- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظنوا المومنین خیراً— مسلمانوں کے ساتھ اچھا گمان رکھو- یہ بڑا بنیادی فلسفہ اور اسلامی ضرورت ہے- اگر اسلاف و اکابر مشکوک قرار پاگئے تو کتاب وسنت کے نام پر جو کچھ سرمایہ ہے، سب شک کے دائرہ میں آجائے گا اور حقیقی اسلام کے متلاشی باب اسلام سے باہر نکلتے ہوئے نظر آئیں گے-

اس تمہیدی گفتگو کے بعد صحابہ کس کی تقلید کرتے تھے؟ کتاب وسنت میں تقلید کا کہاں حکم ہے؟ مجتہدین کس کی تقلید کرتے تھے؟ کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے ائمہ کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟ اور ان جیسے سوالات کی بے معنویت واضح ہوجاتی ہے- ہاں! یہ سوال اپنی جگہ ضرور رہتا ہے کہ کیا واقعی اجتہاد کرنا حالات کا تقاضا تھا اور اس کے بعد تقلید امت کی مجبوری بن گئی؟ یہ سوال اپنے اندر کافی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنا مشکل بھی ہے اور ضروری بھی- ضروری اس لیے تاکہ حقیقت روشن ہو اور مشکل اس لیے کہ جس طرح منکرین حدیث کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے، جس نے حدیث کے بغیر اسلام پر گامزن رہنے کو ممکن مان لیا ہے، اسی طرح ایک طبقہ کتاب وسنت کو بہر صورت اپنے لیے کافی سمجھتا ہے- اس لیے صرف اجتہاد و تقلید کو پرزور الفاظ میں ثابت کردینے سے بحث کی تشنگی ختم نہیں ہوسکتی، جب تک منکرین کے شکوک وشبہات کی بنیادیں نہ تلاش کرلی جائیں-

اجتہاد کی ضرورت کیوں پڑی؟:- اس معنی میں اجتہاد کہ احکام خدا اور سول میں غور وفکر کرکے ان کے منشا ومطلوب معلوم کیے جائیں یا اس معنی میں اجتہاد کہ منصوص مسائل پر قیاس کرکے یا مزاج شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے غیر منصوص مسائل کے احکام معلوم کیے جائیں، اتنا ہی قدیم ہے جتنا اسلام، اور جو لوگ اس کی اہلیت نہیں رکھتے، ان کا اہل لوگوں کا اتباع/تقلید کرنا اتنا ہی قدیم ہے، جتنا اسلام- ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ عہد صحابہ میں حضرت علی یا حضرت معاذ بن جبل یا کسی دوسرے ذی علم وتدبر صحابی نے کوئی رائے قائم کی اور دوسرے صحابہ نے ان کا اتباع کیا- مثال کے طور پر قرآن نے شراب کو حرام کر دیا- لیکن حکم حرمت کے باوجود اگر کوئی شراب پیتا ہے تو اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟ کتاب اللہ میں موجود نہیں ہے- حضرت عمر نے اپنے زمانہ خلافت میں مشورہ کیا تو حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے اس کی سزا أخف الحدود رکھی- یعنی شریعت میں جتنی حدود ہیں ان میں اقل مقدار حد قذف (اسی کوڑے) ہے- حضرت عبد الرحمٰن نے کتاب اللہ میں حد کے نظیر تلاش کی اور سب سے خفیف قذف میں پایا، اس لیے اسی کو شراب نوشی کی حد بھی قرار دیا، کیوں کہ اس سے کم کتاب وسنت میں کوئی حد ہی نہیں- صحابہ نے اس رائے کو تسلیم کرلیا- تو عمومی معنی میں

اسے حضرت عبدالرحمٰن کا اجتہاد اور صحابہ کی تقلید کہہ سکتے ہیں- کیوں کہ اسی کو حضرت عمر نے مقرر مان لیا اور اپنے سارے گورنروں کو لکھ بھیجا کہ شرابی کو اسی کوڑی لگائے جائیں-

اجتہاد کا وہ معنی جس میں فقہ القرآن والسنۃ کو ایک علمی و اصولی فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے یہ نہ تو زمانہ رسالت میں تھا اور نہ عہد صحابہ میں- اس کا آغاز امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا- بعد میں دوسرے درجنوں ذی علم و ذی تدبر حضرات نے بھی اس معنی میں اجتہاد کیا- فقہ الکتاب والسنۃ کے لیے باضابطہ اصول وضع کیے گئے اور ان اصول کی روشنی میں کتاب و سنت سے غیر منصوص مسائل کا حکم معلوم کرنے کا طریقہ بھی واضح ہوگیا اور خود منصوص مسائل کو بھی نص سے علمی انداز سے ثابت کرنا آسان ہوگیا-

حضرت امام ابوحنیفہ کی ولادت ۸۰ ھ میں اور وفات ۱۵۰ ہجری میں ہوئی- اس سے فن اجتہاد کا آغاز کس صدی میں ہوا واضح ہو جاتا ہے- جب امام ابوحنیفہ نے یہ کام شروع کیا تو جو لوگ حدیث کی تلاش و جستجو میں مصروف تھے، ان میں بعض نے اپنے طور پر اسے بہت زیادہ پسند نہیں کیا- اس لیے کہ عام طور پر جو آدمی جو کام کرتا ہے، اسی کو سب سے اہم کام سمجھتا ہے- ایک دوسری وجہ یہ بھی رہی ہو کہ بعض حضرات نے اس اجتہاد کو فقہ القرآن والسنۃ کے علمی اصول کی بجائے کتاب و سنت کے مقابل کوئی اور چیز سمجھا ہو- بہر حال باوجود اس کے بہت سے جلیل القدر ذی علم، ماہرین کتاب و سنت اور واقفین رموز شریعت نے اس میدان میں قدم رکھا- فنی طور پر ان میں اختلاف ہوا اور مختلف مکاتب فقہ وجود میں آئے-

چار مکاتب آج بھی موجود ہیں- حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی- اور امام اوزاعی وغیرہ کے مسالک باقی نہیں رہ سکے- کیوں کہ وہ مدون نہ ہو سکے اور مدون نہ ہونے کی وجہ غالباً یہ ہو کہ ان کے اصول بعد کے اہل علم میں مقبول نہیں ہو سکے- جن کے اصول متاخرین میں سے جتنے زیادہ اور جتنے بڑے اصحاب علم و دانش نے پسند کیا، ان کا مسلک فقہی اسی اعتبار سے پروان چڑھتا رہا- یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تقلید شخصی کا مفہوم یہ نہیں کہ کتاب و سنت کو چھوڑ کر کسی امام کو مصدر شریعت مان لیا جائے یا کتاب و سنت کی طرح قول امام کو بھی مصدر شریعت کا درجہ دے دیا جائے- اس طرح کی تقلید یقیناً تقلید جامد بلکہ اشراک فی الدین ہے-

اہل علم و بصیرت کے لیے تقلید کا فقط یہ معنی ہے کہ انہیں کسی ایک امام کے اصول پسند ہیں اور وہ ان اصولوں کی پیروی کرتا ہے- اس مفہوم میں غیر مقلدین حضرات بھی اپنے ان بڑوں کے مقلد ہیں جنہوں نے اپنے طور پر علم و استدلال کی روشنی میں تقلید کو غلط قرار دیا- اس کے لیے انہوں نے جو دلائل پیش کیے وہ دلائل ان کے تمام متبعین کے ذہن و فکر میں بھی اتر گئے- اس لیے یہ حضرات بھی اپنے بڑوں کی بات دہرانے لگے- مقلدین اہل علم کا بھی یہی حال ہے- وہ اپنے امام کو اس لیے نہیں مانتے کہ خدا اور سول کی طرح ان کے ارشادات بھی مستند ہیں- بلکہ اس لیے کہ امام نے جو بات کہی ہے وہ منشا کتاب و سنت کو پوری کر رہی ہے- رہے عوام یا جنہیں دین کا شعور نہیں وہ تو اھل الذکر سے معلوم کریں گے ہی- انہیں اہل علم کے اتباع/تقلید سے بہر حال چارہ کار نہیں- اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مخصوص معنی (اصول سازی) میں اجتہاد کی ضرورت کیوں پڑی؟ اس سوال کا جواب ہمیں دو مثالوں سے سمجھنے میں آسانی ہوگی- ہمارے سامنے اس وقت ایک مثال بدھ مذہب کی دو خانوں مہایان اور ہنایان میں تفریق ہے اور دوسری مثال ہے علم شریعت کی ذیلی علوم علم تفسیر، علم حدیث، علم اصول، علم کلام وغیرہ میں تقسیم-

(ا) گوتم بدھ ۵۶۳ ھ ق م میں ایک چھتری حکمراں خانوادے کے اندر نیپال میں پیدا ہوئے- ۲۹/سال کی عمر میں تلاش حق کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں میں گم ہو گئے، ۳۵/سال کی عمر میں بدھ مت کے مطابق انہیں نروان (نجات) حاصل ہوگیا اور بقیہ زندگی کے ۴۵ سال اپنی فکر کی تبلیغ و اشاعت میں گزار دیے- گوتم بدھ کی وفات کے ۱۰۰/ سال بعد بنارس میں ان کے متبعین (بھکشوؤں) کا ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں باضابطہ بدھ مت کو ایک مذہب کی شکل دے دی گئی اور اس کے ساتھ ہی بدھ بھکشوؤں میں روایت و جدت کے حوالے سے اختلاف ہوگیا- ایک وہ طبقہ تھا جو گوتم بدھ کے الفاظ پر عمل کرنے کا مطالبہ کرتا تھا اور ذرہ برابر اس سے ہٹنے کو بدھ مت سے ارتداد سمجھتا تھا، جبکہ دوسرا طبقہ گوتم بدھ کے مقاصد، ان کے ارشادات کے معانی و مفاہیم اور نئے دور اور نئے مسائل میں ان کے ارشادات کی توضیح و تطبیق کا قائل تھا- روایت پرستوں کا نمائندہ ہنایان اور آزاد خیالوں کا نمائندہ مہایان کی شکل میں آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہیں-

اس تناظر میں مسلمانوں کے اندر مقلدین و غیر مقلدین کے

اختلافات پر نظر ڈالیے تو ان کا سرا اصحاب اجتہاد اور اصحاب ظواہر پر ختم ہوتا ہے- یعنی اصل اختلاف یہ نہیں ہے کہ اہل علم کی بات مانی جائے یا نہ مانی جائے- اہل علم سے دریافت کرنا اور ان کی رہنمائی پر عمل کرنا یہ تو قرآن سے ثابت ہے- اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی کلمہ خواں کو اس مسئلہ میں اختلاف ہوگا- اصل اختلاف یہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے اب تک جو سمجھا ہے وہ یہی ہے کہ بدھ مت کے ماننے والوں کی طرح بنیادی طور پر یہی نقطہ اختلاف مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا- کچھ اہل علم کی رائے یہ بنی کہ قرآن وحدیث کو کافی سمجھا جائے اور جتنی باتیں ان میں ہیں انہیں پر عمل کا جائے- جبکہ دوسرے طبقے کو نئے دور اور نئے مسائل کا اندازہ تھا اور اس نے یہ سمجھا کہ نئے مسائل اتنے زیادہ اور اتنے مختلف النوع پیدا ہو رہے ہیں کہ ان کے لیے حل مسائل کا علاحدہ اور مخصوص شعبہ قائم کرنا ضروری ہے- ان کے لیے باضابطہ اصول وقوانین وضع کیے بغیر اسلام نئے چیلنجیز کا نہ تو جواب دے سکتا ہے اور نہ ہی مسائل شریعت کو جدید علمی انداز میں سمجھا جا سکتا ہے- یہ بنیادی اختلاف ہے جس پر سب کی نظر نہیں ہوتی- اس حوالے سے میں اپنے محدود و مختصر مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان دونوں نظریات میں صحیح کیا ہے؟ اس میں ہمارا اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن اس میں ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں نظریات نیک نیتی پر مبنی ہیں- اگر ان نظریات کے متبعین بھی نیک نیتی پر گامزن ہوں تو عند اللہ وہ ضرور ماجور یا معذور ٹھہریں گے-

(۲) عہد رسالت میں ایک منبع علم تھا، سرچشمۂ رسالت- اس سے جو جتنا سیراب ہوتا وہ اتنا ہی بڑا عالم شریعت ہوتا- اس زمانہ میں نہ کوئی مکتب تھا، نہ مدرسہ، نہ علم حدیث نہ علم تفسیر، نہ قرآن الگ، نہ حدیث الگ- سب شہر علم وحکمت کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور علم وفن کے موتی اپنے دامن میں سمیٹے واپس ہوتے- علم دین میں تھوڑی سی تفریق بس یہ تھی کہ تاجدار اقلیم رسالت صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کی نشاندہی فرماتے اور کاتب بلوا کر اسے لکھوا دیتے- لیکن مجموعی طور پر صحابہ کے پاس ایک علم تھا اور وہ تھا علم شریعت- یہ اور بات ہے کے وہی تمام علوم وفنون کو جامع تھا- ایک ہی صحابی حافظ وقاری بھی تھا، محدث و فقیہ بھی اور مجتہد ومتکلم بھی- علمی اعتبار سے صحابہ میں کمی وبیشی ضرور تھی- لیکن ان میں اسپیشلائزیشن کا کوئی باضابطہ تصور نہیں تھا-

خلافت راشدہ کے بعد جب بنو امیہ کا عہد آیا اور رسالت کا زمانہ کافی پیچھے چھوٹ گیا، مشکوٰۃ نبوت سے براہ راست روشنی حاصل کرنے والے ایک ایک کر کے کم ہونے لگے تو اب علم شریعت کو مدون کرنے کا رجحان اور تدوین کے لیے، تخصص، تفنن اور ترتیب کا شعور پیدا ہوا- کچھ نفوس قدسیہ نے جمع حدیث کا کام کیا، کچھ نے نقد حدیث کا کام کیا، بعض محسنین امت نے ماثور تفسیریں لکھیں، کچھ نے رجال حدیث کے احوال جمع کیے- اسی زمانے میں قانون اسلامی ایک علاحدہ فن کی حیثیت سے سامنے آیا اور علم فقہ واصول کی وضع ہوئی- یہ ساری چیزیں بدعت تھیں، لیکن بدعت ہوتے ہوئے یہ امت کی ضرورت تھیں اس لیے امت کی نمائندہ شخصیتوں نے پورے انہماک اور لگن سے یہ کام انجام دیا- آج اگر ہم کہیں کہ کتاب وسنت کے بعد ساری چیزیں بدعت ہیں جن کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے- تو یہ سوال صرف فقہ واجتہاد پر نہیں ہوگا بلکہ اس سوال سے دین کا سارا سرمایہ خطرے کی زد میں آ جائے گا-

اس گفتگو سے اس طرح کے شبہات ختم ہو جاتے ہیں کہ کیا امام بخاری مجتہد نہیں تھے؟ اور کیا امام ابو حنیفہ محدث نہیں تھے؟ اس طرح کے شبہات انہی ذہنوں میں آ سکتے ہیں جن میں تخصص اور اسپیشلائزیشن کا مفہوم واضح نہیں ہے- اس طرح کے شبہات میں ڈوب کر جو فکری ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں، انہیں دور جدید میں علوم میں اسپیشلائزیشن کا مفہوم کیا ہے؟ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، جسے بدقسمتی سے مغرب کی دین سمجھ لیا گیا ہے- اگر آج کوئی سیاسیات کا اسپیشلسٹ ہے تو اس کا بالکل یہ معنی نہیں کہ وہ سماجیات، عمرانیات اور تاریخ سے نابلد ہے اور نہ کوئی تاریخ کا ماہر سیاسیات سے نابلد ہو سکتا ہے- لیکن اس کے باوجود خصوصی موضوع کے خصوصی مطالعہ کے سبب اس موضوع کے حوالے سے جو وسعت علم ہوتی ہے وہ دوسرے موضوع کے حوالے سے نہیں ہوتی-

اسپیشلائزیشن کے مفہوم کو سمجھنے کے بعد یہ بات بھی سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ امام بخاری یا دوسرے ائمہ حدیث کا میدان فکر وعمل کچھ اور ہے اور امام ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ اجتہاد کا میدان عمل کچھ اور-

از روئے تخصص علم حدیث وعلم فقہ کا معنی جب تک ذہنوں میں واضح نہیں ہو جاتا، اس وقت تک امام بخاری وامام ابو حنیفہ میں تفضیل، علمائے حدیث اور علمائے فقہ میں تفضیل، علمائے حدیث کی تقلید کرنے کا مطالبہ اور اس طرح کے شکوک وشبہات ختم نہیں ہو سکتے- جو لوگ تخصص

کا مفہوم نہیں سمجھتے ہم انہیں معتوب کرنے کی بجائے دعا دینے کے خواہاں ہیں- کیوں کہ وہ یقینی طور پر دعاؤں کے مستحق ہیں-

کیا آج ائمہ مجتہدین کی تقلید کرنی چاہیے؟:- عہد حاضر کے نامور فقیہ علامہ غلام رسول سعیدی (پاکستان) فرماتے ہیں:

"آج کل ہمارے زمانے میں دو قسم کے مقلد ہیں، ایک تو عوام ہیں جو امام کے محض مقلد ہوتے ہیں اور ایک وہ علماء ہیں جو فقہی مسائل اور ان کے دلائل پر بصیرت رکھتے ہیں اور مسائل عصریہ کا حل کتاب وسنت اور اصول کی روشنی میں تلاش کرتے ہیں- پہلی قسم کے مقلد صرف تقلید کرتے ہیں اور دوسری قسم کے مقلد امام کی اتباع کرتے ہیں- تقلید کے معنی ہیں دلائل سے قطع نظر کر کے کسی امام کے قول پر عمل کرنا اور اتباع سے یہ مراد ہے کہ کسی امام کے قول کو کتاب وسنت کے موافق پا کر اور دلائل شرعیہ سے ثابت جان کر اس قول کو اختیار کر لینا- سو تقلید صرف عوام کے لیے ہے جو دلائل شرعیہ سے بے خبر ہوتے ہیں اور اہل علم اور اہل فتویٰ حضرات کے لیے تقلید محض جائز نہیں ہے-" (شرح صحیح مسلم ۵/۶۴)

الفاظ کے اختلاف کے ساتھ عوام بلا شبہ مقلد یا متبع ہیں- اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے- اصل اختلاف اہل علم کے تقلید کرنے یا نہ کرنے میں ہے- پھر یہ کہ تقلید فروع میں کریں؟ یا اصول میں کریں؟ یا دونوں میں کریں؟ علامہ سعیدی کے مذکورہ خیال کہ "علماء امام کی اتباع کرتے ہیں" کا تجزیہ کرنے اور اس کے مضمرات پر گہرائی سے سوچنے کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی عالم کے حنفی یا شافعی ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کو امام شافعی یا امام ابوحنیفہ کے اجتہاد کردہ مسائل کتاب وسنت کے موافق نظر آرہے ہیں-

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ کسی حنفی کو امام ابوحنیفہ کے ہی تمام مسائل کتاب وسنت کے موافق نظر آتے ہیں اور کسی شافعی کو صرف امام شافعی کے تحقیق کردہ مسائل ہی کتاب وسنت کے موافق نظر آتے ہیں؟ جہاں تک دلائل کی بنیاد پر علماء کے اتباع کرنے کی بات ہے تو ہونا تو یہ چاہیے کہ انہیں بعض دلائل امام ابوحنیفہ کے مستحکم نظر آئیں اور بعض امام شافعی کے اور اگر بات ایسی ہو تو پھر تقلید شخصی کا قصہ افسانہ بن جائے-

مزید غور کرنے کے بعد یہ عقدہ کھلتا ہے کہ مقلدین علماء، اصول میں اپنے ائمہ کی تقلید کرتے ہیں اور فروع میں اتباع کرتے ہیں- اصول میں تقلید کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ذہن فطری طور پر ایسا واقع ہوا ہے کہ اسے کسی ایک امام کے اصول ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ مسائل میں وقت ضرورت دوسرے مسلک فقہی پر فتوی دینے کے باوجود وہ کسی ایک ہی مسلک کے پابند سمجھے جاتے ہیں-

واقعہ دراصل یہ ہے کہ دنیا میں اصولی ذہن بہت کم ہوتے ہیں- اس کی واضح مثال یہ ہے کہ شیخ ابن حزم (م ۴۵۶ھ) پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے باضابطہ طور پر تقلید کا رد کیا- آج تک جتنے غیر مقلدین ہیں تقریباً سب کے سب معمولی اختلاف کے ساتھ انہی کے اصول واسلوب کی پیروی کرتے ہیں- اس طرح یہ سب کے سب "اصول نقد تقلید" میں ابن حزم کے مقلد ہو گئے- اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیر مقلد کا معنی یہ نہیں رہا کہ وہ ہر مسئلہ میں تمام علماء کے اقوال واختلافات کا تجزیہ کر کے اپنی رائے قائم کرے- بلکہ غیر مقلدیت ایک مستقل فقہی مسلک کی شکل اختیار کر گئی- آج جتنے غیر مقلدین ہیں ان کے سر میں جہاں تقلید کی مخالفت کا سودا سوار ہے وہیں داؤد ظاہری، شیخ ابن حزم، شیخ ابن تیمیہ، ابن قیم اور البانی کی عظمت علم اور سطوت قلم کا جنون بھی- اس طرح جیسے سارے مقلدین فقہی سطح پر ایک نکتے پر جمع تھے غیر مقلدین بھی تقلید کی مخالفت کرتے ہوئے ایک تقلیدی پلیٹ فارم پر آ گئے- اب جو سوال مقلد علماء پر تھا، ٹھیک وہی سوال غیر مقلد علماء پر ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ان کو ابن حزم، ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تحقیقات ہی کتاب وسنت کے موافق نظر آتی ہیں- اگر وہ غیر مقلد ہیں تو ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ بعض مسائل میں شیخ ابن تیمیہ کے ساتھ رہیں اور بعض دوسرے مسائل میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ- اور یہ کہ ایک غیر مقلد ایک ہی مسئلہ میں شیخ ابن تیمیہ کی موافقت کرے اور دوسرا غیر مقلد عالم اسی مسئلہ میں اس کی مخالفت کرے-

اس پوری گفتگو سے معلوم یہ ہوا کہ اہل علم نے اصول میں ائمہ اربعہ کی تقلید کی اور یہ اس لیے نہیں کہ انہوں نے آنکھ بند کر کے ان کے فرمان کو کتاب وسنت کی طرح تسلیم کر لیا- بلکہ اس لیے کہ ان کی ذہنی ساخت ہی کچھ ایسی تھی جسے کسی ایک امام کے اصول ہی پسند آئے- اصول اور اصولی ذہن کی قلت کوئی حیرت انگیز چیز نہیں- اسے گہرائی میں اتر کر سمجھا جا سکتا ہے-

عصر حاضر میں اجتہاد کی صورت:- جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں معلومات کے دریا کے ساتھ مسائل کا سمندر بھی جاری کر دیا جس کا تموج ہر اگلے عشرے میں دگنا یا اس سے

بھی زیادہ ہوتا چلا گیا، اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ دنیا کا سیاسی اور سماجی منظرنامہ بڑی تیزی سے بدلنے لگا، آج ہر آن ایک نقش ڈوبتا ہے تو دوسرا ابھرتا ہے- اس کی ایک محسوس مثال یہ ہے کہ جو حضرات پچھلے پچاس سالوں سے تصویر سازی اور ویڈیوگرافی کی شدید مذمت کرتے آرہے تھے، آج اچانک ایسے تصویری سحر کا شکار ہو گئے کہ وہ خود کو وسط سمندر میں تصور کر رہے ہیں جہاں سے دونوں کناروں کی مسافت برابر ہے- ایسے میں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پار ہے ہیں کہ رخ کس کا کریں- اسی اضطراب کا نتیجہ ہے کہ ابھی میڈیا، صحافت اور تصویر کی تباہ کاریوں پر لیکچر دیتے ہیں اور چند لمحے بعد ہی میڈیا کی اہمیت وضرورت کا احساس انہیں کیمرے کے سامنے کھینچ لاتا ہے- یہ صرف ایک مثال ہے ورنہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیجیے تو اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں- اس گومگو کی کیفیت کے سبب عوام وخواص، عالم و جاہل، ہر کس و ناکس تقلید و اجتہاد کے موضوع پر مہذب یا غیر مہذب الفاظ میں اظہار خیالات کرنے کی جرأت و جسارت کرنے لگا ہے- یہ بحث غلو کی شکل اس وقت اختیار کر لیتی ہے جب کمزور دماغ مغلوبیت میں اباحیت پسندی کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کے نزدیک ہر مسئلہ میں اجتہاد ضروری ہے اور اجتہاد کا صرف یہ معنی ہے کہ ماضی کے علمانے جتنی باتوں کو ناجائز وحرام لکھا ہے ان سب کو بیک جنبش قلم مباح قرار دے دیا جائے-

اس افراط کے برعکس تفریط کا یہ عالم ہے کہ کسی مسئلہ پر عصری تناظر میں نظر ثانی کو ارتداد فکری، نفس پرستی اور آزادروی بمعنیٰ الحاد ولادینی کے مرادف سمجھ لیا جاتا ہے- تقلید جامد کا یہ عالم کہ کسی کو بھی یہ اجازت نہیں کہ وہ کسی مسئلے میں اپنے سابق عالم سے علم واستدلال کی روشنی میں اختلاف کرے، یا بوجہ ضرورت اصل حکم کا اعتراف کرتے ہوئے اس میں دوسرا حکم صادر کرے- اس کا ایک شدید نقصان یہ ہے کہ نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں، عوام ان میں علما کی رہنمائی کا انتظار کرتے کرتے تھک ہار کر اپنی مرضی کی راہ نکال لیتے ہیں، جبکہ اہل علم تحت السوال جواب دینے کے لیے ان کے استفتے کا انتظار کرتے رہتے ہیں- اجتہادی جمود اور تقلیدی مزاج کی انتہا اور کیا ہوسکتی ہے کہ جب میں نے ایک عالم دین کے سامنے شہری زندگی گزار رہے مسلمانوں کے کچھ مسائل کا ذکر کیا تو انہوں نے صاف طور پر فرما دیا کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد گاؤں اور دیہاتوں میں بستی ہے اور حکم ہمیشہ اکثریت کے حالات کو مدنظر رکھ کر لگایا جاتا ہے، اس لیے ہم شہری زندگی کی مشکلات کا اعتبار نہیں کر سکتے-

اجتہاد اپنے آپ میں ایک متعدد المفاہیم لفظ ہے، جس کی وضاحت ہم پیچھے کر چکے ہیں، اس کی وجہ سے ہوتا یہ ہے کہ جب عصر حاضر کے تناظر میں اجتہاد پر گفتگو کی جاتی ہے تو کسی ایک معنی کے تعین کیے بغیر ہی معرکہ بحث ونظر گرم ہو جاتا ہے- جس کا اختتام بلا نتیجہ ہوتا ہے- ہمارے خیال میں ممکنہ طور پر عصر حاضر میں اجتہاد کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں (آپ چاہیں تو اسے اجتہاد کی بجائے کسی اور لفظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں) (۱) نو پیدا مسائل میں اجتہاد (۲) علمائے متقدمین کے مجتہد فیہ مسائل میں نئے حالات کے پیش نظر از سر نو تدبر (۳) فقہی اصول میں اجتہاد- ہم ذیل میں ہر ایک کے تعلق سے مختصراً عرض کیے دیتے ہیں، خدا! رہوار قلم کو جادۂ مستقیم پر گامزن رکھے- بصورت دیگر اہل علم اس کی نشاندہی کریں ہم دل وجان سے ان کے شکر گزار ہوں گے-

نو پیدا مسائل میں اجتہاد:- یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ کتاب و سنت نے ضروری اور بنیادی احکام بیان کر دیے- یہ ممکن ہی نہیں کہ ان میں قیامت تک آنے والے ہر مسئلہ کا علاحدہ حکم بیان کر دیا جاتا، ہاں تمام مسائل کے لیے اصول پیش کر دیے گئے اور انہی اصول کی روشنی میں مسائل کو حل کرنے کا حکم دے دیا گیا، اس کے لیے قرآن وحدیث میں بے شمار دلائل موجود ہیں اور میری دانست کی حد تک کسی ذی علم نے بھی اس اجتہاد کا انکار نہیں کیا ہے- اس معنی میں اجتہاد عہد رسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین میں بھی ہوا، بعد کے ہر دور میں بھی ہوا، چوں کہ نئے مسائل ہر دور میں پیش آتے رہے، آج بھی نئے مسائل پیدا ہورہے ہیں اس لیے لازمی طور پر آج میں بھی اجتہاد کیا جائے گا، مجھے نہیں لگتا کہ کوئی اپنی سالم الحواسی کا مدعی اس مفہوم میں اجتہاد کا منکر ہوسکتا ہے- یہ اجتہاد نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے- تمام علماء پر فرض کفایہ ہے کہ وہ نئے مسائل کا حکم بتا کر امت کی رہنمائی کریں، اور یہ فرض کفایہ اس وقت فرض عین ہو جاتا ہے جب کسی خاص عالم دین (جو اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو) کے سامنے اس کے تعلق سے استفسار کر دیا جائے-

نئے مسائل کا جواب دینے میں عموماً عہد حاضر کے ارباب علم و فتویٰ مسائل کے الفاظ کو سامنے رکھ کر ''اگر مگر'' کے ساتھ جواب دیتے ہیں، جب کہ جدید مسائل کا حل بتانے کا یہ مجتہدانہ طریقہ نہیں ہے- کیوں کہ نئے مسائل میں سائل ایک ہوسکتا ہے پر وہ مسئلہ عمومی طور پر سب کے

لیے ہوتا ہے، اس لیے نئے مسائل کا جواب دینے میں صحیح طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ سائل کے الفاظ کے پیچ وخم میں الجھنے کی بجائے، حالات کا ماہرانہ جائزہ لیا جائے اور ایک عمومی جواب دیا جائے- پچھلے دنوں "چاؤ مین" کے تعلق سے ایک فتویٰ ہماری نظر سے گزرا- سائل نے یہ دریافت کیا تھا کہ سننے میں آیا ہے کہ چاؤمین میں جو پاؤڈر استعمال کیا جاتا ہے اس میں سور کی ہڈی شامل ہوتی ہے، ایسی صورت میں چاؤمین کھانے کا کیا حکم ہے؟ مفتی صاحب نے یہ جواب دیا کہ اگر چاؤمین میں سور کی ہڈی پڑتی ہو تو اس کا کھانا حرام ہے ورنہ جائز- ہمیں بتایا جائے کہ کیا سائل کو اس فتوی سے کوئی ایسی بات معلوم ہوئی جو اسے پہلے معلوم نہ تھی، آج عام انسانوں کے پاس بالکل وقت نہیں کہ وہ ہر چیز کے بارے میں تحقیق کریں، نہ یہ ان کی ذمہ داری ہے، غضب تو یہ ہے کہ اس عدیم الفرصتی نے ان کے اندر اباحیت پسندی کا مزاج پیدا کر دیا ہے، لیکن ایسے وقت میں بھی اگر کوئی شرعی حکم دریافت کرتا ہے تو کیا "اگر مگر" سے جواب دے دینے سے جدید مسائل میں حق جواب ادا ہو جاتا ہے؟؟؟

عصر حاضر کے نو پیدا مسائل کے حل میں دو بڑی اہم دشواریاں یہ ہیں کہ ایک تو جدید مسائل اتنی عجیب وغریب نوعیت کی حامل ہیں کہ ان میں جواز وعدم جواز کسی ایک جانب کو ترجیح دینا خاصا مشکل ہوتا ہے- نیز حل مسائل کا جو ایک عمومی طریقہ ہے کہ اگر کوئی جدید مسئلہ کتاب و سنت میں منصوص نہیں ہے تو اس کے لیے فقہا، فقہائے متقدمین کے یہاں کوئی جزیہ تلاش کرتے ہیں، موجودہ مسائل میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماضی کے فقہاء کے یہاں کوئی نظیر یا جزیہ نہیں ملتا جس کی وجہ سے براہ راست از سر نو تدبر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی مثال ممالک یورپ وامریکہ کو دار الاسلام، دار الحرب، دار الامن، دار الخوف یا دار الدعوہ کہنے کا مسئلہ ہے-

جدید مسائل کے حل میں ایک دوسری بڑی دشواری یہ ہے کہ عصر حاضر کے علما میں جس طرح علوم اسلامیہ پر گہری نظر، وسعت مطالعہ، ژرف نگاہی، قوت تدبر اور دولت تفقہ کی ضرورت ہے وہ ناپید ہے- اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ تقلیدی مزاج نے عموماً اہل علم کو ھل من مزید کی طلب سے آزاد کر دیا ہے، یہ مشکل جدید مسائل کے حل میں خاصا مشکل پیدا کر دیتی ہے- ویسے عصر حاضر کے علماء نے جدید مسائل کے حل کے لیے جو اجتماعی طریقہ نکالا ہے اس نے مذکورہ بالا دشواریوں کو کافی حد تک کم کر دیا ہے، اس طرح کا طریقہ خود امام اعظم ابو حنیفہ کے یہاں بھی ملتا ہے- اس کی وجہ سے حل مسائل میں بیک وقت کئی دماغ کام کرتے ہیں اور خطا کا احتمال کم سے کم رہ جاتا ہے- یہ بہت ہی بہتر طریقہ ہے، بشرطیکہ فقہائے عصر اس طرح کی مجلسوں میں اپنے تفقہ اور مطالعہ کی روشنی میں حل مسائل کے قصد سے جائیں نہ یہ کہ صرف اپنے بڑے عالموں کے فیصلے سننے کے لیے- علاوہ ازیں جدید مسائل میں انفرادی تدبر وتفکر کا طریقہ بھی غلط نہیں، امت کے جو اصحاب علم اس کے اہل ہوں وہ انفرادی طور پر بھی تحقیق واجتہاد کریں، اس مہربانی کے ساتھ کہ اپنی انفرادی رائے کو امت پر مسلط کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے اسے اپنے لیے تو واجب العمل سمجھیں لیکن دوسروں کو ان کے اجتماعی موقف پر قائم رہنے دیں-

مجتہد فیہ مسائل پر نظر ثانی: -مجتہد فیہ مسائل پر نظر ثانی کا یہ معنی نہیں کہ متقدمین کے تمام تحقیقات وفتاوی پر از سر نو اجتہاد کرنے کے لیے بیٹھا جائے، یہ تو تضیع اوقات اور حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے- نیز اس میں اکابر واسلاف امت کے ساتھ سخت بدگمانی ہے جبکہ ہمیں عام مسلمانوں کے ساتھ حسن ظن رکھنے کا حکم دیا گیا ہے- مجتہد فیہ مسائل پر نظر ثانی کرنے کا صرف یہ معنی علم اور حسن ظن کے تقاضے پورے کرتا ہے کہ اگر متقدمین کی کوئی تحقیق آج کسی بھی طرح زیر بحث آجائے تو اس پر غیر جانب دارانہ علمی اسلوب میں غور وفکر کیا جائے نہ یہ کہ اسلاف کا قول ہونے کی وجہ سے اسے آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیا جائے- آج اس کی دو صورتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ فقہائے متقدمین نے جو فیصلے دیے ہیں ان سے اتفاق کرتے ہوئے بوجہ ضرورت ان میں دوسرا حکم صادر کیا جائے- اور دوسری یہ کہ خود ان کے فیصلے سے اختلاف کر لیا جائے- پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ قرآن حکیم نے مصارف صدقات میں تالیف قلب کو بھی شامل رکھا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مال زکوۃ غیر مسلموں پر بھی خرچ کیا جائے تاکہ ان کے دلوں میں نرمی پیدا ہو اور وہ اسلام سے قریب ہوں- ظاہر ہے کہ یہ ایک منصوص مسئلہ ہے جس کا انکار کفر کے ہم معنی ہے، لیکن حضرت فاروق اعظم نے اپنے عہد خلافت میں اسے موقوف کر دیا- اس لیے نہیں کہ وہ قرآن سے اتفاق نہیں رکھتے تھے، یا انھوں نے حکم قرآنی کی مخالفت کی، بلکہ اس لیے کہ جس مقصد کے لیے قرآن نے اس کا حکم دیا تھا وہ مقصد اب باقی نہیں رہا، اگر آج بھی بالفرض اس کی ضرورت ہو تو اس

پر مال زکوٰۃ صرف کیا جاسکتا ہے- یہ منصوص مسائل میں احوال عصر کے بدلنے سے حکم شریعت میں تبدیلی کی مثال ہے- غیر منصوص مسائل میں اس کی مثال یہ ہے کہ علمائے احناف کے نزدیک اصل حکم یہ ہے کہ مفقود الخبر شوہر کی بیوی ۸۰ رسال تک انتظار کرے گی، حنفی علمائے متاخرین نے اس سے انکار نہیں کیا، بلکہ اصل حکم کا اعتراف کرتے ہوئے حالات اور یسر کے پیش نظر امام مالک کے قول پر فتویٰ دیا اور مدت انتظار فقط ۴ رسال رکھا، اس کی دوسری واضح مثال تصویر سازی کا مسئلہ ہے- ماضی قریب کے علماء نے اسے ناجائز و حرام لکھا، موجودہ علماء بھی اسے ناجائز و حرام قرار دیتے ہیں مگر بوجہ ضرورت اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ اس سلسلے میں ضرورت کا تعین ابھی مختلف فیہ ہے-

مجتہد فیہ مسائل میں اس معنیٰ میں اجتہاد نہ تو شاذ و نادر ہے اور نہ ہی باعث حیرت و استعجاب- اس لیے عصر حاضر میں کوئی ذی علم اور صاحب استعداد اگر اس طرح کا اجتہاد کرتا ہے تو صرف اس لیے اس کی مخالفت نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے متقدمین سے اختلاف کر رہا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ حالات کا گہرا تجزیہ اور ضرورت کا تعین وسیع علم، پختہ فکر اور عمیق تفقہ کا تقاضا کرتا ہے، اس لیے بلاوجہ اس راہ پر خار میں ہر کوئی قدم رنجہ فرمائی کی زحمت نہ کرے-

متقدمین سے اختلاف کی دوسری صورت یعنی علمی طور پر اختلاف یہ عقلاً بھی جائز ہے اور ہمارے سامنے اس کی کئی ایک مثالیں بھی موجود ہیں- عقلاً جواز کی وجہ یہ ہے کہ بڑے سے بڑا امام بہر حال بشر تھے اور بشر سے امکان خطا ایک اتفاقی مسئلہ ہے، حضرت امام مالک فرماتے ہیں: **انما انا بشر أخطی و أصیب فانظروا فی قولی فکل ماوافق الکتاب والسنة فخذوا به و ما لم یوافق الکتاب والسنة فاترکوه** (میں بشر ہوں، میری رائے درست و نادرست دونوں ہو سکتی ہے، میری باتوں میں غور کروں، جو ان میں کتاب و سنت کی موافق ہوں، ان پر عمل کرو اور جو موافق نہ ہوں انہیں چھوڑ دو-)

متقدمین سے علمی اختلاف کی ایک مثال ماہ شوال کے بعد چھ نفلی روزے رکھنے کا مسئلہ ہے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مکروہ کہا تھا اور متاخرین نے حدیث صحیح ملنے کے بعد اس کے استحباب کا قول کیا- پاکستانی فقیہ و محقق علامہ غلام رسول سعیدی نے اسی نوعیت کا اختلاف کتابت نسواں کے مسئلے میں کیا ہے، متقدمین علماء نے جن احادیث کی بنیاد پر کتابت نسواں کو ناجائز لکھا تھا انھوں نے ان احادیث کی صحت کا انکار کرتے ہوئے جواز کے حوالے سے احادیث پیش کر دیے، اس طرح کے اختلافات اور بھی ہیں، اگر ان اختلافات کے پیچھے نیت صالح ہو تو ان کی حیثیت بھی وہی ہے جو دیگر اجتہادی اختلافات کی ہے، لیکن باوجود ایں ہمہ اسلاف کے اندر یقینی طور پر فقہ، تدبر اور علم القرآن والسنۃ زیادہ تھا، اس لیے اس طرح کے اختلافات کی گنجائش کم سے کم ہے، کیوں کہ اسلاف نے بڑی جاں فشانی اور کمال احتیاط سے فتاوے صادر کیے ہیں، ہمیں ان سے حسن ظن رکھنا چاہیے، تاہم حسن ظن کا یہ معنی نہیں کہ علمی طور پر ان کے خلاف حق روشن ہو جائے جب بھی ہم دلیل کو نظر انداز کر کے شخصیت سے چمٹے رہیں-

علمی اختلاف کی بات آ ہی گئی تو یہاں اس نکتے کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جو حضرات اسلاف سے علمی اختلاف کے جواز کے قائل ہوتے ہیں وہ خود اپنے نظریے اور رائے سے اختلاف کو نہیں معلوم کسی دلیل سے یکسر غلط سمجھتے ہیں، وہ جب خود اختلاف کرتے ہیں تو مسائل میں توسع، خطائے بشری کا احتمال اور **الحق أحق ان یتبع** کی دہائی دیتے ہیں لیکن جب دوسرے ان سے اتفاق نہیں کرتے تو وہ آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں- جماعت غیر مقلدین کا بالعموم رویہ یہی ہے اور یہ زہر البانی کے مزاج میں کچھ زیادہ ہی سرایت کیے ہوئے ہے- یہی وجہ ہے کہ تراویح میں بیس اور آٹھ رکعت کا نزاع جو زیادہ سے زیادہ استحباب یا سنت کی نوعیت کا تھا اسے وجوب کا درجہ دے دیا- اور بیس رکعت پڑھنے کو جو عامۃ الصحابہ کے عمل سے ثابت ہے نہ صرف مرجوح بلکہ ناجائز قرار دے کر دم لیا-

انصاف یہ ہے کہ ہر عالم جس کے اندر مجتہدانہ علم و شعور ہو، کو علمی سطح پر اپنے پیش رو عالم سے اختلاف کا حق ضرور ہے، لیکن دوسرے علماء کو بھی اس سے اختلاف یا اتفاق کرنے کا حق ہے- اگر کسی نے دلائل سے اپنے پیش رو عالم سے اختلاف کیا اور دوسرے معاصر عالم نے دلائل کی روشنی میں ہی اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا تو اسے اتفاق کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی اس کے اختلاف کو تقلید جامد یا اسلاف پرستی کا نام دیا جاسکتا ہے، کیوں کہ ایسا کرنا اسلاف پرستی سے روکنے کی بجائے خود اپنی شخصیت پوجنے کی دعوت دینا ہے-

فقہی اصول میں اجتہاد:- عالم عرب کے معروف اسکالر شیخ

یوسف قرضاوی وغیرہ نے عصر حاضر میں ''تجدید اصول فقہ'' کی بحث چھیڑی ہے، یہ بحث جہاں شرعی حدود و قیود سے آزاد رہ کر مسلمان بنے رہنے کے متمنی افراد کے لئے ایک شادیانہ مسرت سے کم نہیں وہیں امت کے ذمہ دار، اسلام کے درمند اصحاب فقہ و افتا کے لئے یہ دعوت فکر و نظر بھی ہے- ان جدید اجتہادیوں کی رائے یہ ہے کہ اصول فقہ دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو نص قرآنی کی تفہیم کے لیے بنائے گئے ہیں جیسے الامر للوجوب امر مطلق وجوب کے لئے ہے- اس طرح کے اصول محکم ہیں، ان میں مزید کسی نکتہ آفرینی کی نہ گنجائش ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت البتہ وہ اصول جو احوال زمانہ اور عامۃ الناس کے عرف و عادت کے پیش نظر فقہا نے وضع کیے تھے، کوئی وجہ نہیں کہ حالات کے اتنے بدل جانے کے بعد بھی ان پر نظر ثانی کرنا کوئی گناہ ٹھہرے- اس کی ایک مثال یہ ہے کہ زمانہ اول میں شخصی زندگی کی ضرورتیں کم تھیں، اٹھارہ بیس سال کی عمر میں باپ اپنے بچوں کی شادی کر دیتا اور بچے اپنے دم خم پر زندگی کا آغاز کر دیتے، آج کا حال یہ ہے کہ ۲۵/ سے ۳۵،۳۰/ سال تک تعلیم کا مرحلہ ہوتا ہے پھر اس کے بعد کئی سالوں تک ملازمت کے لئے خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں جا کر کوئی اپنے قدم پر کھڑا ہونے کا اہل ہوتا ہے- یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ فقہائے سابقین نے باپ کے اوپر بچے کی کفالت کی جو مدت متعین کی تھی جس پر بہت سے دوسرے مسائل متفرع ہوتے ہیں، اس پر از سر نو غور کیا جائے- اسی طرح نماز جمعہ کی صحت کے لئے شرائط، فقہاء نے اپنے دور کے مطابق مقرر کیے تھے اور اپنے اعتبار سے ممالک کی شرعی تقسیم اور گاؤں اور شہر کی تعریف کی تھی، اب ضرورت ہے اس بات کی کہ فقہائے سابقین کی ان تعریفات و تحدیدات پر نظر ثانی کی جائے—— برصغیر کے سرکردہ علما و فقہا کے حضور ہم مذکورہ مطالبات تسلیم کرنے کی وکالت تو نہیں کر سکتے- لیکن یہ ضرور ہے کہ ان مطالبات سے یکسر چشم پوشی یا اعراض بھی نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی یہ رویہ اس مسئلہ کا مستقل حل ہے-

اصول فقہ میں اجتہاد کے تعلق سے آج کچھ خام فکر افراد یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا ضرور ہے کہ ائمۂ اربعہ نے جو اصول بنا دیے ہم آج بھی انہی کو سینے سے لگائے رکھیں، ہمیں خود سے براہ راست کتاب و سنت کی رہنمائی میں اصول وضع کرنے چاہیے- حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کی باتیں وہ کرتے ہیں جو شریعت کے حروف ابجد سے بھی واقف نہیں، اب انہیں کون بتائے کہ اس طرح کا اجتہاد، اجتہاد مطلق کے باب سے ہے، جو در حقیقت مجتہد مطلق کا عمل ہے، جو کسی کا مقلد نہیں ہوتا، نہ اس کا جسے اجتہاد و تقلید کے معنی تک نہیں معلوم، نہ ہی یہ اس کا عمل ہے جس نے خیر القرون کے اعلم و افقہ مجتہدین کی تقلید کی بجائے شاذ و منفرد رائے رکھنے والے متأخر علما کی غلامی کا پٹہ اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے-

مقلد یا غیر مقلد ہونے کی بنیاد در حقیقت اصول فقہ میں اجتہاد کرنے یا نہ کرنے پر ہی ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی اور امام احمد رضا بریلوی اور معاصر جبال علم و فن، حنفی علماء و فقہاء اسی معنی میں حنفی ہیں کہ انھوں نے اصول میں امام ابو حنیفہ کی تقلید کی، یہی وجہ ہے کہ فروعیات میں بہت سے اختلافات اور تفردات کے باوجود یہ تمام حضرات حنفی ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ آسمان شریعت کے ان تمام ماہ و نجوم نے امام ابو حنیفہ کی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ ان کے اوپر امام کے اصول کی صداقت روشن ہوئی اور انھوں نے امام ابو حنیفہ کا بابصیرت اتباع کیا- موجودہ دور کے تمام علما و مشائخ بھی کسی نہ کسی امام کے مقلد ہیں، کوئی بھی غیر مقلد نہیں، کیوں کہ غیر مقلد صرف مجتہد مطلق ہو سکتا ہے اور اجتہاد مطلق کا دروازہ باوجود اس کے کہ آج بھی کھلا ہوا ہے مگر کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو اس میں داخل ہونے کی صلاحیت یا کم از کم جرأت ہی رکھتا ہو- جرأت کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ آج یہ کہنے والے تو بہت ہیں کہ کیا ضرور ہے کہ ہم آج بھی ائمہ کی تقلید کریں لیکن عملی طور پر کوئی اصول اجتہاد وضع کرے، ایسا ایک شخص بھی نہیں- ہاں یہ غلط فہمی ضرور رائج ہو گئی ہے کہ شیخ ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ کی تقلید کو لوگ مخالفتِ تقلید سمجھ بیٹھے ہیں جب کہ یہ تقلید خود اتنی جامد ہے کہ ایسے مقلدین ''مدارِ حق'' شیخ ابن تیمیہ، ابن قیم اور البانی کے فرمودات میں منحصر مانتے ہیں اور طرفہ یہ کہ ان کی بات خواہ کتنی ہی قوی دلائل سے رد کر دیجیے وہ اپنے موقف سے اس اعتقاد کے ساتھ چمٹے رہیں گے کہ وہی حق ہے اور ان کے مخالفین ہزارہا ہزار دلائل رکھنے کے باوجود تقلید جامد کے شکار ہیں-

عصر حاضر میں اجتہاد کی بات آ ہی گئی ہے تو عالم عرب کے ان جدید مجتہدین کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو اجتہاد کیا کر رہے ہیں، شریعت کے شیش محل میں بیٹھے مجتہدین سابقین پر سنگ باری فرما رہے ہیں، اپنی ژرف نگاہی اور گہرے تفقہ سے ایسے ایسے لطیف نکات اور اجتہادات علمیہ پیش فرما رہے ہیں کہ اگر انہیں ابن الجوزی کی ''کتاب

الحمقاء و المغفلین" میں شامل کردیا جائے تو کتاب اور وقیع ہو جائے اور عصر حاضر کے معیار اسلوب پر بھی پورا اترے- اس کی مثال شیخ مراغی سابق شیخ ازھر کا یہ اجتہاد ہے کہ مجتہد کے لئے زبان عربی سے آشنا ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح بعض دوسرے مجتہدین کا ٹیلی ویژن پر جواز اقتدا کا فتویٰ بھی اسی ذیل میں آتا ہے-

اسی نوعیت کا وہ اجتہاد بھی ہے جو ہندوستان میں جاوید اختر، شبانہ اعظمی، پروفیسر طاہر محمود اور کبھی کبھی صحافت مآب جناب عزیز برنی فرماتے ہیں- اس طرح کے لوگ بڑے ہی شد و مد کے ساتھ اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہندومت میں پنڈتوں اور یہودیت وعیسائیت میں ربّیوں اور راہبوں کا شریعت پر تسلط ہے، مگر اسلامی شریعت پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری نہیں- اب اس جہالت پر کب تک ماتم کیا جائے کہ شریعت اسلامیہ پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری نہ ہونے کا صرف یہ معنی ہے کہ اس پر کسی خاندانی طبقہ کا تسلط نہیں، اس میں جس طرح کسی سید زادے عالم کو اپنی بات کہنے کا حق ہے ایک معمولی خاندان کے فرزند کو بھی ہے جس نے علوم شریعت حاصل کیے ہوں- یہ معنی نہیں کہ شریعت میں عالم و جاہل یکساں طور پر نکات آفرینی کے مجاز ہیں- قرآن کا واضح حکم ہے هل یستوی الذین یعلمون و الذین لایعلمون جاہل و عالم برابر نہیں ہو سکتے- مزید یہ کہ شریعت اسلامیہ میں گفتگو فقہ و قانون کی گفتگو ہے اور یہ گفتگو وہی کر سکتا ہے جس نے قوانین اسلامیہ کا گہرا مطالعہ کیا ہو، صرف اسلام کی تاریخ، تفسیر کا مطالعہ اور بخاری و مسلم کے اردو یا انگریزی ترجمے پڑھ لینے سے بھی کسی کو شرعی قوانین میں لب کشائی کا حق نہیں دیا جا سکتا، یہ تو اختصاص (Specialization) کی بات ہے جسے شاید موجودہ دور میں بہت زیادہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں-

خلاصہ یہ کہ نہ تو اجتہاد کرنا جرم ہے اور نہ تقلید کرنا حرام، جو اجتہاد کے اہل ہوں ان کے لیے تقلید ناجائز ہے اور جو تقلید کے اہل ہیں ان کے لیے اجتہاد ناجائز- یہ کھلی ہوئی بات ہے جسے ذہن نشین رکھنا چاہیے- لیکن بایں ہمہ ہر آدمی کو طلب مزید کی کوشش جاری رکھنی چاہیے، ذہن و فکر کو مقفل کر دینا انسانی ترقی کے آگے بند باندھ دینے کے مرادف ہے- ہر شخص کو بارگاہِ خدا میں رب زدنی علما کی دعا کرنی چاہیے اور اپنے طور پر اس کی بھرپور کوشش بھی- اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه و ارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابه-

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد☆

تقلید شوق یا ضرورت؟

(۱) **تقلید** ہر انسان کی ضرورت ہے، ہر مسلمان کی بھی ضرورت ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں...... تعلیم و تہذیب اور تمدن میں ہر قسم کی ترقیاں اسی کی مرہون منت ہیں، تقلید کی ضرورت نہ ہوتی تو قرآن حکیم کافی تھا، حیات پاک کا عملی نمونہ تقلید کی اہمیت پر گواہ ہے، تقلید کا حکم تو قرآن میں بھی ہے (۱) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑیں، ایک اللہ کی کتاب دوسری اس کے رسول کی سنت، جب تک ان دونوں کو تھامے رہو گے ہرگز ہرگز گمراہ نہ ہو گے (۲)

(۲) قرآن حکیم عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہو گیا تھا، عہد صدیقی میں کتاب ہوا، عہد عثمانی میں مختلف علاقوں میں پھیلا دیا گیا (۴) بلکہ عہد فاروقی ہی میں دور دراز علاقوں میں پھیل چکا تھا (۵)

(۳) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم اور اس اختیار کی روشنی میں جو قرآن حکیم ہی نے آپ کو عطا فرمایا تھا (۶) مختلف علاقوں میں دستاویزی صورت میں احکام ارسال فرمائے (۷) صحابہ کرام نے ان کو محفوظ رکھا اور ذاتی طور پر احادیث شریفہ کی حفاظت فرمائی، کیوں حفاظت نہ فرماتے کہ محبوب کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے- اس قسم کے بہت سے صحائف (مجموعے) موجود تھے، مثلاً صحیفہ صدیقی، صحیفہ علوی، صحیفہ سمرہ، صحیفہ صادقہ، صحیفہ صحیحہ ۸ (قبل ۵۸ھ) وغیرہ وغیرہ-

(۴) ہر صحابی کا یہ منصب نہ تھا کہ وہ از خود قرآن و حدیث کی روشنی میں فتوے دیتا یا فیصلے کرتا، کبار صحابہ نے یہ فرض ادا کیا، خلفائے راشدین اور صحابہ کے فیصلے اور فتوے بھی جمع کیے گئے، چاروں خلفاء کے فیصلے شائع ہو چکے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے فتوے بیس ۲۰ جلدوں میں مرتب ہوئے تھے- (۹)

(۵) قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف دین کی سمجھ رکھنے والے ہی قرآن کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں (۱۱) ہر کس و ناکس یہ سمجھ نہیں رکھتا کہ قرآن و حدیث سے مسائل نکالے اور فیصلے دے، اسی لیے قرآن کریم میں علم اور علم والوں کا ذکر کیا گیا ہے (۱۲) اور حکمت و فقاہت والوں کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے (۱۲) تا کہ دین سے بیگانہ کوئی پڑھا لکھا دین میں مداخلت نہ کرے اور یہ بات قرآن حکیم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر کتاب کو سمجھنے کے لیے اس کے اہل کی ضرورت ہوتی ہے، ہر زباں داں اس کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، کتاب سمجھنے کے لیے صرف زبان ہی کافی نہیں، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہیے-

(۶) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد کبار صحابہ کی تقلید کی، انہیں کی تقلید تابعین نے بھی کی، پھر تبع تابعین نے کبار تابعین کی تقلید کی، اس کے بعد ائمہ اربعہ کی تقلید کا سلسلہ شروع ہوا اور تسلسل برقرار رہا، حتیٰ کہ تقلید کا یہ عمل اپنی انتہا کو پہنچا- یہ حقیقت بھی قابل توجہ ہے کہ ائمہ حدیث بھی مقلد تھے، چنانچہ امام بخاری، شافعی تھے، ابن ماجہ، مالکی تھے، امام طحاوی، حنفی تھے، ابن تیمیہ و ابن قیم حنبلی تھے، شاہ ولی اللہ، حنفی تھے وغیرہ وغیرہ- اور ائمہ اربعہ کی یہ تقلید بھی اس لیے کی گئی کہ وہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب اور بہت قریب ہیں، قریب کا مشاہدہ دور والے سے ہمیشہ زیادہ بہتر اور صحیح ہوتا ہے، کوئی معقول انسان قریب والوں کو چھوڑ کر دور والوں کی بات نہیں مانتا-

(۷) جن ائمہ اربعہ کی عالم اسلام تقلید کرتا ہے ان کا مبارک عہد پہلی صدی ہجری سے لے کر تیسری صدی ہجری تک ہے، امام ابو حنیفہ ۸۰ھ سے قبل یا ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ء میں انتقال فرمایا- امام مالک نے ۱۷۹ھ میں انتقال فرمایا- امام شافعی نے ۲۰۴ھ میں انتقال فرمایا- امام احمد بن حنبل نے ۲۹۱ھ میں انتقال فرمایا- گویا ائمہ اربعہ کا تعلق اس مقدس زمانے سے تھا، جس کو ''خیر القرون'' کہا جاتا ہے اور جس کی فضیلت حدیث شریف میں آئی ہے (۱۳) اس فضیلت سے کسی کو انکار نہیں-

(۸) ائمہ اربعہ نے قرآن کریم، حدیث کے ذخیروں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتووں اور فیصلوں کو سامنے رکھا اور اس دانائی حکمت سے

☆E-5-6/2, Nazimabad, Karachi, Pakistan

کام لیا، جس کا قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے اور اس سلیقے سے سب کچھ سیکھا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سکھایا (۱۵) یہ سمجھنا کہ ائمہ اربعہ احادیث سے غافل تھے اور من مانی پر عمل کیا کرتے تھے، غیر مؤرخانہ اور طفلانہ خیال ہے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں- ہر مسئلے پر غور کیا جاتا ہے، جبھی حل سامنے آتا ہے- ائمہ اربعہ و مجتہدین نے بھی قرآن و حدیث میں غور وفکر فرمایا اور ہمارے ہزاروں مسائل حل فرمائے، اب اس غور وفکر کو "من مانی رائے" سے تعبیر کرنا ایک ایسا ظلم ہے، علم و دانش کی تاریخ میں جس کی مثال نہیں ملتی اور ایک ایسا الزام و بہتان ہے، عقل و دانائی کی تاریخ میں جس کی نظیر نہیں ملتی-

(۹) بعض صحابہ صرف محدث تھے، بعض محدث بھی تھے اور فقیہ بھی، بعض تابعین صرف محدث تھے، بعض محدث بھی تھے اور فقیہ بھی، بعض تبع تابعین صرف محدث تھے، بعض محدث بھی تھے اور فقیہ بھی، محدث کا فقیہ ہونا ضروری نہیں، فقیہ کا محدث ہونا ضروری ہے، محدثین، نقد و جرح کے بعد احادیث جمع کرتے ہیں، مجتہدین و فقہاء انہیں احادیث سے مسائل کا استنباط و استخراج کرتے ہیں- ائمہ مجتہدین سے انکار کرنا ایک روشن حقیقت سے انکار کرنا ہے- اس حقیقت کو ایک مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے جو بات ذہن نشین کرنے کے لیے پیش کی جا رہی ہے- اس کا قرآن و حدیث کی عظمتوں سے کوئی تقابل نہیں -غور فرمائیں! امراض جسمانیہ کے علاج کے لیے جڑی بوٹیاں جمع کرنے والی ایک جماعت ہے، ان کے خواص دریافت کرنے والی دوسری جماعت ہے، ان سے مختلف شکلوں میں ادویات بنانے والی تیسری جماعت ہے، امراض کی تشخیص اور ادویات کو تجویز کرنے والی چوتھی جماعت ہے- اب اگر کوئی یہ کہے کہ سوائے پہلی جماعت کے جڑی بوٹیوں کو سب نے چھوڑ دیا، اس لیے ہم سب کو چھوڑ کر وادیوں اور صحراؤں میں خود جڑی بوٹیاں تلاش کریں گے، خود ہی خواص دریافت کریں گے، خود ہی ادویات بنائیں گے، خود ہی تشخیص کریں گے، خود ہی تجویز کریں گے، خود ہی آپ اپنا علاج کریں گے تو ایسے شخص کے بارے میں آپ کیا فیصلہ کریں گے؟ کیا اس طرز عمل کو معقولیت سے تعبیر کریں گے؟ ...... عہد نبوی سے احادیث کا تحریری سرمایہ مسلسل منتقل ہوتا چلا آیا، ہاں کتابی صورت میں مدون نہ ہوا تھا، پھر یہ اہم کام بھی ہو گیا، غالباً سب سے پہلے امام ابوحنیفہ کا مجموعہ احادیث کتابی صورت میں مدون ہوا، جس کا نام "کتاب الآثار" رکھا گیا (۱۶) پھر امام مالک نے مؤطا (۱۷) مرتب کی، اس کے بعد امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد (م-۱۸۹ھ) نے مؤطا مرتب کی، پھر ائمہ حدیث، حدیث کے تحریری سرمایہ کو مسلسل مرتب کرتے رہے- چناں چہ امام احمد بن حنبل (م-۲۴۱ھ) نے مسند مرتب کی، (۱۸) امام بخاری (م-۲۵۶ھ) نے صحیح بخاری، امام مسلم (م-۲۶۱ھ) نے صحیح مسلم، ابن ماجہ (م-۲۷۳ھ) نے سنن ابن ماجہ، امام ترمذی (م-۲۷۹ھ) نے جامع ترمذی، امام نسائی (م-۳۰۳ھ) نے سنن نسائی، امام طحاوی (م-۳۲۱ھ) نے شرح معانی الآثار وغیرہ وغیرہ- یہ کہنا کہ حدیث کا سرمایہ دو تین سو برس کے بعد وجود میں آیا، تاریخی نقطہ نظر سے سراسر لغو ہے، ہر کام ابتدائی مدارج طے کر کے اپنے عروج کو پہنچتا ہے، یہ ایک فطری عمل ہے، جس کو نظر میں رکھنا چاہیے، محدثین نے جو احادیث جمع فرمائیں، یہ وہی احادیث تھیں، جن کو سامنے رکھ کر ائمہ مجتہدین نے مسائل کا استخراج و استنباط کیا-

(۱۰) امام ابوحنیفہ، ائمہ اربعہ اور تابعین میں بعض خصوصیات کی وجہ سے نہایت ممتاز تھے، آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت فرمائی، کبار صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے فیض یافتگان سے آپ نے فیض حاصل کیا (۱۹) صحابی رسول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (م-۹۳ھ) حضرت عبد اللہ بن حارث رضی اللہ عنہ (م-۹۷ھ) حضرت عبداللہ بن اوفی رضی اللہ عنہ (م-۸۹ھ) آپ کے استاد تھے (۲۰) آپ کے اساتذہ ہزار سے زیادہ ہیں-

(۱۱) اسلامی حکومت کا دائرہ جس سرعت سے پھیل رہا تھا اور جس سرعت سے نئے نئے مسائل سامنے آ رہے تھے، اسی سرعت سے مجتہدین کرام نے فقہ کی تدوین کی اور عالم اسلام کی ایک بڑی مشکل حل کر دی، امام ابوحنیفہ نے ایک بورڈ تشکیل دیا، جس میں ہر فن کے ماہرین موجود تھے، کیوں کہ قرآن و حدیث فہمی کے لیے صرف زبان عربی جاننا کافی نہیں مختلف موجودہ اور آئندہ آنے والے مسائل پر بحث و مباحثہ اور غور و فکر ہوا اور اس غور وفکر کے نتیجے میں تراسی ہزار مسائل کا حل قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کیا گیا (۲۲) قانون شریعت کا یہ عظیم مجموعہ ۱۱۴ھ سے قبل مرتب ہو گیا تھا- امام ابوحنیفہ کا یہ عظیم علمی کارنامہ ہے اور امت مسلمہ پر عظیم احسان ہے- تراسی ہزار مسائل پر مشتمل قانون شریعت کے مرتب ہونے کے بعد امام ابوحنیفہ نے بورڈ

کے اراکین اور ایک ہزار مخصوص طلبہ کے سامنے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس کے مندرجہ ذیل نکات عالم اسلام کے ججوں، منصفوں، قاضیوں، مفتیوں کے لیے مشعل راہ ہیں، ان نکات میں مومنانہ فراست بھی ہے اور مدبرانہ وحکیمانہ بصیرت بھی، ملاحظہ فرمائیں-

(ا) میں تم کو اللہ کی قسم اور اس علم کا واسطہ دیتا ہوں کہ اس علم کو کبھی رسوا نہ کرنا

(ب) قضا کا عہدہ (جج یا منصفی کا عہدہ) اس وقت تک درست ہے جب تک قاضی (جج یا منصف) کا ظاہر و باطن پاک ہو-

(ج) تم میں جو اس عہدے کو قبول کرے وہ اپنے اور عوام کے درمیان رکاوٹیں پیدا نہ کرے-

(د) ہر حاجت مند کی تم تک رسائی ہو-

(ھ) امیر و حاکم اگر مخلوق خدا کے سامنے غلط رویہ اختیار کرے تو قاضی (جج یا منصف) اس سے باز پرس کرے (۲۳)

(۱۲) اس میں شک نہیں کہ امام ابو حنیفہ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم معجزہ تھے- قرآن کریم میں سورہ جمعہ کی آیات نمبر ۲، ۳ جب نازل ہوئی، جس میں فرمایا گیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ''مستقبل میں آنے والوں کو بھی پاک کرتے اور علم عطا فرماتے ہیں''، تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان آنے والوں کے بارے میں دریافت کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہ دیا، پھر عرض کیا، جواب نہ ملا، پھر عرض کیا، جواب نہ ملا، پھر عرض کیا تو راز سے پردہ اٹھایا اور امام ابو حنیفہ کی طرف واضح اشارہ فرمایا (۲۴)

ان شاء اللہ اس کی تفصیل بسیط مقالے میں پیش کی جائے گی، محدثین میں جلا الدین سیوطی علیہ الرحمہ (م-۹۱۱ھ) اور شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ (۲۵) (م-۱۱۷۶ھ) نے اس حدیث شریف کا مصداق امام ابو حنیفہ کو قرار دیا ہے، امام طحاوی (۲۶) (م-۳۲۱ھ) اور ابن حجر ہیثمی (۲۷) (م-۹۷۳ھ) نے امام ابو حنیفہ کو تاجدار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا ہے، قرآن حکیم میں لفظ ''حنیف'' آیا ہے (۲۸) دین حنیف (۲۹) مسلم حنیف (۳۰) اور حنفاء (۳۱) بھی آیا ہے-

(۱۳) ابن خلدون نے چھ سو برس پہلے (۳۲) امیر خسرو نے سات سو برس پہلے، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے چار سو برس (۳۳) پہلے، عالم اسلام بالخصوص برصغیر میں اہل سنت و جماعت اور حنفیوں کی اکثریت کا ذکر کیا ہے، دور جدید کے فاضل ڈاکٹر صبحی محمصانی نے احناف کو روئے زمین کے مسلمانوں کا دو تہائی قرار دیا ہے (۳۴) یعنی تاریخی طور پر احناف کو ملت اسلامیہ کا سواد اعظم تسلیم کیا ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے دعا کی کہ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہو، اللہ نے دعا قبول فرمائی (۳۵) میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہ ہوگی (۳۶) آپ نے فرمایا جماعت کی پیروی کرو (۳۷) اور فرمایا، سواد اعظم (جماعت کثیر) کی پیروی کرو (۳۸) یہ بھی فرمایا، جماعت اور عام مومنین کی پیروی کرو (۳۹) یہ بھی فرمایا، جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے (۴۰) امیر شکیب ارسلاں نے حسن المساعی کے حاشیے میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ابو حنیفہ کی پیرو ہے، خود غیر مقلد حضرات میں نواب صدیق حسن خاں، مولوی ثناء اللہ امرتسری نے بھی یہی لکھا ہے اور غیر مقلد عالم مولوی محمد حسین بٹالوی نے غیر مقلدین کو ''آٹے میں نمک کے برابر'' قرار دیا ہے (۴۱) اللہ تعالیٰ نے امام ابو حنیفہ کو جو قبولیت عامہ عطا فرمائی وہ وہی مقبولیت و محبوبیت ہے، جو وہ اپنے خاص بندوں کو عطا فرماتا ہے اور جس کا حدیث شریف میں بھی ذکر ہے ۴۲...... جو ان مقبول و محبوب بندوں سے لڑائی مول لیتا ہے ان سے اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

وہ مجھ سے جنگ کے لیے تیار ہو جائے (۴۳)

کون ایسا بد نصیب انسان ہوگا جو اللہ سے جنگ کے لیے تیار ہو؟

(۱۴) جماعتی شکل میں ائمہ اربعہ سے بیزاری اور تقلید سے فرار کا رجحان دور غلامی کی یادگار ہے اور یہ انکار و بیزاری بھی مخصوص نفوس قدسیہ سے ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بیزاری اور فرار کی اصل وجہ سیاسی ہے، مذہبی نہیں- اس قیاس و گمان کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لاہور میں اہل حدیث کے ہیڈ کوارٹر سے اہل قرآن کی تحریک نے جنم لیا، یہ انکشاف اہل حدیث عالم مولوی محمد حسین بٹالوی نے فرمایا ہے: (اشاعۃ السنۃ ج ۱۹، شمارہ ۸، ص: ۲۵۲) آپ خود غور فرمائیں کہاں اہل حدیث اور کہاں اہل قرآن! ان دونوں تحریکوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو متاثر کیا، اس لیے بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے یہ ایک سازش ہے، نابلس کے جج اور محکمہ انصاف کے وزیر یوسف اسماعیل نے اس اندیشہ کا اظہار کیا ہے- (شواہد الحق، لاہور ۱۹۸۸ء، ص: ۴۹) جیسا کہ عرض کیا گیا تقلید کے بغیر چارہ نہیں، کیوں کہ وہ انسان کی ضرورت ہے، غیر مقلدین بھی

تقلید کے لیے مجبور ہیں، خود غیر مقلد عالم نواب وحید الزماں صاحب اپنے مسلکی ساتھیوں سے پوچھتے ہیں:

''ہمارے اہل حدیث بھائیوں نے ابن تیمیہ اور ابن قیم اور شوکانی اور شاہ ولی اللہ اور مولوی اسماعیل کو دین کا ٹھیکیدار بنا رکھا ہے- بھائیو! ذرا غور کرو اور انصاف کرو، جب تم نے ابوحنیفہ، شافعی کی تقلید چھوڑی تو ابن تیمیہ یا ابن قیم اور شوکانی، جو ان سے بہت متاخر ہیں، ان کی تقلید کی کیا ضرورت''؟ (۴۴)

(۱۵) تاریخ اسلام میں ''اہل حدیث'' نام کا کوئی فرقہ نہیں ملتا، یہ لفظ صرف اور صرف ماہرین حدیث کے لیے مخصوص تھا- چوں کہ غیر مقلدین نے یا تو انگریزوں کی امداد و اعانت سے اپنی حکومت قائم کی (۴۵) یا برصغیر میں انگریزوں کی حکومت قائم کرنے میں ان کی پوری پوری مدد کی (۴۶) اس لیے عالم اسلام بالخصوص برصغیر کے مسلمان ان سے نفرت کرتے تھے (۴۷) اور ان کو ''وہابی'' کہتے تھے- یہ حضرات مسلم حکومت کے مقابلے میں انگریزی حکومت کو رحمت سمجھتے تھے، (۴۸) انہوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حاکموں کو اپنی وفاداریوں کی یاد دلاتے ہوئے درخواست کی کہ ان کو ''وہابی'' کے بجائے ''اہل حدیث'' کہا جائے (۴۹) اور اس سلسلے میں نوٹیفیکیشن جاری کیا جائے- چناں چہ درخواست منظور ہوگئی اور نوٹیفیکیشن جاری کر دیا گیا (۵۰) ان حقائق کی تائید اہل حدیث عالم مولوی محمد حسین بٹالوی کے بیانات سے ہوتی ہے، ورنہ ایسے بیانات ناقابل اعتبار سمجھے جاتے اور شاید شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھے جاتے- مگر اب تاریخی حقائق کی روشنی میں روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ غیر مقلدین کو ''اہل حدیث'' نام انگریزوں نے دیا ہے- ۱۸۵۷ء سے پہلے اس نام کا مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہ تھا-

(۱۶) ہم نے علمی اور تاریخی حقائق غیر جانبداری کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں، اب آپ خود اپنی عقل اور ضمیر سے یہ بات پوچھیں-

- جو فرقہ انتہائی اقلیت میں ہو
- جس نے انگریزوں کی حمایت کی ہو
- جو مسلمانوں کی حکومت سے انگریزوں کی حکومت کو اچھا سمجھتا ہو
- جس کا نام ہی انگریزوں نے رکھا ہو
- جو سواد اعظم سے بیر رکھتا ہو، جس کی پیروی کا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور اس کو مشرک کہنے سے بھی دریغ نہ کرتا ہو

(۵۱) وہ حق پر ہے یا وہ جماعت حق پر ہے؟

- جو انتہائی اکثریت میں ہو
- جس نے کبھی انگریزوں کی حمایت نہ کی ہو
- جو انگریزوں کی حکومت سے مسلمانوں کی حکومت کو اچھا سمجھتی ہو
- جس کا نام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اہل السنۃ الجماعۃ'' رکھا ہو-
- جو خود ملت اسلامیہ کا سواد اعظم ہو

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ سے محبت کا تقاضا تو یہی ہے کہ آپ کا ہر ہر حکم مانیں، آپ نے فرمایا اگر کسی مسئلے میں الجھ جاؤ تو دل سے فیصلہ طلب کیا کرو (۵۲) ہاں، دل کیا کہتا ہے؟ دل کی سنیں اور اسی پر عمل کریں- ہاللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن وحدیث سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے- آمین

حواشی و حوالہ جات

(۱) قرآن حکیم، سورۂ نسآء، آیت نمبر ۱۲۵، سورۂ نحل، ۱۶، آیت نمبر ۱۲۳

(۲) مشکوۃ شریف، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ج ۱، ص: ۸۳ (۱۳۰۱ء مصر)

(۳) محمد بن اسماعیل بخاری، بخاری شریف، ج ۳، ص ۱۴۳، ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، ج ۹

(۴) جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص: ۹-۱۴۵، مطبوعہ کراچی

(۵) ابن حزم، کتاب الفصل والملل والاہواء والنحل، قاہرہ، ج: ۲، ص: ۸۷

(۶) قرآن حکیم، سورۂ حشر، آیت نمبر ۷

(۷) ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ، ج ۱، ص: ۱۷، ابن حجر عسقلانی، الاستیعاب لاسماء الصحابہ، ج: ۲، ص: ۴۳۷

نوٹ:- (۱) ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مقیم پیرس) نے اپنی تالیف، الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ (مطبوعہ مصر) میں دو سو ۲۰۰ سے زیادہ دستاویزات نقل کی ہیں، پھر نئے اڈیشن میں چالیس ۴۰ دستاویزات کا اور اضافہ کیا ہے (۲) محمد بن فرح المعروف بابن الطلاع الاندلسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر مشتمل ایک مجموعہ ''اقضیۃ الرسول'' مرتب کیا، جس کے اردو ترجمہ کو مدینہ یونیورسٹی، مدینہ منورہ کے ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی نے مدون کیا ہے اور دائرہ معارف اسلامیہ لاہور نے شائع کیا ہے- یہ ۷۹۲ صفحات پر مشتمل ہے- مسعود

(۸) مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر ۶۵۱، ۶۸۲، ۶۹۳، جامع البیان ج: ۱، ص: ۲۷

نوٹ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگرد حضرت ہمام بن منبہ بن کامل بن شیخ

السجانی الصنعانی الانباوی کے لیے مرتب فرمایا تھا جو "صحیفہ ہمام بن منبہ" کے نام سے حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مقیم پیرس) نے اس کو مدون کیا اور اس پر فاضلانہ مقدمہ تحریر فرمایا۔ صحیفہ صحیحہ کو محدثین نے اپنی اپنی مسانید، جوامع اور صحاح میں شامل کیا ہے۔ مسعود

(۹) حافظ ابن قیم، الوابل الصیب ص:۷۸
(۱۰) قرآن حکیم، سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۲۳، سورۂ نسأء آیت نمبر ۸۳
(۱۱) قرآن حکیم، سورۂ عنکبوت، آیت نمبر ۴۳، سورۂ شعراء آیت نمبر ۱۹۷، سورۂ فاطر، آیت نمبر ۲۸
(۱۲) قرآن حکیم، سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۲۵۹، بخاری شریف، ج:۱۷ص:۲۴
(۱۳) مشکوٰۃ شریف، کتاب المناقب، باب مناقب صحابہ، حدیث نمبر ۴
(۱۴) قرآن حکیم، سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۶۹، ۱۵۱، سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۶۴، سورہ نساء آیت نمبر ۱۱۳، سورہ نحل، آیت نمبر ۱۲۵
(۱۵) سنن ابوداؤد، لاہور، پارہ نمبر ۲۳، باب نمبر ۱۷، حدیث نمبر ۱۹۶
(۱۶) کتاب الآثار (براویت امام ابویوسف)، کتاب الآثار (بروایت حسن بن زیاد) کتاب الآثار (بروایت امام محمد)، کتاب الآثار (بروایت زفر بن ہذیل)
(۱۷) دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ج ۱۸:ص:۳۷۲
(۱۸) مسند امام احمد بن حنبل، (۱۸ مسانید کا مجموعہ جس کو از سر نو مرتب کر کے مصر سے بیس جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے)
(۱۹) علامہ بیاضی، اشارات المرام ص:۲۰، ابوزہرہ مصری، حیات امام ابوحنیفہ ص:۲۷۵
(۲۰) حافظ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج:۱ص:۷۶-۷۹
(۲۱) خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج:۲۲ص:۱۰۸
(۲۲) ذیل الجواہر، ج:۲ص:۴۷۲
(۲۳) معجم المصنفین ج ۲ص:۵۵
(۲۴) بخاری شریف، ج:۲ص:۹۷۳، حدیث نمبر ۸۸۹ مطبوعہ لاہور ۱۹۹۱ء
(۲۵) مکتوبات شاہ ولی اللہ، ص:۱۶۸
(۲۶) درمختار، مطبوعہ دہلی، ص:۴۵
(۲۷) ابن حجر ہیثمی، الخیرات الحسان، ص:۶
(۲۸) حنیف کے معنی سیدھا، اسلامی احکام پر عمل پیرا (المنجد، ص:۲۴۳) نیز مائل بہ حق، دین کا سچا، باطل سے امر حق کی طرف آنے والا (لغات کشوری، لکھنو، ص:۱۶)
(۲۹) قرآن حکیم، سورہ روم، آیت نمبر ۳۰
(۳۰) قرآن حکیم سورہ آل عمران، آیت نمبر ۹۵
(۳۱) قرآن حکیم، سورہ بینہ، آیت نمبر ۵
(۳۲) مقدمہ ابن خلدون، ص:۴۶۹
(۳۳) احمد سرہندی، رد روافض، لاہور ۱۹۹۲ء، ص:۹، مکتوبات شریف، دفتر دوم، مکتوب نمبر ۵۵
(۳۴) ڈاکٹر صبحی محمصانی: فلسفہ شریعت اسلام ص:۴۸
(۳۵) مسند احمد بن حنبل ج:۶، ص:۳۹۶، علی ہیثمی، مجمع الزوائد، باب اجماع، ج:۱، ص:۱۷۷
(۳۶) مشکوٰۃ شریف، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ج:۱ص:۸۰
(۳۷) ایضاً، ج:۱ص:۸۴
(۳۸) ایضاً، ج:۱ص:۸۴، سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب السواد الاعظم ص:۳۰۳
(۳۹) مشکوٰۃ شریف، کتاب الایمان، باب الاعتصام ج:۱ص:۸۴
(۴۰) ایضاً، ج:۱ص:۸۰
(۴۱) ترجمان وہابیہ، ص:۱۰، شمع توحید:۴۰، اشاعۃ السنۃ، ج:۷، شمارہ ۱۲، ص:۳۷۰
(۴۲) (ا) بخاری شریف، کتاب الادب، ج:۲، ص:۸۹۲ (ب) مسلم شریف، کتاب البر والصلہ، ج:۲، ص:۳۳۱
(۴۳) ریاض الصالحین بحوالہ بخاری شریف، باب علامات حب اللہ تعالیٰ العبد
(۴۴) محمد حلیم چشتی، حیات وحید الزماں، کراچی، ص:۱۰۲
(۴۵) زمیندار (لاہور) شمارہ ۶ فروری ۱۹۲۲ء
زمیندار (لاہور)، شمارہ ۷ فروری ۱۹۲۲ء
زمیندار (لاہور) شمارہ ۱۰ فروری ۱۹۲۲ء
زمیندار (لاہور) شمارہ ۱۱ فروری ۱۹۲۲ء
(۴۶) اشاعۃ السنۃ لاہور، شمارہ ۹، ج ۸، ص:۲۶۳
(۴۷) سیاست (لاہور) شمارہ ۱۹ فروری ۱۹۲۵ء
(۴۸) مقالات سرسید (مرتبہ اسماعیل پانی پتی)، حصہ نہم، ص:۱۲-۲۱۱ لاہور ۱۹۶۱ء
(۴۹) اشاعۃ السنۃ ج:۱۱، شمارہ:۲، ص:۶۹
(۵۰) (ا) بحوالہ خط نمبر ۱۲۷، مورخہ ۱۵/ اگست ۱۸۸۸ء، (حکومت مدراس کو ارسال کیا گیا) (ب) بحوالہ خط نمبر ۱۵۶، مورخہ ۴ مارچ ۱۸۹۰ء، (حکومت بنگال کو ارسال کیا گیا) (ج) بحوالہ خط نمبر ۳۸۶، مورخہ ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء، (حکومت یوپی کو ارسال کیا گیا) (د) بحوالہ خط نمبر ۴۰۷، مورخہ ۱۴/ جولائی ۱۸۸۸ء، (حکومت سی پی کو ارسال کیا گیا) (ہ) بحوالہ خط نمبر ۳۲، مورخہ ۴/ اگست ۱۸۸۸ء، (حکومت بمبئی کو ارسال کیا گیا) وغیرہ وغیرہ
(۵۱) A Glossary of the Tribes, Lahore, 1978, Vol. II, P. 8
(۵۲) (ا) سنن الدارمی، ج:۲، ص:۲۳۶، بیروت (ب) مسند الامام احمد، ج:۴، ص:۲۲۸، مکہ مکرمہ (ج) عین العلم، ص:۲۱، پشاور ۱۲۷۹ء

انٹرویو

(اجتہاد وتقلید پر مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات)

- مولانا محمد احمد مصباحی — جماعت اہل سنت
- مولانا عبد الوہاب خلجی — جماعت اہل حدیث
- مولانا وحید الدین خان — اسلامی مرکز
- مولانا عبد الحمید نعمانی — دیوبندی جماعت

تحریری مباحثہ

(اجتہاد وتقلید پر برصغیر کے مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں کا دلچسپ تحریری مباحثہ)

- بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی — جماعت اہل سنت
- مولانا عطاء الرحمن مکی — جماعت اہل حدیث
- مولانا وارث مظہری — دیوبندی جماعت
- مولانا شفیع مونس — جماعت اسلامی
- مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی (پاکستان) — جماعت اہل سنت

مذاکرہ

(شام کے نامور عالم دین شیخ سعید رمضان البوطی کی ایک غیر مقلد عالم سے علمی گفتگو)

ترجمہ: مولانا نعمان احمد ازہری

انٹرویو

اجتہاد و تقلید پر برصغیر کے مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات

مسئلہ اجتہاد و تقلید انہی مسائل میں ہے جن کو سمجھے بغیر ہر کوئی اظہار خیال کرنا اپنا فطری حق سمجھتا ہے۔ اگر اس مسئلے میں ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن قیم اور البانی جیسے افراد امت کے اجماعی موقف سے الگ راہ نکالنے کی کوشش کریں، تو ان کے ذاتی دینی مطالعے کے پیش نظر انہیں نظر انداز بھی کر دیا جائے لیکن حیرت تو یہ ہے کہ آج ہر بالشتیہ جسے نہ فقہ و حدیث کے معنی معلوم ہیں اور نہ قیاس و اجتہاد کا مفہوم، آستین چڑھائے منصب اجتہاد پر براجمان ہونے کے لیے بے قرار نظر آتا ہے، جس کے نتیجے میں ۹۵ رفی صد یا اس سے زائد افراد مقلدین و غیر مقلدین کے اصل اختلاف سے ناواقف ہیں۔ اسی ناواقفی کو ختم کرنے اور معلومات و حقائق عام کرنے کے لیے ہم نے مختلف مکاتب و مسالک کی سرکردہ ذی علم و فہم شخصیات کے انٹرویوز شامل کیے تا کہ اجتہاد و تقلید پر پڑے جہالت کے دبیز پردے چاک ہوں اور حقیقت عوام کے حضور بے نقاب ہو جائے۔ عصر حاضر کے اس متنازع ترین موضوع کے تعلق سے ۱۵ ر سوالات پر ترتیب وار جن چار شخصیات کے جوابات حاضر ہیں وہ یقیناً معاصر مذہبی و علمی حلقے میں محتاج تعارف نہیں ہیں اور ان کی باتوں کا بہر حال اپنے اپنے حلقوں میں وزن اور اعتبار ہے۔ یہ چار نام یہ ہیں (۱) **مولانا محمد احمد مصباحی** صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور (۲) **مولانا عبد الوہاب خلجی** سابق ناظم عمومی مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، دہلی (۳) **مولانا وحید الدین خان** صدر اسلامی مرکز دہلی (۴) اور **مولانا عبد الحمید نعمانی** سکریٹری و ترجمان جمعیۃ العلما ہند، دہلی۔ یہ یقینی بات ہے کہ ہر شخص بیک وقت ان کی تمام باتوں سے اتفاق نہیں کر سکتا، لیکن ہمارا وجدان ہے کہ طالب حق کی نیت اگر درست ہو تو اسے حقیقت کا سراغ مل ہی جاتا ہے.................................. (ادارہ)

سوال (۱):- قیاس و اجتہاد کی حقیقت کیا ہے؟ اور کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت کیوں پڑی؟

مولانا محمد احمد مصباحی :- قیاس کا لغوی معنی اندازہ کرنا اور برابری دکھانا اور فقہا کی اصطلاح میں قیاس یہ ہے کہ جو حکم کسی امر کے لیے کسی علت کی بنیاد پر نص سے ثابت ہے وہی حکم اسی علت کی بنیاد پر دوسرے ایسے امر کے لیے ثابت کرنا جس کے بارے میں نص وارد نہیں۔

اجتہاد کے لغوی معنی کوشش و محنت صرف کرنا اور فقہا کی اصطلاح میں فقیہ کا کسی حکم شرعی نظری کے استخراج کے لیے پوری طاقت صرف کرنا۔

کتاب و سنت سے بے واسطۂ قیاس استخراج احکام پر بھی اجتہاد کا اطلاق ہوتا ہے اور منصوص کی روشنی میں علت کی بنیاد پر قیاس کے ذریعہ غیر منصوص کا حکم نکالنے کو بھی قیاس کہا جاتا ہے۔

قیاس کے ارکان و شرائط کی تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، یہاں خاص طور سے بتانے کی بات یہ ہے کہ قیاس کسی ایسے ہی معاملہ میں ہو سکتا ہے، جس کا حکم کتاب و سنت میں صراحۃً بیان نہ ہوا ہو، ائمہ کرام نے قیاس سے اسی وقت کام لیا ہے، جب کتاب و سنت، اجماع امت یا فقہائے صحابہ کے اقوال سے مسئلہ کا حل دست یاب نہ ہوا ہو۔

کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے قیاس و اجتہاد کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں صرف اصول و کلیات اور بعض جزئیات صراحۃً بیان ہوئے ہیں، اصول کی روشنی میں فروع کا بیان اور جزئیات کی تفصیل قرآن نے بیان رسول اور فکر مجتہدین کے سپرد کر دی ہے، ارشاد ہے: وأنزلنا اليك الذكر لتبين للناس ما نزل اليهم ولعلهم يتفكرون (سورہ نحل آیت ۴۴) ''اور اے رسول ہم نے تم پر یہ ذکر نازل فرمایا تا کہ لوگوں کے سامنے تم اسے واضح کرو جو ان کی طرف اتارا گیا اور کہیں وہ خود بھی فکر کریں''۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ احادیث کریمہ میں اگر چہ بے شمار احکام اور اصول و فروع کا ذکر ہوا، پھر بھی عہد صحابہ سے ہی روز بروز ایسے مسائل پیش آتے رہے جن کا جواب صحابہ کرام کو بھی حدیث نبوی میں نہ ملا اور قیاس و اجتہاد کا سلسلہ جاری ہوا، یعنی منصوص کی روشنی میں غیر منصوص امور کے احکام کا استخراج ہونے لگا۔

مولانا عبدالوھاب خلجی: -**قیاس:** ادلہ شرعیہ میں چوتھے نمبر کی دلیل ہے۔ فرع، اصل، علت اور حکم اس کے ارکانِ اربعہ ہیں۔ جب کسی مسئلہ میں کتاب اللہ، سنت مصطفےٰ ﷺ اور اجماع سے دلیل ثابت نہ ہو تو قیاس حجت شرعی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ قیاس کسی نص یا اجماع سے متصادم نہ ہو نیز جس اصل پر فرع کو محمول کیا جارہا ہے وہ اصل، نص یا اجماع سے ثابت ہو۔ قیاس پر قیاس صحیح نہیں ہے۔ نیز علت اور حکم کے درمیان شرعی طور پر معتبر اور مناسب معنی پایا جاتا ہو۔ اسود اور ابیض جیسے طردی اوصاف علت نہیں ہوسکتے۔ تفصیل کے لیے کتب اصول کا مراجعہ کیا جائے۔

اجتہاد: کسی حکم شرعی کو معلوم کرنے کے لیے، غایت درجہ کوشش صرف کرنے کا نام ہے۔ اور اس قسم کے جُہد صرف کرنے والے کو مجتہد کہا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے اجتہاد کے لیے ضروری حد تک ادلہ شرعیہ سے واقف ہو، مثلاً آیاتِ احکام، احکام سے متعلق احادیث اور ان کی صحت وضعف کا تحقیقی علم رکھتا ہو، ناسخ ومنسوخ اور مواقع اجماع واختلاف پر پوری طرح مطلع ہو اور عربی زبان ولغت اور اصول فقہ واستنباط سے بھی بخوبی واقف ہو۔ ایسا شخص اگر معرفت حق کے لیے کوشش کرتا ہے اور جو رائے اس کے سامنے حق ہوکر ظاہر ہوتی ہے وہ کتاب وسنت کے دلائل اور معانی شرعیہ کی روشنی میں درست ثابت ہوتی ہے تو وہ دوہرے اجر کا مستحق ہوتا ہے ورنہ اکہرے اجر کا، جیسا کہ حاکم وقت کے اجتہاد کے متعلق صحیحین میں عبداللہ بن عمرو اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت آئی ہے۔

قیاس واجتہاد کی ضرورت: یقیناً کتاب وسنت کے دلائل سے جو شخص جس قدر زیادہ واقف ہوگا اس کو اجتہاد وقیاس کی اتنی ہی کم ضرورت پڑے گی، تاہم مسائل متجددہ ومتنوعہ کے پیش نظر اجتہاد کی ضرورت واہمیت سے انکار ممکن نہیں، بشرطیکہ مجتہدین امت اجتہاد کی بنیادی اور لازمی شرطوں سے متصف ہوں۔

مولانا وحید الدین خاں: -فقہا چار مصادر شریعت مانتے ہیں، قرآن، سنت، اجماع اور قیاس- میرے نزدیک مصادر شریعت تین ہیں، کتاب، سنت اور اجتہاد، میرے نزدیک قیاس اور اجماع دونوں اجتہاد کے دو درجے ہیں- اجماع کے بغیر جو اجتہاد ہو وہ قیاس ہے اور جس اجتہاد پر عمومی اتفاق ہوجائے وہ اجماع ہے-

اجتہاد دین کی ایک فطری ضرورت ہے، کیوں کہ ساری باتیں نص میں نہیں ہوسکتیں، نص میں صرف بنیادی باتیں ہی ہوتی ہیں- نئے حالات میں ضرورت ہوتی ہے کہ منصوص احکام کا انطباق نئے حالات میں تلاش کیا جائے- اسی کا نام اجتہاد ہے- یہ اجتہاد ہمیشہ جاری رہتا ہے، اسی لیے بخاری میں یہ روایت ہے کہ صحیح اجتہاد پر دگنا ثواب ہے اور اجتہادی خطا پر ایک ثواب، بشرطیکہ نیت درست ہو-

مولانا عبدالحمید نعمانی: -قرآن نے دین کے تعلق سے کہا ہے **الیوم أکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً** دین مکمل ہے اور جب دین مکمل ہے تو کسی بھی شرعی مسئلے میں جس کا تعلق سماج سے ہو یا انسانی ضروریات سے ہو تو اس کا جواب نفیاً یا اثباتاً ہاں یا نہیں میں ملنا چاہیے- بعد کے دور میں امت کے سامنے جو مسائل پیدا ہوئے یا درپیش ہوں گے، مثال کے طور پر انشورنس کا مسئلہ ہے، شیئر کا ہے، اعضاء کی پیوندکاری کا ہے، بین الاقوامی حالات کے پیش نظر جو خارجی و داخلی سطح پر مسائل پیدا ہوئے، دوسرے فرقے سے ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہونے چاہیے، شرعی نقطۂ نظر سے ہم دوسروں سے کہاں تک قریب ہوسکتے ہیں اور دوسروں کو کہاں تک قریب لاسکتے ہیں، اسی طرح ملک وسماج کے مشترک مسائل، اب ان مسائل کے تعلق سے اگر پوچھا جائے کہ بتایئے قرآن میں یا حدیث میں ان کے تعلق سے کیا حکم ہے؟ تو ظاہر ہے کتاب وسنت کے اندر ان کی صراحت نہیں ہے، تو جب نفی یا اثبات میں ان مسائل کے تعلق سے کتاب وسنت سے جواب نہیں ملا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین مکمل کیسے ہوا؟ مکمل کا مطلب ظاہراً تو یہی ہے کہ اب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہ ہو- حالاں کہ یہاں ضرورت پڑ رہی ہے- تو اب یہیں سے ہمیں سمجھنا ہوگا کہ دین کے مکمل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں سارے مسائل صراحت سے مذکور ہیں- دین کے مکمل ہونے کا معنی یہ ہے کہ اصولی طور پر قرآن نے تمام مسائل کا حل پیش کردیا ہے، مثال کے طور پر کسی فرد یا قوم سے مقابلے کی بات، قرآن نے بتایا کہ اس کے لیے ایسی تیاری ہو کہ وہ مرعوب ہوجائے- اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح کے اسلحہ یا وسائل جنگ مدمقابل کے پاس ہوں اس نوعیت کے اسلحے آپ کے پاس بھی ہونے چاہیے، اب اگر آپ کے مقابل کے پاس ایٹم بم ہے یا لیزر بم ہے تو آپ تلوار سے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے- تو

اب اگر کوئی کہے کہ قرآن نے ایٹم بم رکھنے کا حکم تو نہیں دیا ہے، اس لیے مسلم ممالک کو اس کی کیا ضرورت؟ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ قرآن نے اصول بتا دیا ہے، اس اصول کی روشنی میں علم دین کے ماہرین جزئیات کی تحقیق کرتے ہیں اور اس کے مطابق حکم دیتے ہیں- قرآن نے ایک اصول دے دیا کہ ایسی تیاری ہو کہ مدمقابل مرعوب ہو سکے اور ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں اس کے لیے ایٹم بم کی ضرورت ہے-

اس طرح کے جدید مسائل جو سامنے آتے ہیں ان میں بہر حال رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، ان کے حل کی ضرورت ہوتی ہے- حل مسائل کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں- کبھی مجتہدین امت اس نئے مسئلے میں متفق ہو جاتے ہیں اور کبھی ان کے آپس میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے- پہلی صورت کو اصطلاح شریعت میں اجماع کہتے ہیں اور دوسری صورت کو قیاس سے تعبیر کرتے ہیں- اتفاق اور اجماع والی صورت میں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، وہ حکم واجب الاتباع ہوگا- ہاں! اختلاف کی صورت میں یہ ہوگا کہ سارے مجتہدین کا اور ان کی آراء کا احترام کیا جائے گا، لیکن ایک شخص اتباع ان میں سے کسی ایک ہی کا کر سکتا ہے- ایک وقت میں سب کی بات مان لے یہ ممکن ہی نہیں ہے-

جس طرح انبیائے کرام بہت سے ہیں اور ہم پر ہر ایک کا احترام واجب ہے، لیکن جہاں تک ماننے کی بات ہے تو ہم اپنے ہی نبی کو مانیں گے، دوسرے کو نہیں- ائمہ کی پیروی کا بھی یہی حال ہے کہ ہم احترام تو سب کا کریں گے، لیکن مانیں گے اپنے ہی امام کی-

یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ تقلید غیر منصوص مسائل میں ہی ہوتی ہے، جو مسائل کتاب و سنت میں منصوص ہیں، جیسے خدا ایک ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں- تو ان میں ہم کسی کی تقلید نہیں کریں گے، یہ حکم تو صراحت کے ساتھ موجود ہے ہی- اسی طرح ایسے مسائل جن کی صراحت تو قرآن میں ہے لیکن الفاظ کے معنی کے تعین میں اختلاف ہو گیا، قروء ایک ہی لفظ ہے جس کا معنی کسی امام نے حیض بتایا جبکہ دوسرے نے طہر بتایا، نکاح کا اصلی معنی وطی ہے لیکن عقد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، تو تعین معنی میں علماء کا اختلاف ہو جاتا ہے- اب ان میں ہر ایک کی بات تو مان نہیں سکتے، کیوں کہ یہ نا ممکن ہے، اس لیے کسی ایک پر اعتماد کرنا ہوگا- یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ لوگ حضور کے زمانہ سے قریب رہے، پھر دین کو ہم سے زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا، یہی تقلید ہے جو صرف دین ہی میں نہیں دوسری صنعت و حرفت مثلاً خیاطی، معماری وغیرہ میں کی جاتی ہے- تقلید کے حوالے سے ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مقلدین کتاب و سنت کے حکم کی بجائے مجتہد کے حکم کی پیروی کرتے ہیں، حالاں کہ یہ بہت بڑی چوک ہے، کیوں کہ کوئی بھی مجتہد اپنی طرف سے حکم صادر نہیں کرتا، وہ تو نص کے اندر جو پوشیدگی ہوتی ہے، اس کو ختم کر کے کتاب وسنت کے حکم کو ظاہر کر دیتا ہے- اس کی حیثیت اس شخص کی ہے جو بادام کا چھلکا توڑ کر مغز نکالتا ہے، وہ بادام پیدا نہیں کرتا، صرف چھلکا ہٹا دیتا ہے، اسی لیے اصول فقہ کی کتاب میں مجتہد کی تعریف میں آیا ہے **هو مظهر للحكم الشرعي** وہ حکم ظاہر کرتا ہے، صادر نہیں کرتا-

قرآن نے خدا و رسول کے بعد ایک ایسے طبقے کا ذکر کیا ہے، جس کی طرف لوگ رجوع کرتے ہیں اور اس کی تعبیر استنباط سے کی ہے اور استنباط مسائل ہی در اصل اجتہاد ہے، استنباط لغت میں پانی نکالنے کو کہتے ہیں اور پانی نکالنے والا پانی پیدا نہیں کرتا، بلکہ زمین کے اندر پانی موجود ہوتا ہے، بس وہ مٹی کھود کر اس پانی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، مجتہد کا عمل بھی در حقیقت اسی نوعیت کا ہے-

سوال (۲):- مجتہدین کے مختلف طبقات کے کیا معنی ہیں؟ اور کیا آج بھی مجتہدین کا کوئی طبقہ موجود ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- ہر فقیہ کی علمی وسعت اور اجتہادی قوت یکساں نہیں، علمی صلاحیت اور احکام کے استخراج و بیان کے لحاظ سے فقہا میں فرق مراتب ہے، فقہا کے طبقات اور ان کی مثال میں فقہا کے نام ذکر کرتے ہوئے، اسی فرق مراتب کو واضح کیا گیا ہے، یہ ہمارے فقہائے کرام کی دیانت و امانت ہے کہ جو فقیہ جس درجے کا تھا، اسی حد پر رہ کر اس نے اپنا کام کیا اور بعد کے فقہا نے اس فقیہ کے کام کی نوعیت اور اس کا دائرۂ عمل دیکھ کر اس کے مرتبے کا تعین کیا، لیکن اگر کوئی شخص اپنا مرتبہ اپنی حیثیت سے ہزار گنا اونچا باور کر چکا ہو تو ممکن ہے اسے یہ تعین مراتب اور تفریق درجات پسند نہ آتی ہو اور اپنے کو امام اعظم کا ہم پلہ جتانے اور بالکل مساوی و ہم قامت بتانے کی راہ میں اسے بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا ہو- مگر حق یہی ہے کہ سب فقہا و مجتہدین ہم پلہ اور ہم رتبہ نہیں-

علامہ محمد امین بن عابدین شامی نے شرح عقود رسم المفتی میں فقہا

کے سات طبقات ابن کمال پاشا کے حوالے سے بیان کیے ہیں-

اول: مجتہدین فی الشرح، جیسے ائمہ اربعہ اور ان کے امثال جنہوں نے اصولی قواعد وضع کیے اور ادلہ اربعہ (کتاب، سنت، اجماع قیاس) سے احکام نکالنے کے اصول مقرر کیے اور اصول و فروع میں کسی مجتہد کی تقلید نہ کی-

دوم: مجتہدین فی المذہب جیسے امام ابو یوسف، امام محمد اور دیگر تلامذۂ امام اعظم یہ اپنے استاذ کے مقررہ قواعد کے مطابق ادلہ اربعہ سے استخراج احکام پر قادر ہوتے ہیں، یہ اصولی قواعد میں اپنے استاذ کے مقلد ہوتے ہیں اگرچہ بعض فروع میں استاذ سے اختلاف کرتے ہیں-

سوم: مجتہدین فی المسائل، یہ اصول و فروع کسی میں امام کی مخالفت کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن جن مسائل میں امام سے کوئی روایت نہ آئی ہو، ان کے احکام اپنے امام کے مقررہ اصول وقواعد کے مطابق استنباط کرنے پر قادر ہوتے ہیں- جیسے امام ابو جعفر طحاوی، امام کرخی، فخر الاسلام بزدوی وغیرہم-

چہارم: اصحاب تخریج، جیسے ابو بکر جصاص رازی وغیرہ، یہ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے، لیکن اصول سے پوری آگاہی اور مأخذ سے کامل آشنائی رکھتے ہیں، اس لیے امام یا ان کے اصحاب سے منقول کسی مجمل قول کی تفصیل یا کسی محتمل حکم کی توضیح اپنی رائے اور وسعت نظر کی بنیاد پر کر سکتے ہیں-

پنجم: اصحاب ترجیح جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ، ان کا کام بعض روایات کو بعض دیگر روایات پر ترجیح دینا ہوتا ہے- اس کے لیے وہ اس طرح کے الفاظ لاتے ہیں: **هذا اولی، هذا اصح رواية، هذا أوضح، هذا أوفق للقياس، هذا أرق للناس**-

ششم: اصحاب تمیز، یہ اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اقوی، قوی، ضعیف، ظاہر الروایہ، ظاہر المذہب اور روایت نادرہ میں امتیاز کر لیں- جیسے صاحب کنز الدقائق، صاحب مختار، صاحب وقایہ وغیرہم مصنفین متون معتبرہ، ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی کتابوں میں نامقبول اقوال اور ضعیف روایات نقل نہ کریں-

ہفتم: مقلدین، جو تمیز کی بھی قدرت نہیں رکھتے اور جو پا گئے حاطب اللیل کی طرح کتاب میں جمع کر دیتے ہیں، **فالويل لمن قلد هم كل الويل** -انتہی-

ہو سکتا ہے کلی نہیں تو جزوی اصحاب تمیز آج بھی موجود ہوں، اور آئندہ بھی ہوتے رہیں-

مولانا عبدالوہاب خلجی: -علمائے فقہ و اصول نے مجتہدین کے متعدد طبقات ذکر کیے ہیں۔ کوئی مجتہد فی المذہب ہوتا ہے، کوئی مجتہد منتسب (اصولی طور پر کسی مجتہد سے متفق اور فروعات میں کلی طور پر متفق نہ ہو) اور کوئی مجتہد مطلق ہوتا ہے۔ الحمد للہ ''**كل يعمل على شاكلته**'' کے تحت مجتہدین کا ہر طبقہ کہیں نہ کہیں پایا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کل مجتہدین اور فقہاء کا سیلاب اُمڈ آیا ہے اور شیخ الاسلام اور فقیہ العصر کے بھاری بھرکم القاب سے ملقب حضرات کی بہتات نظر آتی ہے۔ **والله المستعان**۔

مولانا وحید الدین خاں: -فقہا نے مجتہدین کے کئی طبقے بنائے ہیں- لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ غیر ضروری تطویل ہے، حقیقی معنوں میں مجتہدین کی دو قسمیں ہیں:

(۱) جزئی مجتہد اور (۲) کلی مجتہد، مثلاً طبی انجکشن کا طریقہ قدیم زمانے میں موجود نہ تھا، اب جو شخص انجکشن کے معاملے میں اجتہاد کر کے اس کا شرعی حکم بتائے، وہ جزئی مجتہد ہے، اسی طرح سیکولرزم قدیم زمانے میں موجود نہیں تھا- اب سیکولرزم پر اجتہاد کر کے جو اس کا شرعی حکم بتائے وہ کلی مجتہد ہے-

مولانا عبدالحمید نعمانی: -اجتہاد دراصل نو پیدا غیر منصوص مسائل کو کتاب و سنت کے اصولی احکام کی روشنی میں حل کرنے کا نام ہے، نئے نئے مسائل زمانہ گزرنے کے ساتھ پیدا ہوتے رہتے ہیں تو ظاہر ہے اجتہاد کا تسلسل بھی برقرار رہے گا، اسی لیے علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا ہے کہ اجتہاد قیامت تک ہوتا رہے گا- لیکن اس کے ساتھ ایک بنیادی بات یہ ہے کہ دین کے جو عمومی مسائل ہیں، ائمہ اربعہ نے تمام مسائل کا حل پیش کر دیا ہے- ائمہ اربعہ کے علاوہ بھی امام اوزاعی وغیرہ دوسرے ائمہ ہوئے، لیکن ان کی فقہ مدون نہیں ہو سکی، ائمہ اربعہ کی فقہ مدون شکل میں موجود ہے، جو دین کے عمومی مسائل کے تمام جزئیات کا حل بتاتی ہے، تو یہ حضرات مجتہد مطلق ہیں اور آج کے زمانے میں نہ تو اجتہاد مطلق کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے لیے جس قسم کی صلاحیت درکار ہے، وہ کسی میں موجود ہے، ہمیں خدا کی قدرت سے انکار نہیں، آج بھی ایسی صلاحیت کا انسان پیدا ہو

سکتا ہے، لیکن موجودین میں اس کی مثال ناپید ہے- خلاصہ یہ کہ دین کے عمومی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے، رہے وہ مسائل جو حالات کے بطن سے آج پیدا ہو رہے ہیں، ان میں غور وفکر اور تحقیق و اجتہاد کا سلسلہ تو بہر حال برقرار رہے گا، لیکن چوں کہ آج دین کی کامل بصیرت اور نصوص پر گہری نظر رکھنے والے لوگ عنقا ہیں اس لیے یہ کام انفرادی کی بجائے اجتماعی سطح پر ہو رہا ہے- دنیا بھر میں جو فقہی اکیڈمیاں ہیں وہ یہ کام بخوبی کر رہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ انفرادی طریقہ سے زیادہ بہتر ہے-

رہی اجتہاد کے مختلف درجات کی بات تو اس کے لیے آپ کو سب سے پہلے مجتہد مطلق اور مقلد مطلق کو سمجھنا ہوگا- جو کتاب وسنت کو سامنے رکھ کر اصول بناتا ہے اور مسائل کا استخراج واستنباط کرتا ہے، وہ کسی اور عالم کی پیروی نہیں کرتا- مجتہد مطلق کی مثال ائمہ اربعہ ہیں، وہ اصول وفروع کسی میں بھی کسی دوسرے کی پیروی نہیں کرتے- مقلد مطلق وہ ہے جس کو شریعت کا کچھ بھی علم نہیں- اس نے اہل علم سے مسئلہ سنا اور اس پر آنکھ بند کر کے عمل کر رہا ہے، یہ مسئلہ کیسے ثابت ہوا اور کون سی دلیل ہے اس کے لیے نہ تو وہ جانتا ہے اور نہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتا ہے- ان دونوں طبقات کے بیچ میں بھی کئی طبقات ہیں جو بعض مسائل میں تو خود اپنی رائے رکھتے ہیں مگر بعض دوسرے میں وہ امام اعظم کی تقلید کرتے ہیں- بعد کے ادوار میں امام طحاوی، ابن ہمام وغیرہ خود مجتہد ہیں لیکن وہ اصول میں امام اعظم کی اور مسائل میں امام محمد اور امام ابو یوسف کی پیروی کرتے ہیں- خلاصہ یہ کہ اہل علم کو بھی اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے کا اتباع کرنا پڑتا ہے- اسی سے اجتہاد کے اور مجتہدین کے مختلف طبقات سامنے آتے ہیں-

سوال (۳):- امام اعظم ابو حنیفہ اور دوسرے تینوں ائمہ کا اصل علمی کارنامہ کیا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ پوری امت انھی چاروں کی تقلید پر متفق ہوگئی؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- عہد رسالت اور عہد صحابہ میں لوگ قرآن وسنت کی عام ہدایات اور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے کاربند تھے- خلوت و جلوت میں خوف خدا، عدل، امانت، عام نصیحت وخیر خواہی، دعوت خیر، منع شر، کار خیر میں تعاون، کار شر سے کنارہ کشی وغیرہ عام اصول تھے جس پر ہدایت قرآنی مشتمل تھی، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی فضائل ومحاسن پر صحابۂ کرام کی تربیت فرمائی، جزئی امور میں صحابہ کرام کو اگر کوئی اشکال پیش آتا تو سرکار کی بارگاہ میں رجوع کرتے یا اکابر صحابہ سے معلوم کرتے، تمدن کی وسعت اور اسلامی رقبہ کے پھیلاؤ کے بعد واقعات ومعاملات کی بے پناہ کثرت ہوتی گئی اور افراد بھی اچھے برے، حق کوش، ناحق کوش، عدل پرور، ظلم شیوہ ہر طرح کے پیدا ہونے لگے، ایسے ماحول میں اقامت خیر اور دفع شر کے لیے مبسوط اصول وقوانین اور مفصل جزئیات مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ ان قوانین کی روشنی میں افراد اپنے معاملات کی صحت وسقم کو سمجھ سکیں اور جہاں حکومت کی مداخلت کی ضرورت ہو وہاں حکومت ان قوانین کے تحت رعایا کے معاملات حل کر سکے-

اس طرف باضابطہ اور ہمہ گیر توجہ سب سے پہلے امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مبذول فرمائی اور ایک فقہی مجلس کی شکل میں اپنے تلامذہ کو جمع کر کے مسلسل جد وجہد کی، اسی روش پر دیگر ائمہ بھی چلے اور اصول فقہ اور فقہ کی شکل میں دو مستقل فن وجود میں آئے، ان سب پر مفصل گفتگو اور مستقل تبصرہ کا موقع نہیں، مگر چند باتوں کی جانب اشارہ ہو سکتا ہے، مثلاً

(۱) ان حضرات نے کتاب وسنت اور آثار صحابہ میں نظر کر کے یہ واضح فرمایا کہ احکام کی مشروعیت کا ہدف پانچ چیزوں (نفس، دین، عقل، مال، نسب) کا تحفظ ہے- اور سارے احکام اسی امور پر گردش کرتے ہیں-

(۲) طلب اور ممانعت کے مدارج و مقاصد اور دلالت کے احوال ومراتب پر غور کیا، یعنی کس چیز کا مطالبہ لازمی طور پر اور شدت کے ساتھ ہے، پھر اس مطالبہ سے کون سا اہم امر مقصود ہے، جس آیت سے یہ مطالبہ مفہوم ہو رہا ہے، اس کی دلالت، اس پر بہت واضح اور نمایاں ہے یا دقیق اور مبہم یا محتمل ہے، بلفظ دیگر قطعی وجزمی ہے یا ظنی و احتمالی؟ اگر حدیث سے کسی فعل کا مطالبہ سمجھ میں آ رہا ہے تو خود اس حدیث کا ثبوت کس درجہ کا ہے- وہ حدیث متواتر ہے یا مشہور یا آحاد ہے؟ صحیح ہے یا حسن یا ضعیف وغیرہ؟ پھر طلب واضح ہے یا مبہم؟ ان امور پر نظر کے نتیجے میں احکام کے بھی درجات واقسام طے ہوئے- مثلاً فرض، واجب، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ، مستحب، حرام، مکروہ،

تحریمی، اساءت، مکروہ، تنزیہی، خلاف اولی، مباح۔

(۳) اصول وقواعد کی تاسیس کے بعد جزئیات کی تفریع وتدوین کا مرحلہ آتا ہے، اس سلسلے میں فقہاے امت کی جانکاہی وعرق ریزی جاننے کے لیے فقہ کی کوئی کتاب اٹھا کر اس کی فہرست پر نظر ڈالیے آپ کو معلوم ہوگا کہ طہارت اور عبادات سے لے کر نکاح ومعاملات، وقف، میراث، حدود وتعزیرات وغیرہ تمام ابواب سے متعلق احکام کا ذخیرہ نہایت خوش اسلوبی سے مرتب کر دیا گیا ہے، دنیا کے بڑے بڑے ماہرین قانون بھی ایسے جامع اور مستند مجموعے پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

ائمہ اربعہ کے مذاہب پر اتفاق امت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر باب کے احکام مدون کر دیے اور بعد کے اہل نظر متبعین حالات کے مطابق ان کی تنقیح اور ان میں اضافہ کرتے رہے۔ عام آدمی جو خود اجتہاد واستنباط کی صلاحیت نہیں رکھتا، شرعی زندگی گزارنے کے لیے کوئی ایسا ہی مذہب اپنا سکتا ہے، جس میں ضرورت کے تمام مسائل مدون اور مرتب شکل میں موجود ہوں، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد، امام ابن جریر طبری وغیرہم کے مذاہب مدون اور محفوظ ومنقول نہ ہوئے، اس لیے امت انہیں اپنانے بلکہ جاننے سے بھی قاصر رہی۔

مولانا عبدالوہاب خلجی: -امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ ثلاثہ وغیرہم رحمہم اللہ مجتہدین امت ہیں اور ان کی کوششیں قابل ستائش، لائق استفادہ اور ان شاء اللہ باعث اجر وثواب ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کے لیے عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ امام دار الہجرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے "**کل منا مأخوذ منه ومردود علیه الا صاحب هذا القبر**" (یہ قول اصلاً مجاہد اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے) یعنی نبی ﷺ کے علاوہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کی بات لی اور چھوڑی نہ جا سکتی ہو۔ لہٰذا امت کے کسی امام وفقیہ کے ہر قول وفتویٰ کو لائق اتباع سمجھنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ بلکہ مخالف دلیل صحیح اور نص صریح قول وعمل کا ترک کرنا واجب ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس پر علماء امت کا اجماع نقل کیا ہے۔ ائمہ اربعہ کی تقلید پر کبھی کسی دور میں اجماع منعقد نہیں ہوا۔ خود ائمہ اربعہ رحمہم اللہ نے اپنے متبعین اور تلامذہ کو سختی سے کتاب اللہ اور صحیح سنت مصطفےٰ ﷺ پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔ بھلا ایک غلط چیز یعنی جامد تقلید پر امت کے علما مجتہدین کیوں کر متفق ہو سکتے ہیں (بعض فقہاء اجماع کا دعویٰ اپنے مخالف کو مرعوب کرنے کے لیے بطور ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہیں جب کہ تحقیق کے بعد اختلافی مسائل خلافیہ میں ایسے مزعومہ اجماعات کی پول کھل جاتی ہے۔ لہٰذا اجماع کا دعویٰ کرنے میں کمال احتیاط سے کام لینا چاہیے)

مولانا وحید الدین خاں: -میرے نزدیک فقہاء میں کوئی نہ امام اعظم ہے اور نہ کوئی امام اصغر، سارے فقہا برابر ہیں۔ میرے نزدیک انہی چاروں کی تقلید پر اتفاق کر لینا درست نہیں۔ کیوں کہ چاروں فقہا نے اپنے زمانے کے لحاظ سے فقہی خدمت انجام دی۔ نئے دور میں نئے فقہا مطلوب ہیں، جو دوبارہ حالات کے لحاظ سے فقہی خدمت انجام دیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی: -ابھی میں نے کہا کہ قرآن میں جو باتیں صراحت کے ساتھ نہیں ہوتی ہیں ان میں اجتہاد کیا جاتا ہے، بلا شبہ ائمہ اربعہ کے علاوہ بھی کئی ایک مجتہد پیدا ہوئے اور انہوں نے اجتہاد کیا۔ لیکن جن حضرات کی اجتہادی کاوشیں مدون شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں، وہ یہی چاروں ائمہ ہیں۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل۔ اس لیے امت کی مجبوری ہے کہ وہ انہی میں سے کسی ایک کی تقلید کرے، کسی اور امام کے اجتہادات مدون ہی نہیں ہیں تو ان کی تقلید کیوں کر ممکن ہے؟ اس کے ساتھ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ قرآن کے جو احکامات ہیں، جو احادیث ہیں، جو صحابہ کے معمولات ہیں، وہ سب کے سب انہی چاروں میں موجود ہیں، کوئی حکم یا عمل ان سے الگ نہیں مل سکتا، اس لیے وہ حضرات بھی جو اجتہاد کا دعویٰ کرتے ہوئے آج تقلید کا انکار کرتے ہیں وہ جو کچھ بھی اجتہاد کرتے ہیں، ان کا وہ اجتہاد ائمہ اربعہ میں سے کسی کے یہاں ضرور موجود ہوتا ہے تو شرعی مسائل میں اختلافات توسع کے لیے ہیں اور یہ توسع ائمہ اربعہ کی تقلید سے حاصل ہو جاتا ہے، اب ہمیں کسی بھی قول یا عمل پر عمل کرنے کے لیے الگ جانے کی ضرورت نہیں، ائمہ اربعہ کے یہاں سب کچھ موجود ہے۔ زور سے آمین کہنے کا مسئلہ ہو، یا قرأت خلف الامام کا مسئلہ ہو، ان مسائل میں آج کچھ لوگ اختلاف کرتے ہیں اور اجتہاد کرتے ہیں، حالاں کہ وہ جو تحقیق بھی لے کر آتے ہیں وہ کسی نہ کسی امام کے یہاں موجود ہے، ان کا اجتہاد کوئی الگ سے نہیں ہوتا۔

اب کچھ لوگ آج یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ انہی چاروں میں سے کسی ایک کی تقلید کرو؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے ہمیں ان میں سے کسی ایک کی تقلید کا حکم نہیں دیا- لیکن بعد میں جو حالات سامنے آئے یہ حالات وجوب پر دلالت کرتے ہیں- یعنی صورت حال ایسی ہی ہے کہ انہیں میں سے کسی ایک کا اتباع کرنا آپ کی مجبوری ہے- آپ نہ تو بیک وقت ان چاروں کی پیروی کر سکتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں ہے اور نہ ان سے ہٹ کر کسی اور کی تقلید کر سکتے ہیں کہ یہ بھی ممکن نہیں ہے، کیوں کہ ان سے ہٹ کر کوئی اجتہاد سامنے آ ہی نہیں سکتا- اسی لیے علما نے کہا ہے کہ ''حالات'' کے پیش نظر ان چاروں میں سے کسی ایک کی پیروی واجب ہے اور اس سے انکار سخت گمراہی ہے، رہا یہ کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، امام طحاوی، رحمۃ اللہ علیہ اور صاحب فتح القدیر وغیرہ نے بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے، یہ ان کے تفردات ہیں اور تفردات بھی ایسے کہ وہ کسی نہ کسی امام متبوع کے یہاں ضرور موجود ہیں، اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ امت کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی، اس لیے امت کا جو عمل ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا- اسی لیے امام ترمذی وغیرہ نے کہا کہ عمل امت سے ضعیف حدیث صحیح کی منزل میں آ جاتی ہے، اور اسی وجہ سے صحیح حدیث کے مقابل اگر ضعیف حدیث معمول بہ ہے تو وہ زیادہ لائق اتباع ہے، سنت کہتے ہی اسی کو ہیں جو معمول ہو، مثال کے طور پر بخاری شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے تھے اور اپنی زوجہ کو بوسہ لیتے تھے، یا جوتا پہن کر نماز پڑھتے تھے، تو یہ چیزیں اگر چہ حدیث صحیح سے ثابت ہیں لیکن چوں کہ ان پر عمل نہیں رہا، اس لیے یہ سنت نہیں ہیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی حالت میں ان کے نواسے ان پر چڑھ جاتے تھے، یہ حدیث موجود ہے، لیکن یہ امت میں معمول اور جاری نہیں ہوا، اس لیے اس حدیث کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی نواسہ تلاش کرنے جائے اور نماز کی حالت میں اپنے اوپر سوار کر لے- تو خلاصہ یہ کہ حدیث صحیح کا موجود ہونا ہی کافی نہیں ہے، ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ اس کے تعلق سے صحابہ کا عمل کیسا رہا، تابعین کا عمل کیسا رہا، تبع تابعین کا عمل کیسا رہا وغیرہ-

سوال (۴):- کیا حضرات محدثین ومفسرین بھی مقلد تھے؟ اگر ہاں تو کیوں؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- محدثین ومفسرین سے مراد صحاح ستہ وغیرہ کے مصنفین اور مشہور کتب تفسیر کے مرتبین ہیں تو بلاشبہ وہ مقلد تھے، جس کی وجہ یہ ہے کہ استخراج احکام کے لیے صرف حفظ حدیث کافی نہیں اور بھی بہت سے لوازم ہیں، جن کے بغیر کار اجتہاد کی تکمیل نہیں ہو سکتی- ان لوازم کا فقدان ان خدا ترس حضرات کے لیے اجتہاد سے مانع اور تقلید کا باعث ہوا-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- بعض محدثین ومفسرین اصولی طور پر ائمہ اربعہ کی طرف انتساب کرتے تھے، لیکن فروعات میں ان کے پابند نہ تھے جیسا کہ آج کل کے اکثر منتسبین مذاہب علماء کا وطیرہ ہے- یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعض اجلہ تلامذہ نے ایک تہائی سے دو تہائی تک مسائل فرعیہ کے اندر اپنے اساتذہ کا ساتھ نہیں دیا- لہٰذا اگر مقصود اصلی اتباع دلیل ہو تو میرے خیال میں انتساب اگر مستحسن امر نہیں تو حرام ومکروہ بھی نہیں ہے بلکہ جواز اور مباح کے دائرہ میں آتا ہے-

مولانا وحید الدین خاں:- مفسرین کا لفظ میرے نزدیک اس بحث میں مبہم ہے- کیوں کہ مفسرین چودہ سو سال تک پھیلے ہوئے ہیں- البتہ طبقہ اول کے محدثین کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، میرے مطالعے کے مطابق محدثین کا کوئی فقہی مسلک نہ تھا- اس معاملے میں میری رائے وہی ہے جو ابن رجب حنبلی کی رائے ہے-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- وہ اسی لیے کہ اجتہاد خصوصی ذہن اور عمل کا نام ہے اور یہ سب کے بس کی چیز نہیں ہے، چاہے وہ محدث ہو، مفسر ہو یا اور کوئی- میں نے کہا کہ امت میں ہمیشہ دو ہی طبقے رہے ہیں، ایک وہ جو بات مانتا ہے اور دوسرا وہ جس کی بات مانی جاتی ہے، جس کی بات مانی جائے گی وہ مجتہد ہوگا اور جو بات مان رہا ہے وہ مقلد ہے- سمجھ بوجھ اس کے اندر بھی موجود ہے لیکن اس درجے کی نہیں کہ وہ خود اجتہاد کر سکے- اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ کتب احادیث پڑھنے کے دوران یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ یہ لوگ کس کے مقلد تھے، امام مسلم کس کی تقلید کرتے تھے، فقہی امور میں امام نسائی کس کا اتباع کرتے تھے- اہل علم میں اس تعلق سے اختلاف بھی ہوتا ہے- کچھ حضرات انہیں شافعی بتاتے ہیں، کچھ حنفی بتاتے ہیں، کچھ حنبلی بتاتے ہیں تو یہ بحث کیوں ہے؟ اسی لیے کہ یہ حضرات محدث ہونے کی حیثیت سے معروف ہیں- انہوں نے احادیث کی تلاش وجستجو کی، تحقیق کی، دوسروں سے حدیثیں

سنیں اور خود نہیں بیان کیا، ان کا مشغلہ یہی تھا، انہوں نے احادیث سے مسائل کے استنباط و استخراج کا عمل نہیں کیا- اس میں بھی شبہ نہیں کہ بعض محدثین نے اجتہاد بھی کیا لیکن ان کا اجتہاد باضابطہ نہیں ہے اور نہ وہ مدون ہے- مثلاً میں اگر سوال کروں کہ تراویح کے بارے میں امام بخاری کا کیا مسلک ہے؟ وہ بیس پڑھتے تھے، یا آٹھ پڑھتے تھے، یا بارہ پڑھتے تھے؟ تین طلاق کے بارے میں ان کا کیا نظریہ تھا؟ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ انور کی زیارت کو جانا کیسا ہے؟ اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں، جن کے تعلق سے اگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک دریافت کیا جائے تو اس کا جواب نہیں مل سکتا-

آپ کا سوال محدثین اور مفسرین کے طبقے سے ہے اور ان کے حوالے سے ہاں اور نہیں میں جواب نہیں دیا جا سکتا- اس لیے کہ محدث ہونا، مفسر ہونا ایک خاص وصف ہے، ہوسکتا ہے کہ محدث یا مفسر ہونے کے ساتھ کوئی مجتہد بھی ہو، یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مجتہد نہ ہو مقلد ہو، تو مجتہد یا مقلد ہونے کا سوال اگر کسی فرد کے تعلق سے کیا جائے تب تو صحیح ہے لیکن طبقات کے تعلق سے اگر کیا جائے تو ہاں یا نا میں اس کا جواب نہیں مل سکتا- بہت سے محدثین اور مفسرین مقلد تھے اور بعض مجتہد تھے، لیکن ائمہ اربعہ جو محدث و مفسر بھی تھے، کے علاوہ کسی اور کی فقہ باضابطہ مدون نہ ہوسکی-

سوال (۵):- اس الزام کی کیا حقیقت ہے کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر ان عبقری علمائے مقلدین کی علمی خدمات کو کیا نام دیں گے جن پر آج بجا طور پر امت کو فخر کرنے کا حق ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- اولاً ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے- تحقیق کا عمل برابر جاری ہے اور جیسا کہ آپ نے اشارہ کیا فقہائے مقلدین کی حیرت انگیز علمی و تحقیقی خدمات اس پر شاہد عدل ہیں اور اگر یہ کہیں کہ تقلید نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا تو یہ بھی ہمیں تسلیم نہیں- جو شخص اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے، اس کے لیے تقلید جائز نہیں، اسی لیے ائمہ کرام نے اجتہادی صلاحیت رکھنے والے اپنے تلامذہ سے یہ فرمایا کہ ”ہم نے جس ماخذ سے احکام اخذ کیے ہیں، اسی سے تم بھی اخذ کرو“

یا یہ فرمایا کہ ”ہمارے بیان کردہ احکام پر تمہارے لیے عمل جائز نہیں، جب تک یہ نہ جان لو کہ ہم نے یہ احکام کہاں سے اخذ کیے“-

ظاہر ہے کہ اس طرح کے ارشادات کے مخاطب کوفہ و بغداد اور مدینہ و مصر کے وہ دوکاندار اور کاشت کار یا صنعت کار نہیں جو کتاب و سنت اور اخبار و آثار کی تصریحات، اشارات، دلالات اور اقتضاءات سے نابلد اور اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، وہ فوجی اور ملازمت پیشہ بھی نہیں جو تلاوت و قرأت سے زیادہ کی صلاحیت نہیں رکھتے، اہل اجتہاد کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے اور نا اہل کے لیے شروع ہی سے بند ہے-

ثانیاً اگر کوئی طبقہ یہ چاہتا ہے کہ اہلیت اجتہاد ہو یا نہ ہو اجتہاد کا دروازہ ہر شخص کے لیے چوپٹ کھلا رہنا چاہیے تو بہت صفائی کے ساتھ عرض ہے کہ جو دروازہ صرف اہل حضرات کے داخلے کے لیے کھلا اگر اس سے صرف نااہلوں کی آمد و رفت ہونے لگے تو اسے سختی کے ساتھ بند کر دینا ہی عقل و دانش اور ایمان و حکمت ہر ایک کا تقاضا ہے، اسی میں متاع گراں مایہ کی حفاظت ہے اور خلاف ورزی میں کھلی ہوئی بربادی-

تجربہ شاہد ہے کہ آج اہلیت اجتہاد تو درکنار ارشادات ائمہ کے مصادر و مآخذ سے کامل آشنائی بھی مفقود ہے، اہلیت کے بغیر منصب اجتہاد پر تمکن کا شوق اور اس کی جسارت ناروا ایسے ہی دلوں میں ہوتی ہے جو خوف الٰہی سے عاری ہوں-

مولانا عبدالوہاب خلجی: -یقیناً تقلید جامد نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دئے، کیونکہ جب آدمی کسی ایک امام کے تمام اقوال کو ہی دین سمجھنے لگتا ہے اور اسی کی پیروی کو اپنے لیے باعث نجات سمجھتا ہے اور دیگر ائمہ کے اقوال اور ادلہ پر نظر نہیں کرتا یا ان کے درمیان جمع و تطبیق اور ترجیح کی صورتوں کو بروئے کار نہیں لاتا تو بلاشبہ علم و تحقیق اور اجتہاد و ترجیح کی راہ بند ہو جاتی ہے- اور اگر حضرات مقلدین تقلید کے بجائے تحقیق و اتباع کی راہ اختیار کرتے تو اصحاب مذاہب ائمہ کرام کی خدمات علمیہ و فقہیہ کو مزید فروغ حاصل ہوتا اور ان سے استفادہ بھی عام ہوتا اور جو لوگ مذہب اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کے تقلیدی فقہی مذاہب اور ان کے فکری و علمی جمود اور آپسی اختلاف و انتشار کے باعث تردد کا شکار ہو کر دولتِ اسلام سے محروم نہ ہوتے- لہٰذا علماء امت کی خدمات جلیلہ سے استفادہ کرتے ہوئے ہمیں ادلہ صحیحہ اور نصوص شرعیہ کی پیروی کرنی چاہیے اور ”**اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء**“ (الاعراف: ۳) تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے

تمھارے پاس آئی ہے۔اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کا اتباع نہ کرو۔اور ''اتخذوا أحبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله'' (التوبہ:۳۱) ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنالیا ہے کی تفسیر ماثور جو عدی بن حاتم سے بسند صحیح مسند احمد وسنن ترمذی میں منقول ہے، اگر سامنے رکھی جائے تو تقلید جامد کی قباحت وشناعت کھل کر سامنے آجائے گی اور امت تقلید پر فخر کرنے کے بجائے شرم وندامت کے آنسو بہائے گی۔

مولانا وحید الدین خاں:- میرے نزدیک یہ الزام نہیں بلکہ ایک درست بات ہے۔تقلید ہمیشہ تخلیقی فکر کا دروازہ بند کرتی ہے اور مسلمانوں میں ایسے ہی ہوا- یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزار سال کی مسلم تاریخ میں صرف ایک تخلیقی مفکر پیدا ہوا- اور وہ تھے علامہ ابن خلدون۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:- یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے ہیں وہ مسائل کا صحیح شعور نہیں رکھتے- ان کو پتا ہی نہیں کہ تقلید کیا چیز ہے، مجتہد امام کی رہنمائی میں صحیح جگہ پہنچنا تقلید کہلاتا ہے-تقلید کا مطلب نہ تو آوارگی ہے اور نہ ایسی غلامی ہے کہ آدمی سو فیصد اندھا ہو جائے- بلکہ امام سے حسن ظن رکھتے ہوئے شریعت کا جو منشا ہے، جو مطلوب ہے اسی کی پیروی کرنے کا نام تقلید ہے-تقلید اور اتباع میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور اتباع کرنا اپنے سے بڑے کا یہ فطرت ہے- اس لیے یہ کہنا کہ تقلید نے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے یا غلام بنا دیا ہے، تقلید کے مفہوم سے ناواقفی کا نتیجہ ہے، اگر تقلید کا مطلب آنکھ بند کر کے دوسروں کی پیروی لے لیا جائے تو پھر سوال ہوگا کہ مقلدین نے اتنے سارے علمی و تحقیقی کام کیوں کیے؟ آپ نظر اٹھا کر دیکھ لیجیے کل سے آج تک سارے بڑے بڑے علمی و تحقیقی کارنامے انھوں نے انجام دیے جو خود مقلد تھے- ان کے علاوہ کسی نے نہیں کیا- حدیث کی خدمت ہو، فقہ کی ہو، قرآن کی ہو، سب انہی لوگوں نے کی ہے، حدیث، تفسیر، فقہ کسی بھی فن میں علماء کے طبقات آپ دیکھ لیجیے، طبقات حنفیہ، طبقات شافعیہ، طبقات مالکیہ، طبقات حنابلہ تو ملیں گے لیکن کہیں بھی آپ کو طبقات غیر مقلدین نام کی کتاب نہیں مل سکتی تو اہل علم و مجتہدین کے طبقات یہی چاروں ہیں، کوئی پانچواں طبقہ موجود نہیں ہے- آج جو لوگ ان چاروں سے ہٹ کر راہ نکالنے کی کوشش میں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی روش بھی کمتر لوگوں کی متشددانہ تقلید ہی ہے- میں دیکھ رہا ہوں کہ جو لوگ ائمہ اربعہ کی تقلید کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں وہ کہیں، اس سے زیادہ شدت سے امام ابن تیمیہ کی تقلید کرتے ہیں- ابن قیم کی تقلید کرتے ہیں تو جو لوگ آج مقلد کہلانے کی بجائے اپنے کو اہل حدیث کہہ رہے ہیں وہ بھی اپنے بڑوں کی تقلید ہی کر رہے ہیں-

سوال(۶):- امام اعظم ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے شرعی احکام کی تخریج واستنباط کے لیے اصول وضع کیے، دوسرے ائمہ مجتہدین بھی کسی نہ کسی طور سے ان کے فیض یافتہ ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ غیر مقلدین حضرات سب سے زیادہ انہیں کے خلاف صف آرا رہتے ہیں؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- امام اعظم سے عداوت کوئی نئی چیز نہیں خود ان کے زمانے کا واقعہ ہے، جسے خطیب نے بھی بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی سے بیروت میں حضرت عبد اللہ بن مبارک شاگرد امام ابوحنیفہ کی ملاقات ہوئی، انھوں نے پوچھا یہ کوفہ میں ابوحنیفہ کنیت رکھنے والا کون مبتدع پیدا ہوا ہے؟ حضرت عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں، میں اپنے گھر واپس آیا فاقبلت علی کتب ابی حنیفه امام ابوحنیفہ کی کتابیں دیکھنی شروع کیں (اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی لکھی ہوئی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں) ان سے کچھ مسائل منتخب کر کے لکھے اور سرخی یہ ڈالی: قال النعمان بن ثابت، پھر امام اوزاعی کے پاس گیا، مجھ سے وہ اوراق انھوں نے لے لیے اور مطالعہ کے بعد پوچھا یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟ ابن مبارک نے کہا ایک شیخ ہیں، جن سے عراق میں میری ملاقات ہوئی، فرمایا: هذا نبیل من المشائخ، ابن مبارک نے بتایا یہ وہی ابوحنیفہ ہیں، جن کا آپ نے ذکر کیا تھا- بعد میں امام اوزاعی کی ملاقات امام ابوحنیفہ سے مکہ میں ہوئی اور عبد اللہ بن مبارک کے پیش کردہ مسائل اور دیگر مسائل پر گفتگو کے بعد انھوں نے امام اعظم کے تبحر علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے قول سے استغفار کیا اور عبد اللہ بن مبارک سے فرمایا: ابوحنیفہ کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا، میں نے انہیں اس کے برخلاف پایا، تم ان کی بارگاہ فیض سے وابستہ رہو- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عصر ہی میں وہ حاسدین کی عداوتوں اور غلط پروپیگنڈوں کا نشانہ تھے-

مگر اس تاریخی حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے استنباط کے اصول وقواعد وضع کیے اور فقہی احکام کی تدوین کی- دیگر ائمہ نے بھی ان سے استفادہ کیا، امام ابن حجر ہیتمی شافعی نے الخیرات الحسان میں یزید بن ہارون کی روایت لکھی ہے کہ امام سفیان ثوری نے کسی حیلے سے امام ابوحنیفہ کی کتاب الرہن کی نقل حاصل کی اور اس سے استفادہ کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم کی ایک تصنیف کتاب الرہن بھی تھی-

بالفرض امام اعظم نے خود کوئی کتاب نہ لکھی، یا لکھی اور ناپید ہو گئی، ان کا مذہب ان کے تلامذہ نے قلم بند کیا یا ثقات نے زبانی طور پر اس کی روایت کی تو اس سے امام اعظم کی فقہی خدمات اور علمی جلالت پر حرف نہیں آتا- اجلۂ صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت عبد اللہ ابن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کوئی کتاب نہ آج دستیاب ہے نہ پہلے کسی زمانے میں تھی لیکن تفسیر وحدیث اور فقہ میں ان حضرات کی عظمت شان سے کسی باخبر منصف مزاج کو انکار نہیں- آخر امام شافعی نے سارے لوگوں کو امام ابوحنیفہ کی عیال کیوں بتایا؟ خود اپنے یا اپنے استاذ امام محمد یا امام مالک رحمہم اللہ کی عیال نہیں بتایا؟ کیا امام شافعی بھی امام ابوحنیفہ کی تقلید جامد یا اندھی عقیدت میں بتلا تھے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اہل انصاف جس امر کو امام اعظم کی اولیت اور عظمت شان کی دلیل سمجھتے ہیں، وہی اہل عناد کی عداوت ومخالفت کی بنیاد ہے، امام اعظم نے آزادانہ اجتہاد سے کام نہ لیا- بلکہ پہلے اجتہاد کے اصول وضوابط مقرر کیے، دلائل کے مراتب اور ان کی حیثیتوں کا تعین کیا، پھر دلائل اور قواعد کی روشنی میں فروع واحکام کی تخریج فرمائی، دیگر ائمہ عادلین رحمہم اللہ نے بھی اس عادلانہ روش کی پیروی کی- مگر آج جب کسی کے سر میں آزادانہ اجتہاد یا ہوائے نفس کے مطابق انتخاب احکام کا سودا سماتا ہے تو یہ اصول وضوابط اس کی آزادی طبع اور غلط روی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں- اس لیے دل کا بخار اسی پر اترتا ہے، جس نے اس طریقے کی بناڈالی-

امام اعظم کے خلاف علم حدیث میں کم مائگی کا پروپیگنڈا بھی کوئی نیا نہیں مگر امام ابو یوسف جو امام اعظم کے شاگرد اور ان کی مجلس فقہ کے رکن تھے، علم حدیث میں ان کے تبحر اور مہارت کا اعتراف بڑے بڑے ائمہ نے کیا ہے، جس کے باعث اعدائے زمانہ کے لیے بھی مجال انکار نہیں، یہ امام ابو یوسف بیان کرتے ہیں کہ بعض اوقات امام ابوحنیفہ سے میرا اختلاف ہوتا اور کوئی فیصلہ نہ ہو پاتا، پھر میں محدثین کوفہ کے یہاں جاتا کہ میرے یا میرے شیخ کے قول کی تائید میں کوئی حدیث مل جائے، جس کے ذریعہ اختلاف کا تصفیہ ہو-

مجھے امام کے قول کی تائید میں ایک دو حدیثیں مل جاتیں، میں آکر امام کو سناتا وہ قبول نہ کرتے میں عرض کرتا یہ تو آپ کے قول کے موافق ہے، اسے آپ کیوں نہیں لیتے؟ وہ فرماتے اس میں فلاں فلاں علت قادحہ ہے- اہل کوفہ کا علم حدیث مجھ سے مخفی نہیں، غور کیجیے جس شیخ کی نظر اتنے جلیل القدر ائمہ حدیث سے فزوں تر ہو، خود اس کی حدیث دانی کا پایہ کتنا بلند ہوگا؟ مگر تعصب وعناد کی بیماری کا کوئی علاج نہیں-

محدث کا کام سونا جمع کرنا ہے اور ناقد کا کام پرکھ کر بتانا کہ کون سونا کتنا کھرا ہے کتنا کھوٹا؟ اسی طرح محدث کا کام شفا بخش دواؤں کا ذخیرہ کرنا ہے اور فقیہ کا کام امراض اور مریضوں کی تشخیص کے ساتھ ان دواؤں کا استعمال کرانا ہے، امام اعظم کے استاذ امام اعمش سے کچھ مسائل دریافت کیے گئے وہ نہ بتا سکے- امام ابوحنیفہ سے پوچھا انہوں نے بتا دیا- استاذ نے پوچھا تم نے یہ جوابات کہاں سے اخذ کیے؟ عرض کیا فلاں فلاں حدیثوں سے، جو آپ نے اس اس سند سے مجھ سے بیان فرمائیں- فرمایا اے فقہا تم لوگ طبیب ہو اور ہم محدثین عطار ہیں، اور ابوحنیفہ تم تو دونوں ہو- میں نے سو دن میں جو حدیثیں تم سے بیان کیں وہ ایک ساعت میں تم مجھے سنائے دے رہے ہو-

دونوں واقعے الخیرات الحسان لابن حجر الہیتمی الشافعی میں ہیں-

پھر فقہ واجتہاد کا کمال علم حدیث میں رسوخ کے بغیر متصور بھی نہیں، حدیث کے تمام مراحل اور شعبوں کو عبور کیے بغیر پایۂ اجتہاد تک رسائی ناممکن ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی: -امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی جانب کسی کتاب کی نسبت خواہ وہ اصول میں لکھی گئی ہو یا فروع میں صحیح نہیں ہے- فقہ حنفی کا سارا ذخیرہ امام محمد بن حسن شیبانی کی علمی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے- جب کہ قاضی ابو یوسف کا منصب قضا اس کی نشر واشاعت کا مؤثر ذریعہ ہے- جیسا کہ خود شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالی نے اپنی مشہور تالیف حجۃ اللہ البالغہ میں اسباب اختلاف الفقہاء فی الفروع کے تحت اس موضوع کا خلاصہ پیش کیا ہے

اور اصول فقہ کے باب میں امام شافعیؒ کی تالیف شہیر ''الرسالۃ'' کو اول تالیف گردانا ہے اور یہی درست ہے- بہر حال امام ابوحنیفہ ایک بزرگ عالم وفقیہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ علم حدیث میں عدم رسوخ کے سبب ان کی فقہ مسائل شرعیہ میں دیگر ائمہ کرام کی فقہ کے مقابلے میں صحت وصواب سے بعید ہے۔ بایں ہمہ ذاتی طور پر ان سے بغض وعناد رکھنا یا ان کے خلاف صف آرا ہونا کسی حال میں درست نہیں ہے۔ البتہ مسائل کی تحقیق وتنقیح میں مخالف ادلہ شرعیہ صحیحہ اقوال پر رد کرنا علماء کا دینی فریضہ ہے اور حق کی توضیح وتبیین میں کسی قسم کی مداہنت جائز نہیں ہے بشرطیکہ ادب واحترام ملحوظ خاطر ہو۔

مولانا وحید الدین خاں:- میرے نزدیک امام ابو حنیفہ نے جو اصول وضع کیے وہ کلی معنی میں درست نہ تھے- ان کی اصول سازی میں ایک ایسی چیز شامل ہوگئی جو روح شریعت کے مطابق نہ تھی اور وہ ہے فقہیت- مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ کا یہ اصول کہ الحق لایتعدد سب سے بڑی وجہ ہے کہ مسالک فقہی کا اختلاف شدید بن گیا- حالاں کہ یہ شدت ایک ایسا غلو تھا جو اسلام میں ممنوع ہے-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- یہ تنگ نظری اور ایک طرح کی معاندت کا معاملہ ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو منہج تحقیق ہے اور استنباط کے جو اصول وضابطے ہیں، ان میں بہت گہرائی ہے، بہت بلندی ہے، جیسا کہ امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے میزان الشریعۃ الکبری میں یہ بات لکھی ہے کہ جب یہ لوگ اپنی کم فہمی کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں پاتے تو مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں- حضرت امام اعظم سے خصوصی معاندت کی کچھ خاص وجوہات ہیں- ایک یہ کہ وہ ائمہ میں اقدم ہیں- بہت سی روایتوں کے مطابق انہوں نے کئی ایک صحابہ کو دیکھا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے- دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی فقہ عملی شکل میں مدون ہوگئی- حکمرانوں نے باب قضاء میں اس کو نافذ کیا- ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مقلدین میں امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ ۹۵ ؍ فی صد مقلدین امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کرتے ہیں تو اب مخالفین تقلید نے یہ دیکھا کہ ہم جہاں جاتے ہیں، دنیا کے جس خطے میں پہنچتے ہیں وہاں حنفی پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کا مقابلہ بھی زیادہ تر احناف سے ہی ہوتا ہے، اور جواب دینے والے بھی یہی ہوتے ہیں، ان کی کاٹ کرنے والے بھی زیادہ احناف ہی ہوتے ہیں، اس لیے فطری طور پر ان کو عداوت بھی سب سے زیادہ امام ابوحنیفہ اور فقہ حنفی سے ہوتی ہے-

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کو لگتا ہے کہ کتاب وسنت کا نعرہ تو ہم لگاتے ہیں مگر جب عوام کو رجوع کرنا ہوتا ہے تو وہ حنفی مفتیوں سے رجوع کرتے ہیں کہ دنیا میں زیادہ وہی ہیں- خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں جو ان کی مخالفتیں ہوئیں وہ اسی لیے ہوئیں کہ لوگ دیکھتے تھے کہ حدیث کی خدمت تو ہم کر رہے ہیں لیکن عوام کا رجوع امام ابوحنیفہ کی طرف ہوتا ہے- حالاں کہ یہ واضح سی بات ہے کہ کوئی مریض دواخانہ نہیں جاتا، جہاں ہزاروں طرح کی دوائیں ہوتی ہیں، ہر کوئی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے- تو محدثین کی مثال دواخانے والے کی ہے، جن کے پاس دوائیں تو بہت سی ہیں، لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ کون سی دوا کس مرض میں کام آئے گی۔ یہ کام مجتہد کرے گا، جس کی دواؤں کی ساخت پر، ان کے اثرات پر اور مریض کی حالت پر گہری نظر ہے- تو عوام کا فقہ حنفی کی طرف رجوع کرنا بھی امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ایک بہت بڑی وجہ ہے- اور اس کا سلسلہ بہت دراز ہے- چوں کہ فقہ حنفی کی عمر سب سے لمبی ہے، اس لیے اس کی مخالفت کا تسلسل بھی سب سے زیادہ دراز ہے-

سوال (۷):- تقلید شخصی کا مفہوم کیا ہے اور امت کو اس کی ضرورت کیوں ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- جو شخص اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتا مگر مجتہدین کے اقوال تک اس کی رسائی ہے اور بے شمار متفقہ مسائل کے علاوہ بڑی تعداد میں ایسے مسائل بھی ہیں جن میں مجتہدین کے نتائج فکر مختلف ہیں، ایسی حالت میں وہ کسی ایک ہی مجتہد کی پیروی کر سکتا ہے، اسی کا نام تقلید شخصی ہے، اس کے لیے بھی اس مجتہد کے اصول وفروع کو جاننا، سیکھنا، پوچھنا، سمجھنا ضروری ہے اگر وہ بیک وقت دو مجتہد کے قول مثلاً جواز وعدم جواز دونوں پر عمل کرنا چاہے تو یہ جمع نقیضین کی آرزو ہوگی جس کا وقوع محال ہے اور اگر یہ چاہے کہ جس وقت جو آسان معلوم ہوا سے اپنا لیا کرے تو یہ شریعت کی نہیں ہوائے نفس کی پیروی ہوگی اور اگر اسے یہ تکلیف دی جائے کہ تمام مذاہب کی تحقیق کرو، ہر قول کو کتاب وسنت اور قیاس واجتہاد کی روشنی میں پرکھو جو زیادہ درست اور مطابق دلائل نظر آئے اسے لے لو، دوسرے کو چھوڑ دو تو

یہ ایک عامی کی قوت وصلاحیت سے باہر ہے، جس کا وہ مکلف نہیں، وہ ساری عمر کھپا کر بھی اتنی اہلیت پیدا کرنے سے عاجز ہے پھر عمل کب کرے گا؟ قبر میں جانے کے بعد یا میدان قیامت میں؟ اور اگر کوئی عالم بے قید تیار ہو جائے کہ تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے تمام ائمہ کے اقوال و دلائل کی تحقیق تام فرمانے کے بعد ایک بے نظیر معجون مذاہب تیار کیا ہے، تم اسے لے لو اور حسب ضرورت استعمال کرتے رہو، اس میں ساری مشکلات سے نجات ہے اور یہ ساری آسائشوں کا انتخاب لا جواب ہے- اب وہ شخص وہ نسخۂ کیمیا ہاتھ میں لے اور آنکھ بند کر کے اس پر عمل کرتا رہے تو یہ بارہ سو سال پہلے کے کسی امام کو چھوڑ کر پندرہویں صدی کے ایک عالم بے قید کی تقلید شخصی ہوگی اور آج اسی پر پوری دنیا کے غیر مقلدین سختی سے کاربند ہیں-

مگر بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ابتدائی دو صدیوں کے بعد سے ہی پوری دنیائے اسلام ایک امام مجتہد کی پابندی پر کاربند ہے، پھر فرق کیا رہا؟ صرف یہ کہ قدیم امام جو علم وتقویٰ، فقاہت واجتہاد، عہد رسالت سے قرب وغیرہ ہر لحاظ سے اعلیٰ واعظم تھا اسے چھوڑ کر آج کے ہر لحاظ سے اشنی وپست شخص کی پیروی ہو-

ایک امام معین کی پیروی بھی اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ خدا اور رسول کے احکام سے ہمیں باخبر کرتا ہے اور جہاں جہاں اس نے خود اجتہاد کیا ہے تو اپنی طرف سے اس نے کوئی چیز حلال یا حرام نہیں ٹھہرائی ہے بلکہ نصوص کتب وسنت میں نظر غائر کے نتیجے میں جس چیز کو اس نے خدا ورسول کے یہاں حلال جانا ہے، اسے حلال بتایا ہے، جسے حرام جانا ہے، اسے حرام بتایا ہے اور ہم نے اس کی دیانت وتقویٰ کا مشاہدہ اور اس کے رسوخ علم کا تجربہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کر لینے کے بعد اس پر اعتماد کیا ہے اور اس کے اقوال کو قبول کیا ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:-تقلید شخصی، یعنی غیر نبی ﷺ کا مطلق التزام اور تمام امور میں کسی ایک عالم وفقیہ کی مکمل اقتداء ایک حرام، منکر اور اجماع کے خلاف امر ہے- بعض حالات میں اور کچھ ضروری قیود وحدود کے ساتھ بعض علماء نے تقلید کو جائز قرار دیا ہے جس کے لیے کتب اصول کا مراجعہ کرنا چاہیے- یقیناً امت مسلمہ کی بھلائی اُسی راستہ کی پیروی میں ہے جس کی پیروی سلف صالحین صحابہ وتابعین نے کی- چنانچہ امام احمد کا مشہور قول ہے ''لا تقلدونی ولا تقلدوا مالکاً ولا الشافعی ولا الاوزاعی ولا الثوری وخذوا الاحکام من حیث اخذوا'' نہ میری تقلید کرو اور نہ مالک، نہ شافعی، نہ اوزاعی اور نہ ثوری کی تقلید کرو بلکہ احکام وہاں سے لو جہاں سے یہ حضرات اخذ کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اپنے شاگرد خاص امام ابویوسف کو نصیحت فرماتے ہیں ''اننا بشر نقول القول الیوم ونرجع عنه غداً''، یعنی مجھ سے سنی ہوئی ہر بات مت لکھ لیا کرو کیونکہ ہم بشر ہیں آج ایک بات کہتے ہیں اور کل اس سے پلٹ جاتے ہیں- اور امام ابوحنیفہ کا مشہور قول ہے ''اذا صح الحدیث فھو مذھبی''، یعنی جب صحیح حدیث مل جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو- اور امام مالک کا فرمان ''لن یصلح آخر ھذہ الامة الا بما صلح به اولھا''، یعنی امت کا آخری دور اس وقت اصلاح ودرستگی کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اوائل امت کی راہ اختیار نہ کرے- (یعنی منہج صحابہ پر کتاب وسنت کی کامل پیروی کے بغیر امت کی اصلاح ممکن نہیں) (ایقاظ الھمم للفلانی واعلام الموقعین لابن القیم والمیزان للشعرانی وغیرہ)

تقلید شخصی کے وجوب کے قائلین کے پاس مغالطات کے سوا کوئی معتبر دلیل نہیں ہے- اللہ تعالیٰ کا خوف اور کتاب اللہ وسنن صحیحہ کی پیروی کا جذبہ خالص ہی انسان کو اباحیت اور فکری وعملی انارکی سے نجات دے سکتے ہیں- ورنہ بعض فقہاء (سامحہم اللہ، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے) کی حلت وحرمت کے باب میں حیلہ سازیاں اہل علم وتحقیق سے مخفی نہیں- لہٰذا امت کو نہ صرف یہ کہ تقلید کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اتحاد امت کے لیے یہ زہر ہلاہل ہے- تقلید شخصی کے رواج سے پہلے کی ابتدائی چار صدیوں میں امت مسلمہ کے متعلق مقلدین کیا رائے قائم کریں گے جو کسی ایک متعین شخص کی تقلید پر متفق نہ تھی؟ جب کہ قرون مفضلہ، بہترین ادوار میں اسلام نے نمایاں ترقی کی ہے اور یہ ترقی صرف اتباع کتاب وسنت کا ثمرہ تھی-

مولانا وحید الدین خاں:-میرے نزدیک تقلید شخصی اصولاً ایک نادرست چیز ہے- وہ صرف ضرورت شرعی کی بنا پر درست قرار پا سکتی ہے- اور وہ یہ کہ جو آدمی براہ راست عربی ماٴخذ سے مسئلہ دریافت کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو وہ کسی ایسے شخص کا مقلد بن جائے، جس کے علم اور نیت پر اس کو اعتماد ہو-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- ابھی جیسا کہ میں نے بتایا کہ منصوص مسائل میں تقلید کی ضرورت نہیں ہے اور ایسے ہی جو مسائل اجماعی ہیں، متفق علیہ ہیں، ان میں بھی تقلید کا کوئی سوال نہیں اٹھتا- ہاں! جو غیر منصوص مسائل ہیں اور ان میں مجتہدین کے مابین اختلاف ہوگیا ہے، اب ان مسائل میں ہم سب کی باتیں کیسے مان سکتے ہیں یہ تو ممکن ہی نہیں- تو اب یہیں پر تقلید کی ضرورت پڑتی ہے- کیوں کہ کوئی عمل جب بھی کرے گا تو ایک ہی پر کرے گا-

تقلید شخصی دراصل اتباع ہوا سے روکنے کے لیے ہے، تقلید شخصی نہیں ہوگی تو جس کو جو مسئلہ جہاں آسان نظر آئے گا اس کا اتباع کرے گا تو گویا یہ شریعت کی نہیں اپنی طبیعت کی پیروی ہوگی-

اب مثال کے طور پر ایک شخص نے وضو کیا اور مس ذکر کرلیا تو ایک امام کے نزدیک تو اس کا وضو ٹوٹا دوسرے کے نزدیک نہیں ٹوٹا- پھر وضو کے بعد اس کے جسم سے خون نکل آیا تو ایک کے نزدیک تو وضو ٹوٹ گیا دوسرے کے نزدیک نہیں ٹوٹا- تو ایک ہی وقت میں اس نے مس ذکر بھی کرلیا اور اس کے بدن سے خون بھی نکل آیا تو اس کا وضو تو دونوں اماموں کے نزدیک ٹوٹ گیا- اب گویا اس نے بغیر وضو کے ہی نماز پڑھی- اب وہ کہے کہ مس ذکر کے مسئلہ میں ہم نے امام ابوحنیفہ کی پیروی کی اور خون کے مسئلہ میں امام شافعی کی پیروی کی- اس طرح میری نماز درست ہوگئی، کیوں کہ دونوں امام برحق ہیں- تو اس کا یہ فریب دراصل اماموں کی تقلید نہیں، ہوائے نفس کی تقلید ہے- اسی لیے تقلید شخصی ضروری ہے- ایک ساتھ دو چار ائمہ کی تقلید نہیں کی جا سکتی- اسی لیے منطق کا مسئلہ ہے کہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف فکر کا انتقال بھی محال ہے، اور عمل بھی بہ یک وقت محال ہے-

علاوہ ازیں تقلید مطلق تو سب کے نزدیک جائز ہے، قرآن کا حکم ہے کہ فاسئلوا أهل الذكر ان كنتم لا تعلمون- اس کو سب مانتے ہیں اور یہ اصول ہے کہ جو چیز کلیات میں جائز ہوگی وہ جزئیات میں بھی جائز ہوگی تو جب تقلید مطلق جائز تو عقلی طور پر تقلید شخصی جو تقلید مطلق کی ہی فرع ہے ضرور جائز ہونی چاہیے-

اس کے ساتھ ایسا بھی نہیں کہ حالات وضروریات سے آنکھیں موند کر تقلید کی جاتی ہو- تقلید شخصی کے اندر بھی اس بات کی وسعت ہے کہ اگر ضرورت ہو، مجبوری ہو تو ہم توسع کے لیے دوسرے امام کے قول پر عمل کر سکتے ہیں- جیسے مفقود الخبر شوہر کے بارے میں اب ہمارے یہاں امام مالک کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے- تقلید شخصی کا معنی ہرگز تقلید جامد نہیں ہے-

سوال (۸):- تقلید کی مخالفت کے پیچھے کیا واقعی ''دعوۃ الی الکتاب والسنۃ'' کا جذبہ کارفرما ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- غیر مقلدین نے پہلے تو بہت شد و مد کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ کتاب وسنت کی پیروی کرو، ائمہ کی پیروی شرک جلی ہے اور تمام مقلدین مشرک مباح الدم ہیں، وہ ''اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله'' کے مصداق ہیں، وہ ائمہ کی تحلیل وتحریم کو مان کر ان کے پجاری ٹھہرے اس لیے چھ سو سال کی پوری امت شرک خالص پر گزری-

اس دعوے کا تقاضا یہ تھا کہ غیر مقلدین ایسا مجموعۂ احکام منظر عام پر لاتے جو صرف کتاب وسنت کی تصریحات پر مشتمل ہو اور کسی امام کے قیاس واجتہاد اور تحلیل وتحریم سے یکسر خالی ہو، مگر یہ کام غیر مقلدین سے آج تک نہ ہو سکا- جیسے چکڑالوی فرقہ نے صرف کتاب اللہ کے اتباع کا نعرہ بلند کیا مگر کوئی ایسا نظام عمل پیش کرنے سے عاجز رہے جو صرف قرآن مجید کی تصریحات پر مشتمل اور تمام شعبہا زندگی پر حاوی ہو-

غیر مقلدین کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہ پیش کر سکے جو کتاب وسنت میں ان کے اجتہاد کا ثمرہ ہو- ان کا کارنامہ بس یہ رہا کہ بزعم خویش ''تقلید جامد'' سے ہٹ کر ''تقلید سیال'' پر آگئے- یعنی کسی ایک امام کا پورا مذہب اختیار کرنے کے بجائے اپنی راحت بدن اور ہوائے نفس کے مطابق مختلف ائمہ کے مذاہب سے کچھ کچھ مسائل چھانٹ کر ایک معجون مرکب تیار کرلیا- اب وہ خود ہی بتائیں کہ ایک امام کی تحلیل وتحریم کو ماننے والا ''واتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله'' کا مصداق ہوا تو چند اماموں کی تحلیل وتحریم کو ماننے والا اس کا مصداق کیوں نہیں ہوا؟ وہ تو کسی ایک حبر وراہب نہیں بلکہ بقول آپ کے واقعۃً چند احبار ورہبان کو ارباباً من دون اللہ بنانے والا ہے، وہی تو اس کا سچا اور پورا پورا مصداق ہے؛

اگر یہ کہیں کہ ہم نے چند احبار کو اپنی تحقیق اور اتباع کتاب وسنت کے تحت مانا ہے تو ایک امام کا مقلد بھی یہی کہتا ہے کہ ہم نے اپنے امام کو خدا یا رسول نہیں مانا ہے، بلکہ خدا کا بندہ، رسول کا امتی، ان کے

ارشادات کا غواص اور ان کے احکام کا مبلغ اور مظہر ہی مانا ہے اور ہمیں بھی تحقیق سے معلوم ہے کہ انہوں نے نہایت اخلاص وامانت، کمال علم و ادراک اور وفور آلات اجتہاد کے ساتھ کتاب و سنت کے سمندر میں غواصی کر کے احکام شریعت کے تابناک گوہر نکالے ہیں اور ہم نے ہاتھوں ہاتھ لیے ہیں تا کہ خدا اور رسول کی اطاعت اور زندگی کے ہر شعبے میں شریعت حقہ کی پیروی ہو سکے۔

الحاصل تقلید کی مخالفت کے پیچھے اتباع کتاب وسنت کا جذبہ کار فرما نہیں، بلکہ اتباع نفس کا جذبہ کار فرما ہے۔ یا ان ہی کے الفاظ میں ''تقلید جامد'' سے ہٹ کر، ''تقلید سیال'' کا راحت بخش داعیہ کار فرما ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی: ۔تقلید کی ضد اتباع ہے اور تقلید کا لفظ اپنے عرفی معنی میں ایک محدث لفظ ہے۔ لہٰذا مقصود اصلی بنیادی طور پر اتباع کتاب وسنت ہونا چاہیے اور تقلید جامد کی مخالفت کرنے والوں کا مطمح نظر بھی یہی ہے۔

مولانا وحید الدین خاں: ۔تقلید کی موجودہ مخالفت میرے نزدیک صرف کٹر پن یا گروہی عصبیت کی بنا پر ہے۔ میں تقلید کا جزوی مخالف ہوں۔ یعنی عوام کے لیے تو میں تقلید کو درست مانتا ہوں۔ لیکن خواص اہل علم کے لیے نہیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی: ۔ممکن ہے، بہت سے لوگوں کی نیت صالح ہو، لیکن بیشتر لوگ نیک جذبات کے تحت کتاب و سنت کی دعوت نہیں دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکثر لوگوں کے نزدیک اصل مسئلہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ میں یہ قطعی طور پر نہیں مان سکتا کہ ان کے سینوں میں ائمہ، صالحین، اسلاف اور اولیاء اللہ سے زیادہ اتباع شریعت کا جذبہ موجود ہے۔ جتنے اولیاے کرام اور بزرگان دین ہوئے ہیں سب کا مطالعہ کر جائیے، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ تک، یا دوسرے اولیاے کرام ہیں، مثلاً خواجہ غریب نواز، حضرت صابر کلیری، شہاب الدین سہروردی یا آج بھی جتنے صالح لوگ ہیں، سب کسی نہ کسی امام کے مقلد ہیں تو کیا آج جو لوگ کتاب وسنت کے نام پر تقلید کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کے اندر ان حضرات سے زیادہ جذبہ اتباع شریعت ہے؟ جی نہیں! کتاب وسنت کی دعوت کا آخر معنی ہے کیا؟ کیا ائمہ نے کتاب وسنت سے ہٹ کر کوئی قانون بنایا؟ کتاب وسنت کے منشا تک پہنچنے کے لیے اور پورے طور پر شریعت کا اتباع کرنے کے لیے ہی انہوں نے اجتہاد کیے ہیں۔ تو اجتہاد کتاب وسنت کی دعوت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ ہم یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ ائمہ اور مجتہدین کا جو فہم ہے، یہ عام لوگوں کے فہم سے بڑھ کر ہے۔ اس میں نسبۃً یہ احتیاط ہے کہ ہم اپنے سے بالاتر فہم والے کے اوپر اعتماد کر کے قرآن وسنت کا اتباع کریں۔ یہ کتاب وسنت کی حقیقی پیروی ہے، مخالفت نہیں۔ پھر کتاب وسنت کی دعوت دینے والے کوئی نمونہ بھی تو پیش کریں، جس کو ہم کہیں کہ یہ کتاب وسنت کی دعوت ہے۔ اور اس سے ہٹ کر کتاب وسنت کی مخالفت ہے۔ انہوں نے اب تک کوئی نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔

سوال (۹): ۔غیر مقلدیت کا وجود کب سے اور کیوں ہوا؟

مولانا محمد احمد مصباحی: ۔ہندوستان میں شاہ اسماعیل دہلوی نے اس کی تخم ریزی کی اور میاں جی نذیر حسین دہلوی نے اس کی کاشت تیار کی، یعنی یہ پودا تیرہویں صدی کے ربع دوم میں لگا اور ربع سوم و چہارم میں پیداوار مارکیٹ میں فروخت ہونے لگی۔

مولانا عبدالوہاب خلجی: ۔مقلدیت اور غیر مقلدیت جیسا کہ عرض کیا گیا اصطلاح حادث ہے۔ اصل دین، اتباع کا نام ہے ''اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم'' لہٰذا اتباع کی تاریخ اُتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اسلام کی تاریخ۔ وللہ الحمد۔ اگر کوئی ائمہ اربعہ کی تقلید کو حرام اور بعد کے کسی عالم کی تقلید کو واجب گردانتا ہے تو اس کی مثال ''فر من المطر وقام تحت المیزاب''، یعنی بارش سے بچنے کے لیے پرنالہ کے نیچے کھڑے ہونے کی ہے۔ ہر حال میں دلیلوں کی پیروی اور حق کا اتباع واجب ہے۔ کسی عالم وفقیہ کی وہی بات لائق اخذ واعتناء ہے جو دلیل سے مبرہن ہے اور ایسی صورت میں اصل اتباع، دلیل کا ہے نہ کہ اُس عالم کا۔ یہی وجہ ہے کہ خالی از دلیل یا مخالف دلیل قول کا متبعین کتاب وسنت کی دنیا میں کوئی اعتبار نہیں۔ چاہے اس کا قائل وقت کا بڑے سے بڑا عالم کیوں نہ ہو۔ لہٰذا سوال تو یہ مناسب تھا کہ مقلدیت کا وجود کب سے ہوا؟ کیونکہ اتباع اصل شئی ہے اور تقلید شئی حادث یعنی چوتھی صدی ہجری کی پیداوار۔ (سوال نمبر ۹/اور ۱۰/کا جواب اسی میں ہے)

مولانا وحید الدین خاں: ۔غیر مقلدیت کے آغاز کی قطعی تاریخ بتانا، شاید ممکن نہیں ہے۔ لیکن عام طور پر اس کا آغاز غالباً

امام ابن تیمیہ سے شروع ہوتا ہے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:۔اس طرح کے کچھ لوگ ہمیشہ رہے ہیں جو امت کی عام روش سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں۔لیکن انہیں آپ شرذمہ قلیلہ کہہ سکتے ہیں۔وہ امت کا عام رویہ نہیں ہے، اسے آپ امت کے Main stream سے کٹے ہوئے انحرافی نظریے کی پیداوار کہہ سکتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ غیر مقلدیت کا تو کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا ہے۔میرے نزدیک اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا طبقہ نہیں، جسے ہم صحیح معنی میں غیر مقلد کہہ سکتے ہیں۔

سوال (۱۰):۔غیر مقلدیت نے امت کو ائمہ اربعہ کی تقلید سے آزاد کرایا ہے یا کسی دوسری تقلید میں الجھا دیا ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:۔ایک نئی تقلید میں الجھا دیا ہے، آزادی تو جب ہوتی کہ ہر غیر مقلد مجتہد ہوتا اور الگ الگ اجتہاد سامنے آتا۔یا کم از کم یہی ہوتا کہ مثلاً رفع یدین یا آمین بالجہر ،قرأت خلف الامام اور دوسرے صدہا مسائل میں کسی کو امام ابوحنیفہ کی دلیل وزنی معلوم ہوتی، کسی کو امام مالک کی، کسی کو امام شافعی یا امام احمد بن حنبل کی، اور ہر ایک اپنی تحقیق کے مطابق آزادی کے ساتھ بے روک ٹوک عمل کرتا۔

مگر صورت حال یہ ہے کہ ہزاروں غیر مقلد جنگلی اور گنوار ہیں جن کے لیے صحیح طور سے سورۂ فاتحہ پڑھنا یا اردو میں لکھا ہوا ترجمہ قرآن سمجھنا بھی دشوار ہے، وہ اجتہاد یا تحقیق کیا کریں گے۔کچھ غیر مقلد اگر عالم ہیں تو سب کا مذہب وہی ہے جو میاں جی اور ان کے معاصر و موافق رفقا نے ثبت قرطاس فرمادیا۔کوئی شخص اس سے سرمو انحراف کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔نتیجہ سامنے ہے کہ نہ آزادانہ اجتہاد رہا، نہ آزادانہ تحقیق اور فکر وجستجو، ایک طے شدہ ،مقررہ اور احبار و رہبان کے ہاتھوں نئی کتابوں میں درج شدہ مذہب کی ''تقلید جامد'' رہ گئی۔اجتہاد تو ان کے یہاں کچھ تھا نہیں ''تقلید سیال'' بھی رخصت ہوگئی۔

مولانا وحید الدین خاں:۔بطور واقعہ اس معاملے میں جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہی ہے کہ اس کی وجہ سے امت تقلید سے آزاد نہیں ہوسکی، بلکہ وہ ایک نئی تقلید میں مبتلا ہوگئی ہے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:۔آپ کسی حدیث کو کہہ رہے ہیں کہ ضعیف ہے کیوں کہہ رہے ہیں، اس لیے کہ اسے ذہبی نے بیہقی نے یا ابن کثیر نے ضعیف کہا۔تو آپ کا اس حدیث کو ضعیف کہنا یہ تقلید ہوئی۔تو جس طرح فن کے اندر آپ مقلد ہیں تقلید کر رہے ہیں تو پھر احکام شریعت کے لیے جو فقہی اصول ہیں ان میں بھی آپ کو تقلید سے انکار کا حق نہیں پہنچتا۔وہاں آپ کسی صاحب بصیرت کی ہی تقلید کررہے ہیں جس نے کتاب وسنت سے احکام استخراج کیے ہیں۔

سوال (۱۱):۔جماعت سلفیہ اور جماعت اہل حدیث میں کچھ فرق بھی ہے یا اختلاف صرف ناموں کا ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:۔اصل میں غیر مقلدین کا جب وجود ہوا اور ابن عبدالوہاب کا اعتقادی مذہب انہوں نے اپنایا اور عمل میں مذاہب ائمہ سے آزادی کا نعرہ بلند کیا تو مقلدین نے انہیں وہابی یا لامذہب یا غیر مقلد کا نام دیا۔کوئی نام انہیں پسند نہ آیا۔انہوں نے ماضی کی صدیوں کا مطالعہ کیا، ماضی میں سلفی اور محدث یا اہل حدیث نام کے گروہ انہیں نظر آئے، یہ نام انہیں اچھے لگے اور انہیں سے اپنی تشہیر گوارا کرلی، کبھی اپنے کو محمدی یا اثری بھی کہتے ہیں، شاید اور زیادہ اچھے نام کی تلاش ابھی جاری ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی:۔جماعت سلفیہ، جماعت اہل حدیث اور انصار السنۃ، وغیرہ میں کوئی فرق نہیں، یہ نہج صحابہ وتابعین یعنی مطلق کتاب وسنت، ثابت اجماع اور قیاس شرعی کو حسب ضرورت قبول کرنے والی جماعت کے مختلف نام ہیں۔اور جب مقصود ومنشور ایک ہوتو ناموں کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔''لا مشاحۃ فی الاصطلاح''

مولانا وحید الدین خاں:۔جہاں تک میں جانتا ہوں دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے، ضمنی نوعیت کا فرق پایا جاسکتا ہے۔لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، دونوں کے درمیان حقیقی نوعیت کا کوئی فرق موجود نہیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:۔دیکھیے!جب آدمی کے سامنے کوئی مضبوط بنیاد نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید حاصل نہ ہو تو اسی طرح انتشار پیدا ہوتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ جب مامون کے زمانہ میں خلق قرآن کا مسئلہ سامنے آیا اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے یہ پوچھا گیا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟اور ان پر جبر کیا گیا تو انہوں نے صاف صاف یہی کہا کہ ہم نے کتاب وسنت میں

کہیں ایسا نہیں پایا اور نہ اپنے اسلاف سے سنا کہ یہ مخلوق ہے- اس لیے ہم اسے مخلوق نہیں کہہ سکتے - بعد میں اسی بنیاد پر امام احمد ابن حنبل کو ماننے والے اپنے آپ کو سلفی بھی کہنے لگے تو عالم عرب میں دراصل حنابلہ کو سلفی کہا جاتا ہے، جو امام احمد ابن حنبل کے مقلد ہیں- اور آج بھی عالم عرب میں وہی سلفی ہے جو حنبلی ہے، غیر مقلدیت کا تعلق سلفیت سے کچھ بھی نہیں ہے- غیر مقلدیت درحقیقت کتاب وسنت کی بابصیرت رہنمائی سے انحراف کا نام ہے اور جہاں تک اہل حدیث کا معاملہ ہے تو یہ بھی عجیب وغریب ہے- پہلے یہ محمدی تھی اور پھر اہل حدیث ہو گئے، پھر اپنے آپ کو سلفی کہنے لگے- یہ اس وقت ہوا جب عالم عرب میں پڑول نکلنا شروع ہوا اور یہاں کے اہل حدیث کے رابطے وہاں سے ہو گئے- اس سے قبل آپ کسی بھی اہل حدیث کے ساتھ سلفی لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے تو اس کو ہم کیا کہیں کہ کل تک تو اہل حدیث رہے اور آج اچانک سلفی ہو گئے- اسی لیے ہمیں یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ جن کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی وہ اسی طرح سے اپنا نام بدلتے رہتے ہیں-

مولانا محمد حسین بٹالوی نے برٹش حکومت کے زمانہ میں اپنے طبقہ کا نام اہل حدیث رجسٹرڈ کرایا تھا- اس سے پہلے وہ محمدی کہلاتے تھے، تو بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے آدمی ہر طرف لڑھکتا رہتا ہے-

اب رہا ہندوستانی اہل حدیث اور عالم عرب کی جماعت سلفیہ کے بیچ تقابل کی بات تو عالم عرب میں جتنے بھی سلفی ہیں، تقریباً سب کے سب مقلد ہیں، ہندوستانیوں کی طرح مخالف تقلید نہیں، پھر عموماً وہ حنبلی ہیں اور تھوڑے بہت شافعی اور مالکی بھی ہیں- لیکن ہندوستان کے اندر اہل حدیث کا جو نظریہ ہے اور مخالفت تقلید کی جو لہر ہے، اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے- ہاں! اس کے باوجود اب ہندوستانی اہل حدیث ان کے ساتھ روابط کو بڑھانے کے لیے ان سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرور کوشش کر رہے ہیں-

علامہ شوکانی یمن کے ایک زیدی شیعہ تھے، انہوں نے تقلید کی مخالفت کا آغاز کیا اور ایک نئی روش پیدا کی تو ان کے بعد سے ہی یہ انحرافی رویہ چلا ہے- رہا علامہ ابن تیمیہ یا علامہ ابن قیم کا ذکر، جن کا یہ حضرات بہت چرچا کرتے ہیں تو خود وہ بھی غیر مقلد نہیں تھے، وہ سب کے سب مقلد تھے، حضرت غوث اعظم بھی مقلد تھے، اب یہ کہ بعض مسائل میں انہوں نے اختلاف کیا تو یہ ان کے اپنے تفردات ہیں، جیسے حنفیوں میں علامہ ابن ہمام کے تفردات ہیں، شاہ ولی اللہ کے تفردات ہیں، وغیرہ وغیرہ- علامہ ابن تیمیہ کے جتنے تفردات ہیں سب کی تعداد ۷۰/۲ ہے اور باقی مسائل میں وہ خود بھی مقلد ہیں، ان کو اہل حدیث غیر مقلد کہنا بالکل غلط ہے-

سوال (۱۲):- جماعت اہل حدیث کا اختلاف صرف فقہی ہے یا نظری واعتقادی بھی ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- غیر مقلدین اعتقاداً کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے پابند ہیں اور عملاً ایک نئی تشکیل اور جدید تدوین کے، دونوں کی کچھ تفصیل جامع الشواہد میں محدث سورتی مولانا وصی احمد علیہ الرحمہ نے دی ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- جماعت اہل حدیث پورے اسلام کی نمائندہ جماعت ہے، اور وہ مخالف کتاب وسنت واجماع صحیح کسی عقیدہ وعمل یا فکر ونظر کو قبول نہیں کرتی- ویسے ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے عقائد کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں اور بنیادی طور پر ان کے درمیان عقیدہ کے باب میں کوئی قابل ذکر ولحاظ اختلاف نہیں ہے- صوفیاء اور خانقاہیوں کے درمیان مروجہ عقائد میری مراد نہیں ہیں- کیونکہ ائمہ اربعہ میں سے بعض کی طرف انتساب کرنے والے بہت سے لوگ عقائد کے اعتبار سے اشعری اور ماتریدی ہیں- اور تصوف کے متعلق مزید چار سلسلے رائج اور مشہور ہیں- جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں-

مولانا وحید الدین خاں:- جہاں تک میں جانتا ہوں، جماعت اہل حدیث کا اختلاف دونوں نوعیت کا ہے- فقہی مسائل کے اعتبار سے بھی اور اعتقادی مسائل کے اعتبار سے بھی-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- غیر مقلدین کے زیادہ تر اختلافات فقہی ہیں، لیکن کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جو نظریاتی ہیں، یہ نظریاتی اختلافات ان لوگوں نے شیخ ابن تیمیہ کے اتباع میں اپنا لیے ہیں، مثلاً یہ کہ اللہ فوق میں ہے اور یہ کہ انسانوں کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں بھی ہیں، تو اس طرح کے نظریاتی اختلاف کے اندر اگر ہم احتیاط کریں اور ان کی تکفیر نہ کریں تو کم از کم وہ گم راہ تو ہیں ہی- ان کی گمرہی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا-

سوال (۱۳):- غیر مقلدیت نے ''دعوۃ الی الکتاب والسنۃ'' کے نام پر امت کو متحد کیا یا اس کے انتشار کے مزید سامان بہم پہنچا دیے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:-امت ائمہ اربعہ کو برحق مانتے ہوئے اپنے امام کی تقلید پر مطمئن تھی غیر مقلدیت کے وجود میں آتے ہی انتشار اور جنگ وجدال کا ماحول برپا ہو گیا-فوجداری، مقدمہ کورٹ، کچہری سب کی نوبت آئی اور سلسلہ اب بھی جاری ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:-اہل حدیث اور انصار السنۃ، امت کو یقیناً کتاب وسنت اور اعتصام بحبل اللہ کے پلیٹ فارم پر متحد کرنے کے آرزومند ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کی تعداد میں اضافہ فرمائے اور کوششوں کو بارآور کرے۔جماعت اہل حدیث نے ہمیشہ امت کو انتشار سے بچانے اور شاہراہ قرآن وحدیث پر متحد کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔پہلے بھی امت کا اتحاد کتاب وسنت پر قائم تھا اور آج بھی اسی متحدہ پلیٹ فارم پر اتحاد قائم اور راسخ ہوسکتا ہے۔کاش! لوگ غور وفکر سے کام لیتے۔

مولانا وحید الدین خاں:-اس سوال کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس کوشش کا عملی نتیجہ منفی صورت میں نکلا ہے-اور اس کا سبب غلو ہے-جب بھی غلو کا طریقہ اختیار کیا جائے گا ہمیشہ اس کا نتیجہ منفی صورت میں برآمد ہوگا-

مولانا عبدالحمید نعمانی:-ہر باطل تحریک ایک خوشنما نام کے ساتھ سامنے آتی ہے-معتزلہ کی تحریک اصحاب العدل والتوحید کے نام سے اٹھی تھی-لیکن ظاہر ہے کہ وہ گمراہی تھی، قادیانیت کی تحریک کو دیکھیے وہ تحفظ ختم نبوت کی تحریک، خدا کی نعمت کی تحریک بتا رہے ہیں، تو اس طرح کی جتنی تحریکیں ہوتی ہیں، کسی خوب صورت نام کے ساتھ ہی سامنے آتی ہیں اور یہ باطل کی کمزوری ہے کہ وہ کبھی بھی اپنی اصلیت کو واضح کر کے سامنے نہیں آسکتی-شیطان اپنی ہر شیطانی کو خوب صورت بنا کر پیش کرتا ہے، اس طرح کی تمام انحرافی تحریکوں کا یہی حال ہے، ان کا کتاب وسنت کی دعوت یا اتباع شریعت کے جذبے سے اصلا کوئی تعلق نہیں ہوتا، آج بھی وہ لوگ جو اسلاف کے حقیقی معنی میں اتباع کرتے ہیں، صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور اولیاء اللہ کا احترام کرتے ہیں، ان کے اندر اتباع شریعت کا جذبہ ان سے بہت زیادہ ہوتا ہے جو صرف کتاب وسنت کے نام سے اپنا کام چلانا چاہتے ہیں، کون کتاب وسنت کی پیروی کو اولین اور بنیادی فریضہ نہیں سمجھتا؟ ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کتاب وسنت کے مطالبات پر زیادہ سے زیادہ عمل کرے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ کتاب وسنت کی دعوت نے لوگوں کو اتباع شریعت کی طرف متوجہ نہیں کیا ہے، بلکہ دین کے اتباع پر جو سماج قائم تھا، اس میں انتشار وخلفشار پیدا کر دیا ہے اور عوام ذہنی طور پر سخت الجھن کا شکار ہو گئے ہیں-

سوال (۱۴):-عالمی تناظر میں مسلمانوں کے حوالے سے سعودی عرب کے منفی کردار میں اس کی غیر مقلدیت کا کیا کردار ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:-سعودی عرب میں رہنے والے شیوخ نجد کو غیر مقلدیت سے زیادہ عقیدۂ وہابیت سے دلچسپی ہے اور اس کو وہ طاقت، دولت، افراد وغیرہ کے ذریعہ پھیلانے میں منہمک ہیں، وہ حنبلیت کے مدعی ہیں مگر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد دیگر مذاہب کے مصلے مسجد حرام سے ختم کر دیے-تعظیم واحترام کو عبادت اور شرک کہتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے آثار و مقابر کو اصنام کا درجہ دیتے اور ان کی شکست وریخت کو بت شکنی سمجھتے ہیں-

مولانا عبدالوہاب خلجی:-سعودی عرب کے کردار پر لوگوں کی آراء مختلف ہوسکتی ہیں۔میرا حسن ظن ہے کہ سعودی عرب کی اسلامی حکومت امت مسلمہ کے مفاد میں کام کر رہی ہے اور ''رموز مملکت خویش خسرواں دانند'' کے تحت وہ جو بھی قدم اُٹھا رہی ہے اس کے پیچھے دوررس مقاصد کارفرما ہیں۔دور دراز علاقوں میں بیٹھے اور جھوٹ و بے سروپا باتوں کی اشاعت کرنے والی میڈیا کے دام فریب میں مبتلا حضرات کو خواہ مخواہ اس مملکت سے بدگمانیاں اور خدا واسطے کا بیر ہیں۔جب کہ یہ حکومت بفضلہ تعالیٰ شدت پسندی کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہی ہے اور آج بھی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی دہشت گردی سے نبرد آزما رہے گی۔حکومت کا منشور اتباع کتاب وسنت اور رد بدعت کے ساتھ امت مسلمہ کی خیر خواہی ہے۔اور شاید ان ہی اصولوں پر کاربند ہونے کے سبب مسلمانوں کے بعض طبقات کو اس حکومت سے بلاوجہ ردوکد ہے۔ویسے میرا یہ بھی دعویٰ نہیں کہ حکومت اپنے ہر فیصلہ اور اقدام میں درست ہے۔لیکن بہر حال اس کے محاسن، معائب پر غالب ہیں اور اگر کسی کو کوئی خامی وخرابی نظر آتی ہو تو دین خیر خواہی کا نام ہے۔اس کو چاہیے کہ حکومت یا اس کے سفارت خانے سے رجوع کرے۔

مولانا وحید الدین خاں:-جہاں تک میں جانتا ہوں مسلمانوں کے حوالے سے سعودی عرب کا کوئی منفی کردار نہیں ہے اور اگر

ہے تو مجھے اس کا علم نہیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی: -دیکھیے! ہم لوگوں نے جو دیکھا ہے، جو سمجھا ہے اور رابطہ ہونے کے بعد جب بات چیت ہوئی ہے تو اس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سعودی حکومت اور وہاں کے ذمہ داران کا غیر مقلدیت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، چاہے محمد بن عبدالوہاب ہوں چاہے آج کے دوسرے ذمہ داران ہوں، آل شیخ وغیرہ- ان کا تحریری بیان موجود ہے کہ ہم ائمہ اربعہ کی توہین کے خلاف ہیں، ہم چاروں ائمہ کا احترام کرتے ہیں اور ہم لوگ حنبلی ہیں اور ہمارا عقیدہ وہی ہے جو ہمارے اسلاف کا رہا ہے-لیکن یہ لوگ جو ہندوستان میں اہل حدیث اور غیر مقلد کے نام سے جانے جاتے ہیں، یہ اپنے آپ کو وہاں کی سلفیت سے جوڑ کر ایک طرح کی غلط فہمی اور مغالطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، ورنہ سعودی حکومت کا وہاں بالکل ایسا کردار نہیں ہے کہ وہ غیر مقلدیت کو اہمیت دے- جب جمعیۃ العلماء نے تحفظ سنت کانفرنس میں یہ سوال اٹھایا تھا تو وہاں کے ذمہ داروں نے باضابطہ کہا کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے-لیکن ہاں! کچھ لوگ وہاں اس طرح کے نظریات کے حامل ضرور ہیں، جو بااثر بھی ہیں-

سعودی کے اندر چوں کہ دو طبقات ہیں، ایک حکومت کا طبقہ ہے جسے ال سعود کہا جاتا ہے اور دوسرا مذہبی طبقہ ہے جسے ال شیخ کہا جاتا ہے- ال شیخ کے اندر کچھ لوگ ایسے ضرور رہے ہیں، جن کے اندر آزادی کا پہلو ابھرا ہوا ہے-لیکن ان کو آپ برصغیر میں جو معروف معنی میں اہل حدیث اور غیر مقلد کی اصطلاح ہے، اس معنی میں انہیں اہل حدیث یا غیر مقلد نہیں کہہ سکتے-لیکن وہاں پر جو حکومتی طبقہ ہے، ان کا جو مزاج ہے، اس سے بالکل ایسے آزاد رویہ کی تائید نہیں ہوتی ہے-حکومتی افراد تقریباً سب کے سب مسلکاً حنبلی ہیں- اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حکومت کی وجہ سے غیر مقلدیت کو فروغ ہو رہا ہے- ہاں! لیکن یہ جو میں نے کہا کہ یہ لوگ کنفیوژن پیدا کرتے ہیں، تو یہ اپنے اس حربہ سے کہ وہاں پر اپنے کو ان کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور یہاں پر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ سعودی میں ہمارے ہی نظریات کے لوگ ہیں- اس حربے سے ان کو ضرور فائدہ حاصل ہوتا ہے اور یہ اپنا فروغ کرتے ہیں-

سوال (۱۵): -کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے؟ اگر ہاں! تو کیوں؟ اور اگر نہیں تو عصر حاضر میں تحقیق و اجتہاد کی کون سی صورت ممکن یا واجب ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی :-اجتہاد کی اجازت اہلیت سے مشروط ہے اور وہ صدیوں سے مفقود ہے مگر ائمہ نے جامع اصولوں کی روشنی میں فروع کا جو ذخیرہ ہمیں دیا ہے، اس میں پیدا ہونے والے اکثر مسائل کا حل بعینہٖ مل جاتا ہے اور کچھ کے لیے نظر وفکر اور الحاق کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ کام انفرادی و اجتماعی طور پر ہر دور میں ہوتا آیا ہے اور آج بھی جاری ہے- اسی لیے مقلدین کے یہاں ہر نئے مسئلے کا حل مل جاتا ہے اور غیر مقلدین کے یہاں بے شمار پرانے مسائل بھی تشنہ ہیں-

مولانا عبدالوہاب خلجی: -اجتہاد کا دروازہ کس نے اور کب بند کیا کہ آج اس کے کھولنے کی ضرورت پیش آئی؟ مسائل لامتناہی ہیں اور شرعی اصول کے اندر ان کے حل کی پوری صلاحیت موجود ہے اور ماشاء اللہ متجددہ مسائل کے اندر امت کی رہنمائی کرنے والے علماء راسخین سے بھی یہ دنیا خالی نہیں ہے- ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ قیاس واجتہاد کے اصول کو نظر انداز نہ کیا جائے اور اس بحر کی شناوری وہی لوگ کریں جو اس کے اہل ہیں ...... ع ...... ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں

مولانا وحید الدین خاں :- کچھ علماء کا یہ کہنا ہے کہ فقہائے اربعہ کے بعد کے زمانہ میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے- اس رائے کی واحد بنیاد یہ ہے کہ ان کے نزدیک بعد کے زمانے میں علم کا رسوخ کم ہو گیا- یہ سب اس ضمن میں بلا شبہ بے اصل ہے- کیوں کہ حدیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ اجتہادی خطا پر بھی آدمی کو ایک ثواب ملتا ہے- میرے نزدیک اجتہاد کا دروازہ نہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ کبھی بند ہو سکتا ہے- میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اجتہاد ایک عبادت ہے اور عبادت کبھی بند نہیں ہوتی، اس سلسلے میں جو اصل بات ہے، وہ یہ ہے کہ اگر عالم کی نیت درست ہے تو اس کو اپنے اجتہاد کا ثواب ملے گا اور اگر اس کی نیت درست نہیں ہے تو اس کو اس کا ثواب نہیں ملے گا-

عصر حاضر میں اجتہاد کی ایک لازمی ضرورت یہ ہے کہ عالم علم شریعت کے ساتھ علم زمانہ سے بھی بخوبی طور پر آگاہ ہو- مثال کے طور پر وہ عربی زبان کے علاوہ انگریزی زبان کی اچھی استعداد رکھتا ہو تا کہ اس کی پہنچ جدید مصادر تک ہو سکے- اس دوطرفہ علم کے بغیر کوئی شخص موجودہ

زمانہ میں کامیاب مجتہد نہیں بن سکتا۔

مولانا عبدالحمید نعمانی :-اجتہاد کا دروازہ دور رسالت سے کھلا ہوا ہے، یہ دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے اور قیامت تک مسائل میں اجتہاد ہوتا رہے گا- امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محققین نے یہی لکھا ہے- اگر اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا جائے تو عصری مسائل جو پیش آتے ہیں، ان کا حل کیسے پیش کیا جا سکے گا- اصل مقصد مسائل کا حل ہے-خواہ یہ اجتماعی سطح پر ہو خواہ انفرادی سطح پر، آج اجتہاد کا عمل اجتماعی سطح پر بہتر انداز میں ہو رہا ہے-اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے اور نہ بند کرنے کا کسی کو حق ہے، آج چوں کہ مسائل بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں اور ہر مسئلے میں جدید وقدیم کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت سے پہلو پیدا ہو گئے ہیں- پھر اجتہاد کے لیے جس طرح کی صلاحیت اہل علم میں چاہیے تھی تقریباً مفقود ہے، کوئی ایک آدمی ایسا نظر نہیں ہوتا جو خود ہی سارے مسائل کو حل کر دے، ایسی صورت میں اجتماعی اجتہاد بہت ہی بہتر اور قابل تعریف عمل ہے-

سوال (۱۶):-ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے پیغام؟

مولانا محمد احمد مصباحی :-"جام نور" خوب سے خوب تر، مفید سے مفید تر کی جستجو میں جادہ پیما ہے، اسی بنیاد پر قارئین بھی اس کے دل دادہ ہیں- دونوں کا سفر استقامت اور روز بروز ترقی کے ساتھ جاری رہے، یہی آرزو اور یہی پیغام-

مولانا عبدالوہاب خلجی: -ماہنامہ جام نور کے مدیران اور مقالہ نگاران سے یہی گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کریں، اسلام کے اصل الاصول کتاب اللہ اور سنت مصطفےٰ ﷺ کی بالا دستی کے لیے اشہب قلم کو مہمیز لگائیں اور بدعات وخرافات نیز جذبات وعواطف سے پرہیز کریں۔ اور قارئین کرام حق وصواب کی جستجو میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں، اپنے آپ کو بدعقیدگی اور عملی انحطاط سے محفوظ رکھیں، زور بیان وقلم اور علماء سوء کی لن ترانیوں سے متاثر نہ ہوں بلکہ قرآن وسنت پر مبنی دلائل تلاش کریں اور انھیں کو حرز جاں بنائیں کیوں کہ معاملہ دین کا ہے اور الحمد للہ اللہ کا دین دلائل صحیحہ پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ حق کے کاموں پر ہم تمام لوگوں کا حامی وناصر ہو۔ والصلاۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین.

مولانا وحید الدین خاں :-ماہنامہ جام نور میرے پاس آتا ہے، میں اس کو ایک اچھا رسالہ سمجھتا ہوں، میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میری دعاء ہے کہ ماہنامہ جام نور ہمیشہ ترقی کرتا رہے- اور مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ نفع کا باعث بنے-

مولانا عبدالحمید نعمانی :- ہمارا پیغام یہی ہے کہ کتاب وسنت سے ہماری وابستگی مضبوط سے مضبوط تر ہو اور جو صحابہ اور اکابر اور اولیاء اللہ اور بزرگان دین کا عمل ہے، جو توارث ہے، اس سے ہمارا رشتہ نہ ٹوٹنے پائے- اگر ہمارا رشتہ ان چیزوں سے چھوٹ جائے گا تو کتاب وسنت پر عمل کا دعویٰ مشکوک ہو جائے گا- آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے جذبات کو صحابہ وتابعین، بزرگان دین وصالحین سے کم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے- لیکن سچائی یہ ہے کہ جب تک ان لوگوں سے ہماری وابستگی، عقیدت مندی مستحکم نہیں ہوگی، عمل میں وہ جذبہ صداقت نہیں آسکے گا-

ہمارا بنیادی مقصد تو بلاشبہ کتاب وسنت پر عمل کرنا ہی ہے- لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے اسلاف کو اپنا باغی سمجھیں، ہاں! اگر کسی مسئلے میں کسی سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہو تو ہم انہیں مطعون کرنے کی بجائے معذور سمجھیں گے- انہیں مطعون کرنا قطعی طور پر غلط ہے- انہیں معذور سمجھتے ہوئے کتاب وسنت کا جو صحیح منشا ہے اور جس پر امت عامل رہی ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں جو کتاب وسنت، اجماع امت اور اکابر کے توارث کے خلاف ہو اور نہ کسی طرح اپنے اندر اسلاف سے غلط فہمی پیدا ہونے دیں- ☆☆

تقلید رحمت یا زحمت؟

نوٹ :-ماہنامہ "جام نور" اپنے اس کالم میں عصر حاضر کے کسی بھی مسئلہ کے تحت ہندوستان کے نامور علمائے کرام و دانشوران قوم وملت سے ان کی تحریری رائے لیتا ہے۔ موصول ہونے والی آراء خواہ وہ مثبت یا منفی پہلو پر ہوں، شائع کی جاتی ہیں تاکہ متعلقہ مسئلے کے دونوں پہلو ارباب علم ونظر اور عام قارئین تک پہنچ سکیں اور متعلقہ مسئلہ پر علمائے کرام و دانشوران قوم کی تحقیق وتجزیاتی رائے کی روشنی میں مسئلے کے صحیح نتائج برآمد ہوسکیں، علماء و دانشوران کی سہولت کے پیش نظر مندرجہ بالا سوال سے متعلق چند ذیلی نکات بھی دیے گئے تھے، تاکہ مندرجہ ذیل خطوط پر دلائل و براہین کے ساتھ وہ اپنا تحقیقی جواب دے سکیں.................. (ادارہ)

نکات

{❶} تقلید کی حقیقت کیا ہے؟

{❷} قرآن وسنت کے ہوتے ہوئے ائمہ کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟

{❸} کیا حضرات مفسرین ومحدثین بھی مقلد تھے؟ اگر ہاں تو کیوں؟

{❹} تقلید اتحاد امت کی ضامن ہے یا انتشار امت کی؟

{❺} امت کو تقلید سے کیا فوائد ملے اور کیا نقصانات؟

"ابن تیمیہ نے اہل تصوف کے خلاف بھی جنگ کی اور اہل تقلید کے خلاف بھی، ان کے تفردات سے پورے عالم اسلام میں بحث ومناظرہ اور جنگ وجدال کا آغاز ہوگیا۔ تو بتایئے! زحمت کیا ہے؟ تقلید یا مخالفت تقلید؟"

مفتی عبد المنان اعظمی☆

(۱) **تقلید** کی تعریف کی گئی ہے کہ تسلیم القول بلا دلیل -یہ عام انسان کا فطری تقاضا ہے کہ وہ عمل کے لئے کوئی اسوہ اور نمونہ چاہتا ہے اور یہ عام مسلمانوں کی مجبوری ہے کہ وہ خود قرآن وحدیث سے احکام کو اخذ نہیں کرسکتے اس لئے اہل علم سے ہی پوچھ پوچھ کر عمل کرتے ہیں اور یہی اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے، ارشاد ربانی ہے فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون (اگر تم خود نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو۔)

اور تاریخ کا مشاہدہ ہے کہ عام اہل اسلام عہد رسالت سے ہی اسی روش پر قائم رہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی جو ہندوستان کے غیر مقلدین کے مستند ہیں اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں وہ شخص جو صرف نبی کے فرمان پر چلتا ہے اور جس کو اللہ ورسول نے حلال کیا ہے حلال سمجھتا ہے۔ البتہ جب اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا علم نہ ہو، نہ ہی وہ مختلف حدیثوں کے جمع کرنے کا طریقہ جانتا ہے اور نہ حدیث سے استنباط کرسکتا ہے، اس وقت کسی عالم رشید کا اتباع کرے اور یہ گمان کرے کہ یہ اپنے قول میں سچا ہے اور سنت رسول کے ماتحت فتوی دیتا ہے اور اگر وہ اس کے خلاف کرے تو وہ فوراً اس سے علیحدہ ہوجاتا ہے۔

اس اتباع کا کون انکار کرسکتا ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ عہد رسالت سے ہی مسلمانوں میں فتوی پوچھنے اور فتوی دینے کا رواج چلا آرہا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک (آدمی) سے ہی ہمیشہ مسائل پوچھے یا کبھی دوسرے سے بھی پوچھ لے اس میں کچھ فرق نہیں۔ (حجۃ، جلد اص:۳۷۶)

وہ مزید فرماتے ہیں ایک شبہ یہ ہے کہ چاروں مذاہب فقہی جو مدون ہوچکے ہیں اور احاطۂ تحریر میں آچکے ہیں، اس پر امت کا اجماع

☆Madrasa Shamsul Uloom Po.Ghosi,Distt.Mau(U.P)

ہو چکا ہے یا معتد بہ لوگوں کا اجماع ہو چکا ہے کہ ان کی تقلید جائز ہے اور اس میں بہت سی مصلحتیں بھی ہیں جو مخفی نہیں، خصوصاً اس زمانے میں تقلید ضروری اور درست ہے کہ جس میں لوگوں کی ہمتیں پست ہوگئی ہیں اور خواہشات نفسانی کا غلبہ ہوگیا ہے اور ہر آدمی اپنی رائے پر ناز کرنے لگا ہے۔ (حجۃ، جلد ۱، ص: ۳۷۲)

ائمۂ اربعہ کے مقلدین جو آج موجود ہیں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے ان کی تقلید کا صحیح نقشہ اپنی تحریر میں بیان کیا اور اس کی تصحیح و تائید فرمائی ہے۔ اس قسم کی تقلید کی حرمت کا قول ابن حزم ظاہری نے کیا ہے جو اہل سنت و جماعت کے طبقے سے خارج ہے۔ بلکہ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ آج کل کے غیر مقلدین حضرات بھی اس قسم کی تقلید کرنے پر مجبور ہیں۔ البتہ یہ اپنے اپنے ذوق اور مقدر کی بات ہے کہ ہم کو امام اعظم کی تقلید راس آئی اور ان کو نواب صدیق حسن خاں اور ثناء اللہ صاحب امرتسری اور محمد جونا گڑھی کی تقلید پسند ـــــ ہوئی افسوس از کئے گستی و بہ کئے پیوستی:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

(۲) تمام گمراہیوں کی گمراہیوں اور بد دینیوں کا نقطہ آغاز یہی نقطہ نظر ہے۔

(الف) غیر مقلد حضرات یہی کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی موجودگی میں تقلید اور پیروی کی کیا ضرورت ہے یہ پہلی سیڑھی ہوئی۔

(ب) اہل قرآن کہتے ہیں کہ حدیث کی تدوین حضور ﷺ کے سو سال بعد ہوئی، معلوم نہیں کہ کیا غلط ہے کیا صحیح؟ ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے، حدیث کی ہم کو حاجت نہیں، بلکہ بعض دریدہ دہن کو یہ بھی کہتے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کی بھی ہم کو ضرورت نہیں، انھوں نے کلام الٰہی ہم تک پہنچا دیا ان کا کام پورا ہو گیا اور اب قرآن سمجھنا اور عمل کرنا ہمارا کام ہے۔

(ج) یورپ کے دہریے کہتے ہیں ہماری عقل اور ہمارا علم ہمارے لیے کافی ہے، ہم کو دنیا چلانے کے لئے نہ خدا کی ضرورت ہے نہ اس کے احکام کی، یہ تیسری اور آخری منزل ہے۔ تو کیا مسلمانوں کو بھی اجتہاد اور آزادی رائے کے درجہ بدرجہ بلند ہوتے ہوئے زینوں کی آخری منزل تک پہنچنا چاہیے؟ اور مادر پدر آزادی کے بعد تن بدن اور دین وایمان سے آزادی بھی مسلمان کا مقدر تو نہیں ...... ع

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

یہ سوال جو آپ نے کیا ہے ہندوستان میں سب سے پہلے مولوی اسماعیل صاحب دہلوی نے آواز اٹھائی تھی، انھوں نے اپنی کتاب تقویۃ الایمان صفحہ ۳ ر پر لکھا: ”عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ ورسول کا کلام سمجھنا سخت مشکل ہے، اس کی سمجھ کو بڑا علم چاہیے، ہم کو یہ سمجھ کہاں کہ ان کا کلام سمجھیں اور اس پر چلنا بڑے بزرگوں کا کام ہے ہم کو یہ طاقت کہاں کہ اس کے موافق چلیں، ہم کو تو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں، سو یہ بات غلط ہے، اس واسطے کہ اللہ صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں باتیں بہت صاف اور صریح ہیں، ان کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ اور اللہ رسول کے کلام کو سمجھنے کے لئے بہت علم نہیں چاہیے کہ پیغمبر تو نادانوں کو راہ بتانے اور جاہلوں کو سمجھانے اور بے علم کو علم سکھانے آئے تھے۔

حالاں کہ جب نمبر اول میں یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن وحدیث سے براہ راست سمجھنا اور تخریج جزئیات مسائل، مجتہدین کا منصب ہے، اور جو لوگ اس کی استعداد نہیں رکھتے ان کا فرض تو مجتہدین سے پوچھ پوچھ کر عمل کرنا ہے تو پھر اس سوال کی کیا گنجائش کہ قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے ائمہ تقلید کی کیا ضرورت؟۔

استعداد استنباط اور تخریج مسائل کا شعور نہ رکھنے والوں کا براہ راست قرآن سے استخراج واستنباط اور اخذ مسائل تو زہر ہلاہل ہے، ارشاد رسول ﷺ ہے: من قال فی القرآن برائه فلیتبوا مقعده فی النار – من قال فی القرآن برائه فان اصاب فقد اخطا

جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لیا۔ جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اتفاقاً اگر وہ صحیح بھی ہو تو غلطی پر ہے۔ (مشکوۃ شریف، ص: ۳۵)

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریق عشق میں آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

عن عمر ابن الخطاب قال سمعت رسول الله ﷺ قال سألت عن ربی عن اختلاف اصحابی من بعدی فاوحی الی

یا محمد ان اصحابک عندی بمنزلة النجوم فی السماء بعضها اقوی من بعض و لکل نور فمن اخذ شیئا مماهم علیه من اختلا فهم فهو عندی علی الهدی۔

''میں نے حضور ﷺ کوفرماتے ہوئے سنا کہ میں نے رب تبارک وتعالیٰ سے اپنے بعد اپنے صحابہ کے اختلاف کے بارے میں پوچھا تو رب نے فرمایا اے محمد ﷺ آپ کے صحابہ میرے نزدیک آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں۔بعض بعض سے نورانیت میں کم وبیش ہیں پر سب نور ہی تو ہیں تو جوان کے اختلافات میں جس کی بھی اقتداء کرے میرے نزدیک ہدایت پر ہے''۔(مشکوۃ شریف،ص:۵۵۴)

سبحان اللہ! قرآن موجود ہے،حدیث موجود ہے،خود صاحب قرآن ﷺ نے پردہ فرمالیا ہے،اور آسمان ہدایت کے ثوابت وسیارے صحابہ موجود ہیں تو ربانی ہدایت ہوتی ہے بأ یھم اقتدیتم اھتدیم اور آپ پوچھتے ہیں کہ کسی تقلید کی کیا ضرورت؟ گویا ہم تو ہیں ہی۔اب میں آپ کو کیا بتاؤں شفیق جونپوری مرحوم نے کیا خوب فرمایا ؎

چلا ہے بھٹکا ہوا مسافر کہ اس طرف روشنی ملے گی خبیث روحیں اندھیرے جنگل میں سرخ شعلوں سے کھیلتی ہیں

انما اشکوا بثّی و حزنی الی اللہ

(۳) ایک روایت سنیئے! امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ امام حدیث سلیمان اعمش کے پاس تھے،ان سے کسی نے چند مسئلے پوچھے،انھوں نے امام صاحب سے کہا،ان مسائل کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ آپ نے تمام مسئلوں کا جواب دے دیا،امام اعمش نے پھر پوچھا کہ کہاں سے آپ نے جواب دیا؟ آپ نے انہیں حدیثوں کو پڑھا جو اس سے پہلے امام اعمش سے سن چکے تھے کہ فلاں حدیث سے فلاں مسئلہ اخذ کیا اور فلاں سے فلاں۔حضرت اعمش بے اختیار بول اٹھے:کفاک ماحدثتنی فی مائة یوم حدثتنی فی ساعة ایھا الفقھاء انتم الاطباء و نحن الصیادلہ۔بس بس ابوحنیفہ جتنی حدیثیں میں نے تم سے سو دن میں بیان کی تھیں تم نے ان سب کو ایک گھنٹہ میں سنا دیا۔اے فقیہو! تم طبیب ہو اور ہم محدثین عطار ہیں۔

اس سے آپ کو فقہا و محدثین ومفسرین کا فرق واضح ہو گیا ہوگا،مجتہدین کو حدیث کی مہارت اور تفسیر کی معرفت کے ساتھ ساتھ استنباط وقیاس و تخریج میں بھی ماہر ہونا چاہیے،مفسرین ومحدثین کو اس کی ضرورت نہیں۔

مفسرین ومحدثین کی حالت کا اس بات سے اندازہ لگائیے کہ قرآن عظیم میں طلاق کی عدت کا بیان ان الفاظ میں ہوا والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثة قروء جن عورتوں کو طلاق دی گئیں وہ اپنی عدت تین قروء تک گزاریں۔

لغت میں قرء کا معنی حیض بھی ہے اور طہر بھی،امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اس آیت میں قرء کے معنی حیض قرار دے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے قرء کے معنی طہر مقرر کیے،مفسرین چاہے حنفی ہوں یا شافعی،انھوں نے اس سلسلے میں کوئی تحقیق نہیں پیش کی۔شافعی مفسر نے امام شافعی کا قول طہر لکھ دیا اور حنفی مفسر نے اپنے امام کا مذہب حیض لکھ دیا،وجہ یہی ہے کہ ان کے پاس ملکۂ اجتہاد نہیں تھا،اور ان مذاہب کے پھیلنے کے لئے کسی قسم کی کنونسنگ اور پروپیگنڈہ کی ضرورت نہیں ہوئی،مفسرین نے اور محدثین نے اپنی پسند اور ذاتی ترجیح پر ان مذاہب کو اختیار کیا،امام عبداللہ ابن مبارک جو امیر المومنین فی الحدیث کہے جاتے ہیں حضرت امام اعظم کے مقلد تھے اور انہی کے موافق فتویٰ دیتے تھے،آپ کی مدح میں فرماتے ہیں:

لقد زان البلاد و من علیھا امام المسلمین ابو حنیفہ
باحکام و آثار و فقہ کآیات الزبور علی الصحیفة
فمافی المشرقین لہ نظیر ولا فی المغربین و لا بکوفة

ترجمہ: شہر اور اس کے بسنے والوں کو زینت دی مسلمانوں کے امام ابوحنیفہ نے،احکام اور آثار اور فقہ سے،جیسے کہ زبور کی آیتیں کتاب کے صفحہ پر،تو مشرقین میں ان کا کوئی ہمسر نہیں،نہ مغربین میں نہ کوفہ میں۔

حضرت مسعر ابن کدام جو مشہور عارف باللہ ہیں فرماتے ہیں:

حسبی من الخیرات مااعددته. یوم القیامة فی رضا الرحمن
دین النبی محمد خیر الوریٰ. ثم اعتقادی بمذهب النعمان

ترجمہ: جن نیکیوں کو میں نے جمع کیا ہے قیامت کے دن خدا کی رضا کے لئے وہ مجھے کافی ہیں، محمد خیر الوریٰ ﷺ کا دین اور اس کے بعد امام ابوحنیفہ کے مذہب کا اعتقاد۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی شہادت سنیے: اصحاب تخریج جو تھے وہ تخریج کرتے اور اجتہاد فی المذہب کرتے اور یہ حضرات ان میں سے کسی ایک کے مذہب کی طرف منسوب ہوتے۔ چنانچہ کہا جاتا فلاں شافعی ہیں اور فلاں حنفی۔ اور گاہے ایک محدث بھی کسی ایک مذہب کی طرف منسوب ہوتا، اس لیے کہ وہ کثیر مسائل میں اس کی موافقت کرتا مثلاً امام نسائی اور بیہقی کو شافعی کی طرف منسوب کیا جاتا اور میں کہتا ہوں کہ امام طحاوی رضی اللہ عنہ جو امام مزنی شاگرد شافعی کے بھانجے تھے، امام صاحب کی طرف نسبت کر کے حنفی کہتے ہیں، اسی طرح سے مفسرین میں قاضی بیضاوی اور خازن وغیرہ شافعی کہے جاتے ہیں اور امام نسفی اور زمخشری حنفی، اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ اب کسی سوال و جواب کے لئے باقی نہیں رہ گیا، یہ تو اسلام کی ایک محقق تاریخ ہے کہ محدثین اور مفسرین اپنے موضوع میں ماہر ہونے کے بعد بھی ائمہ کی تقلید کرتے تھے۔

(۴) تقلید اور اجتہاد کو اتحاد اور افتراق سے بالذات کوئی علاقہ نہیں، اس کے اسباب وعوامل ہی کچھ دوسرے ہوتے ہیں۔ دیکھیے شاہ ولی اللہ صاحب کی تحقیق میں چوتھی صدی ہجری تک امت میں تقلید کا رواج نہیں تھا، آپ تحریر فرماتے ہیں:

واضح رہے کہ چوتھی صدی ہجری کے پہلے تک ایک خاص مذہب اور ایک خاص مذہب کی تقلید پر لوگوں کا اجماع نہیں تھا۔ قوت القلوب میں ابوطالب مکی فرماتے ہیں کہ کتب اور مجموعے بعد کی پیداوار ہیں، لوگوں کے اقوال پر حکم دینا اور لوگوں میں سے کسی ایک کے مذہب پر فتویٰ دینا، ایک قول کا پابند ہونا، اور ہر چیز میں اُسے ہی نقل کرنا اور ایک مذہب پر تحقیق وتفقہ کرنا قدیم لوگوں یعنی قرن اول اور قرن ثانی میں نہیں تھا۔

میں کہتا ہوں قرن اول اور قرن ثانی کے بعد کچھ تخریجات شروع ہوئیں۔ مگر چوتھی صدی کے لوگ ایک مذہب کی تقلید خالص اور اس کی تحقیق و تفقہ پر متفق نہیں ہوئے تھے، جیسا کہ تتبع سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

جی چاہے صاحب قوت القلوب کی وضاحت کے موافق دو صدی کی مقدار مقرر کریں چاہے شاہ ولی اللہ صاحب کے تتبع کے موافق چار صدی ہجری تک طول دیں، اس زمانے میں قابل اعتراض تقلید کا وجود ہی نہیں تھا، براہ راست قرآن وحدیث سے ہی اکتساب فیض ہوتا تھا، تو ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ اس دوران میں کسی قسم کا افتراق نہ ہو لیکن اگر آپ دو ہجری تک ہی اس کی مدت مانیں تب بھی مندرجہ ذیل عالم آشوب، ہنگامہ خیز، طوفان انگیز، خون ریز، عرصۂ رستاخیز قائم ہوئے اور گروپ اور گروہ وجود میں آئے جس میں طرفین مسلمان ہی تھے۔

(۱) فتنۂ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ (۲) جنگ جمل وجنگ صفین (۳) مقابلۂ نہروان (۴) عالم آشوب کربلا (۵) بنوامیہ وبنوعباس کی جنگیں، پورا عالم اسلام وقفہ وقفہ سے فتنہ وفساد کی چکی میں پستا رہا، تقلید تو اس وقت تک شائع وذائع ہی نہیں ہوئی تھی کہ اس کو ان خونریزیوں اور گروہ سازیوں کی علت قرار دی جائے، تو کہیں ہر کس و ناکس کے قرآن وحدیث سے براہ راست ہدایت طلبی کے آزار نے اسلام اور مسلمانوں کو اس نوبت تک تو نہیں پہنچایا، اگر آپ چاہیں تو اس براہ راست ہدایت طلبی کی دو ایک مثالیں پیش کروں:

''میدان کربلا میں امام حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آرا ہونے کا استدلال اس حدیث سے تھا اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الآخرة جب دو خلیفوں کے لئے بیعت کر لی جائے تو آخری والے کو قتل کر دو''۔ (مشکوٰۃ شریف، ص: ۳۲۰)

اور نہروان کے خارجی حضرت مولی المسلمین علی کرم اللہ وجہہ کو قرآن کی اس آیت کی بنیاد پر کافر کہتے اور ان کے ساتھ جہاد جائز قرار دیتے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان الحکم الا للہ حکم تو خدا ہی کے لئے ہے اور مولی نے انسانوں کو اپنے معاملہ کا حکم بنایا۔ پس فرمایئے کہ یہ افتراق تقلید کا تو نتیجہ ہے نہیں، کہیں براہ راست ہر خاص وعام کے قرآن سے ہدایت کا خمیازہ تو نہیں؟

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا | یہ کیسا امتحان جذب دل الٹا نکل آیا

اس کے بعد تقلید کا دور آیا اور تمام عالم اسلام میں ائمہ کی تقلید کرنے والے ہی رہ گئے - حجاز، یمن، مصر، شام، عراق، حلب، عرب وعجم میں امام شافعی کے مقلدین کی کثرت ہوئی - مغربی ممالک مراکش اندلس میں امام مالک کے مقلدین کی کثرت ہوئی اور روم، ہند، ماوراء النہر اور افغان وغیرہ میں امام اعظم کے مقلدین کی کثرت ہوئی -

کہا جاتا ہے کہ ان مختلف مذاہب میں باہم بحث ومناظرہ، حجت وتکرار اور تقریر وتحریر میں ایک دوسرے کے خلاف زور آزمائی ہوتی رہی مگر اس کا اثر جو دنیا کے سامنے ہے یہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں ابن تیمیہ حرانی ظہور پذیر ہوئے اور انھوں نے تقلید کو شرک قرار دیا اور نداء غیر اللہ کو غیر خدا کی پوجا بتایا - اہل تصوف کے خلاف ان کے زاویوں اور خانقاہوں میں جاکر جہاد بالسیف بھی کیا اور مختلف مسائل فرعیہ میں ان کے تفردات سے پورے عالم اسلام میں ایک ہلچل مچ گئی - تو بادشاہ وقت نے مناظرہ کی مجلسیں مقرر کیں، صورتحال یہ ہوئی کہ سارے مقلدین کا ایک کامن پلیٹ فارم بنا اور تنہا ابن تیمیہ صاحب ان کی مخالفت میں صف آرا رہے -

ایک مناظرہ کا حال سنیے جس کو مناظر حسن گیلانی نے اپنی کتاب ''نظام تعلیم وتربیت'' میں بیان کیا مقلدین کی طرف سے حضرت شیخ سراج ہندی مناظر مقرر ہوئے اور شیخ ابن تیمیہ سے کلام شروع ہوا، آخر میں شیخ ابن تیمیہ کی یہ حالت ہوئی کہ شیخ سراج ہندی کو کہنا پڑا یا ابن تیمیہ ما اراک کالعصفور اذا اردت عن آخذک ترتد من غصن الی غصن آخ، اے ابن تیمیہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم پھدکنے والے گوریا ہوگئے ہو جب میں ایک ڈال پر پکڑنا چاہتا ہوں تو تم دوسری ڈال پر پھدک جاتے ہو، آخر کار بادشاہ نے جس کے دربار میں مناظرہ ہوا تھا انہیں قلعہ میں نظر بند کر دیا اور فتویٰ دینے سے روک دیا، بار بار ایسے ہی ہوا، آپ کی تحریک اینٹی تقلید ناکام ہوگئی اور آپ نامراد وزندگی گزار کر قید میں ہی انتقال کر گئے -

اب مجھے بتایا جائے تقلید کی برکت سے سارے مذاہب اربعہ کے مقلدین تو ایک موقف پر قائم ہوئے، تو فسادی کون ہوا؟ پورا عالم اسلام یا ان سب سے الگ تھلگ ہو کر ایک نیا محاذ قائم کرنے والا؟ یہ تقلید ہی کی برکت تھی کہ تمام بحث ومباحثہ اور اختلاف وتکرار کے باوجود تمام مقلدین نے خاص حرم کعبہ میں اپنے اپنے مصلے بچھائے اور اپنے طور پر نمازیں پڑھیں اور دنیا کو ایک شعور دیتے رہے کہ مسلمان ظاہری اختلاف کے باوجود ایک قوم اور ایک گروہ ہیں -

ابن تیمیہ نے اپنی تحریک توسل اور استمداد بغیر اللہ کے خلاف بھی جاری رکھی تھی، اس پر جامع ازہر کے شیخ جاد الحق نے ایک تبصرہ فرمایا:

و ان کان المراد بسبب ذاته او بسبب منزلته من الله و جاهه عنده. فهذا هو الذی اصتدم الخلاف حوله بین العلماء ففریق ینکره لان مجرداً لجاه لایعطی شفاعته و علی راسِ هذا الفریق ابن تیمیه و قد الف فی ذالک رسالة حاول فیها ان یرد ما جاء عن الصحابة فی جوازه اما بالطعن فی السند با لضعف او الوقف علی الصحابة او علی من لیس قوله و فعله حجة و اما بالتاویل. (بیان للناس، ص: ۸۲)

ترجمہ: اگر مراد یہ ہے کہ رسول اللہ کی ذات اور ان کے مرتبے اور ان کی قدر کی وجہ سے جو خدا کے نزدیک ہے شفاعت ہو سکتی ہے کہ نہیں تو یہ مسئلہ وہ ہے کہ جس کے گرد علماء کا اختلاف ہے - ایک فریق اس کا انکار کرتا ہے کیوں کہ اس کے نزدیک صرف مرتبہ شفاعت کا سبب نہیں اور اس جماعت کے سرے پر اکیلا ابن تیمیہ کھڑا ہے، اس نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جس میں اس بات کا رد کرنا چاہا جو صحابۂ کرام سے اس کے جواز میں منقول ہے تو کسی سند پر ضعف کا اعتراض کیا، کسی کو صحابہ پر موقوف کیا یا ایسی ذات پر موقوف مانا جس کا قول وفعل حجت نہیں یا اس میں کوئی تاویل کی -

(۱) میری گزارش ہے کہ جب عہد رسالت سے ہی فتویٰ پوچھنے والوں اور بتانے والوں دونوں ہی طبقہ کے لوگوں کا وجود رہا، اور یہ تسلسل پیہم قائم رہا تو سات صدیوں کے بعد کسی ایک فرد کو کیسے یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ فتویٰ پوچھ کر عمل کرنے والوں کو مشرک قرار دے -

(۲) صحابۂ کرام سے شفاعت بالوجاہت کا جواز ثابت، اور اسی پر سات صدیوں تک امت اجابت مضبوطی سے قائم رہی تو جناب ابن تیمیہ کو سات سو سال کے بعد کیسے یہ حق مل گیا کہ لطائف الحیل سے ان روایتوں کا انکار کریں -

☆☆☆

''علماء کی ذمہ داری ہے کہ ہر مسئلہ کو قرآن وحدیث کے معیار پر پرکھیں، اگر کسی امام یا جید عالم دین کا قول بھی قرآن وسنت سے متصادم ہو تو اس کو چھوڑ دیں اور اسی حکم پر عمل کریں جو قرآن وسنت کے عین موافق ہو''

——— مولانا ظل الرحمن تیمی☆

تقلید کی حقیقت کو جاننے کے لیے اس کی لغوی واصطلاحی تعریف اور تاریخی تناظر میں اس کے فروغ اور رائج ہونے کے تعلق کو جاننا ضروری ہے۔

تقلید کے لغوی معنی: -لغت میں تقلید کا معنی گلے میں کسی چیز کا لٹکانا ہے۔لیکن جب اس کا صلہ لفظ دین کے ساتھ آئے یا دین کے مفہوم میں ہو تو اس وقت اس کا معنی کسی بات کو بغیر دلیل اور غور وفکر کے قبول کرنا ہے۔صاحب المنجد نے لکھا ہے:''قلده فی كذا أى تبعهٗ من غير تامل ولا نظر'' (المنجد عربی، ص: ۶۵۹) یعنی تقلید ایسی پیروی کا نام ہے جو غور وخوض سے خالی ہو۔

اصطلاحی تعریف: -علامہ حسین احمد الخطیب مصری نے تقلید کی تعریف یوں کی ہے۔''دلیل کے بغیر کسی قول کو تسلیم کیا جائے اور دوسرے کے مسلک کو اس کی دلیل معلوم کیے بغیر اختیار کیا جائے۔'' (فقہ الاسلام ص: ۵۰۷)

علامہ حسن شرنبلالی حقیقت تقلید کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: العمل بقول من ليس قوله احدى الحجج الاربعة الشرعية بلا حجة فليس الرجوع الى النبى صلى الله عليه وسلم والاجماع من التقليد لأن كلاً منهما، حجة شرعية من الحجج الشرعية وعلىٰ هذا اقتصد الكمال فى تحريرهٖ وقال ابن امير الحاج وعلى هذا عمل العامى بقول المفتى وعمل القاضى بقول العدول لأن كلا منها وان لم يكن احدى الحجج فليس العمل بهٖ بلاحجة شرعية لا جاب النظر أخذ العامى بقول المفتى وأخذ القاضى بقول العدول (جمع الجوامع ص: ۲۵۱)

یعنی تقلید کا اصل ایسے شخص کی بات پر عمل کرنا ہے جس کا قول چاروں شرعی حجتوں (کتاب وسنت، اجتہاد اور قیاس) پر مبنی نہ ہو۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع کی طرف رجوع کرنا تقلید نہیں ہے۔اس لیے کہ یہ دونوں حجت شرعیہ میں سے ہیں۔علامہ کمال نے اپنی کتاب ''تحریر'' میں اور ابن امیر الحاج نے فرمایا کہ جاہل کا مفتی کے قول اور قاضی کا ثقہ کے قول پر عمل کرنا تقلید نہیں، کیوں کہ اگر یہ شرعی حجت میں سے نہ ہو تو اس پر عمل کرنا درست نہیں''۔

معلوم یہ ہوا کہ اگر ہم قرآن وحدیث کے مطابق زندگی گزاریں یا کوئی ایسا مسئلہ درپیش آ گیا، جس کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی واضح نص موجود نہیں ہے اور ہم اس سلسلے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں اجتہاد وقیاس کریں تو یہ اتباع ہے، تقلید نہیں۔یہی شریعت اسلامی میں ہم سے مطلوب ہے۔جبکہ تقلید یہ ہے کہ ہم کسی ایک امام کے اقوال وآرا کے مابین اپنے آپ کو محدود کرلیں، انہوں نے شریعت کو جس انداز سے سمجھا ہے، ہم بھی من وعن اسی طرح سمجھیں۔ان کے اقوال وافعال کو قرآن وسنت کے مطابق ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی کوشش کی جائے گرچہ باطل تاویلات کا ہی سہارا کیوں نہ لینا پڑے، حالانکہ تمام ائمہ کرام اور سلف صالحین نے ایسی تقلید سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔امام اعظم حضرت ابوحنیفہ سے کسی شاگرد نے پوچھا کہ اگر آپ کا فتویٰ کتاب اللہ یا سنت رسول کے خلاف ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ تو آپ نے جواباً فرمایا:

اذا قلت قولاً و كتاب الله يخالفهٗ قال اتر كوا قولى لكتاب الله فقيل اذا كان خبر رسول الله صلى الله عليه وسلم يخالفهٗ قال اتر كو اقولى لخبر رسول الله صلى الله عليه وسلم فقيل اذا كان قول الصحابة يخالفهٗ قال اتر كوا قولى لقول الصحابة (المختصر المؤل ص: ۳۸)

یعنی جب میرا قول کتاب اللہ، سنت رسول یا قول صحابہ کے خلاف ہو تو میرے فتوے کو چھوڑ دو اور کتاب وسنت اور قول صحابہ پر عمل کرو۔

اسی طرح حضرت امام مالک سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں:

انما انا بشر اخطى واصيب فانظر وا فى قولى فكل ما وافق الكتاب والسنة فخذ وابه ومالا يوافق الكتاب والسنة فاتر كوه (اعلام الموقعين ص: ۶۳) یعنی میں بشر ہوں، مجھ سے غلطی اور درستی دونوں کا احتمال ہے، میری ہر ایک بات کی تحقیق کیا کرو، جو

☆Editor: Tooba Monthly, Kucha Chelan, Darya Ganj New Delhi

کتاب وسنت کے موافق ہواس پر عمل کرلیا کرو اور جو مخالف ہو اس کو رد کر دیا کرو۔

گویا ہماری امت کے علماء کی ذمہ داری ہے کہ ہر مسئلہ کو قرآن وحدیث کے معیار پر پرکھیں۔ اگر کسی امام یا جید عالم دین کا قول بھی قرآن و سنت سے متصادم ہو تو اس کو چھوڑ دیں اور اسی حکم پر عمل کریں جو قرآن وسنت کے عین موافق ہو۔ جہاں تک اس امت کے کم پڑھے لکھے اور جاہل حضرات کا تعلق ہے تو انہیں (فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون) کے مطابق علماء کرام سے رجوع کرنا چاہیے اور علماء کرام انہیں خاص ایک امام کی فقہ اور فتاویٰ سے مسائل بتانے کے بجائے قرآن وحدیث کی روشنی میں تمام مسائل کا حل بتائیں۔ تقریباً چوتھی صدی عیسوی کے آغاز تک یہی طریقہ رائج تھا۔ اس وقت تک کسی ایک امام کی پیروی کا چلن نہیں ہوا تھا اور ہر شخص کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی خاص ایک امام کی تقلید کی بجائے قرآن وحدیث کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔

● جب ہم تاریخ اسلامی کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام، تابعین عظام، تبع تابعین اور محدثین و مفسرین مقلد نہیں تھے، بلکہ وہ لوگ قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس کی روشنی میں زندگی گزارتے تھے (۲) یعنی جب کوئی مسئلہ پیش آجاتا تھا تو سب سے پہلے قرآن مجید میں اس کا حل تلاش کرتے تھے، اگر وہاں مل جاتا تو اس پر عمل کرتے ورنہ پھر احادیث نبویہ میں اس کا حکم ڈھونڈتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے اور وہاں بھی اس کا حل نہیں ملتا تھا تو پھر اجماع کی طرف رجوع کرتے تھے اور اگر اس سلسلہ میں کوئی اجماع بھی موجود نہیں ہوتا تھا تو پھر اجتہاد اور قیاس کا سہارا لے کر اس سلسلے میں حکم تلاش کرتے تھے۔

تاریخ اسلامی ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابۂ کرام سرور کائنات علیہ التحیات والصلوات کو جیسا کرتے دیکھتے یا آپ کسی معاملے میں فتویٰ یا کسی سوال کا جواب دیتے تو اسے حضرت کے اصحاب سنتے اور یاد رکھتے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ جب آنحضرت ﷺ کا زمانہ گزر گیا اور صحابۂ کرام کا دور آیا، تب انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں اپنی دیکھی ہوئی سنی ہوئی باتوں پر خود عمل کیا اور اگر کوئی نیا مسئلہ کسی صحابی کو پیش آگیا تو اوروں سے پوچھ لیا، اگر کسی بات میں کوئی حکم صریح کتاب وسنت سے نہ ملا تو منصوصات کتاب وسنت پر غور کیا اور اس کی علت کو دریافت کر کے اسی پر پیش آئے ہوئے معاملے کو قیاس کیا اور اگر کوئی مسئلہ مشکل ہوا تو آپس میں صلاح ومشورہ کر کے اس کو طے کرلیا۔

صحابہ کے زمانہ میں جو لوگ نئے پیدا ہوئے یا نئے ایمان لائے انہوں نے صحابہ سے اسی طور پر علم دین حاصل کیا، جس طرح صحابہ نے آنحضرت سے سیکھا تھا۔ یعنی جس صحابی کو پایا اور اسے فقیہ جانا، اس سے مسائل شریعت کو اخذ کیا اور احادیث نبوی کو سیکھا، تابعین کے بعد تبع تابعین کا دور آیا وہ بھی اسی طور سے اپنے شہر کے مشہور اور نامی فقیہ سے مسائل دریافت کرتے۔ وہ انہیں قرآن وحدیث کے مطابق مسائل کا حل بتاتے تھے۔ اس دور میں ہر شہر کا ایک علیحدہ امام اور ہر مقام کا ایک خاص عالم اور فقیہ تھا، جو لوگ اس کی باتوں کو مانتے یا اس کے فتووں پر عمل کرتے یا اس کی سند سے احادیث کو روایت کرتے وہ اس کی طرف منسوب ہوتے اور اس عالم کے مذہب پر چلنے والے کہلاتے۔

جب ہم صحابۂ کرام، تابعین وتبع تابعین اور محدثین ومفسرین کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے سختی کے ساتھ تقلید کی مخالفت کی اور کسی ایک امام کی پیروی کے بجائے کتاب وسنت کو گلے لگائے رکھنے کی تلقین کی۔

حضرت ابوبکر صدیق فرماتے ہیں: ان اطعت الله رسوله فاطیعونی وان عصیت الله و رسوله فاقیمونی" (تاریخ الخلفاء ص: ۱۱۸) یعنی اگر میں اللہ ورسول اللہ کی اطاعت کروں تو میری پیروی کرو، ورنہ میری اصلاح کر دیا کرو۔ اسی طرح کے اقوال حضرت عمر بن الخطاب (اعلام الموقعین/ ۴۵) حضرت عبداللہ ابن مسعود (اعلام الموقعین ۱/ ۴۷) حضرت عبداللہ بن عباس (دارمی ص: ۵۳) حضرت معاذ بن جبل (اعلام الموقعین ۱/ ۴۹) حضرت علی بن ابی طالب (اعلام، ج: ۱ ص: ۵۰) حضرت عروۃ بن زبیر (دارمی ج: ۱ ص: ۴۷) حضرت مسروق بن اجدع (ایقاظ ص: ۱۴) محمد بن سیرین (ایقاظ: ص: ۱۴) قاضی شریح (اعلام ج: ۱ ص: ۲۲۳) امام زہری (اعلام ص ۱/ ۶۵) امام حسن بصری، امام شعبی، حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام اوزاعی، حضرت ابووائل شقیق وغیرہ سے مروی ہیں۔ جو اس امت کے اجلہ محدثین، مفسرین اور فقہاء میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان حضرات نے کسی خاص ایک امام کی تقلید سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ (تفصیل کے کے لیے دیکھیے "مقلدین ائمہ کی عدالت میں"

مؤلف ابوانس محمد یحییٰ گوندلوی ص:۳۷ تا ص:۴۷)

● کتاب وسنت کے رہتے ہوئے تقلید کی کوئی ضرورت نہیں ہے- پیش آمدہ تمام مسائل میں کتاب وسنت سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے- اللہ رب العالمین کا ارشاد گرامی ہے: یا ایھا الذین آمنوا اطیعو اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول - یعنی اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اللہ کے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو- اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو- اس آیت میں اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اولی الامر کی اطاعت کو اللہ اور رسول کے تابع لاکر بیان کیا گیا ہے- یعنی جب تک اولی الامر کتاب وسنت کے دامن کو مضبوطی سے تھام کر اس کی روشنی میں کوئی حکم صادر فرمائیں تو اس پر عمل کرنا ضروری اور واجب ہے- اس کے بعد بتایا گیا کہ اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے کتاب وسنت کی طرف رجوع کیا جائے-

صحابۂ کرام میں جب کسی معاملہ میں اختلاف ہو جاتا تو وہ کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے اور جب انہیں کتاب وسنت کی دلیل مل جاتی تو کسی ایک کو بھی اختلاف نہ رہتا- سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کا معاملہ نیز مدفن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور وراثت نبوی کا معاملہ بھی اس وقت ختم ہو گیا، جب صدیق الامۃ حضرت ابوبکر نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان فرمائیں-

جہاں تک جاہل اور ان پڑھ لوگوں یا ایسے کم پڑھے لکھے لوگوں کا معاملہ ہے جو قرآن وحدیث سے استفادہ کی قدرت نہیں رکھتے تو ان کو چاہیے کہ وہ "فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون" کے تحت علماء کرام سے رجوع کریں اور علماء انہیں قرآن وحدیث کے مطابق رہنمائی فرمائیں- بعض حضرات بڑے شدومد کے ساتھ یہ بات اٹھاتے ہیں کہ ایسے کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے؟ تو کیا ایسے حضرات تقلید کے لیے فقہ کی کتابوں اور ائمہ کرام کی تحریروں کو سمجھنے کے لائق ہیں؟ اگر نہیں؟ اور اس صورت میں بھی انہیں علماء ہی سے رجوع کرنا ہوگا تو وہ علماء سے یہ کیوں نہ کہیں کہ انہیں قرآن وحدیث کے مطابق رہنمائی کی جائے تاکہ اگر صاحب سے کوئی اجتہادی غلطی ہو گئی ہو تو وہ اس کو دہرانے سے بچ جائیں- ☆☆

"امت کا بنیادی مرض عدم اتحاد ہے، لیکن اسے مسئلہ تقلید سے جوڑنا درست نہیں، جو لوگ تقلید کو انتشار امت کا باعث سمجھتے ہیں وہ بتائیں کہ جب تقلید کا باضابطہ تصور نہیں تھا اس وقت امت منتشر کیوں ہوئی؟"

مولانا وارث مظہری ☆

اجتہاد وتقلید کی بحث قدیم ہے اور پچھلے ہزار سالوں میں اکابر علما نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس کے تمام اہم اور اصولی وعلمی پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے- بنیادی طور پر ان پر نگاہ ڈالنی چاہیے- موجودہ تقاضوں کے نام پر اجتہاد کے حوالے سے تقلید کو جن پہلوؤں سے موضوع بحث یا مورد عتاب بنایا گیا ہے، اس میں دخل اس فکری آزادی کا زیادہ ہے، جو مذہب کی فکری تحریکات کے زیر اثر اسلام کی متوارث فکر میں نقب لگانا چاہتی ہے، اگرچہ ہمارے علمی حلقوں کی کوتاہی فکر وعمل بھی ایک حد تک اس کی ذمہ دار ہے-

قرآن وحدیث میں تقلید کی بنیادیں موجود ہیں: فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون اور اللہ کے رسول نے فرمایا: "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین من بعدی" نیز اقتدوا باللذین من بعدیابی بکر و عمر-"، صحابہ میں بعض مفتی تھے اور بعض مستفتی، یہ ایک معلوم حقیقت ہے، حضرت عمر سے ثابت ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ "اے ابوبکر! ہماری رائے آپ کی رائے کے تابع" (رأینا تبع لرأیک) کلالہ کے معاملے میں حضرت عمر نے فرمایا کہ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں ابوبکر کے قول کی مخالفت کروں (انی لا ستحیی من اللہ ان أخالف أبابکر) عہد نبوت سے تیسری صدی تک تقلید مختلف شکلوں میں جاری رہی- تیسری صدی میں تقلید شخصی کی شکل میں تقلید کی عملی ونظریاتی تنظیم اسی کا امتداد تھی-

تقلید عامی کی ضرورت اور عالم کی مصلحت میں شامل ہے- وہ نہ تو واجب ہے اور نہ فرض، تقلید یقیناً صرف قرآن وسنت کی ہی مطلوب

☆Editor:Tarjamane Darul Uloom,St.12,Zakir Nagar, Okhla,New Delhi

ہے- متعین امام کی تقلید اسی معنی میں ہے یا ہونی چاہیے کہ وہ کتاب وسنت کے صحیح احکام تک رسائی کا ذریعہ ہیں، اس لیے اگر کوئی فقہی رائے صحیح و مستند حدیث کے خلاف ہو تو ہم اسی لمحے اس رائے کو ترک کر دیں گے- خود ہر امام اور دوسرے اہل علم سے اس نوع کے اقوال مروی ہیں- تقلید کا یہ رَویہ جس کے تحت امام کو آخری حجت قرار دیا جائے بلاشبہ مذموم ہے-

جو لوگ تقلید کا انکار اور اس کی مذمت کے قائل ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی معروف معنوں میں پورے طور پر تقلید کا قلادہ ہی اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہیں- اگرچہ متقدمین کی بجائے متاخرین کی تقلید کا- اس طرح زیادہ سے زیادہ وہ ایک پانچویں مسلک کے متبعین ہیں- بلاواسطہ قرآن وسنت کی اتباع کا ان کا دعویٰ دلیل کا محتاج ہے- ہر کوئی امام داؤد ظاہری، ابن حزم اور شوکانی نہیں بن سکتا، ویسے عموماً جن شخصیات کے اقوال وآرا پر وہ اپنے عدم تقلید کے رویے میں اعتماد کرتے ہیں، وہ بجائے خود مقلد تھیں، انہوں نے کبھی اجتہاد وامامت کا دعویٰ نہیں کیا-

حضرات مفسرین ومحدثین کی بڑی تعداد یقیناً مقلد تھی، مجتہد نہ تھی، حوالوں سے بات طویل ہو جائے گی، ان میں سے بعض خواہ مقلد نہ ہوں لیکن استنباط مسائل میں ان کی فہم کی بنیاد بھی خود اختراعی نہ تھی- وہ بھی اصولی طور پر فقہاء ومجتہدین کی ہی تشکیلی کاوشوں کا ثمرہ تھی- محدثین بنیادی طور پر روایت کے امام تھے نہ تو انہوں نے درایت کو اپنا موضوع بنایا اور نہ ہی یہ بات ان کی مصلحت میں تھی- روایت پر ارتکاز درایت میں مانع نہیں لیکن روایت کی اپنی نزاکتوں کے ساتھ درایت اور تفقہ کی تمام تر اصولی نزاکتوں کو نبھانا محال تو نہیں، تاہم مشکل ترین ضرور ہے- اس لیے محدثین نے دوسرے معاملے میں یا تو مجتہدین پر اعتماد کیا یا پھر اپنے اجتہاد واستنباط کو خود اپنی حد تک محدود رکھا- اسی لیے ان محدثین کے پیروکار بھی پیدا نہیں ہوئے- لیکن اس سے یقیناً ان کی حیثیت کم نہیں ہوتی- یہ تقسیم کار ہے، حقیقی فرق نہیں- امت ان محدثین ومفسرین کی بھی اسی طرح مرہون احسان ہے، جس طرح ائمہ مجتہدین کی- وہ روایت کے معاملے میں محدثین پر اعتماد کرتی ہے اور درایت کے معاملے میں ائمہ مجتہدین پر-

جہاں تک اتحاد امت کو تقلید وعدم تقلید سے وابستہ کر کے دیکھنے کی بات ہے- صحیح بات یہ ہے کہ اس کا باضابطہ تعلق امت کے اتحاد وانتشار کے رویے سے نہیں ہے- امت کی تقریباً 99% فی صد آبادی مقلد ہے- لیکن پورے طور پر یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ امت کا بنیادی مرض عدم اتحاد ہے اور یہی تمام مسائل کی جڑ ہے- دراصل اتحاد یا عدم اتحاد کا تعلق انسان کے خارجی سماجی رویے سے ہے- آپ مغرب کے موجودہ اتحاد اور اسلام کے دور اول میں بھی سیاسی وسماجی انتشار کی تاریخی حقیقت کو سامنے رکھ کر اس پر غور کر سکتے ہیں- تاہم تقلید اجتماعی تنظیم کی ایک شکل ہے یا ہو سکتی ہے- اس کا مقابل عملی نہ کہ اصولی سطح پر، ممکنہ انتشار کا ذریعہ- مذکورہ بالا باتوں سے امت کو تقلید سے حاصل ہونے والے فائدے یا نقصان کی کسی قدر وضاحت ہو جاتی ہے، تاہم اس حوالے سے میں مزید مختصراً اپنے موقف کی وضاحت کرنا چاہوں گا-

اقبال نے شاعرانہ انداز میں یہ حقیقت پسندانہ بات کہی ہے کہ

زاجتہاد عالمان کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

تاہم یہ بات بجائے خود دلیل کی محتاج ہے کہ کیا چوتھی صدی کے بعد امت میں، عالمان کم نظر ہی پیدا ہوتے رہے؟ فکر اسلامی کی تاریخ اس کی منکر ہے، اقبال نے دوسری جگہ خود اپنے اس نظریے سے تقریباً رجوع کر لیا تھا (دیکھیے: تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کا چھٹا خطبہ: الاجتہاد فی الاسلام) یہ ایک مستقل بحث کا موضوع ہے، جس پر لکھا جا رہا ہے اور لکھے جانے کی ضرورت ہے- میری نظر میں مقاصد شریعت کو سامنے رکھ کر اصول فقہ کو مزید وسعت اور ترقی نہ دیئے جانے اور اجتہاد کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کو بہت حد تک نظر انداز کر دیے جانے کی وجہ سے دور متاخر میں فقہ میں ایک قسم کا جمود آ گیا- شاہ ولی اللہ جیسی شخصیت اس کی شدید ترین شاکی نظر آتی ہے- بلاشبہ اس فقہی جمود سے امت کو نقصان پہنچ رہا ہے- لوگ عہد وسطیٰ کے فقہی جزئیات سے بھی انحراف کو دین سے انحراف تصور کیے بیٹھے ہیں-

میری نظر میں معذرت کے ساتھ علماء ومشائخ کے ایک بڑے طبقے نے شخصیت پرستی کو کتاب وسنت کے اتباع کا نام دے رکھا ہے- جس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ: ما انزل اللہ بہ من سلطان-
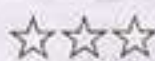
☆☆☆

"میری ذاتی رائے یہ ہے کہ تقلید کی بحث سے امت میں انتشار پیدا ہوگا، ہمارے لیے بہت سے ضروری کام پڑے ہوئے ہیں، جیسے تعلیم، فقر وفاقہ اور غربت کا ازالہ اور مشترک امور ومسائل میں مسلمانوں کو متحد کرنا وغیرہ"

—— مولانا شفیع مونس☆

جناب مولانا خوشتر نورانی صاحب! محترم ومکرم...... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ...... آپ کا خط مورخہ ۲۱ر فروری ۲۰۰۷ پیش نظر ہے، جس میں آپ نے اپنے رسالہ جام نور کے خاص شمارہ "اجتہاد وتقلید نمبر" کے لیے بعض سوالات کے جواب طلب فرمائے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس وقت ملت اسلامیہ داخلی اور خارجی سطح پر جس طرح کے مسائل اور آزمائشوں سے دوچار ہے، اس میں اس نوعیت کے مسائل کو چھیڑنا ان کے وقت کا کوئی صحیح اور بہتر مصرف نہیں ہے۔ اس کے ردعمل میں ایک نامناسب جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہوسکتا ہے، جو ملت کے مفاد میں نہیں ہوگا —— آپ کے سوالوں کا مختصر جواب درج ذیل ہے:

(۱) تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عام مسلمانوں کی ضرورت ہے، جن کی نظر کتاب وسنت اور اسرار ومقاصد شریعت پر نہیں ہے۔ البتہ علماء جن کی کتاب وسنت پر نظر ہو ان کے لیے یہ ضروری نہیں۔ کسی مسئلہ میں کوئی عالم جب شرعی دلائل کا جائزہ لے اور اس کے سامنے فی الواقع حق واضح ہو جائے تو اس صورت میں اس کے خلاف تقلید جائز نہیں، البتہ وہ عالم اس سے مستثنیٰ ہے جو اجتہاد نہ کرسکتا ہو۔

(۲) قرآن وسنت کی موجودگی میں تقلید ائمہ کا جواب اوپر آچکا ہے، البتہ یہ رجحان امت کے لیے نقصان دہ بلکہ خطرناک ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں ایک امام کی رائے سے امت مشکلات میں مبتلا ہو اور کتاب وسنت میں اس سے ہٹ کر دوسرا نقطہ نظر اختیار کرنے کی پوری گنجائش موجود ہو پھر بھی اس امام کی پیروی کو لازمی سمجھا جائے۔

(۳) حضرات محدثین ومفسرین بہت ذی علم، کشادہ دل اور متواضع تھے اور وہ خود اپنے مسلک سے ہٹ کر دوسرے مسلک کے ائمہ کی رائے پر عمل کرلیتے تھے، ان کے یہاں تقلید یا عدم تقلید کی بحث نہیں تھی۔ ان کا موقف تھا کہ **اذا صح الحدیث فھو مذھبی** یعنی زیر بحث مسئلہ میں اگر کوئی صحیح حدیث رہنمائی کررہی ہے تو وہی میرا مسلک ہے، میری ذاتی رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔

خود امام ابوحنیفہ کی متعدد رایوں سے ان کے قابل شاگردوں امام ابویوسف، امام محمد اور امام زفر نے اختلاف کیا اور امام صاحب کی رائے کو حرف آخر نہیں قرار دیا مگر اس کے باوجود ان تمام حضرات کی آراء فقہ حنفی کے جزو کا درجہ رکھتی ہیں۔

(۴) میری ذاتی رائے یہ ہے کہ تقلید کی بحث سے امت میں انتشار پیدا ہوگا، ہمارے لیے بہت سے ضروری کام پڑے ہوئے ہیں۔ تعلیم، فقر وفاقہ اور غربت کا ازالہ۔ مشترک امور ومسائل میں مسلمانوں کو متحد کرنا اور ان میں ملی شعور بیدار کرنا، مسلمانوں کے اندر سے مضبوط سیاسی قوت بن کر ابھرنا، بدعات وخرافات، رسوم ورواج کو مٹانا جیسے کام ہماری خاص توجہ کے طالب ہیں۔

(۵) ائمہ کرام ومجتہدین نے امت کو مختلف مسائل میں بھٹکنے سے بچانے کے لیے ایک راہ نکالی، ان کے لیے سہولت پیدا کی۔ لیکن بعد کے لوگوں نے ان ائمہ کے اقوال وآراء کو حرف آخر سمجھ کر خود امت کے اندر ناقابل عبور مسلکی دیواریں کھڑی کردیں۔ کتاب وسنت کی صحیح حالت میں موجودگی اس بات کی ضمانت ہے کہ جب تک مسلمان اس سے چمٹے رہیں گے، گمراہ نہ ہوں گے، اصل یہ ہے کہ تقلید کے معاملہ میں اعتدال وتوازن قائم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے دوسرے مسالک کا احترام لازمی ہے۔

میں یہاں عصر حاضر کے ایک روشن خیال اور دیدہ ور عالم اور رہنما کی بات نقل کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔

"فقہ کے مذاہب اربعہ جب مشخص ومدون ہوگئے اور تقلید شخصی کا التزام قائم ہوگیا تو سوال پیدا ہوا: ان چاروں میں افضل کون ہیں؟ حضرت امام ابوحنیفہ یا امام شافعی؟ اب بحث شروع ہوئی اور بحث نے جنگ وجدال کی شکل اختیار کرلی۔ چنانچہ ہلاکو خاں کو اسلامی ممالک پر حملے کی سب سے پہلی ترغیب خراسانیوں کے اسی جھگڑے سے ملی تھی، پھر جب تاتاریوں کی تلوار چل گئی تو اس نے نہ شافعی کو چھوڑا نہ حنفی کو۔ ☆☆☆

☆Markaz Jamate Islami, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi

''ہمارا موقف یہی ہے کہ عامی کے لیے تقلید واجب ہے، خواص کے لیے نہیں، گزشتہ طویل مدت نے ہر طرح واضح کیا ہے کہ تقلید بلاشبہ رحمت اور ملت کے اتحاد کی ضامن ہے''

مولانا کوکب نورانی (پاکستان)☆

اللہ کریم جلّ شانہٗ نے دین اسلام کو ہمارے لیے پسند کیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ہمیں عطا فرمایا۔ یہ دین ہمیشہ کے لیے ہے اور تمام ادیان پر یہ غالب ہوگا۔ اس کامل واکمل دین کا ہم تک پہنچنا جن رجال واحوال سے وابستہ ہے، ہم ان پر اعتماد کرتے ہیں، دین اور دین والوں میں ان کا اعتبار ہے اور وہ ہستیاں آج بھی اہلِ ایمان میں باعث افتخار ہیں۔ ان محسن ہستیوں پر اعتبار واعتماد نہ کیا جائے تو ہم اپنی شناخت اور تشخص بھی معتبر نہیں کر سکتے۔ جانے وہ کون ہیں جو ان ہستیوں پر اعتراض کر کے اپنی ہی بنیادیں ہلا رہے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ ان کی بے سروپا واہی تباہی سے خود ان کی تضحیک اور دین کی توہین وتحقیر کا ''غیروں'' کو موقع مل رہا ہے اور اہلِ ایمان کی اجتماعیت متاثر ہو رہی ہے۔

''تقلید'' کوئی ایسا فعل نہیں جو دین سے الگ کوئی راستہ بتاتا یا دین سے دور کرتا ہو بلکہ یہ فعل تو عام شخص کے لیے دین پر عمل کو ممکن اور آسان بناتا ہے۔ دین کے تحفظ کے نام پر اگر ہم علمائے حق اور ائمہ دین پر زبان اعتراض دراز کریں تو یہ سنگین ظلم ہی شمار ہوگا۔ دین کے محافظ وپاسبان اہلِ علم ہیں۔ انہوں نے دنیا میں بسنے والے لوگوں کی آسانی کے لیے ایسے مستقل طریقے اور علوم وفنون وضع کیے ہیں جن کے ذریعے فتنوں کا مقابلہ اور دین کے خلاف سازشوں کا سدباب ہو سکے۔ سبھی مانتے ہیں کہ دین اسلام رہتی دنیا تک کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے اور دین سے وابستہ ہر شخص (یعنی عامی) دین سے بہ تمام وکمال واقف نہیں، نہ ہی ہر شخص کا دین سے پوری طرح واقف ہونا ممکن ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں واضح ارشاد ہے: فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون ''اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھو''۔ یعنی اپنے وہ مسائل جن کا حل تم نہیں جانتے وہ حل ان سے پوچھو جو لوگ جانتے ہیں۔

ایک معین آدمی، جو ماہر استاد، کتاب وسُنّت کا واقف، قابل اعتماد، قوتِ اجتہادیہ میں جسے کمال حاصل ہو، اس میں شرائط اجتہاد پوری طرح پائی جائیں۔ اس کے قول کو ماننا اور بغیر دلیل کے عمل کرنا تقلید مطلق کہلاتا ہے۔ ایک شخص کو دین کا سچا اور صحیح عالم وعامل مانا تو یہ یقین کیا کہ وہ شخص خوفِ خدا رکھنے والا اور قابلِ اعتماد ہے، وہ جو بتائے گا دین کے مطابق وموافق بالکل صحیح بتائے گا۔ اس لیے اس سے دلیل مانگے بغیر اس کی بات کو ماننا تقلید کہلاتا ہے۔ واضح رہے کہ ہم فروعی مسائل میں تقلید کرتے ہیں اور اُصولی مسائل میں اتباع کرتے ہیں اور واجب الاتباع کا اتباع کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے: واتبع سبيل من اناب الى۔

قرآن کریم ہی میں ہے: اطيعو الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم — لعلمه الذين يستنبطونه منهم — ويتبع غير سبيل المومنين الخ — ليتفقهوا فى الدين — فاعتبروا يا اولى الابصار — قرآن ہی نے اہلِ علم کی شان ومرتبت واضح فرمائی: والذين اوتو العلم درجت۔ انما يخشى الله من عباده العلماء. قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون۔

اہلِ ایمان بخوبی جانتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو دین ہی کی تعلیم مقصد تھا۔ انھیں بھیجتے ہوئے طریقہ تعلیم بھی واضح فرمایا اور اہلِ یمن کو ہر مسئلہ میں اُن سے رجوع کی اجازت دی، یہی تقلید شخصی ہے۔ ترکِ تقلید تو نفس پرستی سے عبارت ہے۔ عوام میں تدین کہاں؟ ان کی سلامتی اتباع ہی میں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عام نفوس کا طبعی میلان مفاسد کی طرف ہو جاتا ہے انھیں احکامات وتعلیمات کا پابند بنایا جانا اور اصلاحِ نفس ضروری ہے، یوں تقلید شخصی نہ صرف علاج ہے بلکہ ضروری ہے۔ جب اتباع ہوئی زیادہ ہو اور شریعت کو اپنی طبیعت کے موافق بنانے کی روش اپنائی جا رہی ہو تو ترتیب وتنظیم کیسے ہوگی؟ تقلید کے موضوع پر علمائے حق اہل سُنّت اور علمائے دیوبند کی طرف سے اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کوئی گوشہ شاید ہی تشنہ رہا ہو۔ تقلید کی تعریف کے لیے ہم اگر کتابیں دیکھیں تو جھلک ملاحظہ ہو:

کتاب التعریفات، کشاف اصطلاحات الفنون میں یہ تعریف درج ہے: عبارة عن قبول قول الغير بلا حجة ولا دليل — عبارة

☆B-54, Sindhi Muslim Housing Society, Karachi, Pakistan

عن اتباع الانسان غيره فيما يقول او يفعل معتقد اللحقيقة فيه من غير نظر و تامل فی الدليل كأن هذا المتبع جعل قول الغير او فعله، قلادة فی عنقه— اخذ القول من غير معرفة دليله

اردو فرہنگ دائرہ معارف اسلامی میں یہ تعریف درج ہے: تقلید یہ ہے کہ انسان کسی غیر (حجت) کے قول یا فعل کو صحیح مان کر اس کی دلیل پر غور و تامل کیے بغیر اس کا اتباع کرے، اس معنی میں تقلید، اجتہاد کی ضد ہے۔

جناب اشرف علی تھانوی یہ تعریف لکھتے ہیں: تقلید کہتے ہیں کسی کا قول محض اس حسنِ ظن پر مان لینا کہ یہ دلیل کے موافق بتلا دے گا اور اس سے دلیل کی تحقیق نہ کرنا۔'' (تحفۃ العلماء، ص ۲/۴۰۹)

غیر مقلدین بخاری و مسلم کے قائل ہیں، دلیل کے طور پر اسے پیش کرتے ہیں۔ وہ بتائیں کہ امام مسلم خود بخاری سے روایت کیوں نہیں کرتے؟ جب کہ امام بخاری ان کے استاذ ہیں۔ اصولِ حدیث، صحیح، حسن، ضعیف (لعینہ، لغیرہ) اقسام، (غریب، صرف ترمذی میں ہے، تفرد راوی کی وجہ سے غریب ہے۔غرابت، صحت کے منافی نہیں)، اصولِ حدیث کی یہ شرائط کہاں سے لی ہیں؟ ان پر آیت قرآنی پیش کریں؟

اسماء رجال پر بحث کرتے ہیں۔ ثقہ، صدوق، قابل احتجاج۔ وہ بتائیں کہ اصولِ حدیث کو مانتے ہو تو اصولِ فقہ کو کیوں نہیں مانتے؟ وہ اگر اصولِ حدیث کو جائز سمجھتے ہیں تو ہم پر اصولِ فقہ ماننے کی وجہ سے اعتراض کیوں کرتے ہیں؟

اسماء رجال پر پہلی کتاب ''الکمال'' ہے، اس کی تلخیص علامہ مزی نے تلخیص تہذیب الکمال کے نام سے لکھی، اس کی مزید تلخیص حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب کے نام سے کی۔ پھر تہذیب التہذیب میں جتنے راوی ہیں ان کے مختصر حالات حافظ نے تقریب التہذیب کے نام سے الگ کتاب میں جمع کر دیے۔ پھر ذہبی کی کتاب میزان الاعتدال میں جن راویوں کا صراحۃً ذکر نہیں ہوا ان کے ذکر و تعارف کے لیے حافظ ابن حجر نے لسان المیز ان مرتب فرمائی۔

غیر مقلدین بتائیں کہ ابن حجر اور ذہبی جو کچھ راویوں کے بارے میں کہتے ہیں اسے مانتے ہو یا نہیں؟ کیا یہ تقلید شخصی نہیں؟ ان سے سوال ہے کہ بخاری و ذہبی کے لیے اتباع کی کیا دلیل ہے تمہارے پاس؟ تم صحاح کو مانتے ہو، ہم اہل سنت و جماعت، بخاری سے امام اعظم کو بہت اونچا سمجھتے ہیں۔

واضح رہے کہ بغیر شرائط کے ہم نہیں مانتے۔ ہمارا موقف یہی ہے کہ عامی کے لیے تقلید واجب ہے، جو شخص قابل ہو اور صحیح فہم رکھتا ہو اور مسئلہ نکال سکتا ہو اس کے لیے نہیں۔ میرا ایک اہم سوال ہے غیر مقلدین سے، وہ بتائیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اب تک کتاب وسُنّت کا پورا پورا پابند کوئی شخص ہوا ہے یا نہیں؟

جواب اگر نفی میں ہو تو غیر مسلم ضرور معترض ہوں گے کہ اسلام کیسا دین ہے جس کا پورا پابند کوئی نہیں ہوا۔ ان سے عرض کروں کہ اگر مانو کہ ایسے شخص ہوئے ہیں اور اُن کے افعال و اقوال باسند محفوظ ہوں تو ایسے متبع قرآن وسُنّت کی پابندی و پیروی، تقلید و اتباع میں کیا خرابی ہے؟ بلاشبہ ان لوگوں کی پیروی قرآن وسُنّت ہی کی پیروی ہے۔

اہلِ ایمان جانتے ہیں کہ ہر حدیث واجب العمل نہیں، ہر سُنّت واجب العمل ہے۔ ہر سُنّت، حدیث ہے؟ کیا ہر حدیث، سُنّت ہے؟ ابن حزم جیسے شخص نے بھی اعتراف کیا ہے کہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔ گزشتہ طویل مدت نے ہر طرح واضح کیا ہے کہ تقلید بلاشبہ رحمت اور اتحادِ اُمّت اور جمعیت ملت کی ضامن ہے۔

ارادہ تھا کہ کچھ واقعات نقل کروں گا اور غیر مقلدین کی کتب سے اپنی تائید بھی پیش کروں گا لیکن عشرۂ محرم کی مجالس اور اس کے بعد بھارت کے سفر اور لوگوں میں گھرے رہنے کے باعث مہلت نہ ملی۔ کچھ حوالے بھی نقل کیے تھے لیکن وہ کاغذ بھی محفوظ نہ رہے۔ یہ قلم برداشتہ مختصر تحریر میں نے دہلی سے ممبئی کی پرواز میں مکمل کی ہے۔ اس کا لہجہ اور انداز میری مستقل تحریروں سے مختلف لگے تو درگزر فرمائیں۔

☆☆☆

ترجمہ: مولانا نعمان احمد ازہری☆

مذاکرہ

شام کے نامور عالم دین شیخ ڈاکٹر سعید رمضان بوطی کا ایک غیر مقلد عالم سے مناظرہ

ایک متعصب اور غالی غیر مقلد چند حق پسند اور منصف مزاج جوانوں کے ہمراہ میرے پاس آیا، جب سلسلہ کلام شروع ہوا تو میں نے اس سے پوچھا: احکام الٰہیہ کو سمجھنے کے لیے آپ کے پاس کیا طریقہ کار ہے؟ کیا آپ کتاب وسنت سے براہ راست استفادہ کرتے ہیں یا ائمہ مجتہدین کی تحقیقات کا سہارا لیتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: سب سے پہلے میں ائمہ کے اقوال و دلائل کا جائزہ لیتا ہوں، پھر ان کی جو دلیل کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہوتی ہے، اسی پر اعتماد کرتا ہوں۔

میں نے اس سے بطور مثال کہا: اگر آپ کے پاس پانچ ہزار روپے ہوں اور اس پر چھ مہینہ گزر گیا ہو اور وہ رقم اس درمیان آپ کے پاس محفوظ بھی رہی ہو، پھر آپ نے اس سے سامان تجارت خریدا اور فروخت کرنا شروع کیا تو آپ اس کی زکوٰۃ کب نکالیں گے؟ دوسرے چھ مہینہ کے بعد یا پورا سال گزرنے کے بعد؟

ذرا غور وفکر کے بعد اس نے جواب دیا: آپ کے اس سوال کا مطلب ہے کہ آپ سامان تجارت میں زکوٰۃ واجب سمجھتے ہیں؟

میں نے کہا: میں آپ سے پوچھ رہا ہوں اور میرا مدعا فقط اتنا ہے کہ آپ اپنے خاص طریقہ سے جواب عنایت فرمائیں، اس کے لیے یہ کتابیں آپ کے سامنے ہیں، کتاب وسنت اور اقوال ائمہ بھی آپ کے پیش نظر ہے۔

تھوڑا تامل کے بعد کہتا ہے: برادر! یہ دین کا معاملہ ہے، کوئی آسان بات نہیں، جس میں بغیر سوچے ذہن و دماغ سے جواب دیا جا سکے، اس کا صحیح جواب جاننے کے لیے کچھ پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز اس کے لیے وقت درکار ہے اور اس وقت ہم کسی دوسرے موضوع پہ گفتگو کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

میں نے کہا: ٹھیک ہے، تو کیا ہر مسلمان پر یہ واجب ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں ائمہ کے اقوال و دلائل کا جائزہ لے اور جو قرآن وسنت کے زیادہ موافق ہو اس پر عمل شروع کر دے؟

ہاں! اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا: اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہر شخص ویسی ہی اجتہادی صلاحیت کا مالک ہے، جیسی ائمہ مجتہدین کے پاس تھی، بلکہ آپ کے مطابق تو کئی مرتبہ دوسرے لوگ ان سے بڑھ بھی سکتے ہیں، کیوں کہ جو شخص ائمہ کے اقوال و دلائل کا جائزہ لے کر کتاب وسنت سے قریب تر کو ترجیح دینے کی اہلیت رکھتا ہو گا وہ تو بلاشبہ ان سے بڑا قابل اور لائق و فائق ہو گا۔

یہ سن کر اس نے کہا: دراصل عوام کی تین قسمیں ہیں:

(۱) مقلد (۲) متبع (۳) مجتہد

پس جو شخص اس اہلیت کا مالک ہو کہ مذاہب (مسالک) اربعہ کے دلائل کا تقابلی مطالعہ کر کے کتاب وسنت سے قریب تر کو ترجیح دے وہ ''متبع'' کہلاتا ہے، اور یہ تقلید و اجتہاد کا درمیانی مرتبہ ہے۔

اس پر میں نے کہا: پھر مقلد کا کیا کردار ہونا چاہیے؟

جواب میں اس نے کہا: سارے مجتہدین جس مسئلہ میں متفق ہوں اسی میں ان کی تقلید کرنی چاہیے۔

تو میں نے کہا: اگر کسی ایک ہی مجتہد کی تقلید دائمی طور پر کی جائے تو کوئی خرابی لازم آئے گی؟

فوراً اس نے جواب دیا: ہاں! یہ تو حرام ہے۔

میں نے کہا: حرام! کیوں کر حرام ہے؟ تقلید کی حرمت پر کیا دلیل ہے؟

اس نے جواب دیا: اس کی دلیل یہ ہے کہ اس شخص نے اپنے اوپر اپنی طرف سے وہ چیز لازم کر لی جو اللہ تعالیٰ نے اس پر لازم نہیں کی تھی۔

اس پر میں نے اس سے سوال کیا: آپ قرأت سبعہ میں سے کس کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھتے ہیں؟

جواب دیا: حفص کی قرأت کے مطابق۔

میں نے کہا: اسی ایک قرأت کے مطابق ہمیشہ بالالتزام پڑھتے ہیں یا کسی دن دوسرے قرأت پر بھی عمل کرتے ہوئے دوسری کے مطابق قرآن پڑھتے ہیں؟

جواب دیا: نہیں! اسی قرأت حفص پر ہی مداومت کرتا ہوں۔

☆Principle: Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia, 22, Zakir Nagar, Okhla, New Delhi

میں نے کہا: کیا بات ہے کہ قرأت حفص کو ہی ہمیشہ بالالتزام اپناتے ہیں؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ لازم نہیں کیا، بلکہ قرآن کریم رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسے تواتر کے ساتھ منقول ہوا، اس کے مطابق پڑھنا چاہیے۔

اس پر اس نے کہا: - ایسا اس لیے کہ مجھے دوسری قرأتوں کا مطالعہ یا علم نہیں، اس کے علاوہ یہ پڑھنا میرے لیے ممکن نہیں۔

اب میں نے کہا: ٹھیک آپ کی طرح ایک شخص نے فقہ شافعی کا مطالعہ اور دوسرے ائمہ کی تحریروں پر مطلع نہیں ہو سکا، اور نہ ہی اس کے لیے یہ ممکن تھا کہ سارے مسالک کے دلائل کا مطالعہ کر سکے، اب اگر آپ ایسے شخص کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس پر لازم ہے کہ پہلے سارے ائمہ کی اجتہادی تحریروں کا مطالعہ کرے، یہاں تک کہ سب پر عمل کرنے کی کوشش کرے تو سب سے پہلے تو آپ پر لازم ہوا کہ آپ قرأت سبعہ سیکھیں اور ساری قرأتوں کے مطابق قرآن کی تلاوت فرمائیں۔ اگر اس مقام پر اپنی عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو میں عرض کروں گا، خدارا اس مسکین مقلد کو بھی اپنی ہی منطق کی رو سے معذور جانیے۔

علاوہ ازیں، ہم یہ بھی آپ سے سوال کرنے کے مجاز ہیں کہ آپ نے یہ کہاں سے لازم کیا کہ مقلد ایک امام کے مسائل نہ لے بلکہ دوسرے امام کے مسائل پر بدل بدل کر عمل کرے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ بھی بندوں پر لازم نہیں کیا۔

یعنی آپ کے مطابق اگر ایک مذہب فقہ پر استمرار کے ساتھ گامزن رہنے کو اللہ تعالیٰ نے لازم نہیں کیا، تو بار بار بدل کر عمل کرنے کو کب لازم فرمایا؟

یہاں پہنچ کر اپنی ہی پرانی بات میں نیا شوشہ جڑتے ہوئے کہا: تقلید یوں ہی حرام نہیں، بلکہ اس لیے حرام ہے کہ مقلد کسی کی تقلید کا التزام یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ (جب کہ ایسا نہیں)

میں نے کہا: چلیے آپ کی بات تسلیم کہ ایسا اعتقاد رکھے کہ تقلید رب تعالیٰ کی واجب کردہ اشیاء میں سے ہے تو غلط ہے، آپ کی بات درست ہے۔ لیکن اگر مقلد کو یہ علم ہے کہ اللہ نے اس کا مکلف نہیں بنایا کہ وہ کسی خاص امام کی تقلید کرے تاہم وہ اپنے اختیار سے ایسا کرے تو؟

اس نے جواب دیا - پھر تو ایسی تقلید میں کوئی حرج نہیں۔

اس پر میں نے کہا: جو کتاب آپ پڑھاتے ہیں، اس میں تو آپ کے موقف کے خلاف بات لکھی ہے، اس میں واضح لفظوں میں تحریر ہے کہ کسی خاص امام کی تقلید (بغیر اعتقاد واجب) بھی حرام، بلکہ بعض اوقات کفر ہے۔

اس نے کہا: کہاں؟

میں نے یہ عبارت دکھائی: ''**بل من التزم واحدا بعينه في كل مسئلة فهو متعصب مخطئ مقلد تقليدا أعمى وهو ممن فرقوا دينهم و كانو شيعاً**''

تو کافی غور و خوض اور تأمل کے بعد فرمایا: یہاں بھی التزام سے مراد یہی ہے کہ وہ شریعت کی جانب سے واجب کردہ تصور کرے، یہاں عبارت میں تھوڑی کمی رہ گئی ہے۔

میں نے پوچھا: صاحب تحریر کی یہی مراد جو آپ فرما رہے ہیں، اس پر کیا دلیل ہے؟ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ صاحب تحریر غلطی پر ہے۔

(لیکن واہ رے جذبۂ تقلید و تائید) وہ شخص اسی پر مصر رہا کہ یہ عبارت اپنی جگہ درست ہے اور اس میں کچھ محذوف ہے۔ اس طرح عملاً اس کتاب کے مؤلف کو خطا سے معصوم قرار دیا۔

میں نے کہا: اس تقدیر پر بھی اس عبارت کا کوئی مفاد نہیں، کیوں کہ دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہیں جو اس بات سے ناواقف ہو کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید شریعت اسلامی نے نہیں واجب قرار دی ہے، بلکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہر مکلف کو اختیار ہے کہ وہ کسی ایک کی فقہی مسائل میں تقلید کرے۔

اس پر کوئی جواب نہ دے سکا تو کہا: میں نے ہزاروں لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ کسی ایک مسلک کی تقلید شرعاً لازم ہے، اس سے انحراف ممکن نہیں۔

میں نے مطالبہ کیا: - کسی ایک صاحب علم کا نام یا اس کی تحریر پیش کیجیے؟ جواب مکمل خاموشی رہا، تاہم اس بات کی رٹ لگاتا رہا کہ بعض لوگ ایک مذہب سے دوسرے مذہب کے مطابق احکام پر عمل کو حرام قرار دیتے ہیں۔

میں نے چیلنج کرتے ہوئے اس سے کہا: - آپ ایک بھی فرد ایسا نہیں دکھا سکتے جو ایسا باطل عقیدہ رکھتا ہو، البتہ عثمانیوں کے دور اقتدار کے آخر میں کچھ لوگ مذہب حنبلی سے عدول گراں جانتے تھے، جس کی

تائید ہم بھی نہیں کرتے، یقیناً وہ تعصب پر مبنی تھا-

پھر میں نے اس سے کہا: مقلد اور متبع کے درمیان آپ نے جو یہ فرق کیا ہے، اس کی اصل کیا ہے؟ آیا یہ فرق لغوی ہے یا اصطلاحی؟

جواب دیا: یہ لغوی فرق ہے-

تو میں نے لغتوں کا حوالہ طلب کیا، تاکہ دونوں لفظوں میں لغوی فرق ثابت ہو سکے، تو یہ بھی آنجناب نہ کر سکے-

پھر میں نے کہا: بے شک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے اعرابی سے کہا، جس نے مسلمانوں کی تائید شدہ چیزوں پر اعتراض کیا تھا- ''اذا رضی المهاجرون فانما انتم تبع'' اس اثر میں موافقت کو اتباع سے تعبیر کیا گیا، جب کہ اس میں بحث ونظر کی گنجائش نہیں-

اتنا سن کر اپنی بات بدل دی اور کہا کہ پھر یہ فرق اصطلاحی ہوگا اور کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ کسی چیز کے لیے اصطلاح قائم کرلوں؟

کیوں نہیں! میں نے کہا: ضرور آپ کو یہ حق حاصل ہے، مگر آپ کی مفروضہ اصطلاح امر واقعہ کو نہیں تبدیل کر سکتی، پس یہی جس کو آپ ''متبع'' کا نام دیتے ہیں، اگر دلائل کا ادراک کرے اور طریقہ استنباط سے واقف ہوگا تو یہ مجتہد ہوا اگر بعض مسائل میں استنباط کی صلاحیت اور بعض میں دلائل سے جہالت ثابت ہو تب بھی اب ایسا شخص بعض میں مجتہد اور بعض میں مقلد یا اس کے بالعکس قرار پائے گا اور بہر صورت ہمارا مدعا حاصل- اور وہ یہ کہ تقسیم صرف دو طرفہ یعنی اجتہاد و تقلید میں منحصر ہے اور ہر ایک کا حکم عیاں ہے-

اب تک بات کچھ نہ بن سکی تو کہا: متبع وہ شخص ہے جو اقوال اور دلائل کے مابین خط امتیاز کھینچ سکے اور قوی دلائل کو سمجھ کر ضعیف پر ترجیح کی صلاحیت رکھتا ہو اور یہ مرتبہ بہر حال نری تقلید کے علاوہ ہے-

میں نے کہا: اگر ایسا ہے تو یہ مرتبہ تو اجتہاد میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، کیا آپ بذات خود ایسے ہیں؟

خوش ہو کر جواب دیا: میں بقدر استطاعت ایسا ہی کرتا ہوں-

جی ہاں! مجھے معلوم ہے کہ آپ ایک مجلس میں تین طلاق کو ایک تسلیم کرنے والوں میں سرفہرست ہیں تو کیا آپ نے اپنے فتویٰ صادر کرنے سے پہلے تمام ائمہ کے اقوال و دلائل اور تحریروں کا مطالعہ کر لیا تھا؟ اور اس کے بعد کسی ایک دلیل کی قوت کی بنا پر اسے ترجیح دی؟ اس کے بعد فوراً اس کے سامنے یہ حدیث پاک رکھ دی ''ان عویمر العجلانی طلق زوجته ثلاثاً فی مجلس رسول الله صلی الله علیه وسلم بعد أن لا عن منهافقد قال كذبت علیها یا رسول الله ان امسكتها هي طالق ثلاثاً'' اور میں نے پوچھا کہ آپ کا اس حدیث پاک کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جمہور فقہائے اسلام یا ابن تیمیہ کے مذہب پر اس کی دلالت کیا ہے؟

جواب دیا: مجھے یہ حدیث نہیں معلوم-

میں نے کہا: پھر کیسے آپ نے ایسے مسئلہ میں فتویٰ صادر کیا، جس میں مذاہب اربعہ کے امام متفق و متحد ہیں اور آپ نے ان کے دلائل کا مطالعہ کیے بغیر ان کے خلاف فتویٰ دیا؟ گویا خود آپ ہی اپنے اصل موقف سے منحرف ہوئے اور اتباع کا معنی اصطلاحی جسے آپ کے دماغ نے گڑھا ہے ہمارے سر تھوپنا چاہتے ہیں-

کہنے لگے: اس وقت میرے پاس مذاہب اربعہ کی فقہ پر مشتمل کوئی مدلل کتاب نہ تھی، جس کی جانب میں رجوع کرتا اور دلائل معلوم کرتا-

میں نے کہا: پھر آپ کو فتویٰ دینے میں اتنی عجلت سے کام نہ لینا تھا وہ بھی جمہور علما کی مخالفت میں؟ جب کہ آپ ان کے دلائل سے قطعاً ناآشنا تھے-

کہنے لگے: پھر میں کیا کرتا؟ مجھ سے سوال کیا گیا تھا اور میرے پاس مرجعی کتب نہ تھیں-

میں نے کہا: کیوں نہیں کہہ دیا ''مجھے معلوم نہیں'' جب کہ صالح علما اور متواضع ائمہ دین کا طریقہ رہا ہے- یا اگر یہ نہ کر سکتے تھے تو کسی کی مخالفت میں فتویٰ نہ دے کر صرف اتنا کر دیتے کہ مذاہب اربعہ کے امام اور ان کے مخالفین کی آرا نقل کر دیتے، بلکہ مذکورہ صورت حال میں تو آپ پر یہی فرض تھا، کیوں کہ آپ کے اعتراف حقیقت کے مطابق آپ نے ان کے دلائل کا مطالعہ نہیں کیا، اس کے باوجود اپنی رائے سے ان کے خلاف فتویٰ دیا، مخالفین کی رائے اپنی رائے زنی کے معاون و موید ثابت ہو تو آپ جمہور امت کا خیال ترک کر بیٹھیں، تعصب وعناد میں اس مقام تک پہنچا ہوا آپ جیسا انسان پھر دوسروں کو متعصب ہونے کا طعنہ دے، سخت تعجب ہے!

کہا: میں ''سبل السلام'' اور ''فقہ السنة'' جیسی کتابوں کا مطالعہ کر چکا تھا-

میں نے کہا: مسئلہ ذیل میں تو مذکورہ بزرگ ائمہ کے فریق ہیں اور

ان کی پیش کردہ دلیلیں تصویر کا ایک رخ پیش کرتی ہیں، وہ بھی وہی رخ جس سے ان کے موقف کو تقویت ملے، کیا آپ جیسے محقق کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ کسی مختلف فیہ مسئلہ میں صرف اپنے ہمنواؤں کی دلیلیں دیکھ کر انہیں کے حق میں فتویٰ صادر کر دیں؟

کہا کہ آخر میرے ایسا کرنے میں خرابی کیا ہے؟ مجھ سے جب کسی مسئلہ کی بابت سوال ہوا تو میں صرف اسی کا مکلف ہوں کہ اپنے مطالعہ کی روشنی میں فتویٰ دوں۔

اس پر گرفت کرتے ہوئے میں نے کہا: آپ ہی نے ابھی تسلیم کیا کہ میں متبع ہوں اور دوسروں کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے، پھر اتباع کی تشریح آپ نے یوں کی کہ تمام مذاہب کے اقوال و دلائل کا جائزہ لے کر کتاب وسنت کے قریب ترین دلیل کو راجح قرار دینا ہے، جب کہ اس معاملہ میں آپ نے اپنے موقف و منہج سے روگردانی کی، یہ جانتے ہوئے کہ مذاہب اربعہ میں اجماعی طور پر ایک مجلس میں تین طلاق دینا تین واقع ہوتی ہے، یہی نہیں بلکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسی ثبوت میں ان کے یہاں ٹھوس دلائل موجود ہیں، اب ان دلیلوں پر مطلع ہوئے بغیر رائے زنی کرتے ہوئے آپ نے خرق اجماع کا ارتکاب کیا، کیا آپ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس مسئلہ میں ان کی دلیلیں مردود ہیں؟

کہا کہ میں ایسا نہیں سمجھتا تھا، مگر میرے پاس وہ کتابیں دستیاب نہیں تھیں کہ میں ان دلائل کا جائزہ لیتا۔

میں نے پوچھا: پھر آپ نے انتظار کیوں نہ کیا؟ آپ نے جلد بازی سے کیوں کام لیا؟ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف نہ کیا تھا، انصاف سے کہیے جمہور ائمہ کی رائے پر مطلع نہ ہونا ہی ابن تیمیہ کی رائے کو قوی تصور کرنا آپ کو روا ٹھہرا تو کیا تعصب اور اندھی تقلید اس کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے؟

اس نے کہا کہ میرے پاس جتنی کتابیں مہیا تھیں، انہیں میں دلائل دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا، اور اس سے زیادہ کا میں مکلف نہ تھا۔

میں نے پوچھا: اگر کوئی مسلمان اپنے پاس موجود کتاب میں کوئی دلیل دیکھ کر مذہب جمہور کی مخالفت کو واجب کر دے گرچہ ان کی دلیلیں نہ دیکھیں ہوں، کیا ایسا کرنا ممکن ہے؟

ہاں! ممکن ہے، اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا: اگر کوئی نو مسلم اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''ولله المشرق والمغرب فاينما تولوا فثم وجه الله ان الله واسع عليم'' (سورۃ بقرہ، آیت: ۱۱۵) کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ نماز میں کسی بھی جانب چہرہ کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ آیت کریمہ کا ظاہری لفظ دلالت کرتا ہے، اس کے برخلاف اس کو معلوم ہو کہ ائمہ اربعہ اور علما کرام استقبال قبلہ کو صحت نماز کے لیے شرط مانتے ہیں- لیکن ان کی دلیلوں پر مطلع نہیں ہوا، ایسا شخص جب نماز کے لیے کھڑا ہو تو کیا کرے؟ آیا اپنی فہم کے مطابق دلیل قطعی پر عمل کرے یا ائمہ کے متفقہ فیصلہ کی اتباع کرے؟ جو اس کے فہم خاص کے برعکس ہے-

کہنے لگے: ہاں اپنی فہم کے مطابق عمل کرے-

یعنی مشرق کی جانب چہرہ کر کے نماز پڑھے اور اس کی یہ نماز درست ہوگی؟ میں نے پوچھا-

جواب دیا: ہاں درست ہوگی، کیوں کہ وہ اپنے اطمینان قلب کا مکلف ہے-

تب میں نے کہا: فرض کرو یہی اطمینان قلب اس کو اس بات پہ حاصل ہو جائے کہ زنا کرنے، شراب پینے اور مال حرام کھانے میں کیا حرج اور مضائقہ ہو سکتا ہے؟ تو کیا اللہ اس کے لیے یہ سارے محرمات حلال کر دے گا؟

یہ سن کر آنجناب خاموش رہے، پھر کہا کہ بہر حال ایسی صورت حال وہمی اور خیالی ہے اس کا صدور شاذ و نادر ہے-

میں نے کہا: جناب! وہمی اور خیالی نہیں بلکہ یہ امر واقعہ ہے، یہی نہیں! اس سے بھی عجیب وغریب حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں، ایک مسلمان جسے نہ قرآن وحدیث کا علم ہے، نہ علوم اسلامیہ میں مہارت ہے، اس نے آیت مذکورہ دیکھ کر ظاہری لفظ سے یہ گمان کر لیا کہ کسی جانب چہرہ کر کے نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں، جب کہ دنیا کے مسلمانوں کو جہت قبلہ میں متوجہ دیکھتا ہے؟ اس کے باوجود آپ اس صورت حال کو وہمی قرار دے رہے ہیں اور دلی اطمینان کو اتنا معتمد و معتبر گردان رہے ہیں کہ اس کے ہوتے نص قطعی میں اپنی ذہنی اُپج سے تصرف تک روا رکھ رہے ہیں، یاد رہے کہ یہ چیز بھی آپ کی مفروضہ تقسیم کے معارض ہے کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں (۱) مقلد (۲) متبع اور (۳) مجتہد

پھر بات بناتے ہوئے کہا کہ ایسے شخص کو بحث و تفتیش کرنی چاہیے-

میں نے کہا: اس کے پاس تحقیق کے ذرائع مفقود تھے، جیسا کہ آپ کے ساتھ مسئلہ طلاق میں ہوا تھا، تو کیا یہ شخص اپنے دلی اطمینان پر ہی مصر رہے گا اور اجماع امت کو قابل اعتنا نہ سمجھے؟

کہا کہ ہاں! جب خود غور وفکر اور تلاش وجستجو نہیں کر سکتا تو وہ معذور ہے اور وہ اپنی صواب دید کے مطابق عمل کرے۔

میں نے کہا: آپ کی بات بڑی عجیب وغریب ہونے کے ساتھ انتہائی خطرناک بھی ہے، اگر آپ کی طرف منسوب کر کے کسی سے کہہ دوں تو؟

اس نے بڑی جرأت سے جواب دیا: جس سے چاہیں کہہ دیں مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

میں نے کہا: ہاں! جب آپ کو اللہ کا خوف نہیں تو بھلا کس کا خوف ہوگا؟ جب آپ اللہ کا ارشاد "**فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون**" (سورہ نحل، آیت:۴۳) ٹھکرا سکتے ہیں تو پھر کس کی مانیں گے؟

طیش میں آ کر کہا: برادر! یہ ائمہ کوئی معصوم نہیں تھے، ہاں رہی قرآنی آیات ونصوص تو یہ ضرور اس ذات پاک کا کلام ہے جو جملہ عیوب، نقائص سے پاک ومنزہ ہے، پھر کوئی ذی فہم غیر معصوم کے فیصلے کو لے بے عیب کلام سے کب مستغنی ہو سکتا ہے؟

میں نے کہا: نادان!" **ولله المشرق والمغرب......الخ**" کا معنی معصوم ہے نہ کہ اس جاہل نو مسلم کی فہم اور میں تو انہیں دو عقلوں کے بارے میں حتمی فیصلہ چاہتا ہوں، بایں طور کہ ائمہ بھی معصوم نہیں اور جاہل نو مسلم بھی معصوم نہیں تاہم اول الذکر علوم اسلامیہ میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، جب کہ دوسرا اس سے قطعاً جاہل وبیگانہ اور یکسر ناواقف ہے۔

اس پر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے زیادہ مکلف نہیں کیا۔

میں نے کہا: پھر میرے سوال کا جواب دیجیے! ایک شخص کا بچہ بیمار ہوا، تمام حکیموں نے علاج کیا اور سب نے آخر میں متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ خبردار! پنسلین کا انجکشن ہرگز نہ دیا جائے ورنہ بچہ کی موت واقع ہو سکتی ہے، اس کے برخلاف بچہ کے باپ نے کہیں کسی طبی جریدے میں پڑھ رکھا تھا کہ پنسلین کا انجکشن فلاں مرض میں مفید ہے۔ اس نے اپنی ذاتی معلومات پر بھروسہ کر کے اطباء کے اجماعی مشورہ کو پس پشت ڈال دیا، بچہ کو پنسلین کا انجکشن دیا اور بچہ موت کی آغوش میں پہنچ گیا۔ بتایا جائے یہ شخص گنہگار ہوا یا نہیں؟

تھوڑی دیر توقف کے بعد آنجناب نے فرمایا: یہ تو دوسری بات ہے۔

• **میں نے کہا:** ہرگز نہیں، معاملہ بالکل یکساں ہے، اس شخص نے اطباء کا اجتماعی حتمی فیصلہ سنا، اس کے پیچھے کیا حکمتیں تھیں، اسے نظر انداز کیا اور اس کے مقابلہ میں اپنی ذاتی معلومات پر اعتماد کیا، نتیجہ تمہارے سامنے ہے، بالکل اسی طرح اس نو مسلم نے ائمہ کا اجماع سنا پھر قرآنی آیت کو اپنی ناقص فہم کے مطابق سمجھا اور اس پر عمل کر کے استقبال قبلہ نہ کیا تو اس کی نماز کب درست ہوگی؟

اس نے کہا: برادر! قرآن نور ہے نور............اور کیا نور بھی اپنے وجود ودلالت میں کبھی کسی کا محتاج ہوتا ہے؟

میں نے کہا: جی ہاں! قرآن کا نور ہی قاری وناظر کی عقلوں میں منعکس ہوتا ہے، تبھی تو وہ اللہ کی مراد اس سے سمجھ لیتا ہے، مگر اہل علم اور جاہل میں کچھ تو فرق ہوتا؟۔

میری پیش کردہ دونوں مثالوں میں موزونیت ویکسانیت ہے، اب جواب آپ کے سر ہے کہ دونوں سرگرداں شخص اپنی ذاتی معلومات کی اتباع کریں یا ماہرین فن کی تقلید؟

پھر بھی اڑیل اپنی ہٹ پر اڑا رہا کہ اطمینان قلب بہر حال اصل ہے تو میں نے پھر وہی مثال دہرائی کہ دلی اطمینان پر اعتماد کر کے اطباء کے مشوروں کو ٹھکرا کر اپنے بچہ کو گویا عمداً مارنے والے پر شرعی مواخذہ ہے یا نہیں؟

تعصب وعناد اور حماقت کی انتہاء کرتے ہوئے بے دھڑک کہتا ہے کہ اس پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔

تب میں نے سوچا کہ ایسے اڑیل اور متعصب شخص سے گفتگو بے سود ہے، اہل بصیرت انصاف کریں۔ کیا روئے زمین پر اس سے بڑھ کر کوئی اندھی تقلید کرنے والا یا عقل وخرد کا مفلس ہوگا، جو تعصب وعناد کی رو میں بہہ کر شرعی مسلمات کا انکار کر بیٹھے؟

سبحان اللہ! ایک جاہل اپنی فہم ناقص پر اعتماد کر کے مسلمانوں کے قبلہ سے منحرف ہو کر نماز ادا کرے تو اس کی نماز کی صحت کی ضمانت دی جائے، اور ایک عام انسان اپنے ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر کسی کا علاج کر کے مریض کو موت کے گھاٹ اتار دے تو اس کے بارے میں کہا جائے، اس پر کوئی مواخذہ نہیں!

اگر دلی اطمینان کا درجہ اس قدر بلند ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہمیں اس کے استعمال پر پابندی لگائی جائے، ہمیں بھی تو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ کہہ سکیں: احکام شریعت سے ناواقف شخص پر ائمہ مجتہدین کی تقلید اس لیے ضروری ہے کہ ان کی دلیلیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے قریب تر ہیں۔ اور ان کی فہم سلیم ان کا زیادہ ادراک کرنے والی تھی۔ ☆☆

اظہارِ خیالات

اس کالم میں آپ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی اور ملی کسی بھی مسئلہ پر اپنی فکر اور اپنے خیال کا برملا اظہار اور بے لاگ تبصرہ کرسکتے ہیں جو ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جائے گا، واضح ہو کہ اس سلسلے میں آپ کی تحریر مختصر اور جامع ہونی چاہیے......................(ادارہ)

اجتہاد اور تقلید امت کی بنیادی ضرورت

پروفیسر سید محمد امین برکاتی

خانقاہ عالیہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ، ضلع ایٹہ (یوپی)

قرآن وحدیث اسلام کے بنیادی دستور ہیں- ان پر عمل پیرا ہونا اور ان سے ہدایت حاصل کرنا ہر مسلمان کا بنیادی فریضہ ہے- لیکن ان کے مطالبات تک رسائی کے لیے صرف قرآن وحدیث کا ترجمہ پڑھ لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے اور بہت سارے علوم اور شرائط کی ضرورت پڑتی ہے- حضرات صحابۂ کرام اور تابعین عظام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قرآن وحدیث کے سمندر کی غواصی کر کے بے شمار چمکتے موتی نکال کرامت مسلمہ کے سامنے پیش کر دیے ہیں، جن سے قیامت تک دنیا فائدہ اٹھاتی رہے گی- ائمہ مجتہدین کا یہ وہ لازوال کارنامہ اور باکمال احسان ہے، جس کا قیامت تک نہ حق ادا کیا جاسکتا ہے، نہ جواب لایا جاسکتا ہے، اس لیے اجتہاد اور تقلید امت مسلمہ کی بنیادی ضرورت ہے، ان کے بغیر مفاہیم قرآن اور معانی حدیث پر کما حقہ عمل نہیں کیا جاسکتا- ہمارے امام اعظم امام الائمہ سراج الامۃ حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر اطہر پر اللہ تعالیٰ بے شمار رحمتوں کے پھول برسائے جنھوں نے اجتہاد کے اصول متعین کیے اور تدوین فقہ کی بنیاد ڈالی اور امت مسلمہ کے لیے ایسی آسانیاں پیدا کر گئے، جن کا شمار نہیں ہوسکتا-

ادھر پچاس سو سال کے اندر غیر مقلدیت اور وہابیت نے برصغیر میں وبا کی شکل اختیار کر لی ہے، جسے دیکھو قرآن فہمی اور حدیث دانی کا دعویٰ کیے پھرتا ہے اور ایک شترِ بے مہار کی طرح حضرات ائمہ اور بزرگان دین پر تبرا بازی کرتا نظر آتا ہے، ایسے ماحول میں ماہنامہ جام نور دہلی نے اجتہاد وتقلید نمبر نکال کر امت مسلمہ کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کا ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے، اس شمارے میں ہند وپاک اور دیگر ممالک کے دل ودماغ کہلائے جانے والے اہل علم کی تحریریں شامل ہیں، تقلید مخالف خیمے کی بھی آراء شامل کی گئی ہیں تاکہ دونوں رخ واضح ہوسکے، میں عزیز القدر مولانا خوشتر نورانی صاحب کو اس نمبر کی بروقت پیش کش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اہل علم کی یہ کاوشیں مقبول بارگاہ خداوندی ہوں اور امت مسلمہ کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں تاکہ وہ اپنے بزرگوں کی دینی خدمات کے معترف ہوکر ان کے حضور ادب اور نیازمندی کا شعور بیدار رکھیں- آمین بجاہ النبی الامین علیہ اکرم الصلوٰۃ وافضل التسلیم!

مخالفین تقلید نے تقلید کی ایک نئی روایت قائم کی

حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری

زیب سجادہ آستانہ قادریہ، بدایوں شریف (یوپی)

جام نور کے ''اجتہاد وتقلید نمبر'' کا اعلان پڑھ کر مسرت ہوئی، یہ وقت کی اہم ضرورت ہے، آج جس تیزی سے امت کے سادہ لوح افراد کو ائمہ متقدمین اور مجتہدین کی تقلید سے برگشتہ کر کے سعودی عرب کے بعض شیوخ کی تقلید پر آمادہ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے جماعت اہل سنت کی جانب سے اس پیمانے پر دفاعی اقدامات نہیں کیے جارہے ہیں جو اس قسم کی منظم تحریک سے نمٹنے کے لئے کافی ہوں- ماہنامہ

جام نور اور اس کی مجلس مشاورت وادارت مبارک باد کی مستحق ہے، جس نے اس خلا کو محسوس کرتے ہوئے مسائل اجتہاد و تقلید کی تشریح و تفہیم کے لئے یہ خصوصی نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے، میں صمیم قلب سے اس اقدام کا خیر مقدم کرتا ہوں، اور دعا گو ہوں کہ رب مقتدر اس وقیع نمبر کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش بنائے، اور اس کو گم گشتگان راہ کے لئے ذریعہ ہدایت ورہنمائی بنائے- آمین

تقلید ائمہ کو حرام و شرک قرار دینے والے اور بزعم خود عمل بالحدیث کرنے والے حضرات کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ ان لوگوں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ ائمہ متبوعین کی تقلید کا قلادہ گردن سے اتار کر ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن قیم، شوکانی اور البانی کی اندھی تقلید کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا، مذاہب اربعہ کی مخالفت کی اور اس کے نتیجہ میں ایک پانچویں مسلک کی بنیاد ڈال دی- ائمہ، مجتہدین، فقہا بلکہ بعض تابعین وصحابہ کی شانوں میں بے ادبیاں اور گستاخیاں کرنا اپنا شعار بنالیا، تشدد اور فکری انحراف کا یہ حال کہ گزشتہ ایک ہزار سالہ اسلامی تاریخ میں گزرے ہوئے لاکھوں مقلدین علما، صلحا، صوفیا، محدثین ومفسرین کو گمراہ اور جادۂ حق سے منحرف کہنے اور لکھنے میں ذرا جھجک محسوس نہیں کرتے- ہر چھوٹے بڑے کو آپ دیکھیں گے کہ وہ چند مٹھی بھر غیر مقلدین کے علاوہ تمام احناف، شوافع، اشاعرہ، ماتریدیہ اور صوفیا کو کافر مشرک اور گمراہ کہتا ہوا نظر آئے گا- تقلید سے چھٹکارہ اور آزادروی آخر کاران کو اتنی پستی میں لے جاتی ہے کہ وہ دین وایمان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں- ایک مشہور غیر مقلد عالم نے اپنا پچیس سالہ تجربہ اس طرح بیان کیا ہے: ''پچیس برس کے تجربے سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جولوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، ان میں بعض عیسائی اور بعض لا مذہب بن جاتے ہیں، جو کسی دین ومذہب کے پابند نہیں رہتے اور احکام شریعت سے فسق وخروج تو اس آزادی کا ادنیٰ نتیجہ ہے''- (محمد حسین بٹالوی: اشاعۃ السنۃ، جلد ۱۱، شمارہ ۲، ص ۵۳) یہ ہے ترک تقلید کا آخری نتیجہ- اللہ اپنی حفظ وامان میں رکھے اور ہمیں اپنے اسلاف کرام صحابہ، تابعین، مجتہدین اور اولیاء کاملین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے- (آمین)

تقلید کی مخالفت ایک سازش کا نتیجہ ہے

حضرت شاہ سید محمد اکبر مودودی چشتی

زیب سجادہ آستانہ عالیہ صمدیہ، پھپھوند شریف، ضلع اوریا

تقلید کا وجوب آیات قرآنیہ، احادیث صحیحہ، اجماع امت، اور اقوال مفسرین سے ثابت ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ''**اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم**'' اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ صراط مستقیم وہی ہے جس پر اللہ کے انعام یافتہ بندے چلیں- اس امت کے اولیا، صلحا، محدثین، مفسرین، فقہا، اور جلیل القدر علماء نے ائمہ مجتہدین کی تقلید فرمائی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہی صراط مستقیم ہے- سرکار اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا ''**لاتجتمع امتی علی الضلالۃ**'' یعنی میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی، اگر تقلید کرنا گمراہی ہوتی تو امت اسلامیہ کے یہ جلیل القدر ائمہ، علما، محدثین، مفسرین اور اولیا وصلحا ہرگز تقلید پر اتفاق واجماع نہ کرتے-

اجتہاد کا ثبوت بھی احادیث صحیحہ سے ہے، احکام شرعیہ میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا حکم وثبوت صراحتاً کتاب وسنت میں نہیں ہے، ایسے مسائل کے حل کے لئے اجتہاد ناگزیر ہو جاتا ہے، اگر ایسے مسائل میں اجتہاد سے صرف نظر کر لیا جائے تو اس قسم کے مسائل میں حلت وحرمت کا ادراک ایک امر دشوار ہے-

قرآن کریم میں مسلمانوں کے ایک گروہ کو ''تفقہ'' حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن کریم کی اس ترغیب پر لبیک کہتے ہوئے بعض اہل علم واجتہاد نے اپنی تمامتر صلاحیتیں اور قوتیں حصول تفقہ میں صرف کر دیں، جس کے نتیجہ میں انہوں نے کتاب وسنت کا گہرا مطالعہ کر کے تمام احکام شریعت کو نہ صرف یہ کہ محکم دلیلوں کے ساتھ مدون کر دیا بلکہ کتاب وسنت سے مسائل کے استخراج واستنباط کے لئے ایسے قواعد کلیہ اور محکم اصول وضع فرمادئے جن کی روشنی میں ہر نو پیدا مسئلہ کا حکم کتاب وسنت سے اخذ کیا جا سکتا ہے، اہل علم کی اسی جماعت کو ہم مجتہدین کہتے ہیں، جب ہم اس امت کے مجتہدین کی فہرست پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں بے شمار اسماز ریں حروف سے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر ان میں وہ چار مجتہدین سب

سے نمایاں ہیں جن کی اتباع وتقلید گذشتہ ایک ہزار یا اس سے زیادہ برس سے یہ امت متفقہ طور پر کرتی آرہی ہے-اس میں کوئی شک نہیں کہ در حقیقت اطاعت واتباع صرف اللہ جل جلالہ اور اس کے حبیب کریم ﷺ کی ہے، ائمہ کی تقلید صرف ان کے فہم میں کی جاتی ہے،یعنی ایک عام آدمی کے لئے یہ ایک دشوار گذار امر ہے کہ وہ مسائل شریعت کو ان کے تفصیلی ادلہ کے ساتھ کتاب وسنت سے مستنبط کرے،لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ فہم کتاب وسنت کے سلسلہ میں ان مجتہدین میں سے کسی پر اعتماد کرے-

مذاہب اربعہ اپنے اصول وقواعد اور کلیات وفروع کے ساتھ مدون ومرتب ہیں، یہ مرتبہ دیگر ائمہ کے مذاہب کو حاصل نہیں ہوا،لہذا اب تقلید انہیں چار میں منحصر ہوگئی-شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نام نامی وہ لوگ بہت استعمال کرتے ہیں جو تقلید کو حرام وشرک قرار دیتے ہیں،مگر ذرا شاہ صاحب کا یہ فرمان ملاحظہ فرمائیں:''ولما اندرست المذاهب الحقة الا هذه الاربعة كان اتباعها اتباعاً للسواد الاعظم والخروج عنها خروجاً من السواد الاعظم''-(ترجمہ)''اور جب ان مذاہب اربعہ کے علاوہ باقی بھی مذاہب کالعدم ہوگئے تو اب انہیں کا اتباع سواد اعظم کا اتباع کہلائے گا،اور ان مذاہب اربعہ سے خروج سواد اعظم سے خروج ہوگا''-

آج جب کہ اسلام کو مختلف قسم کی سازشوں کا سامنا ہے وہیں سے امت کے خلاف ایک بڑی سازش یہ بھی ہے کہ اس کو اس کے اسلاف کے طریقہ سے الگ کردیا جائے،اور یہ سازش کہیں عمل بالحدیث کے خوشنما نعروں کے ساتھ اور کہیں ترک تقلید کی دعوت کے ساتھ رچی جارہی ہے،اس سازش کی جڑیں عالم اسلام میں مضبوط کرنے کے لئے امریکی ڈالر اور سعودی ریال دونوں کی تجوریاں کھول دی گئی ہیں،ہمارے مخالف کی کوشش ہے کہ کسی طرح اس امت کو اس کے اسلاف کے نقش قدم سے منحرف کردیا جائے-ایسے نازک وقت میں اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اس سازش کے خلاف کوئی مؤثر ومستحکم اقدام کرکے احقاق حق اور ابطال باطل کا اہم فریضہ انجام دیا جائے،تاکہ امت کے ایمان وعقیدے کی حفاظت ہوسکے ،اللہ تبارک وتعالیٰ نے ماہنامہ جام نور کے مدیر اعلیٰ اور ان کے رفقاء کار کو اس اہم کام کی توفیق مرحمت فرمائی،اور ان حضرات نے وقت کے ایک اہم دینی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے یہ قابل ستائش اقدام کیا-

میں اس اقدام پر صمیم قلب سے جام نور کے ذمہ داران کو مبارک باد پیش کرتا ہوں،اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں آپ کو کامیاب فرمائے اور خالصاً لوجہ اللہ خدمت دین وسنت کی توفیق مرحمت فرمائے-(آمین)

تقلید شخصی: دین فطرت کا فطری مطالبہ

مفتی محمد میاں ثمر دہلوی

سجادہ نشین خانقاہ مظہریہ مسعودیہ،اندرون شاہی مسجد فتحپوری،دہلی

بارگاہ رب کریم میں بندوں کی نیاز مندانہ حاضری اور عبادت کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول صورت وہ ہے جو اس برتر وبے نیاز وحدہٗ لا شریک کی سب سے زیادہ پسندیدہ، سب سے زیادہ مقرب اور سب سے زیادہ مقبول ومحبوب مخلوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سکھائی ہوئی ہے، جسے نماز کہا جاتا ہے-نماز از اول تا آخر لطائف ومعارف، ذکر وعبادات اور محاسن وکمالات قرب وعبدیت کا مجموعہ ہے، بالخصوص سبع مثانی کا ہر نماز میں واجب اور لازمی قرار دیا جانا (لا صلوٰة الا بفاتحة الكتب) اور وہ بھی ایک بار نہیں بلکہ نماز کی ہر رکعت میں اس کا اعادہ، علاوہ دیگر بے شمار اسرار ورموز کے اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اس مقدس کلام کے ذریعہ بندوں کو جس نعمت کے حصول کے لیے دعا سکھائی گئی ہے، وہ ان نعمتوں میں سے نہیں ہے، جن کے حصول کے بعد طلب پوری ہوجاتی ہے، بلکہ اس دعا میں بندوں کو اس نعمت عظمیٰ کا طلب گار بنایا گیا ہے، جس کے حصول کے ساتھ ہی طلب مزید کی توفیق وترقی سے بھی سرفراز فرمایا جاتا ہے اور اس راہ پر چلانے کی التجا سکھائی گئی ہے، جس کی منزل، قرب خداوندی کا حریم قدس ہے، جو لامحدود ہے-لہٰذا طالبین کی طلب کو شرف قبول کی جن نعمتوں سے نوازا جاتا ہے وہ حسب استعداد نہ صرف ان کے احوال زندگی کو محیط ہوتی ہیں، بلکہ عطا وعنایات غیر متناہیہ سے وابستہ ہوجاتی ہیں-اس لیے حضور سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام وفادار امتیوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تمام ضرورتوں حاجتوں اور حالتوں کے تقاضوں کے لیے قیامت تک ہر دور میں کافی وحاوی یہی جامع دعا ہے: اهدنا الصراط

المستقیم الی و لاالضالین ٥ جس میں صراط مستقیم کی ایسی واضح جامع مانع تعریف فرمائی ہے، جس میں نہ اہل علم کے لیے اس کے تعین میں کسی شک وشبہ کی گنجائش اور نہ عوام کے لیے اس کے پہنچاننے میں کوئی دقت، سیدھے راستہ کی تعیین کو چلنے والوں کے روشن اور نا قابل انکار ایسے وہبی نشان اور سعادت خداداد کے ساتھ مشروط و مربوط فرمایا ہے، جسے بزور بازو اور کوشش و محنت کی بنیاد پر کوئی حاصل نہیں کر سکتا- بلکہ ہر زمانہ میں مقبول اطاعت خدا ورسول (تعالی وتقدس وصلی اللہ علیہ وسلم) سے نوازے جانے والے اہل زمانہ ہی منعم علیہم اور انعمت علیہم کے صحیح مصداق ہوتے رہیں گے- (ومن یطع الله و الرسول فاولئک مع الذین......)

قرآن حکیم نے صراط مستقیم کی اس تشریح سے ہر دور کے ان انسانوں کے زعم باطل پر کاری ضرب لگائی ہے، جو عجب اور تکبر کی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہوں اور باطل میں گرفتار ہونے کے باوجود حق پر ہونے کے دعویدار ہوں اور حقیقت میں فتنہ وفساد کے علم بردار ہوتے ہوئے خود کو مصلح گردان کر علم وفضل میں اپنے سے بدرجہا بلند و برتر شخصیات سے نہ صرف اختلاف اور کج بحثی کریں بلکہ بے جالعن طعن اور مجادلہ ومکابرہ کی جارحانہ روش اپنائیں، نوع انسانی کے آغاز ہی میں یعنی حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم خاکی میں نفخ روح فرماتے ہی، تمام ملائکہ کو حضرت آدم کے آگے سجدۂ تعظیمی کا حکم تھا، ابلیس یعنی جو اس وقت تک عزرائیل اور تمام فرشتوں میں بڑا عبادت گزار اور جلیل القدر عالم ہی نہیں بلکہ مستجاب الدعوات کی حیثیت سے معزز اور محترم تھا، سوائے حق سبحانہ تعالی کے اس کے دل کا تکبر اور خود پسندی کا خبث کوئی نہیں جانتا تھا، اللہ تعالی شانہ نے سجدے کا حکم فرما کر اسے ظاہر فرمادیا اور ابلیس نے نہ صرف یہ کہ سجدہ نہ کیا بلکہ باز پرس ہونے پر حضرت حق جل مجدہ سے کج بحثی کرتے ہوئے انتہائی بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ یہ بکواس کی کہ میں نے اسے سجدہ اس لیے نہیں کیا کہ میں اس سے بہتر ہوں اور اس کی دلیل یہ پیش کی کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا فرمایا اور آدم کو مٹی سے- ابلیس لعین نے تکبر اور خود پسندی کے گھمنڈ میں اندھا ہو کر، باطل پر ہوتے ہوئے، اپنے کو حق پر دکھانے میں اتنا بھی نہ دیکھا کہ میں کس کے حکم کی خلاف ورزی کر رہا ہوں اور کس کے سامنے احمقانہ دلیل پیش کر رہا ہوں، اس وقت راندۂ درگاہ ہونے کے بعد اور قیامت تک کی مہلت لینے کے بعد اس نے اپنی بد باطنی کا غبار نکالتے ہوئے اولاد آدم کو انتقاماً گمراہ کرنے کا اعلان اور اظہار کیا کہ میں ان سب ہی کو گمراہ کروں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جو اخلاص سے نوازے گئے ہیں- خدائے ذوالجلال نے بھی فرمادیا کہ میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں، سوائے ان گمراہوں کے جو تیری اتباع کریں- چنانچہ حضرت آدم سے حضور نبی آخر الزماں کی مدت تک ابلیس نے اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہ چھوڑی، تمام پچھلی امتوں میں تفرقہ ڈالا یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں بہتر ۷۲ فرقے ہوئے اور اس آخری امت میں ۷۳ فرقوں کی پیشین گوئی حدیث پاک میں فرمائی گئی جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں اور حضور دانائے سبل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انکشاف فرمادیا کہ میری امت کے ان تہتر فرقوں میں صرف وہ ایک فرقہ ناجی ہوگا جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہوگا، باقی ۷۲ فرقے سب ناری (جہنمی) ہوں گے- یہ حدیث تمام امت مسلمہ کے لیے بڑی عبرت خیز اور فکر انگیز ہے- بہتر فرقوں کے ہجوم میں فرقۂ ناجیہ کے امتیاز اور تشخص کا تحفظ تمام اہل ایمان کے لیے ناگزیر ہے- یہ ایسا اہم اور نازک مسئلہ ہے جس پر آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے- افسوس کہ دینی معلومات سے محرومی اور ناواقفیت اور دنیوی تعلیم کی خوش فہمی نے ۷۲ جہنمی فرقوں سے ایک جنتی فرقہ کی تمیز اور پہچان حاصل کرنے کی بجائے بہت سے لوگوں کو بڑے فخر اور برتری کے انداز میں یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ سب ایک ہیں، سب حق پر ہیں- شیعہ، سنی، قادیانی وغیر ہم سب بھائی بھائی اور سب ایک ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں- حالانکہ یہ دھوکہ اور غلط فہمی کے علاوہ کچھ نہیں اور حقیقت کے سراسر خلاف اور مذکورہ حدیث سے بغاوت ہے- اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دینی شعور اور بیداری و پاس داری عطا فرمائے- آمین-

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کو متفق اور متحد کرنے پر قادر ہے- لیکن نیکی اور بدی، حق و باطل، ایمان اور کفر کی پہچان، ایک دوسرے سے امتیاز پر موقوف ہے- ابلیس کا واقعہ بنیاد ہے حق و باطل اور ایمان وکفر کے درمیان امتیاز کے لیے اور چونکہ اس نے اپنی تلبیسی سرگرمیوں کی چھوٹ کے لیے قیامت تک کی مہلت حاصل کر لی ہے، اس لیے جادۂ مستقیم سے ہٹ جانے والے فرقوں کا اس کے ساتھ خصوصی رابطہ اور دونوں کے درمیان ہم آہنگی، امتیازی نشان ہے، خواہ کسی بھی شکل میں ہو- مگر تکبر، خود پسندی، اپنے سے برتر کو کم تر دکھانے کی ضد اور اس کی شان میں گستاخی وغیرہ یہ سب ابلیسی صفات تمام فرق ضالہ کو اس سے ورثہ میں ملی ہیں، چنانچہ فرقۂ ناجیہ اہل سنت و جماعت کے مقابل اور حریف فرقوں میں مذکورہ خصلتیں کسی نہ کسی

حد تک ضرور پائی جاتی ہیں- مثلاً ۱۲۰۹ھ میں پیدا ہونے والے فرقۂ وہابیہ کے تعارف میں محدث دیو بند مولانا حسین احمد مدنی اپنی کتاب الشہاب الثاقب میں رقم طراز ہیں: ''محمد ابن عبدالوہاب نجدی ابتدائے تیرہویں صدی میں نجد عرب سے ظاہر ہوا اور چونکہ یہ خیالات باطلہ اور عقائد فاسدہ رکھتا تھا، اس لیے اس نے اہل سنت و جماعت سے قتل وقتال کیا- اس کا عقیدہ تھا کہ جملہ اہل عالم اور مسلمانان دیار مشرک و کافر ہیں، ان سے قتل وقتال کرنا اور ان کے اموال کو ان سے چھین لینا، حلال اور جائز بلکہ واجب ہے- چنانچہ نواب صدیق حسن خاں نے خود اس کے ترجمہ میں ان دونوں باتوں کی تصریح کی ہے''- ایسے ہی فرقۂ غیر مقلد کے بارے میں شیخ علمائے دیو بند مولانا گنگوہی اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں ''جو شخص تقلید شخصی کو جو ماموروفروض من اللہ تعالیٰ ہے، شرک یا بدعت کہتا ہے وہ جاہل و گمراہ ہے'' اور جیسا کہ مذکورہ آیات قرآنیہ سے روشن ہے کہ تقلید شخصی ایک ایسی فطری دینی ضرورت ہے، جس کے بغیر اب کسی دور میں بھی امت مسلمہ کے لیے چارہ نہیں ہے- نیز مشہور غیر مقلد نواب وحید الزماں لکھتے ہیں'' ہمارے اہل حدیث بھائیوں نے ابن تیمیہ اور ابن قیم اور شوکانی اور شاہ ولی اللہ اور مولوی اسماعیل صاحب کو دین کا ٹھیکہ دار بنا رکھا ہے، جہاں کسی مسلمان نے ان بزرگوں کے خلاف کسی قول کو اختیار کیا، بس اس کے پیچھے پڑ گئے، برا بھلا کہنے لگے، بھائیو ذرا غور کرو اور انصاف کرو کہ جب تم نے ابو حنیفہ اور شافعی کی تقلید چھوڑ دی تو ابن تیمیہ اور ابن قیم اور شوکانی جو ان سے بہت متاخر ہوئے، ان کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟''- (حیات وحید الزماں ۱۰۲)

لہٰذا خوب واضح ہو گیا کہ غیر مقلدین کے لیے بھی تقلید شخصی کے بغیر چارہ نہیں ورنہ کتے کے گوشت کی حرمت کا حکم بتائیں کہ کس آیت یا حدیث میں ہے؟

تقلید ایک عظیم نعمت ہے

مولانا محمد الیاس عطار قادری رضوی

امیر سنی دعوت اسلامی، فیضان مدینہ، سبزی منڈی، سوداگران، کراچی (پاکستان)

سگِ مدینہ محمد الیاس عطار قادری رضوی عفی عنہ کی جانب سے نبیرۂ حضرت علّامہ ارشد القادری علیہ رحمۃ اللہ القوی عزیزی محبی قبلہ مولانا خوشتر نورانی صاحب زید مجدہ مدیر ماہنامہ جام نور کی خدمتِ عالی میں گنبدِ خضرا کو چومتا ہوا جھومتا ہوا مشکبار سلام ...... السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

جامِ نور کے خصوصی ایڈیشن تقلید نمبر کی اشاعت پر آپ کو اور آپ کے سارے عملے کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں- اللہ عزوجل ماہنامہ جامِ نور کو دن گیارہویں اور رات بارہویں ترقی عطا فرمائے (اٰمین بجاہِ النّبیِ الْاَمین صلّی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہٖ وسلّم)

الحمدللہ عزوجل میں مُقلّد ہوں اور مُقلّد بھی امامِ اعظم ،فقیہ افخم حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا۔ الحمدللہ اپنے حنفی ہونے پر مجھے ناز ہے اور ناز کیوں نہ ہو کہ اس میں مغفرت کی بشارت جو ہے۔ چُنانچہ درمختار وغیرہ میں ہے: حضرت سیّدُنا امام اعظم علیہ رحمۃ اللہ الاکرم نے اپنی زندگی میں 55 حج ادا فرمائے۔ آخری بار خُدّامِ حرم محترم کے تعاون سے کعبۂ مُشرّفہ کے اندر داخلہ کی سعادت ملی تو دونوں ستونوں کے درمیان کھڑے ہو کر نماز میں مکمّل قراٰنِ پاک ختم کیا اور دیر تک مُناجات اور گریہ وزاری میں مشغول رہے۔ بیت اللہ کے ایک گوشہ سے ہاتِفِ غیبی نے آواز دی! اے ابو حنیفہ! تُو نے حُسنِ معرفت کے ساتھ ہمیں پہچانا اور ہمارے دین کی خوب خدمت کی، قَدْ غَفَرْنَا لَکَ وَلِمَنِ اتَّبَعَکَ مِمَّنْ کَانَ عَلٰی مَذْھَبِکَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ یعنی ہم نے تیری اور تاقیامت ہونے والے تیرے پیروکاروں کی مغفرت کر دی ہے۔ (الدرالمختار ج۱ص ۱۲۶، ۱۲۷ ملخصا دار المعرفۃ بیروت) اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی اُن پر رَحمت ہو اور ان کے صَدقے ہماری مغفِرت ہو۔

حنفی ہونے کے ناطے میں نے اپنے امامِ اعظم علیہ رحمۃ اللہ الاکرم کی توصیف بیان کی، البتہ مذاہبِ اربعہ برحق ہیں اور ان ہر چہار مذاہب کے سب پیروکار نجات کے حقدار- میرے آقا اعلیٰ حضرت، اِمامِ اَہلِ سنت، ولیِ نعمت، عظیم البرکت، عظیم المرتبت، پروانۂ شمعِ رِسالت، مُجدّدِ دین ومِلّت، حامیِ سنّت، ماحیِ بدعت، عالِمِ شَرِیعت، پیرِ طریقت، باعثِ خَیر وبَرَکت، آفتابِ حنفیت، حضرتِ علّامہ مولٰینا مفتی الحاج الحافظ القاری الشّاہ امام اَحمد رضا خان علیہ رحمۃُ الرَّحمٰن فتاویٰ افریقہ صفحہ 59 پر ایک استفتاء کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں: ''چاروں مذہب والے حقیقی عینی بھائی ہیں، ان کی ماں شریعتِ مطہرہ اور ان کا باپ اسلام- طحطاوی علی الدرالمختار میں ہے: نجات پانے والا گروہ چار مذہب حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی میں جمع ہے اب جو ان چاروں سے خارج ہے وہ بدعتی جہنمی ہے''- (فتاویٰ افریقہ ص 59 نوری کتب خانہ مرکز الاولیاء لاہور) اللہُ رَبُّ

العزت عزّ وجلّ ہمیں ایسی باغیانہ عقل سے پناہ عنایت فرمائے کہ جو تقلید جیسی باعظمت نعمت کے ضیاع کا باعث بن کر جنت سے محروم کردے۔

تقلید مخالفین تقلید کی بھی مجبوری ہے

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی
بڑا گاؤں، کریم الدین پور، گھوسی، ضلع مئو (یوپی)

اسلام کا بنیادی ضابطہ اور مطالبہ تو دراصل اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت و فرماں برداری ہے۔لیکن قرآن و سنت میں چونکہ سارے احکام واضح اور صریح نہیں ہیں، ان میں کہیں اجمال کہیں ابہام اور کہیں بہ ظاہر تعارض ہے۔ایسی صورت میں قرآن و حدیث سے احکام و مسائل کا استنباط و استخراج بے حد دشوار ہے۔اس لیے قرین عقل اور اسلم و صائب طریقہ یہی ہے کہ ہم اپنے ناقص علم اور کوتاہ عقل وفہم سے کام لے کر از خود کوئی فیصلہ نہ کریں، بلکہ یہ دیکھیں کہ قرآن و سنت کے ان ارشادات سے ہمارے جلیل القدر علماے اسلاف نے کیا سمجھا ہے۔قرون اولیٰ کے جن بزرگوں نے اپنی ساری عمریں صرف کر کے مسائل کا استنباط کیا ہے اور جو علوم قرآن و حدیث کے زبردست ماہر تھے اور فضل و کمال زہد و ورع، ذکاوت و حافظہ، دین و دیانت اور فکر و فراست میں درجۂ کمال پر فائز تھے اور دور صحابہ و تابعین سے قرب زمانی کے باعث قرآن و سنت کی مراد کو بہتر سمجھتے تھے، ان پر اعتماد کرتے ہوئے، مسائل جزئیہ اجتہادیہ میں ان کے احکام کا اتباع اور تقلید کریں۔

درحقیقت تقلید ائمہ مجتہدین کا اصل مقصد دین کی حفاظت اور قرآن و حدیث پر بآسانی عمل کرنا ہے۔تقلید ائمہ اربعہ درحقیقت عمل بالقرآن و السنۃ ہی ہے۔دور رسالت میں دوسری صدی کے اواخر تک تقلید شخصی اور غیر شخصی دونوں کا رواج ہو چکا تھا اور پھر چوتھی صدی کے آخر میں تمام مسلمانوں میں تقلید شخصی پر اتفاق و اجماع ہو گیا اور آج تک اس کا رواج امت محمدیہ میں بدستور چلا آرہا ہے اور اس سنت قدیمہ متوارثہ سے انکار، اجماع امت اور سواد اعظم سے انحراف اور تقلید کو شرک و بدعت قرار دینا، غیر مقلدوں کی ضد، ہٹ دھرمی، حقائق سے چشم پوشی اور صریح گمراہی ہے۔

جب ائمہ اربعہ یعنی امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی فقہ کتابی شکل میں مدون ہو کر تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئی، تقلید شخصی کے سلسلہ میں کوئی بھی اختلاف نہ رہا، بلکہ اس کے خلاف کرنے کو سواد اعظم سے انحراف کے مترادف سمجھا جانے لگا۔جو سخت ترین گناہ ہے۔اس لیے کہ بہ فرمان رسول گرامی **اتبعوا السواد الاعظم فانه من شذ شذ فی النار**۔

حق تعالیٰ نے خیر القرون میں بے شمار صحابہ کرام تابعین و تبع تابعین و من بعدہم کو اس دولت اجتہادیہ سے نوازا اور خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کرتے وقت صاف اور واضح لفظوں میں اجتہاد کی تحسین و تصویب فرمائی، حدیث پاک کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا تو یہ پوچھا کہ اگر کوئی قضیہ پیش آجائے تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا، فرمایا اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ملے ہو؟ عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔آپ نے فرمایا کہ اگر اس میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا اس وقت اجتہاد و استنباط کر کے اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا اور تلاش میں کوئی کسر اور کمی نہ کروں گا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر (فرط مسرت سے) اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی، جس پر اللہ کا رسول راضی اور خوش ہے۔

اس حدیث پاک سے بہت ہی واضح انداز میں اجتہاد و تقلید کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کے لیے اپنے فقہاے صحابہ میں سے صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا اور انہیں حاکم و قاضی اور معلم و مجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم فرمادیا کہ وہ ان کی اطاعت و تابعداری کریں، انہیں صرف قرآن و سنت ہی نہیں بلکہ قیاس و اجتہاد کے مطابق بھی فتویٰ صادر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔اس کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ آپ نے اہل یمن کو ان کی تقلید شخصی کی، نہ صرف اجازت دی بلکہ اس کو لازم بھی قرار دے دیا۔

غور فرمایئے کہ جب ہر علم وفن میں ان علوم وفنون کے ماہرین کی آراء پر اعتناء کیا جاتا ہے، خواہ وہ علوم وفنون، دینی وشرعی ہوں یا دنیاوی تو کوئی وجہ نہیں کہ مسائل شرعیہ میں، ہم ماہرین علوم شرعیہ کے احکام کو قابل عمل اور لائق اعتناء نہ سمجھیں اور ہم اپنے خام ذہن وفکر اور ناقص علم وفہم کی بنیاد پر براہ راست قرآن وحدیث سے استخراج مسائل کا دعویٰ کریں، وہ بھی حرص وہوس، نفس پرستی اور انحطاط عملی کے اس پرآشوب وپرفتن دور میں- کیا غیر مقلدوں کے گروہ کا ہر عامی وعالم براہ راست قرآن وحدیث سے مسائل کے استنباط کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہے؟

آخر کوئی بھی غیر مقلد دینی وشرعی مسائل اپنے علما اور مفتیوں سے ہی تو دریافت کر کے ان پر عمل کرتا ہے، یا جاہل مطلق ہوتے ہوئے بھی خود ہی براہ راست قرآن وسنت سے مسائل معلوم کر کے ان پر عمل کرتا ہے- ظاہر ہے ایسا نہیں ہے تو پھر کوئی غیر مقلد انصاف ودیانت کے ساتھ یہ بتائے کہ وہ جس عالم ومفتی کے بتائے ہوئے فتویٰ پر عمل کرتا ہے، تو کیا وہ اس مفتی اور عالم کو مطاع حقیقی سمجھ کر ایسا کرتا ہے، یا ان کو شارح شریعت سمجھ کر، کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ اس مفتی اور عالم کے حکم اور فتویٰ کو حکم شرع ہی سمجھ کر عمل کرتا ہے، اس مفتی اور عالم کے حکم وفتویٰ کو خود ساختہ ذاتی حکم سمجھ کر نہیں عمل کرتا تو پھر تقلید شخصی سے انحراف وگریز اور اسے شرک وبدعت قرار دینے کے باوجود اسی روش کو اختیار کرنا، کہاں کی دانش مندی ہے- یہ سوائے خود فریبی، نافہمی اور قہر درویش برجان درویش کے اور کیا ہے؟ **اطیعو الله واطیعو الرسول و اولی الامر منکم** کے علاوہ صلاح وفلاح اور حزم واحتیاط کی کوئی دوسری سبیل ممکن ہی نہیں، اس لیے **فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون**

نئے دور کے جدید مسائل اہل علم کو دعوت فکر وتحقیق دے رہے ہیں

مولانا سید شاہ محمد اشتیاق عالم شہبازی
سجادہ نشین خانقاہ عالیہ شہبازیہ، مولانا چک، بھاگلپور (بہار)

یاد ان نے کیا ہے مجھ کو بھی　　　بندہ مسکین کیا شمار میں ہے

ماہنامہ جام نور نوع بہ نوع خصوصیت کے اعتبار سے ترقی کے مختلف مدارج اور مقبولیت عامہ کے مراحل سے گزر رہا ہے- حالات کے تقاضوں کو قریب سے دیکھنا اور اسی اعتبار سے اپنے آپ کو سجانا اور سنوارنا اس کی خصوصیت بن چکی ہے- اکثر ضروری اور کبھی غیر ضروری مباحث وآراء سے اس کے اوراق بھرے پڑے نظر آتے ہیں- عزیزم آپکی جہد پیہم لائق تحسین ہے-

جام نور کا یہ شمارہ اجتہاد وتقلید نمبر ہے، اس کی خبر آپ کے مرسلہ مکتوب سے معلوم ہوئی اور اس کی اہمیت آپ کے پچھلے ماہ کے اداریہ سے واضح ہوگئی- میں بذات خود مذکورہ عنوان کے تعلق سے آپ کے موقف کے ساتھ ہوں اور اس سچائی سے کسی اہل فکر ونظر کو انکار نہیں ہونا چاہیے کہ دور حاضر میں سلفیت کے نام پر غیر مقلدیت کا فتنہ ہمارے اردگرد بھی اپنی منصوبہ بند حکمت عملی کی بدولت پاؤں پسار رہا ہے اور ہماری نئی نسلیں اس دام ہمرنگ زمین کا شکار ہوتی چلی جارہی ہیں- میں خود اس موضوع پر ایک رسالہ لکھنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا مگر مختلف موضوعات پر پے در پے میری کتابیں شائع ہوتی رہیں اور یہ موضوع اب تک تشنہ تحریر رہا-

اجتہاد وتقلید کے عنوان سے بحث وتمحیص دور جدید کی دریافت نہیں، اسلاف نے انتہائی شد ومد کے ساتھ کتاب وسنت، اجماع وقیاس کے وسیلے سے اس پر ہزاروں ہزار دلائل اپنی تصانیف کثیرہ میں جمع کر دیے ہیں اور سیکڑوں مباحثے اور مناظرے ہو چکے ہیں مگر افسوس یہ کہ عربی وفارسی زبان تو کجا ہماری نئی نسل اردو زبان سے بھی نا آشنائی کی حد تک دور ہوتی چلی جارہی ہے- اسلاف کے وہ علمی ذخیرے یا تو کتب خانوں میں بند ہیں یا معدودے چند علما ومحققین کے سینوں اور ان کی آنکھوں میں محفوظ ہیں، آپ نے ہم لوگوں کی گوں ناگوں مصروفیات کے پیش نظر مبسوط مقالہ لکھنے کی فرمائش سے آزاد کر دیا ہے، آپ کی اس نوازش پہ سو جان سے قربان- مزید کرم افزائی یہ کہ ہماری حقیر رائے کو وقیع رائے کا تمغہ عنایت فرما کر زیادہ سے زیادہ فل اسکیپ سائز کے ایک صفحہ پر محدود کر دیا ہے اور وہی آپ کا مطلوب ہے- اب میں کہوں تو کیا کہوں اور لکھوں تو کیا لکھوں، بہر کیف! آپ کے پاس ''لکھ پتی'' حضرات کافی ہیں، جو مشرق ومغرب، شمال وجنوب میں اہل قلم میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کی ایک پہچان ہے، ان کے قیمتی مضامین رسالہ کی زینت بنیں گے ہی- اس کا مطالعہ ہماری نئی نسل کو مختلف جہتوں سے اجتہاد وتقلید کی اہمیت اور امت کے اجماعی موقف سے آشنا کرے گا- عصر حاضر کا موجودہ منظرنامہ

سیاسی، معاشی، تمدنی حالات اور سائنسی ایجادات وانکشافات کے تناظر میں روز بروز نت نئے مسائل سے بھرتا چلا جارہا ہے- بعض غیر ضروری مسائل ہیں تو بہت سارے ضروری مسائل بھی ساتھ ساتھ ہیں اور وہ لحہ بہ لحہ محققین کو دعوت غور وفکر دے رہے ہیں- آوارگیٔ قلم سے محفوظ رہتے ہوئے اور فقہ اسلامی کے اصول ومبادی کی اہمیت، افادیت اور موزونیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حل طلب بھی ہیں اور عقدہ کشا بھی-

جی تو یہی چاہ رہا ہے کہ آپ کے دیے گئے عنوان پر جی کھول کر گفتگو کی جائے لیکن ایک طرف زیادہ سے زیادہ ''فل اسکیپ سائز'' کے ایک صفحہ کی شرط اور دوسری جانب اپنی علالت، جو Paralysis کی صورت میں اچانک دو ماہ قبل سامنے آئی (اور بحمد اللہ روبہ صحت ہونے کا سفر تیزی سے جاری ہے) تفصیلی گفتگو کی راہ میں حائل ہے- میری بہت ساری دعائیں اور نیک خواہشات آپ کے اور آپ کے رسالہ کے ساتھ ہیں- مولائے قدیر اسے ہدایت کا ذریعہ اور قبولیت عامہ کا سبب بنائے...... آمین

غیر مقلدین کے پاس آخر جدید مسائل کے حل کی صورت کیا ہے؟

مفتی عبد المنان کلیمی
مفتی شہر مراد آباد، وصدر مجلس علمائے ہند، مراد آباد

امت مسلمہ کا اجماعی موقف ''ائمہ مجتہدین کی تقلید'' صرف جائز و مستحسن ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے، وہ بھی آج کے سائنسی ایجادات و انکشافات کے ترقی پذیر دور میں جہاں ائمہ مجتہدین کی تقلید اور ان کے فقہی واجتہادی کارناموں سے استفادہ کرنا اور ان کی گراں قدر رایوں سے اتفاق کرتے ہوئے، ان کی تقلید وپیروی کرنا، اس قدر ضروری ہوگیا ہے کہ اس سے مجال انکار کی قطعاً گنجائش نہیں ہے-

غیر مقلدین کا یہ سمجھنا اور کہنا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید شرک وبدعت ہے یہ ان کی کھلی، جہالت اور اصول شرع قرآن وحدیث اور اجماع صحابہ کے آفاقی اور ہمہ گیر مدلول ومنطوق سے ناواقفیت کی بین دلیل ہے-

منکرین تقلید جو اپنے آپ کو سلفی اور اہل حدیث کہتے ہیں ان کے پاس اس سوال کا کیا جواب ہے کہ ان میں جو لوگ عربی داں اور علوم قرآن و حدیث سے واقف ہیں، وہ بزعم خویش قرآن وحدیث پر عمل پیرا ہیں- لیکن ان کے متبعین جو بالکل قرآن وحدیث کے علم سے نابلد ہیں یا ان کے پاس اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ قرآن وحدیث سے مسائل جان سکیں تو آخر وہ کیا کریں گے؟ ایسے لوگ قرآن وحدیث کے مقلد کہلائیں گے یا ان غیر مقلد علما کے پیروکار سمجھے جائیں گے؟

علاوہ ازیں غیر مقلدین علما یہ بتا سکتے ہیں کہ حضور اقدس تاجدار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ اتنی اور اتنی ہیں اور ہمیں ان تمام حدیثوں کا علم بین وجامع حاصل ہے- اس تعلق سے اگر وہ کچھ بھی موشگافی کی جرأت کرتے ہیں تو اس میں بھی سابقین علمائے حدیث کی تقلید واتباع کی واضح جھلک موجود ہوگی-

یہی وہ دور رس نکات ہیں جس بنا پر علمائے متبحرین نے یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ ضلالت وگمراہی اور فکری کج روی سے محفوظ رہنے کا اب صرف یہی ایک راستہ ہے کہ امت مسلمہ چار فقہائے مجتہدین پر اعتماد وبھروسہ کر کے ان کی تقلید کو ضروری سمجھے اور ان کے فقہی اجتہادات پر عمل پیرا ہو کر سعادت اخروی حاصل کرے- کیونکہ ان ائمہ مجتہدین کی تقلید فی الحقیقت قرآن وحدیث اور اجماع صحابہ کی پیروی سمجھی جائے گی-

مجھے حیرت ہے اس ترقی یافتہ دور کے غیر مقلدین پر جو یکسر تقلید واجتہاد کا انکار کر دیتے ہیں اور ان سب علمی، فقہی اور اجتہادی کارناموں کو ضلالت وگمراہی کا نام دیتے ہیں- کیا یہ غیر مقلدین بتا سکتے ہیں کہ آج کے بہت سارے جدید مسائل جن کا واضح ذکر قرآن وحدیث اور اجماع صحابہ میں نہیں اور امت مسلمہ ان مسائل سے دوچار ہے، آخر ان مسائل کے حل اور تصفیہ کا ان کے نزدیک کیا طریقہ ہے؟ تو لامحالہ کسی نہ کسی اسٹیج پر ان غیر مقلدین علما کو اجتہاد وتقلید ہی کا سہارا لینا پڑے گا-

اسی وجہ سے شیخی واستاذی، شمس العلما والفقہا حضرت علامہ قاضی شمس الدین قدس سرہ العزیز درس حدیث کے وقت اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''دیگر فرق باطلہ کے مقابلہ میں غیر مقلدین (نام نہاد اہل حدیث) سے بحث ومناظرہ کرنا نہایت آسان ہے''- اور حضرت شمس العلماء اس کی

بہت ساری تمثیلیں دیا کرتے تھے جس کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہ غیر مقلدین اپنے دعوی باطلہ میں کہاں تک حق بجانب ہیں وہ سیدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتاب مستطاب ''الفضل الموہبی'' کا غیر جانب دارانہ وحقیقت پسندانہ مطالعہ فرمائیں یقیناً وہ اپنے نظریات وافکار سے یکسر رجوع پر مجبور ہوں گے اور قبول حق کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

خصوصی شمارے کے موضوعات اقتضائے حال کے مطابق ہوتے ہیں

ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی

پرنسپل کوٹھی، طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی

محترم خوشتر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ...... مؤقر جام نور کی خصوصی پیش کش ''تقلید واجتہاد نمبر'' کی اشاعت پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے، آپ خصوصی شماروں کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں وہ اقتضائے حال کے مطابق ہوتے ہیں، ہمارا المیہ یہ ہے کہ ان موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے لیے جس کھلے ذہن کی ضرورت ہے، اس کا نشان اہل قلم کی نجی مجلسوں میں تو ملتا ہے، کاغذ وقرطاس تک آتے آتے اس کا رنگ پھیکا ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی ہیئت بھی بدل جاتی ہے۔ جام نور کا ایک خصوصی شمارہ ''جہاد نمبر'' بھی شائع ہو چکا ہے، جس کی ملک وبیرون ملک میں خوب تعریف وتوصیف ہوئی ہے، یقیناً اس سے آپ بہت زیادہ خوش نہیں ہوئے ہوں گے، کیونکہ تعریف وتوصیف جیسے الفاظ کی مارکیٹ ویلیو ہی کم ہوگئی ہے، اہل قلم نے جہاد کے تعلق سے جتنا زور قلم صرف کیا ہے، اس سے زیادہ مواد بہ مجبوری حالات ان کے بطون دماغ میں محبوس ہو کر رہ گئے ہیں، جس جہاد کے تعلق سے اسلام کی شخصیات مجاہد کے نام سے معروف ہیں، اس جہاد پر کھل کر گفتگو کرنے سے اکثر اہل علم نے غض بصر کیا ہے۔

اب آپ نے ''تقلید واجتہاد نمبر'' کا اعلان کر کے نہایت پرخطر وادی میں قدم رکھ دیا ہے، قیاس واجتہاد کی اہمیت وضرورت پر اہل فکر ونظر کے مضامین کا مجھے بے صبری سے انتظار رہے گا۔ ☆☆☆

باب ۳

اصحاب اجتہاد

مولانا نفیس احمد مصباحی ــــــــــ امام اعظم ابوحنیفہ کا علمی مقام اور اجتہادی خدمات

مولانا ذکی اللہ مصباحی ــــــــــ امام مالک کی علمی واجتہادی خدمات

ڈاکٹر عبدالحکیم ازہری ــــــــــ امام شافعی کی علمی واجتہادی خدمات

مولانا انوار احمد بغدادی ــــــــــ امام احمد بن حنبل کی علمی واجتہادی خدمات

مولانا نفیس احمد مصباحی☆

امام اعظم ابو حنیفہ کا علمی مقام اور اجتہادی خدمات

مقررہ عنوان پر گفتگو سے پہلے میں جام نور کے چیف ایڈیٹر ادیب شہیر محترم مولانا خوشتر نورانی زیدحبہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ماہ نامہ جام نور کے ''اجتہاد وتقلید نمبر'' میں قلمی شرکت کے لیے مجھ ناچیز کو دعوت دی اور میرے لیے مذکور بالا عنوان کا انتخاب فرما کر سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع عنایت کیا۔

سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے علمی مقام اور گونا گوں دینی و علمی خدمات کو اجاگر کرنا اور اقوام عالم کے سامنے رکھنا ہم حنفیوں کی مذہبی اور اخلاقی ذمہ داری ہے اور وقت کا تقاضا بھی۔ کیوں کہ ''اسلاف بے زار مٹھی بھر جماعت'' نے ائمہ مجتہدین خصوصا امام اعظم رضی اللہ عنہ کے تعلق سے بے سروپا باتیں وضع کر لی ہیں، اور انہیں بنیاد بنا کر شب وروز اس پروپگنڈہ میں مصروف ہے کہ مذہب حنفی کتاب وسنت کے خلاف صرف قیاس اور رائے کی کمزور اور غیر اسلامی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس مٹھی بھر جماعت کے افراد بخاری و مسلم کی چند حدیثیں رٹ کر ''رٹو طوطے'' کی طرح ہر جگہ موقع بے موقع انہیں کو دہراتے ہیں اور ''اہل حدیث'' ہونے کا دم بھرتے ہیں، اور امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر ''مجتہد مطلق'' اور عظیم الشان تابعی امام کی تقلید کو شرک، بدعت اور نہ جانے کیا کیا ٹھہراتے ہیں، جب کہ حضرت امام کے صدیوں بعد پیدا ہونے والے افراد مثلا ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن عبد الوہاب نجدی، میاں نذیر حسین دہلوی، نواب صدیق حسن خاں قنوجی، عبد الرحمٰن مبارکپوری، ناصر الدین البانی اور عبد اللہ بن باز کی باتیں آنکھ بند کر کے بے چون وچرا مانتے اور ان پر عمل کرتے ہیں اور ہم مقلدوں سے کہیں آگے بڑھ کر ''کورانہ تقلید'' کا عملی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ہر ہوش مند انسان یہ جانتا ہے کہ ہم (احناف) اس باعظمت امام کی تقلید کرتے ہیں جن کے زمانے سے عہد رسالت کا فاصلہ ایک صدی سے بھی کم ہے، جن کی دینی اور علمی عظمتوں کا ایک جہان معترف ہے، جن کی علمی رفعتوں کی بشارت اور پیشین گوئی خود حدیث نبوی میں موجود ہے اور جنھوں نے فقہ کے اصول اور فروع کی تدوین فرما کر بعد میں آنے والے علما اور فقہا اور پوری امت مسلمہ پر زبردست احسان فرمایا ہے۔ جب کہ یہ اسلاف بے زار لوگ، ان لوگوں کے مقلد ہیں جن کے زمانے اور عہد رسالت کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے اور سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں جن کی کوئی دینی و علمی حیثیت نہیں۔

اس عنوان کے دو بنیادی جز ہیں (۱) حضرت امام اعظم کا علمی مقام (۲) آپ کی اجتہادی خدمات۔

اب میں حضرت امام کی بارگاہ میں اس امید کے ساتھ محبتوں کی سوغات لیے حاضر ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس نیک اور مقبول بندے کے فیوض و برکات سے مجھ حقیر کو بھی بہرہ ور فرمائے گا اور میرے لیے دنیا و آخرت کی سعادتوں اور فیروزمندیوں کا سامان کرے گا۔

احب الصالحین و لست منھم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا

(میں تو خود نیک نہیں، (مگر) نیکوں سے اس امید پر محبت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ (ان کی برکت سے) مجھے بھی نیک بنا دے۔

نام اور نسب: -آپ کا اسم گرامی ''نعمان''، کنیت ''ابو حنیفہ''، اور آپ کے والد کا نام ثابت ہے۔ آپ کا خاندان ابتداء کابل میں آباد تھا، آپ کے دادا جن کا نام بعض تذکرہ نگاروں نے زُوطی اور بعض نے زَوطی لکھا ہے۔ جنگ میں گرفتار ہو کر کوفہ آئے اور مسلمان ہو کر یہیں بنی تیم اللہ کی ولاء میں رہ پڑے ان کا پیشہ تجارت تھا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ان کی ملاقات ہوئی اور اس حد تک تعلقات تھے کہ وہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں ہدیے بھیجتے رہتے تھے (مناقب الامام الاعظم للکردری، ج ا ص ۶۵، ۶۶)

ان کے بیٹے ''ثابت'' بھی کوفہ میں تجارت کرتے تھے۔ خود سیدنا امام اعظم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ میں ان کے والد کی روٹیوں

☆Jamia Ashrafia,Mubarak pur, Azam Garh, U.P

کی ایک دوکان تھی (مناقب الامام الاعظم للموفق بن احمد ج ۱ رص ۱۶۲)۔

ولادت ووفات:- امام اعظم رضی اللہ تعالی عنہ کے سن ولادت کے بارے میں مختلف اقوال ہیں (۱) ۶۱ ھ میں (۲) ۷۰رھ میں (۳) ۷۷رھ میں (۴) ۸۰رھ میں۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں مزاحم بن داؤد کی روایت سے ۶۱رھ اور ابونعیم کی روایت سے ۸۰رھ سن ولادت لکھا ہے۔
(تاریخ خطیب، ج ۱۳ رص ۳۳۰)

ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں مذکورہ بالا دونوں اقوال کو نقل کر کے ۸۰رھ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔(وفیات الاعیان، ج ۵رص ۳۱۳ر۳۱۴) جب کہ میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ آپ کی ولادت ۷۷رھ میں ہوئی۔اس کی دلیل یہ ہے کہ قاضی ابوعبداللہ حسین بن علی یمری (متوفی ۴۳۶ھ) نے بہ سند متصل احمد بن الصلت سے (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ، ص ۴)، اور امام ابن عبدالبر نے بہ سند متصل ابوجعفر محمد بن عمرو، اور عبداللہ بن جعفر رازی، اور محمد بن سماعہ سے، امام اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان کے سب سے عظیم شاگرد امام ابویوسف کی یہ روایت نقل کی ہے:

''میں نے ابوحنیفہ (رضی اللہ عنہ) سے سنا کہ میں ۹۳رھ میں اپنے والد کے ساتھ حج کو گیا، اس وقت میری عمر سولہ سال تھی۔ میں نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جس کے پاس لوگوں کا زبردست ہجوم تھا۔ میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ یہ بوڑھے بزرگ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، ان کا نام عبداللہ بن حارث بن جزء ہے۔ پھر میں نے دریافت کیا: ان کے پاس کیا ہے؟ تو والد صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس وہ حدیثیں ہیں جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ مجھے ان کی بارگاہ میں لے چلیں تاکہ میں بھی ان سے حدیث سن لوں - یہ سننے کے بعد والد صاحب آگے بڑھے، اور لوگوں کی بھیڑ چیرتے ہوئے چلے، اس طرح میں ان کے قریب پہنچ گیا اور میں نے ان سے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے۔

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم: من تفقه في دين الله كفاه الله وهمه و رزقه من حيث لا يحتسبه۔

''اللہ کے رسول صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے دین کی بصیرت (سمجھ) حاصل کر لی اللہ تعالی اس کا اور اس کی فکروں کا نگہبان ہو جاتا ہے اور اسے اس طرح روزی دیتا ہے جو اس کے شان وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔''

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ۹۳رھ میں امام اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان کی عمر سولہ سال تھی جس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپکی ولادت ۷۷رھ میں ہوئی۔

ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں آپ کی وفات کے بارے میں اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کی وفات رجب کے مہینہ میں ہوئی، اور کہا گیا ہے کہ شعبان کے مہینہ میں ہوئی۔اور سالِ وفات ۱۵۰رھ ہے، اور کہا گیا ہے کہ جمادی الاولی کی گیارہ تاریخ تھی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ سن وفات ۱۵۳رھ ہے لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔(وفیات الاعیان، ج ۵رص ۳۱۳، ۳۱۴)

اس طرح وفات کے وقت آپ کی عمر تراسی ۸۳رسال تھی، کیوں کہ آپ کی ولادت ۷۷رھ اور وفات ۱۵۰رھ ہے۔

تحصیل علم:۔تعلیم کے متعلق ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ ابتدا میں انہوں نے قراءت، حدیث، نحو، ادب، شعر اور کلام وغیرہ ان تمام علوم کا مطالعہ کیا تھا جو اس زمانے میں رائج اور متداول تھے۔(مناقب الامام الاعظم للموفق بن احمد المکی ج ۱رص ۵۷، ۵۸) اس کے بعد آپ نے علم کلام میں مہارت پیدا کی اور ایک مدت تک اس میں مصروف رہ کر اتنا کمال پیدا کر لیا کہ اس فن میں ان کی طرف نگاہیں اٹھنے لگیں۔ان کے مشہور شاگرد زفر بن ہذیل رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ امام اعظم نے ان سے کہا:''پہلے میں علم کلام سے دل چسپی رکھتا تھا اور اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ میری طرف اشارے کیے جاتے تھے۔''(مصدر سابق، ص ۵۹)

موفق بن احمد مکی نے یحیٰ بن شیبان کے حوالے سے حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے:''میں ایک ایسا شخص تھا جسے علم کلام کی بحثوں میں مہارت حاصل تھی۔ایک زمانہ ایسا گزرا کہ میں ان ہی بحثوں اور مناظروں میں مشغول رہتا تھا اور چوں کہ مباحثے اور مناظرے کرنے والے لوگ زیادہ تر بصرہ میں تھے اس لیے میں بیس سے زیادہ مرتبہ بصرہ گیا۔کبھی کبھی سال چھ مہینے بھی وہاں رہ کر خوارج کے مختلف گروہوں اباضیہ، صفریہ، اور حشویہ سے مناظرے کرتا رہا۔ میں علم کلام کو سب سے اعلی علم سمجھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ یہی اصل دین ہے۔۔ایک مدت کے بعد دل میں یہ خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین سے یہ باتیں پوشیدہ نہیں تھیں جن میں ہم مباحثے کرتے ہیں۔ وہ حضرات ان باتوں کو جانتے ہوئے ان کی طرف راغب نہیں ہوئے، بلکہ ان باتوں سے منع ہی کیا اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ حضرات دین کے مسائل اور ابواب فقہ میں غور وخوض کرتے تھے اسی میں ان کی گفتگو ہوتی تھی، اور اسی میں ان کی مجلسیں ہوا کرتا تھیں، اور وہ اسی کی تعلیم وتربیت دیا کرتے تھے، اسی میں ان کے مناظرے ہوا کرتے تھے۔ اور اسی حالت میں صحابہ کا دور ختم ہوا، اور ان ہی کی پیروی تابعین نے کی ہے۔

جب ہم پر یہ بات عیاں ہوگئی تو ہم نے مناظرے چھوڑ دیے اور علم کلام میں غور وخوض کرنا چھوڑ دیا، سلف صالحین کا طریقہ اختیار کیا اور اصحاب معرفت کی صحبت میں بیٹھے۔ (مصدر سابق، ۵۹)

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ امام اعظم رضی اللہ عنہ نے ابتدا میں علم کلام میں کمال پیدا کیا اور اس علم کے ارباب اختصاص اور اصحاب کمال میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ آپ نے اس وقت فلسفہ ومنطق اور مذاہب کے اختلافات کے متعلق بھی کافی واقفیت حاصل کر لی تھی، کیوں کہ ان علوم پر دسترس حاصل کیے بغیر کوئی انسان علم کلام میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ بعد میں انھوں نے فقہ کی تدوین اور قرآن وحدیث سے شرعی احکام کے استنباط اور مسائل کے استخراج میں منطقی استدلال اور عقلیات کے استعمال کا جو کمال دکھایا اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں جو شہرت حاصل کی وہ اسی ابتدائی ذہنی وفکری تربیت کا نتیجہ تھی۔

ایک مدت تک علم کلام میں مشغول رہنے کے بعد آپ نے اس سے رخ موڑا اور علم فقہ (قانون اسلام) کی تدوین اور قرآن وحدیث کی طرف متوجہ ہوئے اس کے تعلق سے درج ذیل دو روایتیں بھی ملتی ہیں:

(۱) امام اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان کے جلیل القدر شاگرد امام زفر بن ہذیل علیہ الرحمہ حضرت امام اعظم سے ان کا بیان نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"علم کلام میں میری شہرت اتنی بڑھ گئی کہ میری طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جانے لگا۔ میری مجلس حضرت حماد کے حلقۂ درس کے پاس ہی تھی۔ ایک دن ایک عورت نے آکر مجھ سے سوال کیا کہ ایک شخص کی بیوی ایک باندی ہے، وہ شخص چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کو صحیح طریقہ سے طلاق دے، وہ کتنی طلاقیں دے؟ میں نے اس خاتون سے کہا تم جا کر حماد سے پوچھو، پھر وہ جو جواب دیں مجھے باخبر کرو۔ عورت حماد کے پاس گئی، پھر یہ جواب لائی کہ جب عورت حیض سے پاک ہو جائے خاوند اس سے ہم بستری نہ کرے، اور اس کو ایک طلاق دے دے اور بیوی سے الگ رہے۔ جب عورت کو دوسری مرتبہ حیض آجائے اور وہ اس سے پاک ہو جائے تو پھر بھی شوہر اس سے الگ رہے، ہم بستری نہ کرے اور دوسری طلاق دے دے اور عورت سے علاحدہ رہے پھر جب اس کو تیسرا حیض آجائے اور اس سے پاک ہو جائے وہ اپنے شوہر کے نکاح سے نکل گئی۔ اب اس کو اختیار ہے جس سے چاہے نکاح کرے۔ عورت سے یہ جواب سن کر میں نے اپنی جوتیاں اٹھائیں اور حضرت حماد کے حلقۂ درس میں جا کر بیٹھ گیا۔ پھر جو کچھ ان سے سنتا یاد کر لیتا۔ حضرت حماد کا معمول تھا کہ وہ دوسرے دن اپنے شاگردوں سے پڑھے ہوئے اسباق کے متعلق سوال کرتے تھے۔ ان کے شاگرد جواب میں غلطیاں کرتے تھے، لیکن مجھے بالکل صحیح صحیح یاد ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا حضرت حماد نے مجھ کو اپنے قریب بیٹھنے کی جگہ عنایت فرمائی۔"

(تاریخ بغداد للخطیب، ج:۱۳ رص:۳۳۳، مناقب الامام الاعظم للموفق المکی، ج:۱ رص:۵۵)

حضرت امام ابو یوسف کا بیان ہے کہ امام اعظم (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا گیا کہ آپ کو علم فقہ کی طرف کس طرح رغبت ہوئی؟ تو فرمایا: "میں نے جب علم میں رسوخ حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو تمام علوم پر نظر ڈالی۔ علم کلام اور عقائد کے متعلق خیال آیا کہ اس میں فائدہ کم ہے اور عاقبت کا کھٹکا ساتھ لگا ہوا ہے۔ اور علم نحو وادب کے متعلق خیال آیا کہ میرا مشغلہ بچوں کو پڑھانا بن جائے گا۔ اور شعر وشاعری میں بے جا تعریف وتوصیف اور غلط بیانی کے سوا کچھ نہیں۔ اور علم قرائت میں دوسروں کو پڑھا دینے کے سوا کچھ نہیں۔ اور تفسیر میں کلام الٰہی سے بحث ہے، اور یہ نازک مرحلہ ہے۔ اور میں نے جب فقہ پر نظر ڈالی تو مجھ پر اس کی جلالت شان ظاہری ہوئی۔ اس میں علماء، مشائخ اور ارباب علم و دانش سے واسطہ پڑتا ہے۔ اقامتِ دین، فرائض کی ادائیگی اور عبادت کے طور طریقوں کی معرفت کا تعلق اسی مبارک علم سے ہے"۔

(تاریخ بغداد للخطیب، ج۱۳ رص ۳۳۱، ملخصاً)

دور فقاہت میں اگرچہ آپ مناظرہ کی طرف راغب نہ تھے، لیکن

اتفاقی طور پر کبھی کبھی کٹر شیعہ اور خوارج سے مناظرے کی نوبت آجاتی تھی۔ مناظرے کے دوران آپ کی حاضر جوابی، تبحر علمی اور ذہانت وفطانت قابل دید ہوتی تھی۔ آپ کے سیرت نگاروں نے اس زمانے کے کچھ مناظروں اور مباحثوں کے احوال لکھے ہیں۔ ان ہی میں خوارج کے ساتھ آپ کا وہ تاریخی مناظرہ بھی ہے جو کسی زانیہ اور شرابی کے مومن ہونے یا نہ ہونے سے متعلق تھا۔ امام اعظم رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی متعدد آیتیں پڑھ کر مناظرہ کرنے والے خوارج کو اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا کہ زنا کار اور شرابی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہونے کے باوجود دائرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتے آخر کار ان خوارج نے اپنا مذہب چھوڑا اور مذہب اہل سنت اختیار کر لیا۔

اس مناظرہ کی تفصیل علامہ موفق بن احمد مکی علیہ الرحمہ نے ''مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ، ج۱ص ۱۲۴،۱۲۵) پر لکھی ہے۔

علمی مقام: -سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا علمی مقام نہایت بلند ہے، وہ علم وتفقہ کے وہ نیر تاباں ہیں جس کی درخشانی اور تابانی کے سامنے آسمان نے علم ومعرفت کے نجوم وکواکب کی درخشانی گم ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کے علمی مقام کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حدیث نبوی میں ان کے متعلق بشارت آئی ہے: امام ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں یہ حدیث روایت کی ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لو كان العلم بالثريا لتناوله رجال من ابناء فارس -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر علم ثریا کے پاس ہوتا تو فارس کے کچھ افراد اسے حاصل کر لیتے۔ اور شیخ شیرازی نے ''الألقاب'' میں حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کی ہے۔

لو كان العلم معلقاً بالثريا لتنا وله قوم من أبناءِ فارس - اگر علم ثریا پر آویزاں ہوتا تب بھی کچھ ابنائے فارس اسے حاصل کر لیتے۔

امام جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب ''تبييض الصحيفة في مناقب الامام أبي حنيفة'' (ص۴۷۳) پر اس طرح کی روایتیں جمع کی ہیں اور لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان احادیث میں امام ابوحنیفہ کے تعلق سے بشارت دی ہے۔

علامہ سیوطی کے شاگرد سیرت شامی کے مصنف علامہ محمد بن یوسف شامی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ علامہ محمد بن عابدین شامی رد المحتار میں لکھتے ہیں:

في حاشية الشبرا ملسي على المواهب عن العلامه الشامي تلميذ السيوطي، قال: ماجزم به شيخنا من ان ابا حنيفة هو المراد من هذا الحديث ظاهر لا شك فيه، لانه لم يبلغ من ابناء فارس في العلم مبلغه احد (ردالمحتار، ج۱ص ۳۷)

''مواہب لدنیہ کے شبراملسی کے حاشیہ میں ہے کہ علامہ سیوطی کے شاگرد علامہ شامی نے کہا: ''وہ جس پر ہمارے شیخ نے یقین کیا ہے کہ ابوحنیفہ ہی اس حدیث سے مراد ہیں؛ بالکل ظاہر ہے کہ اس میں کچھ شک وشبہ نہیں اس لیے کہ ابنائے فارس میں سے کوئی بھی ان کے درجہ تک نہیں پہنچا''۔

علامہ ابن حجر ہیتمی مکی شافعی اپنی کتاب ''الخیرات الحسان'' میں اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فيه معجزة ظاهرة للنبي صلى الله عليه وسلم حيث اخبر بما سيقع (الخيرات الحسان في مناقب الامام الاعظم ابي حنيفة النعمان، ص ۱۴، دار الكتب العربيه الكبرى، مصر)

''یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا ہوا معجزہ ہے کہ آئندہ ہونے والی بات کی خبر دی''۔

حدیث کی ان بشارتوں سے امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے علمی مقام ومرتبہ کی بلندی آفتاب نیم روز کی طرح نظر آتی ہے جس کا اعتراف نہ صرف ان کے مقلدین اور متبعین نے کیا ہے بلکہ دوسرے ائمہ مجتہدین بھی کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں جس کی ایک جھلک آپ نے ابھی ملاحظہ فرمائی۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

اور آپ کے علمی مقام کی بلندی کی سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ آپ کی ذات میں ایک مجتہد کے سارے اوصاف کامل طریقے پر موجود تھے، تمام اہل علم نے آپ کو ''مجتہد مطلق'' مانا ہے۔ اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان اوصاف وشرائط کو ذکر کر دیا جائے جو ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے تا کہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے کہ اس مجتہد مطلق، مجتہدوں کے سرخیل، فقہ واجتہاد کے امام اعظم کا علمی مقام کتنا بلند ہے۔

شرائط اجتہاد: -امام غزالی لکھتے ہیں: کہ مجتہد کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ اس کا علم تمام علوم شرعیہ کا احاطہ کیے ہوئے ہو اور وہ غور وفکر سے

حکم شرعی معلوم کرسکتا ہو، اور یہ جانتا ہو کہ مسائل کے استنباط میں کون سے علوم مقدم ہیں اور کون سے علوم موٴخر ہیں- دوسری شرط یہ ہے کہ وہ نیک اور پرہیز گار ہواور وہ گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہو جواس کی بدنامی کا باعث اور پرہیز گاری کے خلاف ہوں-

شرعی علوم میں کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور وہ علوم عقلیہ ہیں جن کی مدد سے استدلال کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کتاب اللہ کے علم سے یہ مراد نہیں کہ قرآن مجید کی تمام آیتوں کا علم ہو، بلکہ ان آیتوں کا علم ضروری ہے، جن کا تعلق احکام سے ہے اور وہ پانچ سو آیتیں ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ پانچ سو آیات حفظ ہوں، بلکہ اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ آیات، قرآن مجید میں کہاں کہاں ہیں تا کہ ضرورت کے وقت ان کو تلاش کر سکے -اسی طرح حدیث کا عالم ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ تمام احادیث مرویہ کا حافظ ہو بلکہ یہ ضروری ہے کہ احکام سے متعلق احادیث کا اسے علم ہو۔ مثلاً سنن ابوداؤد یا سنن بیہقی میں کن احکام سے متعلق حدیثیں ہیں ۔اور مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ اسے معلوم ہو کہ کس حکم سے متعلق حدیث سنن ابوداؤد یا سنن بیہقی میں کس جگہ مذکور ہے تا کہ ضرورت کے وقت وہ حدیث تلاش کر سکے-

اجماع کا علم ہونے سے یہ مراد ہے کہ مجتہد کو اس کا علم ہو کہ اس سے پہلے کن کن مسائل پر اجماع ہو چکا ہے تا کہ اسکا حکم خلاف اجماع نہ ہو- یا اس کو یہ علم ہو کہ یہ مسئلہ اس زمانے میں پیدا ہوا ہے اور اس سے پہلے اس پر اجماع نہیں تھا، علوم عقلیہ سے مراد یہ ہے کہ مثلاً ایجاب صغری اور کلّیت کبری شکل اوّل کے نتیجہ دینے کی شرط ہے۔اسی طرح (قیاس کی) باقی تینوں شکلوں کی شرطیں بھی وہ جانتا ہو، تا کہ نتیجہ تک پہنچنے میں غلطی نہ کرے۔ کتاب وسنت کے علم کے لیے کچھ علوم مشترک ہیں جن کا مجتہد کو جاننا ضروری ہے۔ان میں سے لغت، نحو، صرف اور علم بلاغت ہے۔- یہ ضروری نہیں ہے کہ مجتہد ان علوم میں زمخشری، اصمعی، خلیل اور سیبویہ کی طرح ہو، بلکہ ضروری یہ ہے کہ اس کو ان علوم میں اس قدر مہارت ہو کہ وہ قرآن اور حدیث کے معنی، عربی اسلوب کے مطابق صحیح طور پر سمجھ سکے ۔مجتہد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عقائد کے دلائل سے واقف ہو ،یہاں تک کہ وہ عقلی دلائل سے عالم کا حادث ہونا، اللہ تعالی کا موجود ہونا ،اور اس کا واجب الوجود اور ایک ہونا ثابت کر سکے ،اور ضرورت نبوت ،قرآن مجید کی وجہ اعجاز اور نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور ختم نبوت، عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کر سکے ،تا کہ مسائل کلام وعقائد میں اس کا علم مقلد سے ممتاز ہو۔ لغت، صرف ونحو، علم بلاغت اور علم کلام کے علاوہ مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کلام صریح، کلام مجمل، حقیقت، مجاز، عام، خاص، محکم، متشابہ، مطلق، مقید وغیرہ کا بھی عالم ہو- ان علوم کے علاوہ مجتہد کے لئے کتاب وسنت کے ناسخ اور منسوخ کا علم بھی ضروری ہے اس لئے کہیں وہ ایسا حکم نہ بیان کردے جو قرآن یا حدیث میں منسوخ ہو چکا ہو-

یہ تو وہ علوم تھے جو کتاب وسنت میں مشترک ہیں ۔اور جو کچھ علوم وہ ہیں جو سنت (حدیث) کے ساتھ خاص ہیں۔ جن کی وجہ سے اسے صحیح اور غیر صحیح روایت اور مقبول اور نہ مقبول حدیث کے درمیان تمیز ہو سکے- اسی طرح اس کے لئے علم درایت حدیث اور علم اسماء الرجال کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ تا کہ اسے حدیث کے راویوں کی معرفت اور انکی عدالت کا علم ہو سکے- (المستصفی للامام محمد الغزالی، جلد ۲ رص ۳۵۰ تا ۳۴۵ (ملخصا) مطبوعہ مطبعہ کبری، بولاق، مصر ۱۲۹۴ھ رعلامہ آمدی الاحکام فی اصول الاحکام للعلامہ سیف الدین الآمدی، ج:۳ رص ۱۳۹ تا ۱۴۰، مطبعہ محمد علی واولادہ، مصر اور علامہ بزدوی، الموافقات للعلامہ ابراہیم بن موسی الشاطبی، ج ۴: ص ۶۷، مطبعہ محمد علی واولادہ، مصر نے بھی مجتہد کی یہی شرائط بیان کی ہیں- امام غزالی نے مذکورہ بالا تفصیل شرائط اجتہاد لکھنے کے بعد یہ صراحت بھی کی ہے-

''ہم نے اجتہاد کی شرائط میں جو علم قرآن، علم حدیث، علم اصول قرآن، علم اصول حدیث، علم اسماء الرجال، علم اجماع، علم استدلال، علم لغت ونحو اور عقائد کے ضروری مسائل کی جانکاری ہونے کا ذکر کیا ہے-یہ شرط مجتہد مطلق کے لیے ہے جو تمام شرعی احکام میں اجتہاد کرتا ہے۔ مجتہد کے لیے یہ شرطیں نہیں کہ وہ ہر مسئلہ کا جواب دے سکے، کیوں امام مالک علیہ الرحمہ سے چالیس مسائل پوچھے گئے جن میں سے چھتیس کے بارے میں انھوں نے کہا: ''میں نہیں جانتا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بہت سے مسائل میں توقف کیا، بلکہ صحابہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی بہت سے مسائل میں توقف کیا تو جس کا اسے علم ہو اس میں فتوی دے اور جس کا علم نہ ہو اس میں توقف کرے-'' (المستصفی للغزالی ج:۲ ر ص ۳۵۴ (ملخصاً) ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آئی کہ مجتہد کے لیے قرآن وحدیث اور ان کے متعلقات کا زبر

دست علم ضروری ہے۔ اور سیّدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ، شرائط اجتہاد کے جامع کامل تھے۔ اس کا عملی ثبوت وہ ہزاروں شرعی اور قانونی مسائل ہیں جو ان کے اجتہاد کے نتیجہ میں منقح ہو کر سامنے آئے۔

ارباب فضل وکمال کا اعتراف: - اسی بنیاد پر ایک جہان علم آپ کا مداح اور آپ کی علمی جلالت، فقہی بصیرت اور مجتہدانہ صلاحیت کا خطبہ پڑھتا نظر آتا ہے۔ خود آپ کے ہم عصر علماء، محدثین اور قرآن وحدیث کے رمز شناس آپ کی علمی جلالت کی شہادت دے رہے ہیں۔ آئندہ سطور میں ارباب فضل وکمال کی شہادتیں پڑھیے اور حضرت امام کی عظمتوں کو سلام عقیدت پیش کیجیے۔

امام محمد بن ادریس شافعی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

الناس فی الفقه عیال علی ابی حنیفة: لوگ فقہ میں ابو حنیفہ کے محتاج ہیں۔

اور یہ بھی فرمایا: **من اراد ان یعرف الفقه فلیلزم ابا حنیفة و اصحابه** - جو شخص فقہ کی معرفت حاصل کرنا چاہے اسے چاہیے کہ ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کا دامن پکڑے۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ والرضوان جب بغداد گئے تو اما اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ والرضوان کی قبر پر حاضر ہوئے اور دو رکعت نماز پڑھی، جس میں (تکبیر تحریمہ کے علاوہ) کسی بھی تکبیر میں رفع یدین نہیں کیا۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ فجر کی نماز تھی۔ پھر انہوں نے اس میں دعاے قنوت نہیں پڑھی (جب کہ ان کے یہاں فجر کی نماز میں دعاے قنوت پڑھی جاتی ہے) کسی نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو امام شافعی نے جواب دیا: اس امام کے ادب وتعظیم کی وجہ سے مجھے گوارا نہ ہوا کہ میں ان کی بارگاہ میں ان کے مذہب کے خلاف عمل کروں۔

امام مالک علیہ الرحمۃ والرضوان سے امام شافعی نے پوچھا: آپ نے امام ابوحنیفہ کو کیسا پایا؟ تو انہوں فرمایا:

رایت رجلا لو کلمک فی السارية ان یجعلها ذهبا لقام بحجته - میں نے انہیں ایسا باکمال آدمی پایا کہ اگر وہ اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہتے تو اپنی دلیل سے ثابت کر دیتے۔

حضرت فضیل بن عیاض نے فرمایا: امام ابوحنیفہ کی جلالت شان کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ مشہور فقیہ اور صاحب ورع وتقوی تھے۔

حضرت نضر بن شمیل کا بیان ہے کہ لوگ فقہ کے معاملے میں خوابیدہ تھے۔ یہاں تک کہ ابوحنیفہ نے انہیں بیدار کر دیا۔

(الخیرات الحسان، ص ۵ مطبوعہ دار الکتب العربیۃ الکبریٰ، مصر)

امام المحدثین، جلیل القدر تابعی سلیمان اعمش، صحابی رسول سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے ممتاز شاگرد ہیں۔ ان سے کسی شخص نے کچھ مسائل پوچھے۔ اس وقت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ بھی وہاں حاضر تھے۔ امام اعمش رضی اللہ عنہ نے وہ مسائل امام اعظم سے پوچھے، آپ نے فوراً ان کے جوابات دیے، امام اعمش نے کہا: یہ جواب آپ نے کہاں سے دیے؟ آپ نے فرمایا: ان حدیثوں سے جو میں نے خود آپ ہی سے سنی ہیں، پھر آپ نے وہ حدیثیں سند کے ساتھ سنا دیں۔ امام اعمش نے کہا:

حسبک ماحدثتک به فی مائة یوم تحدثنی به فی ساعة واحدة ، ماعلمت انک تعمل بهذه الاحادیث ، یا معشر الفقها ، انتم الاطباء و نحن الصیادلة، و انت ایها الرجل اخذت بکلا الطرفین (مصدر سابق، ص ۶۱) بس کیجیے، جو حدیثیں میں نے سو دن میں آپ کو سنائیں آپ گھڑی بھر میں مجھے سنائے دیتے ہیں، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ان حدیثوں میں یوں عمل کرتے ہیں۔ اے گروہ فقہاء! تم طبیب ہو اور ہم (محدثین) دوا فروش ہیں اور اے ابوحنیفہ! تم تو فقہ وحدیث دونوں کے جامع ہو۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک نے فرمایا: کوئی شخص امام ابوحنیفہ سے زیادہ اس لائق نہیں ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، کیوں کہ وہ متقی، پرہیز گار، صاحب ورع وتقوی عالم اور فقیہ ہیں، انہوں نے علم کو اس طرح منکشف کیا جس طرح کسی نے نہیں کیا۔

امام احمد بن حنبل نے ان کے بارے میں کہا کہ وہ علم، تقوی، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی دل چسپی میں اس مقام پر فائز تھے کہ اسے کوئی دوسرا حاصل نہیں کر سکتا۔ خلیفہ منصور کی طرف سے انہیں قاضی (جج) کا عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، یہاں تک کہ انہیں اس کے لیے کوڑے مارے گئے، مگر انہوں نے یہ عہدہ قبول نہ کیا۔

(امام بخاری کے استاذ) مکی ابن ابراہیم فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ حضرت معمر فرماتے ہیں: میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو عربی زبان وادب کے معاملے میں اچھی طرح گفتگو کر سکتا ہو، قیاس بھی کر سکتا ہو، حدیث کی شرح بھی کر سکتا ہو، اور ان امور میں امام ابوحنیفہ سے زیادہ علم رکھتا ہو۔

خلف بن ایوب فرماتے ہیں: اللہ تعالی نے رسول اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم عطا فرمایا، آپ سے صحابۂ کرام کو ملا، ان سے تابعین کی طرف منتقل ہوا، پھر امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کو ملا، جو شخص چاہے راضی ہو اور جو چاہے ناراض ہو۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں: اگر اللہ تعالی امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری رضی اللہ عنہما کے ذریعہ میری مدد نہ فرماتا تو میں عوام الناس میں سے ہوتا۔ یہ بھی فرمایا: کہ اگر میں نے امام ابوحنیفہ کی زیارت نہ کی ہوتی تو میں بھی سکے (کرسی) بیچنے والوں میں سے ہوتا۔ اور اگر ابوحنیفہ نہ ہوتے تو میں مبتدعین میں سے ہوتا۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو فرماتے: حضرت عبد اللہ بن مسعود نے اس طرح فرمایا، اور امام ابوحنیفہ نے اس طرح فرمایا۔ حاضرین میں سے کوئی شخص کہتا کہ آپ ابوحنیفہ کو ابن مسعود کے ساتھ ملا رہے ہیں تو فرماتے: اگر تو امام ابوحنیفہ کو دیکھتا تو عظیم شخصیت کو دیکھتا۔

حضرت سفیان ثوری علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں: ''ہم امام ابوحنیفہ کے سامنے ایسے تھے جیسے باز کے سامنے چڑیاں ہو، ابوحنیفہ علماء کے سردار ہیں۔''

حضرت جعفر بن ربیع کہتے ہیں: ''میں پانچ سال امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر رہا، میں نے ان سے زیادہ طویل خاموشی والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ جب ان سے کسی مسئلے کے بارے میں سوال کیا جاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے علم کا دریا بہ رہا ہو'' ۔ یہ بھی فرمایا کہ سب سے بڑے فقیہ امام ابوحنیفہ ہیں، میں نے فقاہت میں ان جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا ۔ (تحصیل التعریف فی معرفۃ الفقہ والتصوف للشیخ عبد الحق المحدث الدہلوی (مترجم) ص ۲۱۹،۲۲۰، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی)

حضرت عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں: میں امام اوزاعی علیہ الرحمہ سے ملنے شام گیا۔ بیروت میں ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھ سے کہا اے خراسانی! کوفہ میں یہ کون بدعتی پیدا ہوا ہے؟ یہ سن کر میں گھر آیا ۔ امام ابوحنیفہ کی کتابیں نکالیں اور ان سے چیدہ چیدہ مسائل چھانٹ کر جمع کیے اس کام میں مجھے تین دن لگ گئے پھر میں امام اوزاعی کے پاس گیا، وہ مسجد کے مؤذن بھی تھے اور امام بھی ۔ میرے ہاتھ میں کتابیں دیکھ کر کہا: یہ کیا ہے؟ میں نے ہاتھ بڑھا کر کتابیں ان کے حوالے کر دیں۔ انہوں نے ایک مسئلہ پر نظر ڈالی، جس پر لکھا تھا ''قال النعمان'' (نعمان نے فرمایا) اذان کہہ کر کھڑے کھڑے پہلا حصہ پڑھ لیا۔ پھر کتاب آستین میں رکھ لی، پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر کتاب آستین سے نکالی اور پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ دیکھ کر کہا: یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟ میں نے کہا: ایک شیخ ہیں جن سے عراق میں ملاقات ہوئی تھی۔ کہا: ''بڑی شان کے شیخ ہیں۔ جاؤ ان سے بہت سا فیض حاصل کرو۔ میں نے کہا: یہ وہی ابوحنیفہ ہیں جن سے آپ نے مجھے روکا تھا (تاریخ بغداد للخطیب البغدادی، ج ۱۳/ص ۳۳۸)

امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ''میں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ حدیث کے معنی یا حدیث کے نکات جاننے والا کسی کو نہیں دیکھا اور میں نے جس مسئلے میں بھی امام ابوحنیفہ سے مخالفت کی، اور غور کیا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ ان کا مذہب آخرت کی نجات کے لیے زیادہ کار آمد ہے۔ اور جب بھی مسائل کی استنباط میں میرا جھکاؤ ایک حدیث کی طرف ہوتا تھا تو حال یہ ہوتا کہ وہ حدیث صحیح کی مجھ سے کہیں زیادہ بصیرت رکھتے تھے میں اپنے والدین سے پہلے امام ابوحنیفہ کے لیے دعا کرتا ہوں'' ۔ (مصدر سابق ص ۳۴۰)

حضرت ابو مطیع حکم بن عبد اللہ کہتے ہیں: ''میں نے کسی محدث کو سفیان ثوری سے زیادہ فقیہ نہیں دیکھا مگر امام ابوحنیفہ ان سے کہیں زیادہ فقیہ تھے۔'' (مصدر سابق ص ۳۴۱)

حضرت یزید بن ہارون سے پوچھا گیا کہ امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری میں کون بڑا فقیہ ہے تو انہوں نے کہا: ''سفیان ثوری حفظ حدیث میں بڑھے ہوئے ہیں اور امام ابوحنیفہ فقہ میں، پھر فرمایا کہ میں نے حضرت ابو عاصم نبیل سے یہی سوال کیا تھا کہ ان دونوں میں کون بڑا فقیہ ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ کا ایک غلام بھی سفیان ثوری سے بڑا فقیہ ہے۔'' (مصدر سابق ص ۳۴۲)

حضرت علی بن عاصم نے فرمایا: کہ اگر ابوحنیفہ کے علم کو ان کے زمانے کے علماء کے علم کے ساتھ تولا جائے تو امام ابوحنیفہ کے علم کا پلہ بھاری رہے گا ۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ للقاضی الصمیری، بحوالہ سوانح بے بہائے امام اعظم ابوحنیفہ ص ۹۵)

امام اعظم ابوحنیفہ اور قرآن کریم: ۔ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو قرآن کریم سے حد درجہ شغف تھا ۔ آپ قرآن مجید کے حافظ تھے، کثرت سے قرآن کی تلاوت فرماتے تھے اور نماز میں قرآن مجید ختم کیا

کرتے تھے قاضی ابوعبداللہ صیمری نے خارجہ بن مصعب کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ نے ایک رکعت میں قرآن مجید ختم فرمایا ہے۔

(اخبار ابی حنیفہ واصحابہ، ص ۴۵)

حضرت خارجہ بن مصعب کہتے ہیں: خانۂ کعبہ میں چار اماموں نے پورا قرآن مجید ختم کیا ہے، حضرت عثمان بن عفان، حضرت تمیم داری، حضرت سعید بن زبیر، حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین۔ حضرت یحیٰ بن نصر کہتے ہیں: **كان ابو حنيفة ربما ختم القرآن في شهر رمضان ستين ختمة** -(ترجمہ: کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ امام ابو حنیفہ صرف رمضان کے مہینہ میں ساٹھ مرتبہ قرآن مجید ختم کرتے تھے) مذکورہ بالا روایت سے خوب واضح ہو گیا کہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا تلاوت قرآن سے بڑا گہرا لگاؤ تھا، وہ قرآن سے شرعی احکام کا استنباط بھی فرماتے تھے اور کثرت سے تلاوت بھی فرماتے تھے۔

امام اعظم اور حدیث: -اوپر شرائط اجتہاد کے بیان میں گذرا کہ ایک مجتہد کے لیے دیگر اسلامی علوم کے ساتھ علم حدیث میں بھی مہارت ضروری ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ علم حدیث میں مرتبہ کمال پر فائز تھے یہ اور بات ہے کہ انہوں نے وقت کے تقاضے کے پیش نظر روایت حدیث کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی، بلکہ ان سے مسائل کا استخراج فرما کرامت مسلمہ کے لیے آسانیاں پیدا فرمادیں۔ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کی مشکلات حل فرمادیں- امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ وہ زمانہ ہے جس میں حدیث کا درس شباب پر تھا، تمام بلاد اسلامیہ میں اس کا درس زور وشور سے جاری تھا، اور آپ کا وطن کوفہ تو اس خصوص میں ممتاز تھا، علم حدیث میں اس شہر کا امتیاز امام محمد بن اسمٰعیل بخاری کے دور تک باقی رہا۔ اسی لیے موصوف اتنی بار کوفہ گئے کہ خود فرمایا کہ: میں کوفہ کتنی بار گیا شمار نہیں کرسکتا۔"

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ والرضوان نے حدیث کی تحصیل کی ابتداء اپنے وطن کوفہ سے کی۔ کوفہ میں کوئی ایسا محدث نہ تھا جس سے آپ نے حدیث کا علم حاصل نہ کیا ہو۔ ابوالمحاسن شافعی ہیں، مگر انہوں نے کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ ترانوے وہ مشائخ ہیں جو کوفے کے رہنے والے تھے یا کوفہ میں تشریف لائے جن سے امام اعظم نے حدیث اخذ کی۔

امام اعظم کے مشائخ حدیث میں امام شعبہ بن حجاج بھی ہیں، انہیں دو ہزار حدیثیں یاد تھیں، امام سفیان ثوری نے انہیں "امیر المومنین فی الحدیث" کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: "اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث اتنی عام نہ ہوتی" ۱۶۰ھ میں ان کا وصال ہوا۔ جب سفیان ثوری کو ان کی وفات کی خبر پہونچی تو فرمایا آج علم حدیث مر گیا۔ امام شعبہ کو حضرت امام اعظم سے قلبی لگاؤ تھا غائبانہ ان کی ذہانت اور نکتہ رسی کی تعریف کرتے رہتے۔ ایک بار امام اعظم کا ذکر آیا تو امام شعبہ نے فرمایا: "جس طرح مجھے یقین ہے کہ آفتاب روشن ہے اسی یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم اور ابوحنیفہ ہم نشیں ہیں"۔

امام بخاری کے استاذ حضرت یحیٰ بن معین سے کسی نے امام اعظم کے بارے میں پوچھا کہ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ تو فرمایا: اس قدر کافی ہے کہ شعبہ نے انہیں حدیث روایت کرنے کی اجازت دی، شعبہ آخر شعبہ ہی تھے"۔ (عقود الجمان باب د ہم)

کوفہ کے علاوہ حضرت امام نے بصرہ کے محدثین سے حدیثیں حاصل کیں اس وقت بصرہ بھی علم وفضل خصوصاً علم حدیث کا بہت اہم مرکز تھا- یہ شہر بھی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ نے بسایا تھا اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالی عنہ سے یہ شہر مرکز حدیث بن گیا تھا۔ علامہ ذہبی جیسے علم حدیث کے ماہر نے دوسرے اور تیسرے دور میں جن عظیم شخصیتوں کو محدث کا خطاب دیا ہے وہ بصرہ یا کوفہ کے رہنے والے یا یہاں اکثر آمد ورفت رکھنے والے تھے۔

جب امام اعظم نے ان دونوں مراکز سے ہزاروں ہزار احادیث حاصل کیں مگر امام اعظم ہونے کے لیے ابھی اور بہت کچھ ضرورت باقی تھی، یہ کمی حرمین طیبین سے پوری فرمائی۔ یہ گذر چکا کہ آپ نے پہلا سفر حج ۹۶ھ میں کیا تھا، اور آپ نے اپنی عمر میں پچپن حج کیے ۱۵۰ھ میں آپ کا وصال ہوا تو اس سے ثابت ہوا کہ ۹۶ھ کے بعد کسی سال حج ناغہ نہ ہوا اس لیے حرمین طیبین کی حاضری کم از کم ۹۶ھ کے بعد پچپن بار مسلسل بلا ناغہ ہوئی۔ اس عہد میں حضرت عطا بن رباح مکہ معظمہ میں سرتاج محدثین تھے، یہ تابعی تھے دو سو صحابہ کرام کی صحبت کا شرف انہیں حاصل تھا خصوصاً حضرت ابن عباس، ابن عمر، اسامہ، جابر، زید بن ارقم، عبداللہ بن سائب، عقیل بن رافع، ابو درداء اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہم سے احادیث سنی تھیں- یہ محدث ہونے کے ساتھ بہت عظیم مجتہد بھی تھے- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ عطاء کے ہوتے ہوئے لوگ میرے پاس کیوں آتے ہیں؟ ایام حج میں حکومت کی طرف

سے اعلان عام ہو جاتا تھا کہ عطا کے علاوہ اور کوئی فتوی نہ دے۔ اساطین محدثین، امام اوزاعی، امام زہری، امام عمر بن دینار، انہیں کے تلمیذ خاص تھے۔ امام اعظم جب ان کی خدمت میں تلمذ کے لیے حاضر ہوئے تو حضرت عطا نے ان کا عقیدہ پوچھا، امام اعظم نے کہا: میں اسلاف کو برا نہیں کہتا، گنہگاروں کو کافر نہیں کہتا، تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں اس کے بعد عطا نے آپ کو حلقہ درس میں شامل کر لیا- دن بدن حضرت امام کی ذکاوت وفطانت روشن ہوتی گئی، جس سے حضرت عطا ان کو اپنے قریب سے قریب تر کرتے گئے یہاں تک کہ حضرت عطا دوسروں کو ہٹا کر حضرت امام اعظم کو اپنے پہلو میں بٹھاتے- حضرت امام جب مکہ حاضر ہوتے تو اکثر حضرت عطا کی خدمت میں حاضر رہتے- ان کا وصال ۱۱۵ھ میں ہوا تو ثابت ہوا کہ تقریباً بیس سال ان سے استفادہ کرتے رہے-

مکہ معظمہ میں حضرت امام نے وقت کے ایک اور امام حضرت عکرمہ سے علم حاصل کیا۔ عکرمہ سے کون واقف نہیں یہ حضرت علی، ابن عمر، عقبہ بن عمرو، صفوان، جابر، ابوقتادہ، ابن عباس رضوان اللہ علیہم اجمعین کے شاگرد ہیں۔ تفسیر وحدیث میں تقریباً ستر مشہور ائمہ تابعین ان کے شاگرد ہیں۔ جب حضرت امام اعظم مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے تو فقہائے سبعہ میں سے دو بزرگ باحیات تھے ایک سلیمان جن کا دوسرا نمبر تھا۔ یہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے۔ دوسرے حضرت سالم جو حضرت فاروق اعظم کے پوتے، اور حضرت عبد اللہ بن عمر کے صاحبزادے تھے- حضرت امام اعظم نے خصوصیت سے ان دونوں اماموں سے احادیث اخذ کیں، ان کے علاوہ دوسرے ائمہ احادیث سے بھی فیض پایا- (نزہۃ القاری ج ۱ ص ۱۲۰/۱۲۲ مطبوعہ دائرۃ البرکات گھوسی، مئو، ۱۹۸۴ھ

علامہ ابن حجر ہیتمی شافعی نے لکھا ہے کہ "حضرت امام اعظم نے چار ہزار مشائخ سے جو کہ ائمہ تابعین تھے اور دوسرے حضرات سے حدیثیں اخذ کی ہیں۔ اسی بنا پر علامہ ذہبی اور دوسرے علماء نے حضرت امام کا شمار محدثین کے طبقہ حفاظ میں کیا ہے-"

پھر آگے لکھتے ہیں: "جس نے یہ خیال کیا کہ آپ حدیث کا بہت کم اہتمام کرتے تھے اس نے تساہل سے کام لیا، یا حسد کی بنا پر یہ بات کہی ہے یہ بات ایسے شخص کے متعلق کیسے صحیح ہو سکتی ہے جس نے بے شمار مسائل کا استنباط فرمایا ہو، اور دلائل کے ذریعہ مخصوص طریقہ استنباط میں پہلا شخص ہو- جس کا بیان اس کے اصحاب نے اپنی تالیفات میں کیا ہے- بات در اصل یہ ہے کہ وہ مسائل کے استخراج واستنباط کے کام میں مصروف تھے۔ اس لیے ان کی روایتیں نہیں پھیلیں، جس طرح حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی روایتیں ان کی مصروفیات کی وجہ سے کم ہوئیں کہ یہ حضرات عام مسلمانوں کے فلاح وبہبود کے کاموں میں مصروف تھے۔ اس کے برخلاف ان صحابہ کی روایتیں زیادہ پھیلیں جو عمر اور علم دونوں میں ان سے کم تھے- یہی حال امام شافعی اور امام مالک کا ہے کہ ان کی روایتیں ان افراد سے کم ہیں جو صرف احادیث روایت کرنے کا کام کرتے تھے۔ جیسے ابوزرعہ اور ابن معین۔ کیوں کہ حضرت امام مالک اور امام شافعی مسائل کے استنباط میں مصروف رہتے تھے، پھر یہ بھی واضح رہے کہ روایت حدیث بغیر درایت کے بہت زیادہ قابل تعریف نہیں ہے۔ علامہ ابن عبد البر نے اس کی مذمت میں ایک باب قائم کیا ہے"-

(الخیرات الحسان، ص ۶۰، مطبعۃ دار الکتب العربیۃ الکبری، مصر)

حضرت امام اعظم کے عظیم ترین محدث ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے روشن دلیل فقہ حنفی ہے۔ فقہ حنفی کے کلیات وجزئیات کو اٹھا کر دیکھیے، جن جن ابواب اور جن جن مسائل میں صحیح اور غیر مؤول، غیر منسوخ، کتاب اللہ کے غیر معارض احادیث ہیں وہ سب فقہ حنفی کے مطابق ہیں۔ اس کی تصدیق کے لیے امام طحاوی کی معانی الآثار، علامہ بدر الدین کی عمدۃ القاری شرح بخاری، علامہ کمال الدین ابن ہمام کی فتح القدیر، شرح ہدایہ، شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی فتح المنان فی تائید مذہب النعمان، اور لمعات التنقیح شرح مشکوۃ مصابیح، اور ملا علی بن سلطان قاری کی مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح کا مطالعہ کیا جائے اور کچھ خلجان رہ جائے تو اعلی حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کے مجموعہ فتوی "العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ" کا مطالعہ کیا جائے تو میرے دعوے کی حرف بہ حرف تصدیق ہو جائے گی-

امام اعظم کی اجتہادی خدمات:- امام اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان کی اجتہادی خدمات بھی گوناگوں ہیں، ان میں دو خدمات بہت اہم ہیں (۱) علم شریعت کی باضابطہ تدوین (۲) ائمہ مجتہدین اور فقہائے اسلام کی زبردست ٹیم تیار کرنا-

مگر ان خدمات اور کارناموں کی اہمیت سمجھنے کے لیے خلافت راشدہ کے زمانے سے لے کر ان کے عہد تک کے حالات کا ایک سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔ خلافت راشدہ حقیقت میں محض ایک سیاسی

حکومت نہ تھی، بلکہ نبوت کی مکمل نیابت تھی، اس کا کام صرف اتنا نہ تھا کہ ملک کا نظم ونسق چلائے، امن قائم کرلے اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کرے، بلکہ وہ مسلمانوں کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں معلم، مربی اور مرشد کے وہ تمام فرائض انجام دیتی تھی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ظاہری حیات طیبہ میں انجام دیا کرتے تھے اور اس کی یہ ذمہ داری تھی کہ اسلامی حکومت میں دین حق کے پورے نظام کو اس کی اصلی شکل و روح کے ساتھ چلائے، اور دنیا میں مسلمانوں کی پوری اجتماعی طاقت دین حق اور کلمۃ اللہ کو بلند کرنے کی خدمت پر لگادے۔ اس بناء پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ صرف خلافت راشدہ ہی نہ تھی بلکہ خلافت مرشدہ بھی تھی۔

مگر خلافت راشدہ کے ختم ہوتے ہی امت مسلمہ کی قیادت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک سیاسی قیادت جس کی باگ ڈور امراء اور سلاطین کے ہاتھوں میں رہی اور دوسری دینی و مذہبی قیادت، جسے امت کے علما اور صلحا نے سنبھال لیا تھا اس دور تفریق میں سیاسی قیادت اور سربراہی عام طور پر امور سلطنت، جہانگیری اور ملکی نظام کو چلانے کا کام کرتی تھی اور اسے اس کی پرواہ نہ تھی کہ یہ کام شرعی نقطہ نظر سے جائز ہے یا ناجائز، حلال ہے یا حرام۔ اس طرح مذہبی اور سیاسی قیادت کی تفریق سے اسلام کا قانونی نظام عملی طور پر حد درجہ متاثر ہو چکا تھا۔

قانون شریعت کی تدوین:۔ امام ابوحنیفہ کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے انھیں اسلامی تاریخ میں لازوال عظمت عطا کی، یہ تھا کہ انھوں نے اس عظیم خلا کو اپنے بل بوتے پر کردیا جو خلافت راشدہ کے بعد شوری کا سد باب ہوجانے سے اسلام کے قانونی نظام میں واقع ہو چکا تھا۔

ایک صدی کے قریب اس حالت پر گزر جانے سے جو نقصان رونما ہو رہا تھا اسے ہر صاحب فکر آدمی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف مسلم ریاست کی حدود سندھ سے اسپین تک پھیل چکی تھی۔ بیسوں قومیں اپنے الگ الگ تمدن رسم ورواج اور حالات کے ساتھ اس میں شامل ہو چکی تھیں۔ اندرون ملک مالیات کے مسائل، تجارت وزراعت کے مسائل اور صنعت وحرفت کے مسائل، شادی بیاہ کے مسائل، دیوانی اور فوج داری قوانین وضوابط کے مسائل روز بروز سامنے آرہے تھے۔ بیرون ملک دنیا بھر کی قوموں سے اس عظیم ترین سلطنت کے تعلقات تھے اور ان میں جنگ، صلح، سفارتی روابط، تجارتی لین دین، بحری وبری مسافرت، کسٹم وغیرہ کے مسائل پیدا ہو رہے تھے اور مسلمان چونکہ اپنا ایک مستقل نظریہ، اصول حیات اور بنیادی قانون رکھتے تھے، اس لئے نا گزیر تھا کہ وہ اپنے ہی نظام قانون کے تحت ان بے شمار نت نئے مسائل کو حل کریں۔ غرض ایک طرف وقت کا یہ زبردست چیلنج تھا، جس سے اسلام کو سابقہ در پیش تھا اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ ملوکیت کے دور میں کوئی ایسا مسلّم آئینی ادارہ باقی نہ رہا تھا جس میں مسلمانوں کے معتمد علیہ اہل علم اور فقیہ او رمدبرین بیٹھ کر ان مسائل کو سوچتے اور شریعت کے اصولوں کے مطابق ان کا مستند حل پیش کرتے جو سلطنت کی عدالتوں اور اس کے سرکاری محکموں کے لئے قانون قرار پاتا اور پوری مملکت میں یکسانی کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا۔

اس نقصان کو خلفاء، گورنر، حکام اور قاضی سب محسوس کررہے تھے، کیونکہ انفرادی اجتہاد اور معلومات کے بل پر روز مرّہ پیش آنے والے اتنے مختلف مسائل کو بروقت حل کر لینا ہر مفتی، حاکم، جج اور ناظم محکمہ کے بس کا کام نہ تھا، اور اگر فرداً فرداً انھیں حل بھی کیا جاتا تھا تو اس سے بے شمار متضاد فیصلوں کا ایک جنگل پیدا ہو رہا تھا۔ مگر دشواری یہ تھی کہ ایسا ایک ادارہ حکومت ہی قائم کرسکتی تھی، اور حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو خود جانتے تھے کہ مسلمانوں میں ان کا کوئی اخلاقی وقار واعتماد نہیں ہے۔ ان کے لئے فقہا کا سامنا کرنا تو درکنار ان کو برداشت کرنا بھی مشکل تھا۔ ان کے تحت بننے والے قوانین کسی حالت میں بھی مسلمانوں کے نزدیک اسلامی نظام قانون کا جز نہ بن سکتے تھے۔ ابن المقفع نے اپنے رسالۃ الصحابۃ میں اس خلا کو پر کرنے کے لیے المنصور کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ خلیفہ اہل علم کی ایک کونسل بنائے جس میں ہر نقطۂ نظر کے علماء پیش آمدہ مسائل پر اپنا اپنا علم اور خیال پیش کریں، پھر خلیفہ خود ہر مسئلہ پر اپنا فیصلہ دے اور وہی قانون ہو لیکن منصور اپنی حقیقت سے اتنا بے خبر نہ تھا کہ یہ حماقت کرتا۔ اس کے فیصلے ابو بکر وعمر کے فیصلے نہ بن سکتے تھے۔ اس کے فیصلوں کی عمر خود اس کی اپنی عمر سے زیادہ نہ ہوسکتی تھی، بلکہ اس کی زندگی میں بھی یہ توقع نہ تھی کہ پوری مملکت میں کوئی ایک مسلمان ہی ایسا مل جائے گا جو اس کے منظور کیے ہوئے قانون کی مخلصانہ پابندی کرے۔ وہ ایک لادینی اور غیر مذہبی قانون تو ہوسکتا تھا مگر اسلامی قانون کا ایک حصہ ہرگز نہ ہوسکتا تھا۔

اس صورت حال میں امام ابوحنیفہ کو ایک بالکل نرالا راستہ سوجھا اور وہ یہ تھا کہ وہ حکومت سے بے نیاز رہ کر خود ایک غیر سرکاری مجلس وضع

قانون قائم کریں۔ یہ تجویز ایک انتہائی بدیع الفکر آدمی ہی سوچ سکتا تھا، اور مزید برآں اس کی ہمت صرف وہی شخص کرسکتا تھا جو اپنی قابلیت پر، اپنے کردار پر، اور اپنے اخلاقی وقار پر اتنا اعتماد رکھتا ہو کہ اگر وہ ایسا کوئی ادارہ قائم کرکے قوانین مدون کرے گا تو کسی سیاسی قوت نافذہ اور حکومتی دباؤ کے بغیر اس کے مدون کردہ قوانین اپنی خوبی، اپنی صحت، اپنی مطابقت اصول اور اپنے مدون کرنے والوں کے اخلاقی اثر کے بل پر خود نافذ ہوں گے، قوم خود ان کو قبول کرے گی اور سلطنتیں آپ سے آپ ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گی۔ امام اعظم اعلیٰ درجہ کے دوراندیش تھے، اپنی فراست ایمانی سے انہوں نے ان نتائج کو بھانپ لیا تھا جو فی الواقع ان کے بعد نصف صدی کے اندر ہی برآمد ہونے والے تھے وہ اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو جانتے تھے، مسلمانوں کے اجتماعی مزاج سے واقف تھے، اور وقت کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے انہوں نے ایک کمال درجہ کے دانا و دور اندیش انسان کی حیثیت سے بالکل صحیح اندازہ کرلیا کہ وہ اس خلا کو اپنی نجی حیثیت سے پُر کرسکتے ہیں اور ان کے پُر کرنے سے یہ خلا واقعی پُر ہو جائے گا۔

مجلس وضع قانون:۔ اس مجلس کے شرکا امام کے اپنے شاگرد تھے جن کو سالہا سال تک انہوں نے اپنے مدرسۂ قانون میں باقاعدہ قانونی مسائل پر سوچنے، علمی طرز پر تحقیقات کرنے اور دلائل سے نتائج مستنبط کرنے کی تربیت دی تھی ان میں سے قریب قریب ہر شخص امام کے علاوہ وقت کے دوسرے بڑے بڑے اساتذہ سے بھی قرآن حدیث، فقہ اور دوسرے مددگار علوم مثلاً لغت، نحو، ادب اور تاریخ و سیر کی تعلیم حاصل کرچکا تھا، مختلف شاگرد مختلف علوم کے متخصص اور ماہر سمجھے جاتے تھے مثلاً کسی کو قیاس اور علوم عقلیہ میں نمایاں مقام حاصل تھا، کسی کے پاس احادیث اور صحابہ کے فتاوی اور پچھلے خلفاء وقضاۃ کے نظائر کی وسیع معلومات تھیں، اور کوئی علم تفسیر یا قانون کے کسی خاص شعبے، یا لغت اور نحو یا مغازی کے علم میں اختصاص رکھتا تھا ایک دفعہ امام نے خود اپنی ایک گفتگو میں بتایا کہ یہ کس مرتبے کے لوگ تھے۔

''یہ ۳۶؍ آدمی ہیں جن میں سے ۲۸؍ قاضی ہونے کے لائق ہیں، ۶؍ فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور دو اس درجے کے آدمی ہیں کہ قاضی اور مفتی تیار کرسکتے ہیں''۔

(مناقب الامام الاعظم للموفق المکی ج:۲/ ۲۴۶)

اس مجلس کا طریق کار جو امام کے معتبر سوانح نگاروں نے لکھا ہے وہ ہم خود انہیں کے الفاظ میں یہاں نقل کرتے ہیں علامہ موفق بن احمد المکی (م:۵۶۸ھ؍۱۱۷۲ء) لکھتے ہیں:

''ابوحنیفہ نے اپنا مذہب ان کے (یعنی اپنے فاضل شاگردوں کے) مشورے سے مرتب کیا ہے وہ اپنی حد وسع تک دین کی خاطر زیادہ سے زیادہ جاں فشانی کرنے کا جذبہ رکھتے تھے اور خدا اور رسول اور اہل ایمان کے لئے جو کمال درجہ کا اخلاص ان کے دل میں تھا اس کی وجہ سے انہوں نے شاگردوں کو چھوڑ کر یہ کام محض اپنی انفرادی رائے سے کرڈالنا پسند نہ کیا وہ ایک ایک مسئلہ ان کے سامنے پیش کرتے تھے، اس کے مختلف پہلو ان کے سامنے لاتے تھے، جو کچھ ان کے پاس علم اور خیال ہوتا اسے سنتے اور اپنی رائے بھی بیان کرتے، حتی کہ بعض اوقات ایک ایک مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مہینہ مہینہ بھر اور اس سے بھی زیادہ لگ جاتا تھا۔ آخر جب ایک رائے قرار پا جاتی تو اسے قاضی ابو یوسف کتب اصول میں ثبت کرتے''۔ (مرجع سابق، ص:۱۳۳)

عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ اس مجلس میں تین دن تک مسلسل ایک مسئلے پر بحث ہوتی رہی تیسرے دن شام کے وقت میں نے جب اللہ اکبر کی آوازیں سنیں تو پتہ چلا کہ اس بحث کا فیصلہ ہو گیا۔ (مناقب الامام الاعظم لکردری، ۲/ ۱۰۸)

امام کے ایک اور شاگرد ابو عبداللہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں امام ابوحنیفہ اپنی جو رائیں ظاہر کرتے تھے انہیں وہ بعد میں پڑھوا کر سن لیا کرتے تھے چنانچہ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''میں امام کے اقوال ان کو پڑھ کر سناتا تھا ابو یوسف (مجلس کے فیصلے ثبت کرتے ہوئے) ساتھ ساتھ اپنے اقوال بھی درج کردیا کرتے تھے اس لیے پڑھتے وقت میں کوشش کرتا تھا کہ ان کے اقوال چھوڑتا جاؤں اور صرف امام کے اپنے اقوال انہیں سناؤں ایک روز میں چوک گیا اور دوسرا قول بھی میں نے پڑھ دیا امام نے پوچھا یہ دوسرا قول کس کا ہے؟ (مرجع سابق ۲/ ۱۳۶)

اس کے ساتھ المکی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس کے جو فیصلے لکھے جاتے تھے ان کو الگ الگ عنوانات کے تحت کتابوں اور ابواب میں مرتب بھی امام ابوحنیفہ کی زندگی میں کردیا گیا تھا:

''ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس شریعت کے علم کو مدون کیا

ان سے پہلے کسی نے یہ کام نہیں کیا تھا ابوحنیفہ نے اس کو کتابوں اور جدا جدا عنوانات کے تحت ابواب کی شکل میں مرتب کر دیا تھا‘‘ (مرجع ص:۴۱)

اس مجلس میں جیسا کہ ہم پہلے موفق المکی ہی کے حوالے سے بتا چکے ہیں، ۸۳ ہزار قانونی مسائل طے کیے گئے تھے اس میں صرف وہی مسائل زیر بحث نہیں آتے تھے جو اس وقت تک عملا لوگوں کو یا ریاست کو پیش آ چکے تھے، بلکہ معاملات کی امکانی صورتیں فرض کر کر کے ان پر بھی بحث کی جاتی اور ان کا حل تلاش کیا جاتا تھا، تا کہ آئندہ اگر کبھی کوئی نئی صورت پیش آجائے جواب تک نہ پیش آئی ہو تو قانون میں پہلے سے اس کا حل موجود ہو یہ مسائل قریب قریب ہر شعبہ قانون سے متعلق تھے، بین الاقوامی قانون (جس کے لیے ’’السیر‘‘ کی اصطلاح مستعمل تھی) دستوری قانون، دیوانی وفوج داری قانون قانون شہادت ضابطۂ عدالت، معاشی زندگی کے ہر شعبے کے الگ قوانین، نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ شخصی احوال کے قوانین، اور عبادات کے احکام، یہ سب عنوانات ہم کو ان کتابوں کی فہرستوں میں ملتے ہیں جو اس مجلس کے فراہم کردہ مواد سے امام ابو یوسف نے اور پھر امام محمد بن حسن الشیبانی نے بعد میں مرتب کیں۔

اس باقاعدہ تدوین قانون اور اجتماعی وضع قانون کا اثر یہ ہوا کہ انفرادی طور پر کام کرنے والے مجتہدوں، مفتیوں اور قاضیوں کا کام ساقط الاعتبار ہوتا چلا گیا قرآن وحدیث کے احکام اور سابقہ فیصلوں اور فتاویٰ کے نظائر کی چھان بین کر کے اہل علم کی ایک مجلس نے ابوحنیفہ جیسے نکتہ رس آدمی کی صدارت ورہنمائی میں شریعت کے جو احکام منقح صورت میں نکال کر رکھ دیئے تھے اور پھر اصول شریعت کے تحت وسیع پیمانے پر اجتہاد کر کے زندگی کے ہر پہلو میں پیش آنے والی امکانی ضرورتوں کے لئے جو قابل عمل قوانین مرتب کر دیے تھے، ان کے بعد متفرق افراد کے مدون کئے ہوئے احکام مشکل ہی سے وقیع ہو سکتے تھے، اس لیے جوں ہی یہ کام منظر عام پر آیا عوام اور حکام اور قضاۃ، سب اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو گئے، کیوں کہ یہ وقت کی مانگ تھی اور لوگ مدت سے اسی چیز کے حاجت مند تھے، چنانچہ مشہور فقیہ یحیٰ بن آدم (م:۲۰۳ھ ۸۱۸ء) کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کے اقوال کے آگے دوسرے فقہا کے اقوال کا بازار سرد پڑ گیا، انہیں کا علم مختلف علاقوں میں پھیل گیا اسی پر خلفا وائمہ اور حکام فیصلے کرنے لگے اور معاملات کا چلن اسی پر ہو گیا (مرجع سابق، ص:۴۱) خلیفہ مامون (۱۹۸-۲۱۸ھ ۸۱۳-۸۳۳ء) کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے یہ حالت ہو گئی کہ ایک دفعہ وزیر اعظم فضل بن سہیل کو ابوحنیفہ کے ایک مخالف فقیہ نے مشورہ دیا کہ حنفی فقہ کا استعمال بند کرنے کے احکام جاری کر دیے جائیں وزیر اعظم نے باخبر اور معاملہ فہم لوگوں کو بلا کر اس معاملے میں رائے لی، انہوں نے بالاتفاق کہا یہ بات نہیں چلے گی‘‘ اور سارا ملک آپ لوگوں پر ٹوٹ پڑے گا جس شخص نے آپ کو یہ مشورہ دیا ہے، وہ ناقص العقل ہے‘‘ وزیر نے کہا، میں خود بھی اس خیال سے متفق نہیں ہوں اور امیر المومنین بھی اس قول پر راضی نہ ہوں گے (مصدر سابق ۲/ ۱۵۷، ۱۵۸) اس طرح تاریخ کا یہ اہم واقعہ رونما ہوا کہ شخص واحد کی قائم کی ہوئی نجی مجلس وضع قوانین کا مرتب کیا ہوا قانون محض اپنے اوصاف اور اپنے مرتب کرنے والوں کی اخلاقی ساکھ کے بل پر ملکوں اور سلطنتوں کا قانون بن کر رہا اس کے ساتھ دوسرا اہم نتیجہ اس کا یہ بھی ہوا کہ اس نے مسلم مفکرین قانون کے لیے اسلامی قوانین کی تدوین کا ایک نیا راستہ کھول دیا بعد میں جتنے دوسرے بڑے بڑے فقہی نظام بنے اور اپنے طرز اجتہاد اور نتائج اجتہاد میں چاہے اس سے مختلف ہوں، مگر ان کے لئے نمونہ یہی تھا جسے سامنے رکھ کر ان کی تعمیر کی گئی لہٰذا باضابطہ قانونِ اسلام اور قانونِ شریعت کے مدوّن سب سے پہلے شخص امام اعظم ابوحنیفہ ہی ہیں۔

علامہ شمس الدین محمد بن یوسف صالحی شافعی دمشقی لکھتے ہیں:

’’یقیناً امام ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم شریعت کی تدوین کی ہے اور اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے پھر امام مالک بن انس نے مؤطا کی ترتیب میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کی ہے، امام ابوحنیفہ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں ہے، کیونکہ حضرات صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کا اعتماد اپنی قوتِ حافظہ پر تھا، جب امام ابوحنیفہ نے دیکھا کہ علم شریعت اکناف عالم میں پھیل گیا ہے تو آپ کو اس علم کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوا لہٰذا آپ نے اس کو ابواب اور کتابوں پر مرتب اور منضبط کیا، ابتدا کتاب الطہارت سے کی، پھر کتاب الصلاۃ، کتاب العبادات، کتاب المعاملات کو بیان کیا اور کتاب المیراث پر اس سلسلہ کو ختم کیا کیوں کہ اس کا تعلق انسان کی آخرت سے ہے امام ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے کتاب الفرائض اور کتاب الشروط تصنیف کی‘‘

فقہائے مجتہدین کی ٹیم تیار کرنا: -امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی

عنہ کا دوسرا اہم کارنامہ اپنے شاگردوں کی صورت میں فقہائے مجتہدین کی ایک زبردست ٹیم تیار کرنا ہے، اس خصوص میں بھی امام اعظم دیگر ائمۂ مجتہدین سے منفرد نظر آتے ہیں کیوں کہ آپ نے اپنی مجلس علمی میں جہاں قانون اسلام کی با ضابطہ تدوین کی وہیں اجتہادی میدان میں اپنے شاگردوں کی زبردست تربیت بھی فرمائی، اوران کے اندر یہ صلاحیت پیدا فرمادی کہ وہ کسی بھی جدید مسئلے کا حکم اصول شریعت کی روشنی میں نکال سکتے تھے علامہ محمد بن احمد ذہبی مالکی نے ''مناقب الامام أبی حنیفہ وصاحبیہ ''میں لکھا ہے کہ علمائے کبار کی ایک جماعت نے حضرت امام ابوحنیفہ سے فقاہت حاصل کی ان میں سے مندرجہ ذیل اہل علم خاص ہیں:

(۱) زفر بن ہذیل (۲) قاضی ابو یوسف (۳) آپ کے صاحب زادے حماد (۴) نوح بن ابی مریم معروف بہ نوح جامع (۵) ابو مطیع حکم بن عبداللہ بلخی (۶) حسن بن زیاد لؤلؤی (۷) محمد بن حسن شیبانی (۸) قاضی اسد بن عمرو۔

اورآپ سے بے شمار محدّثین اور فقہاء نے روایت کی، ان میں سے درج ذیل افراد بھی ہیں:

(۱) مغیرہ بن مقسم (۲) زکریا بن ابی زائدہ (۳) مسعر بن کدام (۴) سفیا ن ثوری (۵) مالک بن مغول () یونس بن ابو اسحاق (۷) شریک (۹) حسن بن صالح (۱۰) ابوبکر بن عیاش (۱۱) عیسیٰ بن یونس (۱۲) علی بن مسہر (۱۳) حفص بن غیاث (۱۴) جریر بن عبدالحمید (۱۵) عبداللہ بن مبارک (۱۶) ابومعاویہ (۱۷) وکیع (۱۸) المحاربی (۱۹) ابو اسحاق فزاری (۲۰) یزید بن ہارون (۲۱) اسحاق بن یوسف ازرق (۲۲) معانی بن عمران (۲۳) زید الحباب (۲۴) سعد بن صلت (۲۵) مکی بن ابراہیم (۲۶) ابو عاصم نبیل (۲۷) عبدالرزاق بن ہمام (۲۸) حفص بن عبدالرحمٰن سلمی (۲۹) عبیداللہ بن موسیٰ (۳۰) ابوعبد الرحمٰن مقری (۳۱) محمد بن عبداللہ انصاری (۳۲) ابونعیم (۳۳) ہوذہ بن خلیفہ (۳۴) ابو اسامہ (۳۵) ابویحیٰ حمانی (۳۶) ابن نمیر (۳۷) جعفر بن عون (۳۸) اسحاق بن سلیمان رازی وغیرہ۔ (مناقب الامام ابی حنیفۃ وصاحبیہ ص:۱۱)

امام اعظم علیہ الرحمہ والرضوان نے اپنے شاگردوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

أنتم مسا ر قلبی وجلاء حزنی ،اسریتُ لکم الفقه وأ لجمته ،وقد ترکت الناس یطؤون أعقابکم ،ویلتمسون الفاظکم ،ما منکم آحد الاّ وهو یصلح للقضاءِ، فسألتکم بالله وبقدر ما وهب الله لکم من جلا لة العلم لما مستموہ عن ذلّ الاستیجارِ(ابو حنیفه: حیاته و عصره، آراؤه وفقهه: ابو زهرة ،ص:۱۸۷)

''تم میری مسرت وشادمانی کا سامان اور میرے غم واندوہ کو دور کرنے والے ہو، میں نے تمہارے لیے فقہ پر زین کس دی ہے اور لگام لگا دی ہے اور لوگوں کو اس حال میں چھوڑ رہا ہوں کہ تمہارے نقش قدم پر چلیں ،اور تمہارے ارشادات کے طلب گار ہوں تم میں سے ہر ایک قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے میں نے تم سے اللہ کا اور اس رتبہ کا جو اللہ تعالی نے تم کو علم کی عظمت کا عطا فرمایا ہے واسطہ دے کر یہ چاہتا ہوں کہ اس علم کو اجرت لینے کی ذلت سے بچانا۔''

بہر حال یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ آپ کے تلامذہ کی ایک لمبی تعداد تھی، جنھوں نے آپ سے فقہ واجتہاد کی تربیت لی تھی خود حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ نے اپنے ان تلامذہ کی جلالتِ علمی کا اعتراف فرمایا شیخ محمد ابوزہرہ مصری نے اپنی کتاب ''ابو حنیفۃ حیاتہ وعصرہ، آراؤہ وفقھہ'' ''میں اسے لکھا ہے وہ فرماتے ہیں:''حضرت امام اعظم کے اصحاب اور تلامذہ بہ کثرت تھے ایک جماعت وہ تھی کہ کچھ مدّت تک آپ کی خدمت میں رہ کر اور فضل وکمال حاصل کر کے اپنے وطن چلی گئی اور ایک جماعت وہ تھی جو آپ ہی سے وابستہ رہی چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا''یہ میرے چھتیس اصحاب ہیں، ان میں سے اٹھائیس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قاضی بن سکیں، چھ افراد میں مفتی بننے کی صلاحیت ہے، اور دو یعنی ابو یوسف اور زفر قاضیوں اور مفتیوں کو ترتیب دینے کی لیاقت رکھتے ہیں۔'' (مرجع سابق)

خلاصہ یہ ہے کہ سیّدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کے گراں قدر کارناموں میں یہ دو کارنامے اور علمی واجتہادی خدمات ایسی ہیں جن میں حضرت امام کی ذات منفرد ہے اللہ تعالیٰ آپ کی قبر انور پر قیامت تک رحمت ونور کی موسلا دھار بارش برسائے اور آپ کو آپ کی ان خدمات جلیلہ کا وہ بدلہ عطا فرمائے جو اس کی شانِ کریمی کے لائق ہے۔

☆☆☆

مولانا ذکی اللہ مصباحی☆

امام مالکؒ کی علمی و اجتہادی خدمات

پیدائش اور سلسلۂ نسب:- حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینے میں ولید بن عبد الملک اموی کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے، چنانچہ ۹۰، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۸ھ آپ کی تاریخ پیدائش بتائی جاتی ہے۔ لیکن اکثر کی رائے ۹۳ھ کی ہے۔ اس بابت ایک روایت خود امام مالک سے ہے" **ولدت سنة ثلاث وتسعين** "، میں ۹۳ھ میں پیدا ہوا- **وفات**: ۱۴/ ربیع الثانی ۱۷۹ھ کو رشید عباسی کے زمانے میں ہوئی۔

آپ کا سلسلۂ نسب ذو اصبح نامی ایک یمنی قبیلہ سے ملتا ہے۔ آپ کا پورا نام مالک بن انس بن مالک ابو عامر اصبحی یمنی ہے۔ آپ کی والدہ کا نام عالیہ بنت شریک ازدیہ ہے۔

پرورش و پرداخت:- آپ نے ایک ایسے خاندان اور ماحول میں آنکھ کھولی جہاں اثر اور حدیث کا بول بالا تھا۔ پہلے آپ اسلامی گھرانے کے دستور و رواج کے مطابق قرآن پاک کا حفظ فرماتے ہیں پھر اس کے بعد حفظ حدیث کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ مدینے میں علم حدیث سیکھنے کا جو خوش گوار ماحول قائم تھا اس سے متاثر ہو کر آپ اپنی ماں سے اس کا اظہار فرماتے ہیں۔ چنانچہ والدۂ مکرمہ اجازت مرحمت کرتے ہوئے فرماتی ہیں: "**اذهب الى ربيعة فتعلم علمه قبل أدبه**" ربیعہ کے پاس جاؤ اور اس کے ادب سے پہلے اس کا علم سیکھو۔ آپ کو حدیث سیکھنے کا ذوق و شوق اس قدر تھا کہ ربیعہ کے حلقۂ درس سے جو کچھ سنتے یا سیکھتے اس کو درختوں کے سایے میں بیٹھ کر اعادہ کرتے۔ ایک بار ایسا کرتے ہوئے آپ کی بہن نے دیکھ لیا تو اس کا تذکرہ اپنے والد سے کی۔ انہوں نے جو ابا کہا: "**يا بنية! انه يحفظ أحاديث رسول الله صلى الله عليه وسلم**" "بیٹی! وہ رسول ﷺ کی حدیثیں یاد کیا کرتا ہے۔

درس و افتاء:- حضرت امام مالک نے آثار و فتویٰ نویسی کی تعلیم سے فراغت کے بعد مسجد نبوی میں درس و افتاء کے لیے ایک مجلس کا انتخاب فرمایا۔ جس میں دور دراز سے لوگ آیا کرتے تھے اس کام کو کس عمر میں آپ نے شروع کیا؟ یہ تحقیق سے معلوم نہیں۔ پھر اپنی زندگی کے آخری ایام میں بیماری کی وجہ سے گھر پر ہی درس دینے لگے۔ بہت سے اخبار و روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اس وقت یہ کام شروع کیا جب ربیعہ باحیات تھے۔ ربیعہ کی وفات سن ۱۳۶ھ میں ہوئی اور آپ کی پیدائش راجح روایت کے مطابق ۹۳ھ میں ہوئی اس حساب سے آپ کی عمر شریف اس وقت ۴۳ برس کی ہوئی۔

ایک نکتہ:- جس طرح آپ کے بارے میں یہ غلط روایت ہے کہ آپ والدہ کے حمل میں تین برس رہے اسی طرح کچھ لوگوں کی روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ نے درس و افتاء ۱۷ برس کی مدت میں شروع کر دیا تھا وہ بھی اپنے شیخ ربیعہ سے ناراض ہونے کے بعد، جہاں تک مذکورہ مدت حمل کی روایت کی بات ہے تو وہ طب کی روشنی میں صحیح نہیں۔ علم طب کے مطابق حمل کی مدت زیادہ سے زیادہ سال بھر کی ہو سکتی ہے۔ عقیدہ و ایمان کے حساب سے حمل کی مدت نو ماہ سے زائد کی نہیں ہو سکتی۔ رہی بات ربیعہ سے ناراضگی کی یا ۱۷ برس میں درس و افتاء کے آغاز کی تو وہ صحیح نہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ربیعہ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر ۴۳ برس ہو رہی تھی اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ اس سے پہلے اس کام کو شروع کیا ہو بلکہ ایسا اس سے پہلے ضروری بھی ہے۔

پیشہ اور حکام سے تعلق:- آپ کی روزی کا ذریعہ کیا تھا؟ اس سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کے والد کا پیشہ تیر سازی تھا۔ اور آپ بچپن ہی میں حصول علم حدیث کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے علم کے ساتھ یہ پیشہ بھی بطور روزی کمانے کے لیے اختیار کیا ہو۔ دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے بھائی نضر روئی کے کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور وہ خود علم اور طلب حدیث میں مشغول تھے۔ حضرت امام مالک ان کے ساتھ اس کو بیچا کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی روزی کا ذریعہ تجارت رہی ہو۔

☆Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia,22,Zakir Nagar,Okhla, New Delhi

آپ کے خلفاء اور حکام سے بھی تعلقات تھے- ان کے طرف سے آنے والے ہدایا وتحائف کو قبول کرلیا کرتے تھے- جب کہ آپ کے معاصر حضرت امام ابوحنیفہ نہ تو اموی خلفا کے ہدایا قبول فرماتے اور نہ بنو عباس کے خلفا کے- ایک بار آپ سے خلفاء کے اموال قبول کرنے کی بابت سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "أما الخلفاء فلا شک ،یعنی أنه لا باس به، و أمامن دونهم فان فيه شيئا" رہی بات خلفاء کی تو اس میں کوئی شک نہیں- یعنی ان سے کچھ لینے میں کوئی حرج نہیں، جہاں تک ان کے علاوہ کی بات ہے تو اس میں باعث حرج ہے- اس کی وجہ آپ کی نظر میں یہی رہی ہوگی کہ خلفاء اپنی خواہش کی چیزوں کو اپنے لیے جمع کر لیا کرتے تھے اس میں سے نکال کر بھیجا کرتے تھے جسے قبول کرنے میں آپ کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے- ایک روایت میں آیا ہے کہ رشید نے آپ کے لیے تین ہزار دینار بطور وظیفہ مقرر کردیا تھا- اس سلسلے میں آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: "لو کان امام عدل فأنصف اهل المروءة لم اربه بأسا" اگر امام عدل ہوتا تو صاحب مروت شخص ضرور انصاف کرتے لہذا میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا ہوں۔

حکام کے ساتھ آپ کا سلوک:- حکماء اور خلفاء سے تعلق کے باوجود علم اور علماء کی عظمت کو ان کی شان وشوکت پر ترجیح دیتے، چنانچہ طاش کبری زادہ اپنی تصنیف مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۸۶ میں فرماتے ہیں: ہارون نے آپ کے پاس اپنی مجلس میں حاضر ہونے کا پیغام بھیجا تا کہ آپ سے ان کے دونوں بیٹے امین اور مامون مؤطا سن سکیں- چنانچہ انہوں نے آپ سے یہ درخواست کی کہ اے بندۂ خدا! بہتر یہ ہے کہ آپ ہمارے پاس آئیں تا کہ ہمارے بچے مؤطا سن سکیں- اس پر آپ نے فرمایا: امیر المومنین کو اللہ عزت بخشے! علم آپ کی جانب سے نکلا ہے، اگر آپ اس کی عزت کریں گے تو وہ باعزت ہوگا اور اگر آپ کو رسوا کرتے ہیں تو ذلیل ہوگا- علم کے پاس آیا جاتا ہے وہ خود کسی کے پاس نہیں جاتا- اس پر مامون نے کہا: آپ نے سچ کہا، پھر انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو مسجد جانے کو کہا تا کہ وہ دونوں لوگوں کے ساتھ مؤطا کی سماعت کرسکیں۔ حضرت مالک نے فرمایا: لیکن شرط یہ ہے کہ وہ لوگوں کی گردنوں کو پھلانگے نہیں اور مجلس جہاں ختم ہو رہی ہو وہیں بیٹھیں- اس شرط کے ساتھ دونوں مسجد میں حاضر ہوئے- اسی طرح کا واقعہ رشید کے ساتھ پیش آیا کہ انہوں نے اسی کتاب مؤطا کو اپنے پاس لانے کو کہا تو آپ نے اس کے پاس جانے سے انکار فرمادیا چنانچہ خلیفہ کو کہنا پڑا" واللہ لا نسمعه الا في بيتک "بخدا! ہم آپ کے گھر میں ہی اسے سماعت کریں گے-

حدیث وفقہ میں آپ کا مرتبہ:- حضرت امام شافعی آپ کے مرتبۂ حدیث وفقہ کے بارے میں فرماتے ہیں:" اذا ذكر العلماء ،فمالک النجم ،وماأحدأمن علي من مالک " جب علما کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو مالک ستارے کی مانند بلند ہوتے ہیں۔ اور مجھ پر مالک سے زیادہ کسی کا احسان نہیں۔ امام محمد ابوزہرہ فرماتے ہیں: امام مالک رضی اللہ تعالی عنہ کی فقہ میں دو باتیں نمایاں ہیں" ایک یہ کہ مالک رضی اللہ تعالی عنہ جہاں فقیہ اثر تھے وہیں فقیہ رائے بھی تھے۔ جس طرح اپنی فقہ کے اندر اثر کا بکثرت استعمال کرتے وہیں رائے کو بھی خوب استعمال کرتے ہیں- متقدمین ان کو فقہائے رائے میں شمار کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ سے جو فقہ مروی ہے اور اس کا جو طریقہ ہے وہ ان کے اس قول پر شہادت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت امام مالک کے یہاں رائے کے بہت سے وسائل تھے لیکن ان کا مرجع ایک ہی اصل تھا اور وہ تھا جلب مصلحت اور رفع حرج۔

آپ کے شیوخ کرام:- آپ کے شیوخ کرام میں **ابن ہرمز** ہیں جن سے آپ نے مسلسل سات برس یا اس سے کچھ زائد عرصہ تک استفادہ کیا- اس دوران کسی اور سے استفادہ نہیں کیا- اس کے بعد بھی وقتا فوقتا ان سے استفادہ کرتے رہے- ایک قول میں یہ ہے کہ آپ کا ان سے تقریبا سترہ برس تک علمی رابطہ رہا- ایک دوسرے قول میں یہ ہے کہ آپ کا ان سے تقریبا تیس برس تک علمی رابطہ رہا-

نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر:- ان سے امام مالک نے حضرت عبد اللہ کی فقہ اور ان سے پوچھے جانے والے مسائل کے سلسلے میں جواب اور افتا کا علم سیکھا- حضرت نافع اس سلسلۃ الذہب کی کڑی ہیں جس کے بارے میں خود حضرت ابوداؤد نے أصح الاسانید فرمایا- وہ سلسلۂ ذہب اس طرح ہے: مالک عن نافع عن ابن عمر -آپ کا انتقال باختلاف روایت ۱۱۷ھ یا ۱۲۰ھ میں ہوا-

ابن شہاب زہری:- ان سے حضرت مالک نے علم حدیث سیکھا- آپ ان کے سب سے بڑے راوی ہیں- مؤطا میں بھی ابن شہاب کے واسطے سے بہت سی احادیث ہیں-

ابوزناد:- یہ امام مالک کے سب سے آخری استاذ ہیں جن کا پورا

نام عبداللہ بن ذکوان ہے جو موالی میں سے تھے اوران کی اصل ہمدان سے تھی۔کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی لیکن ابوزناد کی کنیت ان پر غالب آگئی۔ ان کا انتقال ۶۶ برس میں رمضان ۱۳۰ھ یا ۱۳۱ھ میں غسل خانے کے اندر اچانک ہوا۔ان سے آپ نے صرف صحابہ اور تابعین سے منقول حدیث اور فقہ پڑھی۔

ربیعۃ الرای:-آپ حضرت امام مالک رضی اللہ تعالی عنہ کے پہلے استاذ ہیں۔ان سے انہوں نے فقہ اثر سیکھی جس کا معنی ومطلب اثر پر ہی مبنی ہوتا ایسا نہیں کہ اس کے معانی اپنی طرف سے نکالے گئے ہوں۔آپ کے فتوی دینے کا طریقہ یہ تھا کہ اس کا حل اثر میں تلاش کرتے تب فتوی دیتے اگر اس کے بارے میں کوئی اثر نہیں ملتا تو اثر پر مبنی معانی اخذ کر کے فتوی دیتے۔

ایک نکتہ:-بعض روایت میں امام مالک کے پہلے استاذ حضرت ربیعہ الرای کو بتایا گیا ہے جب کہ بعض روایت میں ابن ہرمز کو۔ان دونوں روایت میں تطبیق کی صورت یہ ہوگی کہ طلب علم کے لیے سب سے پہلے اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں آپ ربیعہ کے پاس گئے ہوں پھر آپ کے والد نے آپ کے بچپن ہی میں یہ خیال کیا ہو کہ ربیعہ سے آپ کا استفادہ محدود شکل میں ہے تو مالک نے ابن ہرمز کی طرف رخ کیا ہو۔

دیگر علماء سے روابط:-آپ کی شخصیت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا ربط وتعلق اپنے شیوخ کے علاوہ دیگر علماء سے بھی رہا خواہ وہ فقہا ہوں یا نہ ہوں۔ان علماء سے آپ کا تعلق تین نوعیت کا تھا (۱) حج کے موقع پر براہ راست علماء سے ملتے (۲) مدینے کے علماء کے ساتھ مسلسل نشست ہوتی (۳) اور کتابوں سے۔

دولت عباسیہ میں مختلف فرقوں کا ظہور:-مامون، معتصم اور واثق جن کے دور کو آپ نے پایا، ان کے دور میں دو قسم کے فرقوں کا ظہور ہوا: ایک سیاسی، دوسرا اعتقادی۔ان کے بارے میں آپ کا موقف کیا تھا؟ اس کو بیان کرنے سے پہلے ان کے نظریات کو بیان کرنا ضروری ہے تا کہ بہ آسانی ان کے تئیں آپ کے موقف تک رسائی حاصل کی جاسکے۔

سیاسی فرقوں میں شیعہ اور خوارج تھے۔اعتقادی فرقوں میں قدریہ، جہمیہ (جبریہ) اور مرجئہ۔

شیعی فرقہ: تمام اسلامی فرقوں میں قدیم ہے جو حضرت عثمان کے آخری دور میں ظہور پذیر ہوا۔اس کا ماننا تھا کہ حضرت علی بن ابو طالب خلافت کے زیادہ حق دار تھے، پھر اس میں بھی مختلف فرقے کا ظہور ہوا جنہوں نے حضرت علی کی تقدیس میں دینی حد سے تجاوز اختیار کیا۔ان میں سے سبئیہ اور غرابیہ تھے۔

سبئیہ:-عبداللہ بن سبا کے پیروکار تھے۔انہوں نے حضرت علی کو صفت الوہیت سے متصف کیا، تو ان میں سے بعض کو حضرت علی نے نذر آتش کر دیا۔

غرابیہ:-اس کا ماننا تھا کہ نبوت حضرت علی کو ملنی تھی لیکن حضرت جبرئیل بھٹک گئے اور غلطی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے۔پھر اس میں سے دوسرے گروہ ظاہر ہوئے ان میں ایک معتدل اور میانہ روی اختیار کیے ہوئے تھا۔دوسرا غالی اور حد اعتدال سے متجاوز تھا۔ پہلے کو **زیدیہ** کہا جاتا ہے جو زید بن علی زین العابدین کا پیرو تھا جو شیخین حضرت ابوبکر وعمر کی امامت کو صحیح نہیں مانتا تھا اور دیگر صحابہ پر طعنہ زنی نہیں کرتا۔دوسرا گروہ جو غالی اور حد اعتدال سے متجاوز تھا اس میں بھی مختلف گروہ کا ظہور ہوا (۱) کیسانیہ (۲) امامیہ اثناعشریہ (۳) اسماعیلیہ۔

کیسانیہ:-مختار کا پیرو تھا جو دولت مروانیہ کا پہلا شخص تھا۔**امامیہ اثناعشریہ**: اس کا ماننا تھا کہ اس کے بارہ امام ہیں جو 'سر من رای' میں غائب ہو گئے ہیں وہ آخری زمانہ میں ظہور پذیر ہو کر دنیا کو حق وصداقت اور عدل وانصاف سے معمور کریں گے، اس فرقے کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے، یہ فرقے زیادہ فارس میں پائے جاتے ہیں۔

اسماعیلیہ:-اس فرقے کے کچھ لوگوں نے فاطمیوں کے نام پر حکومت مصر کی باگ ڈور سنبھالی۔

دوسرا سیاسی گروہ **خوارج** کا تھا جس کا ظہور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں آپ کے ثالث اور فیصل کا کردار ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ہوا پھر اس نے آپ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور کہا کہ اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا، بلکہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ حضرت علی نے تحکیم کی ذمہ داری قبول کر کے کفر کیا لہذا اس کو چھوڑنا اور آپ پر توبہ کرنا ضروری ہے پھر اس نے ہی آپ کو شہید کر ڈالا۔

دولت امویہ میں مختلف گروہوں کا ظہور:-دولت عباسیہ میں ظہور پذیر ہونے والے گروہ ایک تو ایسے ہی دولت امویہ کے لیے خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں تھے دوسرا یہ کہ مزید دوسرے فرقوں کا ظہور دولت امویہ میں ہو رہا تھا جن کے نظریات کا لب لباب اور خلاصہ یہی تھا کہ خلافت کا کوئی مستحق نہیں، خلیفہ آزادانہ اختیار حاصل کر لیتا ہے لہذا بہتر یہ ہے کہ اس کے تئیں طرفداری یا عصبیت نہیں برتی جائے تا کہ اس

کا تختہ پلٹنے میں آسانی ہو- یہ گروہ گناہ کے مرتکبین کی تکفیر کیا کرتے تھے ان میں بھی مختلف فرقے ہوئے - اعتدال وغلو کے اعتبار سے ان کے اعمال اور نظریات میں ایک دوسرے سے تفاوت تھا - ان میں سے ازارقہ اور اباضیہ ہیں-

ازارقہ: نافع بن ازرق حنفی کے متبعین تھے جو غالی قسم کے تھے- جماعت اسلامی سے یہ بہت قریب تھے -**اباضیہ**: یہ عبداللہ بن اباض المری التیمی کا پیروکار تھا- ان کا ماننا تھا کہ ان کے مخالفین نہ کفار ہیں اور نہ مشرک بلکہ وہ کفار نعمت ہیں - ان کے مخالفین کا خون حرام ہے، ان کی شہادت جائز ہے- اس فرقے کے کچھ لوگ مراقش میں پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ عمان، مشرقی افریقہ، طرابلس الغرب اور جنوبی الجزائر میں بھی پائے جاتے ہیں، استعراض ”سیاسی قتل“ کے منکر ہیں، غیر اباضیوں سے نکاح کی اجازت ان کے یہاں ہے، پھر اباضیہ اور ازارقہ میں بھی مختلف فرقے کا ظہور ہوا جن میں نجدات، صفریہ اور عجاردۃ ہیں- **نجدات**: نجدۃ بن عویمر جو بنی حنیفہ کے قبیلے سے تھا، اس کے متبعین تھے -**صفریہ**: زیاد بن اصفر کے متبعین تھے -**عجاردۃ**: عبدالکریم بن عجرد کے متبعین تھے-

خوارج: - اس میں کچھ وہ لوگ تھے جو اپنی بعض آرا میں اسلام سے خارج تھے- ان کے دو فرقے ہیں: یزیدیہ اور میمونیہ - یزیدیہ: یزید بن انیسہ کے متبعین تھے- ان کا ماننا تھا کہ اللہ تعالی عجمیوں میں سے ایک رسول بھیجے گا جسے کتاب دی جائے گی جو شریعت محمدی کو منسوخ کرے گی-

میمونیہ: - میمون عجردی کے متبعین تھے اس نے نواسیوں، پوتیوں، بھتیجیوں اور بھانجیوں سے نکاح کو جائز قرار دیا - ان کا ماننا تھا کہ ان کا ذکر قرآن میں نہیں ہے- اس کے بارے میں یہ بھی مروی ہے کہ اس نے سورۂ یوسف کا انکار کیا، اس کو وہ قرآن شمار نہیں کرتے -

اعتقادی فرقوں کا ظہور: - جن اعتقادی فرقوں کا ظہور آپ کے دور میں ہوا- وہ مرجئہ، جبریہ (جہمیہ) اور قدریہ ہیں-

مرجئہ: - یہ اصول دین کو سیاست سے مربوط کرتا تھا- جب یہ مسئلہ اٹھا کہ آیا گناہ کا مرتکب جہنم میں ہمیشہ رہے گا یا نہیں؟ تو اس فرقے نے کہا کہ ایمان کے ساتھ معصیت نقصان نہیں دیتی جس طرح کفر کے ساتھ عمل فائدہ مند نہیں ہوتا- **معتزلہ** مرجئی ہر شخص کو کہتے تھے جو یہ نہیں مانتا تھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب جہنم میں ہمیشہ رہے گا- اس بنا پر حضرت ابوحنیفہ کو مرجئی کہا گیا جب کہ شہرستانی نے آپ کو مرجئ اللہ گردانا یعنی گناہ گاروں کے لیے عفو الٰہی کی امید کرنے والا نہ کہ منکرات کو مباح تسلیم کرنے والا-

جبریہ: - (جہمیہ): اس کا ماننا تھا کہ انسان کو اپنے افعال میں کوئی ارادہ نہیں ہوتا - اللہ تعالی ہی ہر طرح کے عمل خواہ وہ برا ہو یا اچھا، کا خالق ہوتا ہے جو بندہ کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتا ہے- بندہ اپنے افعال کے تئیں اس پر کی مانند ہے جس کو ہلکی سی ہوا بھی حرکت دے دیتی ہے- اس عقیدہ کا پرچار اموی دور میں خوب ہوا - اس نظریہ کی جس نے تشہیر کی اس کا نام جہم بن صفوان تھا اسی وجہ سے اس کا نام جہمیہ پڑ گیا-

قدریہ: - اس کا ماننا تھا کہ انسان اپنے اختیاری افعال کا خالق ہے- ان میں کچھ وہ لوگ تھے جن کو تاریخ اسلام میں معتزلہ کہا جاتا ہے- جن کی عباسی دور میں اسلامی فکر میں زبردست اہمیت حاصل تھی کیوں کہ انہوں نے زندیقیوں کی تردید کی - اس فرقہ کے پانچ بنیادی اصول ہیں-

توحید: - ان کی نظر میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنی ذات اور صفات میں ایک ہے لہذا کوئی مخلوق کسی صفت میں اس کا شریک نہیں، اسی وجہ سے انہوں نے رویت باری کا انکار کیا-

(۱) عدالت من جانب اللہ: لہذا اس کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالی لوگوں اور اس کے افعال کا خالق ہو، تاکہ ثواب وعقاب اور تکلیف عام طور پر ملے-

(۳) وعد ووعید من جانب اللہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی محسن کو احسان کا اور مسیٔ کو اساءۃ (برائی) کا بدلہ دے گا اور مرتکب گناہ کبیرہ کو معاف نہیں فرمائے گا-

(۴) مرتکب کبیرہ مومن اور کافر کے درمیانی درجہ میں ہے اس کا نام مومن فاسق ہے، اس کا نام مومن کبھی نہیں ہوسکتا وہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا-

(۵) **امر بالمعروف ونہی عن المنکر**: - ان دونوں چیزوں کو دعوت اسلامی کی اشاعت اور گمراہوں کی ہدایت کے لیے واجب قرار دیا ہے، لہذا استطاعت بھر ہر شخص پر دعوت کا فریضہ انجام دینا ضروری ہے- جو بزور تلوار دعوت کی خدمت انجام دے سکتے ہیں وہ تلوار سے اور جو صاحب لسان ہوں وہ زبان سے اس فریضہ کو انجام دیں-

عقائد کے سلسلے میں آپ کا موقف: - جب عقائد سے متعلق کسی ایسے مسئلے میں جس پر مختلف فرقوں نے خوب بحث وتمحیص کی ہو اس میں پڑنے کی بجائے مختصر جواب دیتے جس میں اثر پر اعتماد ہوتا اور کتاب وسنت میں صریح جواب نہ ملنے کی صورت میں اجتناب کرتے-

چنانچہ ایک بار آپ سے ایک شخص نے ” الرحمن علی

العرش استوی" پڑھ کر کہا: کیسے اللہ نے استوا فرمایا؟ حضرت امام مالک تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے یہاں تک کہ آپ پسینے سے شرابور ہو گئے۔ جب یہ کیفیت دور ہو گئی "تو آپ نے فرمایا استوا معلوم ہے لیکن کیفیت عقل میں نہیں آنے والی ہے۔ اس قسم کا سوال بدعت ہے اور استوا پر ایمان واجب ہے۔ میں تجھے گمراہ خیال کرتا ہوں۔ اس پر اس شخص نے کہا: اے بندۂ خدا! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہی سوال میں نے اہل بصرہ، کوفہ اور عراق سے پوچھا، لیکن کسی کو ایسے جواب کی توفیق نہ دی گئی جس جواب کی توفیق آپ کو عنایت کی گئی۔

ایمان کے نقص وزیادت کے بارے میں آپ کا موقف:-

حضرت امام مالک ایمان کو نہ صرف اعتقادی اور نہ صرف قولی مانتے تھے بلکہ یہ مانتے تھے کہ ایمان اعتقاد، قول اور عمل کا مجموعہ ہے۔ آپ کی نظر میں طاعت ایمان تھی یونہی نماز پڑھنا بھی۔ اس پر استشہاد یوں پیش کرتے ہیں کہ نماز پہلے بیت المقدس کی طرف منھ کر کے پڑھی جاتی تھی۔ پھر خانۂ کعبہ کی طرف پڑھی جانے لگی۔ مومنین کو ڈر ہوا کہ کہیں ان کی گذشتہ نمازیں اکارت نہ چلی جائیں تو اللہ تعالی نے فرمایا" وما کان اللہ لیضیع ایمانکم " اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں۔ یہ آیت اس پر دال ہے کہ نماز ایمان ہے اور نماز فعل ہے لہذا ایمان قول اور فعل کا مجموعہ ہوا۔ آپ قرآن وسنت کے ظاہری لفظ سے بھی استشہاد کرتے تھے لہذا پہلے آپ ایمان کی زیادت اور نقص اور بعض ایمان کا بعض سے افضل ہونے کا قول کرتے تھے لیکن جب دیکھا کہ زیادت ایمان کے بارے میں آیت مذکور ہیں تو صرف زیادت کا قول کرنے لگے اور نقص ایمان کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی۔

تقدیر اور افعال انسان کے بارے میں آپ کا موقف:-

پیچھے اس سلسلے میں اعتقادی فرقوں کے بارے میں ان کے موقف کا بیان کیا جا چکا ہے کہ تقدیر اور افعال انسان کا مسئلہ خلفاء راشدین کے آخری دور میں اٹھا مگر اموی دور میں اس نظریے کی خوب تشہیر ہوئی۔ دو اعتقادی گروہوں کا موقف ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھا۔ جبریہ جس کا سرغنہ جہم بن صفوان تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ انسان کو اپنے اعمال میں کوئی ارادہ ودخل نہیں ہوتا۔ اگر فعل کی نسبت انسان کی طرف کی بھی جائے تو اس میں انسان کا کچھ اختیار نہیں ہوتا۔ قدریہ جس کا سرخیل غیلان ثقفی تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ انسان اپنے افعال مکلفہ میں بالکل آزاد ہے، لہذا انسان اگر اچھا عمل کرتا ہے تو اچھا بدلہ پائے گا اور برا کرتا ہے تو برا۔ حضرت امام مالک کا قدریہ کے اعتقاد کو ناپسند کرنے کے باوجود ان کو مشرک نہیں مانتے اور نہ یہ کہ وہ دین سے خارج ہیں کہ ان سے نکاح، ان کی اقتدا میں نماز پڑھنا اور ان کا جنازہ پڑھنا جائز نہ ہو۔ یونہی جبریہ کے اعتقاد کی موافقت میں آپ سے کوئی صریح قول منقول نہیں۔ کیوں کہ آپ کا ماننا تھا کہ ان جیسی چیزوں میں پڑنا جمال دین کے لئے نقصان دہ اور لوگوں کو پریشانیوں میں مبتلا کرنا ہے۔

خلق قرآن کے بارے میں آپ کا موقف:- خلق قرآن کا مسئلہ جب خوب زور وشور سے اٹھا جس کو قدریہ اور معتزلہ خوب ہوا دے رہے تھے تو آپ نے اس میں پڑنے سے خود کو روکے رکھا اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اس میں پڑنے والے کو مستحق سزا قرار دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:" القرآن کلام اللہ ، ومن قال: القرآن مخلوق ، یوجع ضرباً ویحبس حتی یتوب " قرآن اللہ کا کلام ہے لہذا جو قرآن کو مخلوق کہے اسے دردناک پٹائی کی جائے اور قید کر دیا جائے تا آں کہ وہ اس سے توبہ کر لے۔

رویت باری کے بارے میں آپ کا موقف:- اس مسئلہ کو معتزلہ نے اٹھایا اور کہا کہ رویت باری تعالی محال ہے کیوں کہ اس سے اللہ کے لئے مکان ہونا لازم آلے گا حالانکہ اس کے لئے مکان نہیں۔ کیوں کہ جو مکان میں ہوتا ہے وہ اجسام کے قبیل سے ہوتا ہے اور اللہ جسم وجسمانیات سے منزہ ہے اور ہر قسم کے حدوث سے مبرا ہے اس لئے کہ وہ واجب الوجود ہے لہذا حدوث کی صفت واجب الوجود کے لئے صحیح نہیں۔ حضرت امام مالک رضی اللہ تعالی عنہ نے رویت کی نفی میں قرآن میں موجود آیتوں کی تاویل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ رویت باری تعالی آخرت میں ہوگی نہ کہ دنیا میں۔

اعتقادی اور سیاسی فرقوں کے بارے میں آپ کا موقف:-

اس بارے میں آپ کا موقف بیان کرنا اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ آپ کی زندگی میں خوارج، شیعہ، حکومت امویہ اور دولت عباسیہ کا ظہور ہوا۔ ان میں سے ہر گروہ ایک دوسرے کے موقف کے خلاف تھا۔ چنانچہ شیعہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان پر طعنہ زنی کرتے، خوارج حضرت عثمان، علی، عمرو بن العاص اور معاویہ بن ابوسفیان وغیرہ کو برا بھلا کہتے۔ عباسیہ: خلافت کو بنو ہاشم میں سے صرف بنو عباس میں مانتے۔ امویہ

خلافت کو صرف قریش میں مانتے اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ سے مروی حدیث ہے "الائمۃ من قریش" ائمہ قریش سے ہیں، کو دلیل میں پیش کرتے۔ ایسے عالم میں ان کے خلاف جو اصحاب رسول ﷺ کو برا بھلا کہتے آپ نے فرمایا: یہ جرم عظیم ہے، اور ایسے شہر میں جہاں ان کے خلاف طعنہ زنی کی جاتی ہو ٹھیک اس شہر کی مانند ہے جہاں پر حق پر عمل نہ ہو سکے، ان کو غنیمت کا بھی مستحق نہیں مانتے تھے، البتہ آپ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان کے علاوہ دوسرے صحابہ کو ایک دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے، چنانچہ آپ سے منقول ہے کہ کسی علوی نے سوال کیا، رسول ﷺ کے بعد لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ابوبکر، پھر اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: عمر، پھر اس نے کہا: پھر کون؟ آپ نے ارشاد فرمایا: وہ خلیفہ جو ظلماً شہید کیا گیا یعنی عثمان، اس پر علوی نے کہا: "واللہ، لا أجالسک أبدا" میں آپ کے ساتھ کبھی نہیں بیٹھوں گا، آپ نے فرمایا: "الخیار لک" "تمہیں اختیار ہے۔ رہی بات خلافت کے حوالے سے تو آپ کا موقف اس بارے میں یہ تھا کہ خلافت نہ تو صرف علوی گھرانے اور نہ صرف قریشی گھرانے پر موقوف مانتے۔ چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکر، عمر، اور عثمان کی خلافت کو اختیار نبوی مانا جس میں سے کوئی ہاشمی گھرانے سے نہ تھے بلکہ وہ قریشی تھے۔ یونہی حضرت علی کی عظمت کو ان کی عظمت سے نہ ملایا جب کہ آپ ہاشمی تھے۔

آپ کی کتاب "موطا":۔ حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ نے الموطا کی تالیف عباسی خلیفہ منصور (۱۳۶ھ/۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ/۷۷۵ء) کے حکم کے تحت شروع کی اور اس کے آخری زمانۂ خلافت تک اس کے مسودے سے فارغ ہوئے، خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ/۱۶۹ھ) کے زمانۂ خلافت میں یہ بہ شکل روایت اور کتاب، منظر عام پر آئی اس کی تالیف میں آپ چالیس سال تک مشغول ومصروف رہے۔ اس کتاب کے تقریباً ایک ہزار راوی ہوئے۔ اس کتاب کی روایت متعدد طرق سے ہوئی ہے مگر اس کے متداول نسخے دو ہیں ایک بروایت یحیٰ بن یحیٰ اللیثی المصودی الاندلسی (م ۲۳۴ھ/۸۴۸ء) دوسری براویت امام محمد بن حسن شیبانی (م ۱۸۹ھ/۸۰۴ء) اس کی تصنیف مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کو دھیان میں رکھ کر ہوئی، کیوں کہ قاضی اور مفتی وسیع اسلامی سلطنت میں جو احکام نافذ کرتے تھے ان میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس لیے ارباب سیاست یہ مانتے تھے کہ فیصلوں میں استحکام نہیں ہے۔ لہٰذا خلیفہ کوئی ایسی جامع الاحکام کتاب مقرر کرے۔ جس کی روشنی میں مقدمات کا تصفیہ ہو اور جو اس کے خلاف فیصلہ صادر کرے اس کے خلاف حکم امتناعی صادر کیا جائے۔ اس کتاب کے حوالے سے خود امام شافعی فرماتے ہیں: میری کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے، صحابہ کے اقوال ہیں پھر تابعین کے اقوال ہیں اور رای یعنی اجماع اہل مدینہ ہے۔ میں ان سے باہر نہیں نکلا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی فقہ کے اصول: سنت، فتاوی صحابہ، فتاوی تابعین اور اجماع ہیں، لیکن امام محمد ابوزہرہ نے اس کے علاوہ حسب ذیل اصول آپ کی فقہ سے متعلق گنائے ہیں۔

عمل اہل مدینہ، قیاس، استحسان، استصحاب، مصالح مرسلہ مصلحت ونصوص، ذرائع اور عادت وعرف۔

مذکورہ قول کی روشنی میں یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ الموطا کو حدیث کی کتاب شمار کی جائے لیکن چوں کہ اس کا مواد، ترتیب اور مقصد عملی امور وحالات سے متعلق ہے اور یہی فقہ ہے۔ حضرت امام مالک کے زمانے میں فقہ وحدیث دو الگ الگ چیزیں نہ تھیں اور ان کے مفہوم میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ بعد میں اس میں ارتقاء اور نشو ونما ہونے کی وجہ سے یہ دو الگ الگ چیزیں ہوئیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ الموطا کے اندر کچھ فقہ ہے کچھ اصول فقہ اور کچھ حدیث۔

وہ کتابیں جن سے آپ کے فقہی مذہب کو فروغ ملا:۔ جن کتابوں سے آپ کے مذہب مالکی کو فروغ ملا وہ مدونہ، واضحہ، عتبیہ اور موازیہ ہیں، اس کی قدرے تفصیل یوں ہے کہ حضرت عبد الملک بن حبیب اندلس آئے وہاں انہوں نے "واضحہ" نام کی کتاب مدون کیا اور مذہب مالکی کو عام کیا۔ پھر محمد بن احمد بن عبد العزیز عتبی نے عتبیہ مدون کیا۔ اسد بن فرات نے اصحاب امام ابوحنیفہ کے بارے میں لکھا تب مذہب مالکی کی جانب رخ کیا۔ چنانچہ انہوں نے عبد الرحمٰن بن قاسم کے پاس رہ کر تمام فقہی ابواب کے متعلق لکھ کر قیروان آئے۔ جو کچھ انہوں نے لکھا تھا اسی کا نام اسد بن فرات کی طرف نسبت کرتے ہوئے اسدیہ نام رکھا۔ پھر اسی اسدیہ کو سحنون نے اسد بن فرات کو پڑھ کر سنایا اور مشرق چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ابن قاسم سے ملاقات کی۔ یہاں انہوں نے ان سے اسدیہ کے مسائل کے بارے میں بحث کیا اور ان سے سیکھا انہوں نے اس کتاب کے بہت سے مسائل سے رجوع کیا اور

اسدیہ کے مسائل کو لکھ کر مدون کرنا شروع کیا اور جن مسائل سے انہوں نے رجوع کیا تھا اس کو باقی رکھا۔ اور مدونہ نام رکھا۔ اس کے بعد انہوں نے اسد کے نام لکھا کہ وہ کتاب سحنون (مدونہ) کی پیروی کریں۔ اس پر اسد نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اس لیے لوگوں نے اسدیہ کو چھوڑ کر مدونہ کی پیروی میں لگ گئے، حالاں کہ اس کے اندر بھی بہت سے مسائل میں اختلاط تھا یہی وجہ سے اس کو مختلطہ بھی کہا جاتا ہے۔

چنانچہ اہل قیروان مدونہ اور اہل اندلس نے واضحہ اور عتبیہ پر سارا دھیان دیا، پھر ابن ابی زید نے اسی مدونہ یا مختلطہ کا اختصار پیش کیا اور "المختصر" نام رکھا پھر اسی کتاب "المختصر" کی تلخیص ابو سعید البراذعی جو قیروان کے ایک فقیہ تھے، نے کی اور اس کا نام تہذیب رکھا۔ اس کے بعد اہل افریقہ نے اس تہذیب پر اعتماد کر کے واضحہ اور دیگر کتابوں کو چھوڑ دیا۔ اہل اندلس نے عتبیہ پر اعتماد کر کے واضحہ اور دیگر کتابوں کو چھوڑ دیا۔ بعد میں انہی امہات الکتب کی تشریح و توضیح اور جمع و تالیف علمائے مالکیہ کرتے رہے۔ موازیہ: یہ حضرت محمد بن ابراہیم بن زیاد اسکندری کی تصنیف ہے جو ابن مواز کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کا انتقال سن ۲۶۹ھ میں ہوا۔ اسی کتاب کے بارے میں مدارک میں اجل کتاب ألفه المالكيون، أصح مسائل، و أبسطه كلاما، وأوعبه (یہ مالکیوں کی لکھی کتابوں میں سب سے ممتاز، اس کے مسائل صحیح ترین اور اس میں شرح وسط کے ساتھ مسائل مذکور ہیں) جب کہ اسی کتاب کو ابو الحسن القابسی نے مذہب مالکی کی تمام امہات الکتب پر ترجیح دی۔

آپ کے تلامذہ: - میں حضرت عبد اللہ بن وہب، عبد الرحمن بن القاسم، اشہب بن عبد العزیز القیسی العامری، اسد بن فرات بن سنان اور عبد الملک بن الماجشون ہیں۔

عبداللہ بن وھب: - آپ بربری نژاد ہیں جب کہ آپ کی رشتہ داری قریش سے ہے۔ آپ حضرت امام مالک کی صحبت میں بیس برس رہے۔ مصر میں فقہ مالکی کو عام کیا۔ مصر، حجاز اور عراق کے چار سو سے زائد شیوخ سے استفادہ کیا۔ آپ کی وفات ۱۹۷ھ میں ۷۲/سال کی عمر میں ہوئی۔ پیدائش ۱۲۵ھ یا ۱۲۴ھ بتائی ہے۔

عبدالرحمٰن بن القاسم: - آپ تقریبا ۲۰/برس حضرت امام مالک کی صحبت میں رہے۔ آپ کی موطا کی روایت صحیح ترین شمار کی جاتی ہے۔ آپ سے سحنون نے مدونہ سیکھی۔ اس بنا پر آپ اس کے ناقل ہیں۔ آپ متقی، زاہد اور عابد تھے۔ بادشاہ کے انعامات کو قبول نہیں کرتے۔ بھائیوں کی کثرت کو غلامی تصور کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: ایاک ورق الاحرار۔ آزاد لوگوں کی غلامی سے بچو۔ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: کثرۃ الاخوان۔ بھائیوں کی کثرت۔ آپ کا انتقال ۱۹۱ھ میں ۶۳ برس میں ہوئی۔ ولادت ۱۲۸ھ میں ہوئی۔

اشھب بن عبدالعزیز قیسی عامری: - انہوں نے لیث، یحیٰ بن ایوب، ابن لہیعہ سے سیکھا پھر امام مالک کی صحبت میں رہ کر آپ کی فقہ سیکھی، آپ فقہ مالکی کے ایک راوی ہیں۔ آپ ابن قاسم کے ہم پلہ تھے لیکن عمر میں اس سے چھوٹے تھے۔ سحنون جوان دونوں حضرات کے شاگرد تھے، ان سے پوچھا گیا: أيهما أفقه؟ ان دونوں میں کون بڑا فقیہ ہے۔ انہوں نے کہا: کانا کفرسی رهان، ربما وفق هذا، وخذل هذا، وربما خذل هذا، ووفق هذا، دونوں بازی کے گھوڑے کی طرح ہیں۔ کبھی ایک غالب آجاتا ہے اور دوسرا شکست کھا جاتا تو کبھی دوسرا غالب آجاتا ہے اور پہلا شکست کھا جاتا ہے۔ آپ کی بھی ایک کتاب کا نام مدونہ ہے جو سحنون کے علاوہ ہے اس کے علاوہ آپ کی دوسری کتابیں ہے ایک کتاب الاختلاف فی القسامۃ اور دوسری فضائل عمر بن عبد العزیز میں ہے۔

آپ کی پیدائش ۱۴۰ھ میں ہوئی اور وفات ۲۰۴ھ میں امام شافعی کی وفات کے کچھ دن بعد ہوئی۔

اسد بن فرات بن سنان - آپ خراسان نژاد ہیں، میں پیدائش حران میں ہوئی مگر آپ کے والد تونس لے گئے۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد فقہ سیکھی پھر مشرق چلے گئے اور مالک سے موطا وغیرہ سنی پھر عراق گئے جہاں آپ سے ابو یوسف اور محمد بن حسن کی ملاقات ہوئی اور اسدیہ جو مدونہ سحنون کی اصل ہے اس میں ابن القاسم کے اقوال کو مصر کے اندر جمع کیا پھر قیروان گئے جہاں سحنون نے اسدیہ سیکھی آپ نے قیروان کی قضا کا عہدہ سنبھالا، آپ کی وفات سرقوسہ کے حصار میں ہوئی۔ ولادت ۱۴۰ھ ہے۔

عبدالمالک بن ماجشون - آپ بنی تمیم کے آزادہ کردہ غلام تھے آپ کے والد عبد العزیز بن ماجشون حضرت مالک کے قریبی تھے۔ ایک قول میں ہے کہ موطا امام مالک کے لکھنے سے پہلے انہوں نے لکھا۔ آپ فصیح فقیہ تھے۔ آپ کی خدمت میں تاوقت وفات فتوی پیش کیا جاتا رہا اس سے پہلے آپ کے والد جو خود فقیہ تھے کے پاس فتوے آیا کرتے

تھے، آپ اندھے تھے- موسیقی سننے کے بڑے دلدادہ تھے- ابن حبیب مصنف واضحہ نے آپ کی خوب تعریف کی ہے اور خوب استفادہ کیا- وہ آپ کو تمام اصحاب مالک پر فہم میں اونچا مقام دیتے تھے-

اجتہاد میں فقہ مالکی کی اہمیت: - حضرت امام مالک نے سات فقہا اور دیگر فقہا کی فقہ اوران سے حدیث پڑھی تھی- یہی وجہ ہے کہ آپ کے پاس ہر چہار جانب سے فتاوی آتے- آپ نے جو حدیث اور فقہ پڑھی تھی اس کے مطابق فتوی دیتے اگر ان سے مسائل کا تصفیہ نہیں ہو پاتا تو اس سے ملتی جلتی حدیث اور فقہ کے مطابق فتوی صادر فرماتے- اگر یہ بھی نہ ہوتا تب اجتہاد کرتے، اور کتاب اللہ، سنت رسول نص کی یا اس کے نچوڑ یا اس کے اشارہ یا مفہوم سے احکام کا استخراج کرتے- لیکن اس سے پہلے نصوص کے درمیان موازنہ کرتے چنانچہ سنت اور کتاب کا موازنہ کرتے ہوئے نص میں تعارض نہ ہونے پر قیاس کا استعمال کر کے حکم صادر فرماتے اور اسی کو صحیح مانتے - پھر اگر کوئی ایسی مصلحت ہوتی تو اس مصلحت کے مطابق فتوی صادر کرتے جس میں شارع کی طرف سے نہ کوئی نص موجود ہو اور نہ اس کے اختیار میں کوئی حرج ہو- کیوں کہ فقہ مالکی میں مصلحت ان اصول میں سے تھی جن پر اس فقہ کا دارومدار تھا-

آپ کی آزمائش: - ۱۴۶ھ یا ۱۴۷ھ میں مدینے کے حاکم جعفر بن سلیمان نے ایک بار آپ پر کوڑے برسایا تھا: اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آپ بیعت اکراہ کو صحیح نہیں مانتے تھے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بنو عباس کی بیعت صحیح نہ تھی- جب کہ بعض مورخین کا ماننا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے متعہ کو حرام قرار دیا جب کہ خلفائے بنو عباس اس کو درست مانتے تھے- وجہ جو بھی رہی ہو- لیکن یہ طے ہے کہ آپ پر کوڑے برسایا گیا تھا-

خلاصہ: - حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ جہاں فقیہ اثر تھے وہیں فقیہ رائے بھی تھے- آپ کی فقہ منجمد نہ تھی جیسا کہ ابن خلدون نے اس فقہ پر یہ الزام لگایا ہے- آپ کی فقہ حالات اور مقتضیات زمانہ پر منطبق فقہ تھی- جس کی اصل بنیاد کتاب اور سنت کے ساتھ دیگر اصول فقہ مالکی تھی - فقہ مالکی آج بھی حجاز، بصرہ، مصر، بلاد افریقہ، اندلس، صقلیہ، مراکش، اسلم، سودان میں پائی جاتی ہے- بغداد میں بھی خوب اس کا ظہور ہوا لیکن چار سو تک کچھ کمزور شکل میں رہی- نیشاپور میں اس کا فروغ ہوا جہاں پر اس فقہ کے ائمہ اور مدرسین پائے گئے-

مراجع: - (۱) مالک: حیاته وعصره - آراؤه وفقهه امام محمد ابوزہرہ دار الفکر العربی- (۲) الفقه الاسلامی: ومرونته وتطوره- جاد الحق علی جاد الحق ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۰م شیخ الازہر
(۳) نشأة الفقه الاجتهادی واطواره- محمد علی سائس مطبوعہ: ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵م
(۴) المدخل لدراسته الفقه الاسلامی: محمد یوسف موسیٰ دار الفکر العربی
(۵) اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب- جلد نمبر ۱۸، مطبوعہ ۱۴۰۵/۱۹۸۵ھ

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالحکیم ازہری ☆

امام شافعی کی علمی و اجتہادی خدمات

امام شافعی اہل سنت کے ان چار عظیم وجلیل اماموں میں سے ایک ہیں جن کے علم واجتہاد، فضل وکمال اور زہد وورع پر اس امت کا اتفاق ہے، امت اسلامیہ کا ایک بہت بڑا طبقہ آپ کا مقلد ہے اور آپ ہی کی طرف نسبت کرتے ہوئے خود کو شافعی کہتا ہے۔ آپ کا اسم گرامی ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافع الہاشمی القرشی المطلبی ہے۔ آپ کے سلسلہ نسب میں ایک نام حضرت شافع ہے جو صغار صحابہ میں سے ہیں، حضرت شافع ہی کی طرف نسبت کرتے ہوئے آپ کو شافعی کہا جاتا ہے۔ حضرت شافعی کے والد حضرت سائب ہیں، یہ بدر کے دن مشرکین مکہ کے ساتھ تھے اور مکہ والوں کی شکست کے بعد دیگر قیدیوں کے ساتھ آپ بھی قیدی بنالئے گئے، آپ نے قید سے رہائی کے لئے فدیہ ادا کیا، اور اس کے بعد آپ ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔ امام شافعی کا نسب عبد مناف میں جا کر حضور اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے، آپ ہاشمی، اور قرشی ہیں اس اعتبار سے آپ میں یہ ایک ایسا وصف ہے جو باقی تینوں ائمہ مجتہدین سے آپ کو ممتاز کرتا ہے۔

آپ کے والد گرامی نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی، اور فلسطین کے شہر غزہ کا رخ کیا، آپ کا یہ سفر طلب معاش کے لئے تھا۔ آپ کے والد نے غزہ میں سکونت اختیار کرلی اسی شہر میں سن ۱۵۰ ہجری میں امام شافعی کی ولادت ہوئی۔ آپ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت عبداللہ محض ہیں، یہ برگزیدہ خاتون حضرت حسن مثنی کی پوتی اور سبط رسول سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ کی پرپوتی ہیں۔ ابھی امام شافعی کی عمر صرف دو سال تھی کہ آپ کے والد کی وفات ہوگئی، جس کی وجہ سے آپ کی پرورش یتیمی، عسرت اور تنگ دستی کے عالم میں ہوئی، آپ کی والدہ آپ کو لے کر غزہ سے واپس مکہ مکرمہ آگئیں، لہٰذا آپ کی پرورش اور ابتدائی تعلیم مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ آپ سن تمیز ہی سے علوم وفنون کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوگئے تھے، ابتدا میں شعر، لغت اور تاریخ عرب کی طرف توجہ فرمائی، اس کے بعد تجوید وقرأت اور حدیث وفقہ کی تحصیل شروع کی۔ آپ نے لغت وشعر میں وہ کمال حاصل کیا کہ آپ کا شمار ائمہ لغت میں ہونے لگا۔ امام اصمعی فرماتے ہیں: "صححت اشعار هذيل على فتى من قريش يقال له محمد بن ادريس" (میں نے ہذیل کے بہت سے اشعار کی صحت ایک قریشی نوجوان سے معلوم کی، اس قریشی نوجوان کا نام محمد بن ادریس ہے) امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے "كان الشافعي من افصح الناس" (شافعی لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح اللسان تھے) امام مالک کو امام شافعی کی قرأت بہت پسند تھی، کیونکہ آپ کی زبان میں بڑی فصاحت تھی۔ امام شافعی نے جب حدیث کی تحصیل کی طرف توجہ فرمائی تو صرف تیرہ سال کی عمر میں امام مالک کی کتاب "موطا" حفظ فرمالی، اس کے بعد آپ کی والدہ آپ کو مدینہ منورہ لے کر امام مالک کی خدمت میں لے کر پہنچیں اور آپ کو امام مالک کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے امام مالک کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا، امام شافعی نے امام مالک کی درسگاہ میں ان کی کتاب موطا کی قرأت کی۔ آپ علوم دینیہ کی طرف اپنے رجحان کا واقعہ خود اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "ایک دن میں ذوق وشوق سے لبید کے اشعار پڑھ رہا تھا کہ ناگاہ نصیحت آمیز غیبی آواز آئی، اشعار میں پڑ کر کیوں وقت ضائع کرتے ہو، جاؤ جا کر فقہ کا علم حاصل کرو، میرے دل پر اس آواز کا بہت اثر ہوا، اور میں نے مکہ میں سفیان بن عیینہ کی درسگاہ میں حاضری دی، ان کے بعد مسلم بن خالد زنجی، اور پھر مدینہ منورہ میں امام مالک کی خدمت میں پہنچا"۔ امام شافعی نے حضرت مسلم بن خالد کی درسگاہ سے فیض حاصل کیا، اور ان سے فقہ وحدیث کی تحصیل فرمائی، آپ کے استاذ آپ سے اتنے مطمئن تھے کہ انہوں نے امام شافعی کو بہت کم عمری میں افتاء کی اجازت مرحمت فرمائی۔ امام شافعی نہایت ذہین وفطین اور ذکی وعقل مند تھے۔ ابوعبید کہتے ہیں "ما رأيت احدا اعقل من الشافعي" (میں نے امام شافعی سے بڑھ کر کسی کو عقل مند نہیں پایا) اسی طرح یونس بن عبدالاعلی فرماتے ہیں "لو جمعت امة لوسعهم

☆Markazu Ssaquafathi Ssunniyya Po.Karanthur,Kunnamangalam,Kozhikode-673571 (Kerala)

عقلہ'' (اگر پوری امت بھی ایک طرف جمع ہو جائے تو امام شافعی کی عقل سب کو وسعت کر یگی)۔ مدینہ منورہ میں امام شافعی امام مالک کے علوم وفنون سے مستفید ہوتے رہے، اور ان سے حدیث وفقہ کی تحصیل کرتے رہے، آپ نے امام شافعی کی خدمت میں ۱۶ سال گزارے، یہاں تک کے امام مالک کی وفات ہوگئی۔

امام شافعی کے فضل وکمال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا ''عالم قریش یملأ طباق الارض علما'' (قریش کا ایک عالم دنیا کو علم سے بھر دے گا) ہمارے اصحاب شوافع کے علاوہ دوسرے علمائے متقدمین نے بھی یہی فرمایا ہے کہ اس حدیث پاک میں امام شافعی کی طرف اشارہ ہے۔ امام احمد بن حنبل نے امام شافعی کے علم وفضل اور ان کی خدمات کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے ''ما مس احد محبرة ولا قلماً الا وللشافعی فی عنقه منة'' (جس شخص نے بھی قلم اور دوات کا استعمال کیا ہے، اس کی گردن پر امام شافعی کا احسان ہے۔ امام احمد مزید فرماتے ہیں کہ ''امام شافعی دوسری صدی کے مجدد ہیں جس طرح کہ حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز پہلی صدی کے'' ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا کہ تیس سال میں میری کوئی رات ایسی نہیں گزری جس میں میں نے امام شافعی کے لئے دعا نہ کی ہو''۔

اس علم وفضل کے ساتھ امام شافعی زہد وتقوی میں بھی بے مثال تھے، آپ عابد، زاہد، متقی اور نہایت پرہیز گار تھے، آپ کے زہد وورع کا تذکرہ کرتے ہوئے ربیع بن سلیمان کہتے ہیں ''امام شافعی رات کے تین حصہ کرتے تھے، پہلے حصے میں تصنیف وتالیف، دوسرے میں نوافل اور تیسرے میں آرام فرماتے تھے''۔ ابراہیم بن محمد نے فرمایا ''میں نے امام شافعی سے عمدہ کسی شخص کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، آپ کی نماز مسلم بن خالد کی نماز کے مشابہ تھی، اور ان کی مسلم جریج کی نماز کے مماثل، اور ان کی عطا بن ابی رباح کے، اور ان کی عبد اللہ بن زبیر کے اور ان کی حضرت ابو بکر صدیق کی نماز کے مشابہ تھی، حضرت ابو بکر صدیق کی نماز کے بارے میں کیا پوچھتے ہو ان کی نماز تو بالکل حضور ﷺ کی نماز کے مشابہ تھی''۔

امام شافعی کا منہج اجتہاد: -امام شافعی نے اپنے مقرر کردہ اصول وقواعد کی روشنی میں کتاب وسنت سے مسائل کا استنباط واستخراج کیا، آپ کے قواعد اجتہاد آپ کی کتاب ''الرسالہ'' میں درج ہیں جن کو بروئے کار لا کر آپ نے اجتہاد فرمایا، اور ان اصول وقواعد کے مطابق آپ نے اپنے فقہ کے جزئیات مدون فرمائے، آپ کے یہ اصول وقواعد عملی تھے محض نظری نہیں تھے۔ آپ کے ان اصولوں کے عملی ہونے کا بین ثبوت آپ کی مشہور زمانہ کتاب ''الام'' سے فراہم ہوتا ہے، جہاں آپ نے اپنے استخراج کردہ مسائل کے ساتھ ساتھ ان کے دلائل بھی درج کئے ہیں، اور ساتھ ہی آپ نے اپنے قواعد اجتہاد اور اصول استنباط کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کو منطبق کر کے ثابت کیا ہے کہ آپ نے یہ مسئلہ کس طرح متخرج کیا ہے۔

آپ کے قواعد اجتہاد میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ آپ اولاً مسئلہ کی دلیل کتاب اللہ میں دیکھتے ہیں، اور مسئلہ کی بنیاد کتاب اللہ کے ظاہر کو بناتے ہیں، اور اس وقت تک نص کے ظاہر میں تاویل سے گریز کرتے ہیں جب تک نص میں تاویل کے وجوب پر کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے۔ کتاب اللہ کے بعد آپ سنت رسول اللہ پر نظر کرتے ہیں، اور اپنے نظریہ کی بنیاد سنت رسول پر رکھتے ہیں، یہاں تک کہ آپ ایسی خبر واحد کو بھی اختیار کرتے ہیں جس میں کوئی راوی منفرد ہو، بشرطے کہ وہ منفرد راوی ثقہ ہو صدق میں معروف اور ضبط میں مشہور ہو۔ امام شافعی کے منہج استنباط اور طریقہ اجتہاد کو بغور دیکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ سنت رسول ﷺ کو قرآن فہمی کا بنیادی ماخذ قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ سنت رسول سے بے نیاز ہو کر قرآن کریم کو سمجھنا ایک امر دشوار ہے، یہ سنت رسول ہی ہے جو قرآن کریم کی تشریح وتفسیر کی منزل میں ہے۔ قرآن کریم میں صرف احکام عامہ اور قواعد کلیہ بیان کئے گئے ہیں، اب یہ حدیث کا کام ہے کہ وہ ان احکام عامہ اور قواعد کلیہ کی تشریح وتفسیر کرے، یہی حدیث ہے جو قرآن کے عام کو خاص کرتی ہے، مطلق کو مقید کرتی ہے، اور مجمل کو بیان کرتی ہے۔

اسی لیے امام شافعی نے اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ حدیث نبوی کی حفاظت اور اس کے دفاع میں صرف کیا۔ اور آپ نے خبر واحد کے حجت ہونے پر دلائل قائم فرمائے۔ امام شافعی کی اسی خدمت حدیث اور دفاع سنت نے اصحاب حدیث کے درمیان ان کی قدر ومنزلت میں اضافہ کر دیا، یہاں تک کہ آپ کا لقب ہی ''ناصر السنہ'' پڑ گیا۔ آپ نہ صرف یہ کہ حافظ حدیث تھے بلکہ علل حدیث کی معرفت میں درجہ اجتہاد

پر فائز تھے۔ حسن بن محمد زعفرانی نے آپ کی اس خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا "کان اصحاب الحدیث رقودا فأیقظھم الشافعی فتیقظوا" (اصحاب حدیث محوخواب تھے ان کو امام شافعی نے بیدار کیا تو وہ جاگے)

امام نووی شافعی مجموع میں تحریر فرماتے ہیں "ومن ذلک شدۃ اجتھادہ فی نصرۃ الحدیث واتباع السنۃ وجمعہ فی مذھبہ بین اطراف الادلۃ مع الاتقان والتحقیق والغوص التام علی المعانی والتدقیق حتی لقب حین قدم العراق بناصر الحدیث وغلب فی عرف العلماء المتقدمین والفقھاء الخراسانیین علی متبعی مذھبہ لقب اصحاب الحدیث فی القدیم والحدیث" (المجموع: ج ۱/ص ۱۰)۔ (امام شافعی کے فضائل ومراتب میں سے آپ کی نصرت حدیث کے سلسلہ میں جدو جہد، آپ کا اتباع سنت، اور آپ کا اپنے مذہب کو دلائل کے ساتھ جمع کرنا ہے، وہ دلائل جو اتقان، تحقیق، تدقیق اور معانی پر غور وفکر پر مبنی ہیں، یہاں تک کہ جب آپ عراق میں جلوہ گر ہوئے تو آپ کا لقب "ناصر الحدیث" رکھ دیا گیا، علمائے متقدمین اور خراسان کے فقہا کے عرف میں آپ کے مذہب کا اتباع کرنے والے حضرات کو اصحاب حدیث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اہل فقہ، اہل اصول، اہل حدیث اور اہل لغت سب کے سب امام شافعی کی امانت، عدالت، زہد، ورع، تقویٰ اور علو قدر ومنزلت پر متفق ہیں۔ امام شافعی کی حیات میں ہمیں ان کا ایک خاص وصف ان کی فن مناظرہ میں مہارت بھی نظر آتا ہے، آپ بہترین مناظر تھے مگر آپ کا مناظرہ کرنا نہ اپنے مخالف کو زیر کرنے کے لئے تھا اور نہ شہرت وناموری کی خاطر، بلکہ آپ ہمیشہ مناظرے میں حق کے طالب ہوا کرتے تھے اور صرف اسی لئے مناظرے کے میدان میں آتے تھے کہ حق واضح ہوجائے، اس سلسلہ میں آپ کا یہ قول مشہور ہے۔ "ما ناظرت احداً الا ولم ابالی یبین اللہ الحق علی لسانہ او لسانی" (میں نے جب بھی کسی سے مناظرہ کیا تو مجھے اس کی پرواہ نہیں رہی کہ اللہ میری زبان سے حق ظاہر فرمائے گا یا میرے مخالف کی زبان سے)

امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ نے ان سے دریافت کیا کہ "أی رجل کان الشافعی؟ فأنی رأیتک تکثر الدعاء لہ" (اے والد محترم! یہ شافعی کون شخص تھے جن کے لئے آپ بہت دعا فرماتے ہیں؟) امام احمد بن حنبل نے جواب دیا "کان الشافعی کالشمس للنھار وکالعافیۃ للناس، فانظر ھل لھذین خلف او عنھما عوض" (امام شافعی ایسے ہی ہیں جیسے دن کے لئے سورج اور انسان کے لئے صحت، تو دیکھو کہ کیا ان دونوں چیزوں کا کوئی بدل ہے؟)

تصانیف: - امام شافعی کی زندگی کا اکثر حصہ درس وتدریس، علمی مباحث، استنباط مسائل، اور فقہ وافتا کی خدمت میں گزارا، اس کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر گراں درقدر تصانیف بھی آپ نے اس امت کو عطا فرمائیں۔

ایک مرتبہ امام شافعی سے عبدالرحمٰن بن مہدی نے عرض کیا کہ میرے لئے کوئی ایسی کتاب تصنیف فرمادیں جس میں قرآن عظیم کے معانی معتبرہ، احادیث، اجماع اور ناسخ ومنسوخ کا بھی بیان ہو، آپ نے ان کی طلب پر عین عنفوان شباب میں اپنی مشہور زمانہ کتاب "الرسالہ" تصنیف فرمائی، جو مذکورہ تمام مقاصد اور خوبیوں پر مشتمل تھی۔

مسند شافعی کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے، یہ کتاب ان احادیث مرفوعہ کا مجموعہ ہے، جنہیں امام شافعی خود اپنے طلبہ کے سامنے بیان کیا کرتے تھے، امام شافعی کی بعض روایات کو ابوالعباس محمد بن یعقوب اصم نے ربیع بن سلیمان مرادی سے سماع کر کے ان کو کتاب الام اور مبسوط کے ضمن میں جمع کر دیا ہے، ابوالعباس اصم نے ان تمام روایت کو یک جا کر کے اس کا نام مسند شافعی رکھ دیا ہے۔

وصال: - مزنی روایت کرتے ہیں کہ جب امام شافعی کے وصال کا وقت قریب آیا تو میں ان کے پاس موجود تھا، میں نے پوچھا کیا حال ہے؟ امام شافعی نے جواب دیا کہ دنیا سے روانگی اور احباب سے جدا ہونے کا وقت ہے، موت کا پیالہ پیش ہونے والا ہے اور نتیجہ اعمال نکلنے والا ہے، بہت جلد اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری ہوگی، کون جانے میری روح کدھر لے جائے گی۔

آپ کا وصال ۳۰ رجب المرجب سن ۲۰۴ ہجری میں جمعہ کی شب بعد نماز مغرب ہوا، آپ کا مزار مبارک مصر میں ہے جو آج بھی زیارت گاہ خاص وعام ہے، اور آپ کے علمی اور روحانی فیوض وبرکات کا دریا آج بھی رواں ہے۔

☆☆☆

مولانا انوار احمد بغدادی ☆

امام احمد بن حنبل کی علمی و اجتہادی خدمات

ایک لمبی کشمکش اور خوں ریز تاریخ کے ساتھ خلافت امویہ کی فائل ۱۳۲ھ میں دمشق کے کھنڈرات میں بند ہوگئی اور زمام اقتدار عباسیوں کے ہاتھ آ گئی جنھوں نے ایک طرف اپنے خلاف سلگنے والی ہر قسم کی بغاوت کی آگ بڑے سفاکانہ انداز سے بجھانے کی کوشش کی۔ تو دوسری طرف عام رفاہی کام، امور سلطنت میں عام اصلاحات اور علم و علما کی خدمت بھی خوب کی، جس کے نتیجے میں جہاں ایک طرف بغاوتوں میں کمی آئی، عام لوگوں نے سکون کی سانس لی اور امن وامان کا ماحول پیدا ہوا تو دوسری طرف علمی تحریک کو بھی تقویت ملی، علوم وفنون کے سوتے پھوٹ پڑے، تدوین وتالیف اور ترجمہ نگاری کا ایسا حسین آغاز ہوا کہ دوسری قوموں کے بھی موروثی ذخیرے محفوظ کر لیے گئے۔ سسکتی اور دم توڑتی افلاطونی اور سقراطی فکریں عربی تحریروں میں قید کر لی گئیں۔ علم ومعرفت کا کوئی ایسا گوشہ نہیں بچا جس کی اپنی باضابطہ فوج نہ تیار ہوگئی ہو، روایت ودرایت، حدیث وفقہ، نحو وصرف، لغت وادب، تفسیر وکلام، منطق وفلسفہ، ہر میدان میں ہر سمت قابل قدر علمی پیش رفت عمل میں آئی۔ علامہ ذھبی کہتے ہیں:

''۱۴۳ھ میں علمائے اسلام نے حدیث وفقہ اور تفسیر کی تدوین شروع کردی، چنانچہ مکہ میں ابن جریج نے تدوین کی، مدینہ میں امام مالک نے مؤطا لکھی، شام میں اوزاعی، بصرہ میں ابن ابی عروبہ اور حماد بن سلمہ وغیرھما نے تصنیفی کام کیے، یمن میں معمر، کوفہ میں سفیان ثوری نے تدوین کا کام انجام دیا، ابن اسحاق نے مغازی لکھا جبکہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ اور قیاس میں تصنیف کی، پھر کچھ ہی عرصے کے بعد ہشیم، لیث اور ابن لہیعہ نے تصنیف کیا، پھر ابن مبارک، ابو یوسف اور ابن وہب نے تصنیف کیا اور علم کی تدوین وتبویب کی کثرت ہوگئی۔ علوم عربیہ، لغت وتاریخ اور سیر وحروب کی کتابیں مدون ہوگئیں۔ جبکہ اس زمانہ سے پہلے ائمہ کرام کا اعتماد اپنی یادداشت پر تھا یا غیر مرتب صحیح صحائف سے علم کی روایت کیا کرتے تھے'' (۱)

''خلافت امویہ کے آخری دور اور دور عباسی کے آغاز میں صرف پچاس سال کے اندر ہی بیشتر علوم وفنون کی ترتیب وتدوین عمل میں آچکی تھی۔ خواہ علوم نقلیہ ہو، مثلاً علوم قرآن، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور لغت وادب کے مختلف علوم وفنون یا علوم عقلیہ ہو، مثلاً علوم ریاضیات، منطق، فلسفہ اور کلام'' (۲)

یہی وہ زمانہ تھا جب معتزلیوں کی تحریک جوان تھی اور اس کی لپٹ خلافت عباسیہ کے قصر شاہیں کو جھلسا رہی تھی۔ مامون، (م: ۲۱۸ھ) معتصم (م: ۲۲۷ھ) اور واثق باللہ (م: ۲۳۲ھ) اعتزال کے مبلغ وداعی بن گئے تھے۔ (۴) منطق وفلسفہ کا عقل وشعور پر اس طرح غلبہ ہوا کہ ''العقل هي السلطان'' کے واشگاف نعرہ سے خلافت کی گلی، کوچے گونج اٹھے۔ ہر جگہ بحث ومباحثہ کا بازار گرم ہوگیا۔ اسلام کی تعلیمات میں محض عقلی گھوڑے دوڑنے لگے، فطرتاً لوگ حدیث وسنت سے دور اور بدعت، محدثات اور طرح طرح کی خرافات سے قریب ہوگئے۔ ایسے دور میں اللہ تعالی نے محي السنة، ماحي بدعت حضرت امام احمد بن حنبل کو پیدا فرمایا جنھوں نے نہایت بیباکی کے ساتھ اعلان حق فرمایا۔ کوڑے کھاتے رہے مگر حق گوئی سے مہر بلب نہ ہوئے۔ جسم سے خون رس کر بہتا رہا مگر ''القرآن مخلوق'' کا قول نہ کیا۔

ہزار خوف ہو لیکن زبان دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
جن کی بڑھتی ہوئی بیتابی وبیباکی سے
تازہ ہر عہد میں قصہ فرعون وکلیم

حسب ونسب: آپ کا نام احمد بن حنبل اور کنیت ابوعبداللہ ہے، آپ کا تعلق خالص عربی قبیلہ ''شیبان'' سے ہے، آپ کا نسب شریف حضرت امام بیہقی رضی اللہ تعالی عنہ ''مناقب احمد'' میں اپنے شیخ حضرت ابوعبداللہ الحاکم صاحب مستدرک سے یوں نقل کرتے ہیں:

أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد بن إدريس

☆Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia,22,Zakir Nagar,Okhla, New Delhi

بن عبد الله بن حَيّان بن عبد الله بن أنس بن عَوف بن قاسِط بن مَازِن بن شيبان بن ذُهْل بن ثعلبة بن عُكَابة بن صَعب بن عليّ بن بَكْر بن وَائِل بن قاسِط بن هُنْب بن أقصى بن دُعمِي بن جَدِيلة بن أسد بن ربيعة بن نزار بن معدّ بن عدنان بن أُدّ بن أُدَد بن الهُمَيْسَع بن حَمَل بن النَّبْت بن قَيْدار بن إسماعيل بن إبراهيم الخليل عليهما السلام .(۳)

قاضی ابوالحسین محمد بن ابی یعلی بغدادی نے بھی اسی طرح کا شجرۂ نسب معمولی اختلاف کے ساتھ مبارک بن عبد الجبار بن احمد سے روایت کرتے ہوئے ذکر کی ہے جس میں انھوں نے ''مازن بن شیبان بن ذهل بن ثعلبة'' کی جگہ ''مازن بن ذهل بن شيبان بن ثعلبة'' رقم فرمایا ہے (۴)

آپ کا یہ وہ ارفع واعلی اور مبارک ومسعود شجرۂ نسب ہے جسے سرکار دو عالم ﷺ کے شجرۂ نسب سے ملنے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ یہ مبارک سلسلہ نبی کریم ﷺ کے جد امجد نزار بن معد بن عدنان سے ملتا ہے۔ نزار کے دو بیٹے تھے مضر اور ربیعہ ۔مضر کی نسل پاک سے آپ ﷺ ہیں اور ربیعہ کی نسل سے حضرت امام احمد بن حنبل ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پیدائش:۔آپ کی پیدائش بغداد شریف میں ۱۶۴ھ میں ہوئی ، آپ کی عمر تین برس تھی کہ آپ کے سر سے آپ کے والد بزرگوار کا سایہ اٹھ گیا، آپ کی پوری کفالت آپ کی والدہ محترمہ نے کی۔

تعلیم وتربیت:۔کم عمری ہی میں آپ نے قرآن پاک حفظ کرلیا اور حسب ضرورت لغت کے مسائل سیکھنے کے بعد تحریر و کتابت کی طرف متوجہ ہوئے ۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:''میں ابھی بالکل بچہ ہی تھا کہ حفظ قرآن سے فارغ ہو گیا۔ چودہ سال کا تھا کہ تحریر و کتابت کی مشق وتحصیل میں منہمک ہو گیا''

حضرت کی نجابت اور استقامت ، دیانت اور ثقاہت ، سعادت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ہم نشینوں کے لئے موجب تقلید اور ان کے آباء کے لئے باعث رشک بن گئے تھے۔ یہ لوگ اپنے بچوں کے لئے آپ کو نمونہ اور ماڈل سمجھتے تھے اور کہا کرتے تھے:''میں نے اپنے لڑکے پر اتنا خرچ کیا، اسے اتنے استاذوں کے حوالے کیا، اسے ادب اور تمیز سکھائیں لیکن کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا اور احمد بن حنبل کو دیکھو! یہ یتیم لڑکا اپنے ادب اور حسن تعامل کے باعث کیسے پسندیدہ اور قابل رشک خصائص کا حامل بن گیا۔

شعور بلوغ کے مراحل میں داخل ہوتے ہی آپ نے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ علیہ کی درسگاہ کا رخ کیا۔ مگر بعد میں آپ نے قاضی صاحب کی مجلس چھوڑ دی اور ۱۶ برس کی عمر میں طلب حدیث کی طرف متوجہ ہو گئے ، پانچ مرتبہ آپ نے حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا اور حجازی علماء ومحدثین سے خوب خوب استفادہ کیا، علاوہ ازیں آپ نے کئی بار بصرہ کا سفر کیا اور وہاں کے علماء سے استفادہ کیا، اس کے علاوہ شام، یمن، کوفہ وغیرہ کا بھی سفر کیا ہے۔

طلب حدیث میں آپ چالیس برس کی عمر تک مختلف بلاد اسلامیہ کے سفر کی مشقتیں برداشت کرتے رہے ۔کبھی کوفہ ، کبھی بصرہ اور کبھی سرزمین حجاز یہاں تک کہ آپ کے کسی سفر میں آپ کے کسی جاننے والے نے استعجابا کہا: کب تک کوفہ وبصرہ کا سفر ہوتا رہے گا! بلاشبہ آپ کا یہ کمال احتیاط تھا اور آپ کی نظر میں سنت مصطفیٰ کی کمال جلوہ گری تھی کہ جب آپ کی عمر چالیس برس ہوگئی تب آپ مسند حدیث وافتاء پر جلوہ گر ہوئے اور خلق کثیر نے آپ کی ذات بابرکت سے اکتساب فیض کیا۔ امام ابن جوزی نے اس سلسلے میں ایک روایت بھی بیان کی ہے:''امام احمد کا ایک معاصر ۲۰۳ھ میں سلسلۂ طلب حدیث ان کے پاس پہنچا لیکن انھوں نے حدیث بیان کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ امام عبدالرزاق بن ہمام کے پاس یمن گیا پھر وہ ۲۰۴ھ میں بغداد آیا تو دیکھا کہ امام حدیث بیان کر رہے ہیں اور لوگ ان پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں'' (۶)

سفر آخرت:۔امام احمد بن حنبل کا انتقال مختصر سی علالت کے بعد بروز جمعہ مبارکہ ۱۲/ ربیع الاول ۲۴۱ھ میں ہوا، آپ نے ۷۵ برس کی عمر پائی اور شہیدوں کے قبرستان (مقابر الشہداء) میں حرب دروازے کے قریب دفن ہوئے ۔آپ کی نماز جنازہ میں بے شمار مردوں اور عورتوں نے شرکت کی ۔ امیر محمد بن طاہر نے مردم شماری کا حکم دیا تو آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد تیرہ لاکھ تھی ، ایک روایت میں ہے کہ سات لاکھ تھی ۔ خلافت کے تقریبا سوار باب اقتدار بھی موجود رہے ۔ آپ کی نماز جنازہ نائب شہر محمد بن عبد اللہ نے

پڑھائی، بھیڑ کی وجہ سے آپ کی کئی بار نماز جنازہ پڑھی گئی بلکہ بعد تدفین قبر پر بھی پڑھی گئی اور لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تدفین کی کاروائی نماز عصر کے بعد تک چلتی رہی۔(۷)

مستشرق لاؤسٹ لکھتا ہے: ''آپ کے جنازے کی تفصیلات سے جو کسی حد تک افسانے کا رنگ رکھتی ہیں، یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کے متعلق عوام کے دل میں درحقیقت محبت کے مخلصانہ جذبات تھے، چنانچہ آپ کے مقبرے پر جوش وعقیدت کے ایسے مظاہرے ہوئے کہ مقامی حکام کو قبرستان کی حفاظت کے لئے پہرا لگانا پڑا، بغداد میں آپ کا مقبرہ سب سے بڑی زیارت گاہ بن گیا'' (۸)

۵۷۴ھ میں خلیفہ المستضئی نے اس پر ایک کتبہ لگوا دیا، جس میں اس یگانہ روزگار محدث کو سنت کے زبردست ترین حامی کے طور پر بہت سراہا گیا۔آٹھویں صدی ھجری/ چودھویں صدی میلادی میں دریائے دجلہ کے ایک سیلاب میں یہ مقبرہ بہہ گیا۔(۹)

امام احمد بن حنبل کا زہد وتقوی:-آپ ایک جامع کمالات، گونہ گوں خوبیوں کے حامل، درویش صفت، متقی پرہیز گار، صالح اور نیک طبیعت کے مالک تھے، دنیا بیزاری آپ کے رگ رگ میں بسی تھی، آپ زہد وتقوی کی اعلی مثال تھے، ابن کثیر نے ابوداؤد کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ کی مجلسوں میں کبھی دنیا کی باتیں نہیں ہوتیں اور نہ ہی آپ کبھی دنیا کا ذکر کرتے تھے۔

بیہقی نے مزنی سے، انھوں نے شافعی سے روایت کی ہے، شافعی نے رشید سے کہا کہ یمن کو ایک قاضی کی ضرورت ہے، رشید نے کہا: کسی کو چنو یمن کا قاضی بنا دیں، تو حضرت امام شافعی نے حضرت امام ابن حنبل سے کہا جو آپ کے من جملہ شاگردوں میں تھے: کیا آپ یمن کی قضا قبول کریں گے؟ تو آپ نے اس پیشکش کو سرے سے ٹھکرا دیا اور امام شافعی سے فرمایا: کہ میں آپ کے پاس صرف علم کی بنیاد پر آتا ہوں اور آپ مجھے یمن کا قاضی بنانا چاہتے ہیں، اگر علم کی بات نہ ہوتی تو میں آج کے بعد سے آپ سے بات نہ کرتا۔

آپ کے زہد وتقوی کا عالم یہ تھا کہ اپنے چچا اسحاق بن حنبل اور اپنے بیٹوں کے پیچھے صرف اس لیے نماز پڑھتے تھے اور نہ ان سے باتیں کرتے تھے کہ ان لوگوں نے خلیفہ متوکل باللہ کے انعامات قبول کر لئے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ آپ کو تین دنوں تک کچھ کھانے کو نہیں ملا، آپ نے اپنے کسی دوست سے آٹا قرض لیا، اتفاق سے آپ کے گھر والوں کو اس کی اطلاع ہوگئی، ان لوگوں نے جلدی سے آٹا گوندھا اور روٹی تیار کر کے آپ کی خدمت میں حاضر کر دیا، آپ نے پوچھا اتنی جلدی؟ لوگوں نے جواب دیا کہ صالح (آپ کے فرزند) کے گھر میں تنور جل رہا تھا، ہم نے وہاں روٹی پکالی ہے، اس پر آپ نے فرمایا: اسے فوراً اٹھالو! اور آپ کھانے سے باز رہے، بیہقی کہتے ہیں کہ صالح نے چونکہ بادشاہ وقت کا انعام قبول کر لیا تھا اس لیے ان کے تعلق سے آپ نے یہ موقف اختیار کیا۔

بیہقی کہتے ہیں کہ خلیفہ متوکل انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات سے سجا دسترخوان بھیجا کرتا تھا مگر آپ اس میں سے کچھ بھی نہیں تناول فرماتے تھے۔(۱۰)

اس طرح بیشمار واقعات ہیں جو آپ کے زہد سے متعلق ہیں جن کی یہاں گنجائش نہیں۔

امام احمد بن حنبل کے شیوخ واساتذہ:-آپ ایک زمانہ تک مختلف بلاد اسلامیہ کا سفر کر کے محدثین زمانہ اور فقہاء وقت سے استفادہ کرتے رہے، اس لئے آپ کے اساتذہ وشیوخ کی فہرست لمبی ہے، علامہ ابن جوزی نے ''مناقب'' میں آپ کے اساتذہ وشیوخ کی فہرست ترتیب ابجدی کے اعتبار سے تیار کی ہے جو سو سے متجاوز ہے، جن میں ظاہر ہے کہ آپ کے وہ سبھی شیوخ واساتذہ شامل ہیں جن سے آپ نے یا تو فقہ میں استفادہ کیا ہے یا کوئی حدیث اخذ کی ہے یا کسی حدیث کی روایت کی ہے۔ان میں چند اہم اساتذہ کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

بغداد شریف میں آپ نے سب سے پہلے حضرت امام ابو یوسف (م: ۱۸۲ھ) سے استفادہ کیا، پھر سولہ برس کی عمر میں طلب حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور باقاعدگی کے ساتھ ہشیم بن بشیر کے درس میں جو حضرت ابراھیم النخعی کے شاگرد تھے (۱۷۹ھ) سے لے کر (۱۸۳ھ) تک شریک رہے۔آپ کے بڑے اساتذہ میں حضرت سفیان بن عیینہ (م: ۱۹۸ھ) ہیں جو دبستان حجاز کے سب سے بڑے مستند عالم تھے۔آپ کے دوسرے اساتذہ میں بصرہ کے عبدالرحمن بن مہدی (م: ۱۹۸ھ) اور کوفے کے واقع بن الجراح (۱۹۷ھ) تھے (۱۱)

ابن کثیر نے امام بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل کے من جملہ اساتذہ میں حضرت امام شافعی بھی ہیں- امام احمد

بن حنبل نے شافعی سے فقہ میں استفادہ کیا ہے اور مسند وغیرہ میں آپ سے روایت بھی کی ہے۔ جب امام احمد بن حنبل اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ کے ترکے میں حضرت امام شافعی کے دونوں قدیم و جدید رسالے پائے گئے۔(۱۲)

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام احمد بن حنبل کی فکر میں عراق وحجاز اور کوفہ وبصرہ کی خمیر شامل ہے جو متنوع ہونے کے ساتھ کافی زرخیز بھی ہے۔ امام صاحب کا یہ علمی پس منظر آپ کو ایسی غذا فراہم کرتا ہے جس سے ایک ایسے مسلک فقہی کی تشکیل ہوتی ہے، جسے مدینہ شریف کے مدرسۂ حدیث اور عراق کے مدرسۂ قیاس کا حسین سنگم کہا جا سکتا ہے۔ جس میں جہاں ایک طرف نقلی دلائل کی چاشنی ملتی ہے تو دوسری طرف حسب ضرورت عقلی دلائل کی صلابت بھی محسوس کی جاتی ہے۔ اس لیے یہ حقیقت پر ظلم کرنے کے مترادف ہوگا کہ امام کے اساتذہ کا دائرہ تنگ کر کے آپ کے فکری پس منظر کو کسی خاص مدرسۂ فکر کے احاطہ میں محدود کر دیا جائے۔ جیسا کہ مستشرق لاؤسٹ ابن تیمیہ کے حوالے سے لکھتا ہے:

"لیکن جیسا کہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے (منہاج السنہ، ۱۴۳/۴) علم فقہ میں آپ کی تعلیم وتربیت زیادہ تر اہل حدیث اور دبستان حجاز کی مرہون منت ہے۔"(۱۳)

حلقۂ درس اور تلامذہ:۔ مسند درس وافتا پر جلوہ فرما ہونے سے پہلے آفاق اسلامیہ کے کونے کونے میں آپ کی شہرت ہو چکی تھی لہٰذا لازمی تھا کہ آپ کا حلقۂ درس انبوہ خلائق ہو چنانچہ بعض رواۃ کا بیان ہے کہ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد پانچ ہزار نفوس کے قریب تھی، ان میں سے پانچ سو کے قریب وہ تھے جو لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ بغداد میں اتنے آدمیوں کی گنجائش جہاں ہو سکتی تھی وہ جامع مسجد کے سوا اور کوئی جگہ نہیں تھی چنانچہ ضروری ہوا کہ امام احمد وہیں اپنا درس قائم کریں۔ گرچہ آپ کی مجلس میں شریک ہونے والے سبھی لوگ آپ سے علم کے جویاں نہ تھے بلکہ کچھ تو حصول برکت کی خاطر حاضر ہوتے تھے اور کچھ اخلاق وکردار سے سبق سیکھتے تھے۔

اس کے علاوہ امام صاحب کی ایک خصوصی مجلس بھی تھی جو آپ کے گھر میں سجتی تھی۔ اس میں آپ کے صاحبزادوں کے علاوہ خاص خاص شاگرد استفادہ کرتے تھے۔(۱۹)

امام احمد بن حنبل کی تصانیف:۔ زہد وتقوی، بے نیازی اور احیاء قرآن وسنت کا جذبۂ اخلاص ہی تھا کہ حضرت امام احمد بن حنبل اپنے متبعین کو اپنے افکار ونظریات کی تدوین وتالیف سے منع فرماتے تھے کہ مبادا کہیں ان کے افکار قرآن وسنت سے دوری کے اسباب نہ بن جائیں، یہی وجہ تھی کہ حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ کے برعکس فقہ میں آپ کی کوئی کتاب آپ کی حیات طیبہ میں مدون نہ ہو سکی اور جو کتابیں آپ کی حیات طیبہ میں منظر عام پر آئیں وہ فی الجملہ حدیث ہیں جس کی تدوین میں آپ حرج نہیں تصور فرماتے تھے۔ وہ کتابیں یہ ہیں: المسند، التاریخ، الناسخ والمنسوخ، المقدم والموخر فی کتاب اللہ، فضائل الصحابۃ، المناسک الکبیر، المناسک الصغیر، کتاب الزہد، کتاب الرد علی الجہمیۃ اور کتاب الرد علی الزنادقہ۔ ان کے علاوہ چند رسائل ایسے ہیں جس میں اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے اور اس کو مدلل کیا ہے۔(۲۰)

داستان صبر وعزیمت مسئلہ خلق قرآن کے تناظر میں:۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے یہ کہا کہ قرآن مخلوق ہے وہ جعد بن درہم تھا جو عہد اموی کا ایک فرد تھا، اسے عید الاضحیٰ کے دن کوفہ میں خالد بن عبداللہ القسری نے اس جرم کے پاداش میں قتل کر ڈالا، مگر اس کی فکر عربی معاشرے میں پلتی بڑھتی رہی۔ جہم بن صفوان اور حارث بن سیج کو مروان بن محمد کے زمانے میں سیاسی اسباب کی بنیاد پر قتل کر دیا گیا۔(۲۱)

ایک قول یہ بھی ہے کہ واصل بن عطا نے جو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کا خوشہ چیں تھا۔ آپ کی مجلس سے باضابطہ اعتزالی اصولوں کے ساتھ اعتزال پسندی کا اعلان کیا اور اس تحریک کی داغ بیل ڈال دی۔ امویوں کے دور میں یہ تحریک زیادہ کامیاب نہ ہو سکی مگر جوں ہی عباسیوں کا دور شروع ہوا۔ نئے عناصر سے عرب متعارف ہوئے۔ یونانی اور سریانی زبانوں سے علوم فلسفیہ کے ترجمے ہوئے۔ پس پردہ اسلام کے خلاف برسر پیکار فکری یورشوں کو بھی پنپنے اور بڑھنے کا موقع مل گیا۔ جس کے نتیجے میں منطق وفلسفہ اور عقل مضطرب کے سائے تلے پرورش پانے والی اعتزالی تحریک کو بھی تقویت ملتی گئی۔ چند ہی سالوں میں یہ تحریک بصرہ وبغداد کی مسجدوں کے محراب سے نکل کر تخت سلطنت پر قابض ہو گئی۔ ہارون کا زمانہ ختم ہوتے ہی مامون اعتزالی تحریک کے سلک میں باضابطہ طور پر پرویا گیا۔

مامون ایک معتدل علم دوست، دینی جذبہ سے سرشار اور صاحب فکر وتدبر بادشاہ تھا۔ اپنے بڑے بھائی محمد امین کی حرص بے جا اور بے راہ

روی کی وجہ سے اس کا تختہ پلٹ کر ۱۹۸ھ سے ۲۱۸ھ تک بلا اشتراک غیر خلافت عباسیہ کا بادشاہ رہا۔ اس نے اپنے دور خلافت میں علماء و شعراء کو اپنے والد ہی کی طرح خوب نوازا۔ ارباب فکر ونظر کو قریب کیا جس کے نتیجے میں علم وفن کے ہر شعبے میں قابل قدر پیش رفت ہوئی۔

چونکہ مامون ادیان و مذاہب میں ابو ہذیل علاف کا شاگرد تھا، ابو ہذیل وہ شخص ہے جس کا شمار معتزلہ کے سر براہوں میں ہوتا ہے۔ مامون نے جب افکار وعقائد کی چھان پھٹک کے لئے مجالس مناظرہ منعقد کیں تو یہ معتزلہ سب سے آگے تھے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اس لئے کہ یہ لوگ عقلی طور پر مسائل کی بحث میں خصوصیت و امتیاز رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ مامون پر ان لوگوں کا اثر بہت زیادہ ہو گیا انھیں اپنے سے قریب کیا ،مناصب وزارت بھی تفویض کی بلکہ اس جماعت کے ایک فرد ابو عبد اللہ احمد ابی داؤد کو تو اتنا نوازا کہ اپنے بھائی معتصم کو وصیت کر دی کہ امور مہمہ میں اس کی فکر ورائے کو شریک رکھا کرے۔ چنانچہ وہ اپنی وصیت میں لکھتا ہے: ''ابو عبد اللہ بن ابی داؤد کو اپنے ہر معاملہ میں شریک کار رکھنا''

جب معتزلیوں نے دربار خلافت میں اپنی دال گلتی ہوئی دیکھی تو انھوں نے سوچا کہ اب مامون سے خلق قرآن کے عقیدہ کا اعلان کروا دیا جائے چنانچہ یہ بات مامون کے دل میں بیٹھ گئی اور اس نے ۲۱۲ھ میں اس عقیدہ کا اعلان کر دیا اور معتزلیوں نے اسے ان علماء اور محدثین کے خلاف خوب ورغلایا جو اس فکر کے قائل نہ تھے بالخصوص حضرت امام احمد بن حنبل کے خلاف یہاں تک کہ ان برگزیدہ ہستیوں پر ظلم وتشدد کے پہاڑ بھی توڑنے سے نہ چوکے۔

مامون اپنی موت سے چند ماہ قبل طرسوس میں رومیوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا، معتزلیوں کے اکسانے پر اس نے وہیں سے حاکم بغداد اسحاق بن ابراھیم کو خط لکھا کہ لوگوں کو خلق قرآن کے تعلق سے قائل کراؤ جو انکار کرے اسے ہمارے پاس بھیج دو۔ حاکم بغداد نے حکم پورا کیا اور کچھ علماء کو اس فکر سے رجوع بھی کرا لیا مگر حضرت امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح نے صبر وثبات سے کام لیا اور اعتزالی فکر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے صاف انکار کر دیا جس کے پاداش میں ان دونوں کو بیڑیوں میں ڈال کر طرسوس روانہ کر دیا گیا مگر ابھی یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ مامون اس دنیا سے چل بسا اور ان لوگوں کو بغداد واپس بھیج دیا گیا۔

مامون کے بعد اس کا بھائی تخت نشین ہوا۔ یہ علم سے کورا اور تلوار کا دھنی تھا۔ مجاہدانہ صفت کا حامل جنگی مزاج بادشاہ تھا۔ اسی کے ہاتھوں عموریہ اور ترکی کے بیشتر علاقے فتح ہوئے۔ معتصم کے اس مزاج کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معتزلیوں نے اسے منکرین خلق قرآن کے ساتھ تشدد برتنے پر اکسایا۔ چنانچہ اس نے معتزلیوں کے حریفوں پر خوب ظلم ڈھایا۔ بالخصوص امام احمد بن حنبل جو معتزلیوں کے سب سے بڑے حریف تھے، آپ کو قید وبند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں، آپ پر کوڑے برسائے گئے، جسم سے خون رس کر بہ نکلتا۔ آپ پر بیہوشی طاری ہو جاتی تو آپ کو تلوار کی نوک سے جگایا جاتا، پھر کوڑے کی برسات کی جاتی مگر آپ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، آپ نے کسی بھی حال میں خلق قرآن کا قول نہ کیا۔ صبر وعزم کا پہاڑ بن کر باطل کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ظلم ہار گیا اور مظلوم کی فتح ہوگئی۔ ۲۲۷ھ میں معتصم کا انتقال ہو گیا اور اس کے لڑکے واثق باللہ نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی۔ اس کا رویہ حضرت امام احمد بن حنبل کے ساتھ گرچہ اپنے والد کی طرح سفاکانہ نہ رہا اور اس نے آپ کو جسمانی اذیت دینے سے گریز کیا مگر اس نے آپ کو لوگوں میں گھلنے ملنے سے منع کر دیا اور امام صاحب کے لیے یہ حکم صادر کر دیا کہ: ''تمہارے پاس کسی کو ملنے اور آنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ تم اس شہر میں اقامت اختیار کرو جہاں میرا قیام ہو''۔

اس حکم کے بعد امام صاحب اپنے گھر میں محصور ہو گئے حتی کہ نماز وغیرہ کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ آپ کا دور ابتلاء وآزمائش یوں ہی گزرتا رہا یہاں تک کہ ۲۳۲ھ میں واثق کا بھی انتقال ہو گیا اور متوکل باللہ نے زمام اقتدار سنبھالا۔ اسی کے ساتھ معتزلیوں کا سورج ڈھلنے لگا اور احیاء سنت کا دور شروع ہوا۔ (۲۲)

جس طرح سونا دہکتے انگاروں پر جلنے کے بعد نکھر جاتا ہے یوں ہی حضرت امام کی شخصیت اس آزمائش سے گزرنے کے بعد سونا ہو گئی۔ معتزلیوں کے ظلم وتشدد اور حضرت امام احمد بن حنبل کے صبر واستقلال نے جہاں ایک طرف معتزلی تحریک کو موت کے گھاٹ اتار دیا وہیں لوگوں کو ظلم کے سائے میں جرأت مندی کے ساتھ جینے کا حوصلہ عطا کیا اور امام کی فکر کو بقا وخلود بخش دیا۔ شرق وغرب میں آپ کی مقبولیت میں بے تحاشہ اضافہ ہو گیا، علی الاطلاق آپ کو اس زمانے کی سب سے بڑی شخصیت تسلیم کر لیا گیا، مگر ہمارے امام کو یہ سب راس نہ آیا بلکہ خشیت وتقوی میں مزید اضافہ ہو گیا اور آپ کی نظر میں اگر آزمائش کا ایک دور

ختم ہوا تھا تو اس سے کہیں سخت دور کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ پر متوکل کی کرم فرمائیاں شروع ہوئیں۔

امام احمد بن حنبل کی محدثانہ عظمت:۔حضرت امام احمد بن حنبل ایک بلند پایہ جلیل القدر محدث تھے۔ ابو زرعہ کہتے ہیں کہ آپ کو تقریباً سات لاکھ حدیثیں یاد تھیں اور ایک روایت میں ہے کہ دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں (۲۳) آپ کی حدیث دانی پر ائمہ زمانہ کو اعتماد تھا چنانچہ حضرت امام شافعی آپ کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''اگر آپ کے پاس کوئی صحیح حدیث پہنچ جایا کرے تو مجھے بھی اس سے باخبر کر دیا کیجیے خواہ وہ کسی حجازی سے پہنچی ہو یا شامی سے یا عراقی سے یا یمنی سے'' (۲۴)

قاضی ابوالحسین محمد بن ابی یعلی البغدادی کہتے ہیں کہ: حضرت امام احمد بن حنبل متفقہ طور پر بلاچون وچرا امام فی الحدیث تھے۔ (۲۵)

امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی محدثانہ عظمت کا سب سے بڑا شاہکار آپ کی مسند ہے جس کا عبوری جائزہ لینے سے قبل مناسب ہوگا کہ تدوین کا ایک مختصر تاریخی پس منظر پیش کر دیا جائے تاکہ علم حدیث پر آپ کی گراں قدر خدمات کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔

ابتدائے امر میں صحابہ کرام کا اس بات میں اختلاف رہا کہ حدیثیں جمع کی جائیں یا نہیں لیکن پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہی ارباب عقل وتدبر کو یہ بات شدت سے محسوس ہونے لگی کہ سرچشمہ حدیث خشک ہوتا جا رہا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یکے بعد دیگرے اس روئے زمین سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اس لئے تدوین حدیث کی طرف پہلا قدم بڑھاتے ہوئے حضرت عمر بن عبد العزیز نے قاضی مدینہ ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں جمع کرو! مجھے اندیشہ ہے کہ علماء کوچ کر جائیں اور علم کا نام ونشان مٹ جائے۔ ابونعیم نے تاریخ اصفہان میں تخریج کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پوری اسلامی سلطنت کے اہل علم کو لکھا کہ رسول اکرم ﷺ کی حدیثیں تلاش کرو اور جمع کرو۔ (۲۶)

یہ ۹۹ھ کی بات ہے جب ذخیرہ حدیث باضابطہ طور سے صفحہ قرطاس پر نہیں بلکہ صحابہ کرام کے سینوں میں محفوظ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی خلیفۃ المومنین نے تدوین حدیث کا حکم نامہ جاری فرمایا مگر نوشت تقدیر کہ جلد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا اور یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا، مگر جب دور عباسی کا آغاز ہوا اور اسی کے ساتھ علوم وفنون کی تدوین میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا تو سب سے پہلے جس علم نے تدوین کے چہرہ زیبا کی زیارت کی وہ تھا علم حدیث۔ چنانچہ درجنوں علمائے حدیث نے تدوین حدیث کا کام انجام دیا، البتہ کتاب کی شکل میں ہم تک صرف مؤطا امام مالک پہنچ سکی ہے جسے محدث مدینہ نے فقہی ابواب کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے، اس کتاب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابتداء امر میں جمع حدیث کا پہلا مقصد خدمت فقہ تھا (۲۷)

تدوین حدیث کا یہ پہلا مرحلہ تھا جس میں ابواب فقہ کی رعایت تھی۔ لیکن دوسری صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے بعض ائمہ حدیث کی توجہ اس بات کی طرف مبذول ہوئی کہ حدیث نبوی کو اقوال صحابہ سے الگ کر دیا جائے جیسا کہ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ بخاری شریف کی شرح میں تدوین حدیث کے دور اول کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''دور اول کی تدوین ابواب کے اعتبار سے ہوئی جس میں کسی حد تک اقوال رسول ﷺ واقوال صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور فتاوی تابعین ایک دوسرے میں ملے ہوئے تھے یہاں تک کہ بعض ائمہ نے حدیث نبوی کو مستقل طور پر جمع کرنے کا خیال کیا۔ یہ ۲۰۰ھ کا زمانہ تھا، چنانچہ عبیداللہ بن موسیٰ العبسی الکوفی، مسدد بن مسرھد البصری، اسد بن موسیٰ الاموی اور نعیم بن حماد الخزاعی نے ایک ایک مسند ترتیب دی پھر ائمہ نے انھیں کی تقلید کی چنانچہ بہت کم ہی حافظ حدیث ہونگے جنہوں نے مسانید کی ترتیب نہ دی ہو۔ (۲۸)

یہ تدوین حدیث کا دوسرا دور تھا جس میں حدیث کی تدوین مسانید کے اعتبار سے عمل میں آئی۔ کتب مسانید میں عام طور پر ابواب فقہ کی رعایت نہیں کی جاتی ہے۔ بلکہ یہ کتابیں صحابی کے اعتبار سے ترتیب دی جاتی ہیں، چنانچہ ایک جگہ ایک صحابی سے روایت شدہ تمام حدیثیں ذکر کرنے کے بعد ہی دوسرے صحابی کی روایت شدہ احادیث ذکر کی جاتی ہیں۔ ترتیب میں صحابی کے مرتبہ ومقام کا خیال رکھا جاتا ہے۔

اسی دوسرے مرحلے کی جمع شدہ مسانید میں حضرت امام احمد بن حنبل کی مسند ہے جو ثقہ راویوں سے روایت کردہ حدیثوں کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے جو حضرت کا علم حدیث پر گراں قدر علمی کارنامہ ہے، جس کی جمع وتدوین کے لئے آپ نے خدا کی اس وسیع وعریض سرزمین کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ چھان مارا۔ اس کی راہ میں آپ نے دور دراز مملکت اسلامیہ

کے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آپ کا یہ بیش بہا علمی سرمایہ آپ کی پوری حیات طیبہ کی علمی تگ ودو کا نتیجہ ہے۔ اس کی جمع وتدوین کا کام آپ نے ۱۸۰ھ میں شروع کیا جو تاحیات جاری رہا، چنانچہ اس کتاب کی جمع وتدوین کے تعلق سے حضرت شمس الدین جزری فرماتے ہیں:

''امام احمد نے مسند کی جمع وتدوین کا کام شروع کیا، اسے الگ الگ ورقوں میں لکھا، پھر اسے جدا جدا اجزا میں تقسیم کیا، یہاں تک کہ اس نے ایک مسودہ کی صورت اختیار کر لی، مگر قبل اس کے کہ آرزو پوری ہو پیام اجل آپہنچا تو اسے اپنی اولاد اور اہل بیت کو اسے پہلی فرصت میں سناڈالا اور قبل اس کے کہ اس کی تہذیب وتنقیح اتمام تک پہنچتی وہ اس دنیا سے رخصت کر گئے اور مسودہ جوں کا توں قائم رہا، پھر ان کے صاحبزادے عبداللہ نے ان روایات کے مشابہ اور مماثل مسموعات اس میں شامل کر دیے'' (۲۹)

ان سطروں سے صاف ظاہر ہے کہ مسند کی ترتیب حضرت امام احمد بن حنبل نے نہیں دی ہے بلکہ آپ کا کارنامہ جمع وتدوین کا ہے اور آپ کے صاحبزادے نے مسانید کے اعتبار سے خاص ترتیب دی۔

بہر حال اس کتاب کی ترتیب میں گرچہ آپ کے صاحبزادے اور ان کے ایک شاگرد کا بھی کارنامہ رہا ہے تاہم یہ کتاب آپ ہی کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے، جسے جمع فرما کر آپ نے امت پر احسان عظیم کیا ہے۔ آپ کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ کتابیں مرتب کرنے سے کیوں منع کرتے ہیں حالانکہ آپ نے خود بھی مسند لکھی ہے؟ جواب میں آپ نے فرمایا: یہ کتاب میں نے لوگوں کی رہنمائی کے لئے لکھی ہے جب سنت رسول اللہ ﷺ کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان اختلافات رونما ہوں گے تو لوگ اس کی طرف رجوع کریں گے۔ (۳۲)

مسند کے علاوہ حدیث کے موضوع پر آپ کی اور بھی تصنیفات ہیں جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی جتنی بھی تصنیفات ہیں خواہ وہ کسی بھی موضوع پر ہوں سب کو مجموعہ احادیث تصور کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آپ نے اپنی ہر تحریر وتقریر میں اپنا مطمح نظر حدیث وخبر ہی کو بنایا ہے۔ اس لئے آپ کی ہر تحریر سے آپ کی محدثانہ عظمت بالکل عیاں ہے جس کی شہادت میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مانند ہوگا۔ آپ کی علمی شخصیت میں یہ اتنا ابھرا ہوا پہلو تھا کہ بعض لوگوں نے آپ کے فقہی پہلو کو نظر انداز کر کے آپ کو صرف محدثین کی فہرست میں شمار کیا۔

حضرت امام احمد بن حنبل کی شان تفقہ اور مقام اجتہاد:-

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ پر احادیث وآثار کا ایسا غلبہ تھا کہ بعض حضرات آپ کو فقہاء میں شمار نہیں کرتے بلکہ آپ کو صرف محدثین کی فہرست میں رکھتے ہیں جیسا کہ ابن جریر طبری نے آپ کا مذہب منجملہ فقہی مذاہب میں شمار نہیں کرایا ہے بلکہ وہ آپ کے تعلق سے کہتے ہیں کہ (إنما هو رجل حديث لا رجل فقه) ''وہ صاحب حدیث تھے صاحب فقہ نہیں تھے'' اسی طرح مقدسی نے بھی آپ کو فقہاء میں نہ شمار کر کے محدثین کی فہرست میں رکھا ہے، اسی طرح ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ''المعارف'' میں اور ابن عبد البر نے اپنی کتاب ''الانتقاء'' میں جہاں ائمہ ثلاثہ ابوحنیفہ، مالک اور امام شافعی کا تذکرہ کیا ہے، امام احمد بن حنبل کو نہیں شمار کیا ہے۔ (۳۳)

مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل جہاں ایک بلند پایہ محدث تھے وہیں ایک جلیل القدر، صاحب مذہب، بڑے فقیہ اور عظیم الشان مجتہد بھی تھے۔ حضرت امام شافعی فرماتے ہیں:

''حضرت امام احمد بن حنبل دس چیزوں میں امام زمانہ تھے: حدیث وفقہ، لغت وقرآن، فقر وزہد، تقوی وپرہیزگاری اور سنت مصطفیٰ ﷺ'' (۳۴)

اور حضرت ابوعبید القاسم بن سلام (م: ۲۲۴ھ) کہتے ہیں:

''علم چار شخصیتوں پر ختم ہو جاتا ہے: احمد بن حنبل، علی بن المدینی، یحیی بن معین اور بکر بن ابی شیبہ، مگر احمد بن حنبل ان میں سب سے بڑے فقیہ تھے'' (۳۵) بلکہ بعض حضرات نے تو حضرت امام احمد بن حنبل کو سفیان ثوری سے اعلم وافقہ بتایا ہے۔ جیسا کہ ابوثور البغدادی نے کہا: '' أحمد بن حنبل أعلم من الثوري وأفقه '' (۳۶)

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پایۂ علم اور فقہی منزلت کے بارے میں عبدالوہاب الوراق سے علیمی روایت کرتے ہیں: ''ما رأيت مثل أحمدبن حنبل، فقالوا له وأي شيء بان لك من فضله، فقال: رجل سئل عن ستين ألف مسألة، فأجاب فيها: وحدثنا وأخبرنا'' (۳۷)

''میں نے احمد بن حنبل کا مثیل کوئی اور شخص نہیں دیکھا لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی بنا پر آپ امام احمد کے فضل

کا یوں اعتراف کرتے ہیں، جواب دیا کہ وہ ایسا شخص تھے جن سے ساٹھ ہزار مسائل پوچھے گئے اور ان کا جواب ''حدثنا'' اور ''اخبرنا'' کہہ کر دیا۔یعنی حدیث وخبر کی روشنی میں دیا''

مگر آپ کی شان تفقہ اور مقام اجتہاد کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل مناسب ہوگا کہ اسلام میں فقہ واجتہاد کا سرسری جائزہ پیش کر دیا جائے۔

نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات طیبہ سے انتقال فرما جانے کے بعد امت مسلمہ کو قرآن اور آپ کے اقوال وافعال ملے، جنھیں صحابہ کرام نے دیکھا اور اس پر عمل کیا، تقلید کی یہ خشت اول تھی، مگر جیسے جیسے دائرۂ اسلام بڑھتا گیا اور نت نئے مسائل پیش آئے، صحابہ نے قرآن وحدیث کے علاوہ اجتہاد سے کام لیا، یہ فطری ضرورت تھی اس سے احتراز غیر ممکن تھا۔یہ اجتہاد کا پہلا دور تھا۔

ابن قیم اپنی کتاب ''اعلام الموقعین'' میں کہتے ہیں:

''كان أصحاب رسول الله ﷺ يجتهدون في النوازل ويقيسون بعض الأحكام على بعض ويعتبرون النظير بنظيره'' (۳۸)

''رسول اکرم ﷺ کے صحابہ نئے پیش آنے والے مسائل میں اجتہاد فرماتے تھے اور بعض احکام کو بعض پر قیاس کرتے تھے اور ایک نظیر سے دوسری نظیر قائم کرتے تھے''۔

احمد امین صحابہ کرام کی شان اجتہاد کے تعلق سے لکھتے ہیں:

وظهر بعد ذلك مصدر آخر وهو أن كبار الصحابة وعلمائهم كانت تعرض عليهم بعض الأحداث ممن لم يعرفوا فيها نصا من كتاب ولا حديث ، فيجتهد برأيه ، ويقول فيها قولا ، وكان هذا القول فيما بعد يعد مستندا من مستندات التشريع لأنه صدر عن صحابي كبير عاشر النبي ﷺ زمنا طويلا وعرف مناحي الشريعة ومجراها (۳۹)

''زمانہ رسالت کے بعد قرآن وحدیث کے علاوہ شریعت کا ایک دوسرا ماخذ معرض وجود میں آیا اور یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم میں سے بڑے علما کے سامنے نئے مسائل پیش کیے جاتے تو جس کے سلسلے میں کوئی نص نہ ملتی تو صحابہ اپنی رائے سے اجتہاد فرماتے۔جو بعد میں شریعت کے مآخذ میں سے ایک ماخذ شمار کیا جاتا کیوں کہ یہ حکم کسی ایسے بڑے صحابی سے صادر ہوا ہوتا جس نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک عرصہ گزارا ہے اور شریعت کے مصدر وماخذ کو قاعدے سے پہچانا ہے''۔

جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تعلق سے مروی ہے کہ آپ سے ایک بار اس عورت کے تعلق سے سوال کیا گیا جس کا شوہر مر گیا ہو اور مہر متعین نہ ہو تو آپ نے جواب دینے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو اس مسئلہ میں فیصلہ صادر فرماتے ہوئے نہیں پایا ہے، مگر جب لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے اپنی اجتہادی رائے سے یہ فتوی صادر فرما دیا کہ ایسی عورت کی مہر بلا کسی کمی اور زیادتی کے مہر مثل ہوگی، اسے عدت بھی گزارنی پڑے گی اور وہ وراثت کا بھی حقدار ہوگی، اس پر حضرت معقل بن یسار کھڑے ہوئے اور شہادت دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسی عورت کے حق میں اسی طرح کا فیصلہ صادر فرماتے ہوئے سنا ہے۔یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مسعود اتنا خوش ہوگئے کہ اتنی خوشی انہیں اسلام لانے کے بعد کبھی نہیں ہوئی تھی۔(۴۰)

پھر صحابہ کے بعد تابعین کرام کا دور آیا جس کا افق پہلے دور سے کہیں وسیع تھا، اس زمانے کے مسائل پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور نت نئے تھے۔اس لئے جہاں تابعین کرام کے لئے قرآن وحدیث کے علاوہ صحابہ کے فتاوے قابل تقلید نمونہ بنے وہیں اجتہاد سے چھٹکارا نہ مل سکا بلکہ زمانے کی نزاکت کے پیش نظر اجتہاد کا دروازہ وسیع ہوگیا۔ اسے اجتہاد وتقلید کا دوسرا دور مانا جاسکتا ہے۔

تبع تابعین کے زمانے میں مسائل اور بڑھ گئے، جغرافیہ اسلام کا نقشہ بدلنے لگا، حدود میں وسعت ہونے لگی، اسلام میں نئی نئی قوموں کے دخول اور نئے نئے امور کے اندراج نے علمائے امت اور اساطین اسلام کو اجتہاد پر مجبور کر دیا، پھر اجتہاد وتقلید کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ اسلام میں چار مستقل مذاہب رونما ہوئے جن میں اجتہاد وتقلید کے عناصر بالکل عیاں تھے۔چنانچہ ہر امام کسی نہ کسی کا جزوی طور پر ہی صحیح مقلد رہا ہے مثلا فقہائے عراق حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی بن ابی طالب کے خطوط کے مقلد رہے ہیں جیسا کہ امام اعظم کی فقہ سے عیاں ہے اور اسی طرح فقہائے مدینہ حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ کی فقہ واجتہاد کے مقلد رہے ہیں جیسا کہ حضرت امام مالک کی فقہ کے اوراق شاہد ہیں۔

غرض یہ کہ ائمہ اربعہ کے اجتہادات بدعت نہیں بلکہ سنت صحابہ اور نزاکت زمانہ کی فطری ضرورت کے عکاس تھے۔ان اماموں کی تقلید اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں تھی بلکہ صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کے براہ

راست مقلد تھے، پھر تابعین کرام نے صحابہ کے اجتہادی فتوؤں میں ان کی تقلید کی، کیوں کہ صحابہ، رسول اکرم ﷺ کی تعبیر میں مثل نجوم ہیں- ان میں سے کسی کی بھی اقتدا کی جائے منزل مقصود ہی ملے گا، پھر اسی طرح تبع تابعین نے تابعین کی اقتدا یہاں تک کہ ائمہ اربعہ کے مستقل مذاہب معرض وجود میں آئے، مگر خیر القرون قرنی ثم الذی یلیہ کے تناظر میں دائرہ اجتہاد سمٹتا گیا اور تقلید کے دروازے ہر کسی کے لئے واہوتے گئے تاکہ نظام اسلام درہم برہم نہ ہو-

اسی تقلید فطری کے مذاہب اربعہ میں سے چوتھا اور آخری مذہب حضرت امام احمد بن حنبل کا ہے جس کا ایک خاص مزاج ہے اور خاص رنگ-

امام احمد بن حنبل کے اصول استنباط:- ابن قیم الجوزیہ نے امام احمد بن حنبل کے پانچ فقہی اصول بیان کی ہیں جو بقول علامہ ابوزہرہ چار ہیں اور وہ یہ ہیں: قرآن وسنت، صحابہ کے فتاوے اور قیاس- اس کے علاوہ بھی امام کی طرف بعض اصول منسوب کئے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں: استصحاب، مصالح مرسلہ، اور سد ذرائع -لیکن ہم یہاں آپ کی قیاس کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ آپ کی شان اجتہاد کا پہلو واضح ہوجائے اور ان لوگوں کی تردید بھی ہوجائے جو یہ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل قیاس سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ آپ کا اعتماد صرف احادیث واخبار پر تھا - گویا قیاس دین میں کوئی بدعت ہے جو امام کی سلفیت کے خلاف ہے جب کہ قیاس زمانہ صحابہ ہی سے اسلام کے اہم اصول استنباط میں سے شمار کیا گیا ہے - جیسا کہ حضرت امام شافعی کے شاگرد علامہ مزنی کہتے ہیں:

"الفقهاء من عصر رسول الله ﷺ الی یومنا استعملوا المقاییس فی الفقه فی جمیع الاحکام فی امر دینهم واجمعوا بان نظیر الحق حق ونظیر الباطل باطل فلا یجوز لا حد انکار القیاس لانه التشبیه بالامور والتمثیل علیها.(۴۱)

روی الخلال عن أحمد : سائلت الشافعی عن القیاس فقال: "إنما یصار إلیه عند الضرورة أو هذا معناه (۴۲)

"خلال کی روایت حضرت امام احمد سے کہ انھوں نے حضرت امام شافعی سے قیاس کے تعلق سے پوچھا تو حضرت امام شافعی نے فرمایا: ''ضرورت کے وقت اس سے کام لیا جاسکتا ہے''

جیسا کہ اس سے پہلے گزرا کہ ابن قیم امام کے اصول استنباط میں قیاس کا تذکرہ کرتے ہیں بلکہ یہی تمام حنابلہ کا موقف ہے کہ امام نے ضرورت کے وقت قیاس سے کام لیا ہے جیسا کہ ابوزہرہ لکھتے ہیں:

''تمام حنابلہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ قیاس فرماتے تھے- اس بات کی تائید میں آپ سے منقول عبارت اور فروع پیش کرتے ہیں جن سے طریقۂ استنباط کی طرف صاف اشارہ ہوتا ہے کہ آپ منکرین قیاس میں نہیں تھے بلکہ آپ مثبتین میں تھے'' (۴۳)

ابوزہرہ مزید لکھتے ہیں: '' آثار وخبر کی روشنی میں وہ ہر سوال کا جواب دیتے کبھی کبھی رائے اور قیاس سے بھی کام لیتے تھے لیکن ان کا قیاس آثار اخبار کا پرتو ہوتا تھا- (۴۴)

البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ امام بن حنبل کے یہاں قیاس کا وجود بہت محتاط مقدار میں ہے- ضرورت قصوی کے وقت ہی قیاس کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا ہے، آپ کی بیشتر فقہ نصوص اور فتاوے صحابہ سے ماخوذ ہیں- ابوزھرہ امام کی فقہ کے اوصاف کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''امام احمد کے فتاوی احادیث واخبار اور سلف صالح کے آثار پر مبنی تھے- اس سلسلے میں ان کا علم بہت وسیع تھا اور آپ کے یہاں روایت کا ذخیرہ تھا، وہ قول رسول ﷺ اور صحابہ کرام کے فتاوی پر فتاوی دیا کرتے تھے- فتوی اس قول پر دیتے تھے جو مختلف فیہ نہ ہو، مختلف فیہ ہونے کی صورت میں کسی ایک قول کو اختیار کر لیتے تھے اور اگر ترجیح کی کوئی وجہ نہ دیکھتے تھے تو زیر بحث مسئلے میں دونوں کے قول مان لیتے تھے- اگر انہیں کسی صحابی کا فتوی نہ ملتا تو پھر وہ کسی تابعی کی رائے اختیار کر لیتے، یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو پھر کسی ایسے فقیہ کا قول قبول کر لیتے جو علم حدیث میں مشہور ہوتا- جیسے امام مالک اور امام اوزاعی وغیرہ حالانکہ وہ مسائل فقہیہ میں مقلد نہیں بلکہ مجتہد تھے، ان کے اجتہادی مسائل کم نہیں بہت زیادہ ہیں، اگرچہ آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ آپ کی رائے کسی امام کی رائے سے بہر حال مطابقت رکھتی ہو اس لئے کہ وہ دینی معاملات میں نہ نئی راہ پسند کرتے تھے اور نہ ہی ندرت واغراب کو صحابہ سے فرط تاثر کی بنیاد پر اپنا طریقہ کار بناتے تھے''- (۴۵)

یہ تھا آپ کے فتوی دینے کا انداز اور قیاس کے تعلق سے آپ کا محتاط موقف، مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ قیاس سے بے نیاز تھے- اگر ایسا ہوتا تو حنابلہ کی کتابوں میں قیاس کے انبار نہ ملتے - ابو زہرہ فقہ حنبلی میں قیاس کے وجود کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''امام احمد کے قیاس سے کام لینے کی وجہ سے فقہ حنبلی میں قیاس کو

خاص مقام حاصل ہے بلکہ حنبلی فقہاء امام احمد سے زیادہ قیاس سے کام لینے کے عادی رہے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اس بات پر انہیں زمانہ کی ضروریات نے مجبور کر دیا لوگوں کے حادثات اور مسائل جیسے جیسے گونا گوں شکل اختیار کرتے گئے فقہائے حنابلہ اس بات پر مجبور ہوتے گئے کہ فتاوی صحابہ اور امور منصوص پر قیاس کریں اور فتوی دیں۔ وہ مجبور ہو گئے کہ اپنے امام کے اقوال سے تخریج کریں اور یہ کام بغیر قیاس کے ممکن نہ تھا لہذا وہ اسی طریقہ پر چلے، انھوں نے اجتہاد کیا بھی اور استنباط سے بھی کام لیا اور اجتہاد بالرائی کی دوسری صورتوں سے بھی مثلاً استصحاب، مصالح مرسلہ اور استحسان وغیرہ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علمائے حنابلہ اصول فقہ کے سلسلے میں متعدد بلند پایہ اور مفید کتابیں لکھی ہیں، ان میں علی بن محمد بن عقیل البغدادی ہیں ۵۱۳ھ، ابو یعلی محمد بن الحسین الفراء ۴۵۸ھ، ابو الخطاب محفوظ بن احمد بن الحسین البغدادی ۶۹۵ھ اور ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے اصول فقہ پر کئی کتابیں لکھیں۔ اس علم کے قواعد مرتب کرنے اور ان کی توضیح وتشریح کرنے میں کافی جدوجہد کی اور قیاس پر خصوصیت کے ساتھ قلم اٹھایا اور پھر ابن تیمیہ اور ابن قیم نے فقہ اسلامی کی اس شاخ قیاس پر بہت زیادہ تفصیل اور تکمیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ (۴۶)

امام احمد بن حنبل کی فکر سے وہابیت کے انتساب کا شاخسانہ:- عجیب وغریب تماشہ ہے کہ آج کی غالی سلفیت اپنا قبیح چہرہ چھپانے کے لئے امام احمد بن حنبل کی اس چادر معطر کا سہارا لیتی ہے، جس کے ہر ہر دھاگے سے محبت اسلاف اور تقلید واجتہاد کی خوشبو پھوٹتی ہے۔ تاریخی حقائق اور بنیادی فروق کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے حنبلیت کا ڈھنڈھورا کرتے پھرتی ہے حالاں کہ اللہ شاہد ہے کہ غالی سلفیت اور امام احمد سے موروث اصول وافکار میں زمین وآسمان کا بھی رشتہ نہیں ہے، مگر سر چھپانے کے لئے کم از کم آسماں چاہئے۔ ملاحظہ کیجئے مستشرق لاؤسٹ لکھتا ہے:

''آپ (امام احمد بن حنبل) اہل سنت کے چار مذاہب میں سے مذہب حنبلی کے بانی ہیں، اور اپنے شاگرد ابن تیمیہ کے ذریعے وہابیت کے مورث اعلی اور کسی حد تک سلفیہ کی قدامت پسندانہ تحریک کے بھی محرک ہیں'' (۴۷)

اس تحریر میں لاؤسٹ نے اپنا ''استشراقی تیور'' دکھاتے ہوئے جہاں ''وہابیت'' کی کڑی کو امام کی ذات سے جوڑنے کی بے جا کوشش کی وہیں ایک مغالطہ کی بنیاد ڈال دی اور ابن تیمیہ کو امام احمد کا شاگرد کہہ ڈالا جو قطعا درست نہیں ہے۔ ہاں اگر ہم مجاز بعید کا سہارا لیں تو بالواسطہ ان کو امام صاحب کا شاگرد گردانا جاسکتا ہے مگر اس تکلف کی اس شخص کے حق میں کیا ضرورت جس نے مجاز کا ہی انکار کیا ہو؟

مصر کے ایک مشہور قلم کار ڈاکٹر شوقی ضیف نے بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر عصر حاضر کے ''وہابیوں'' کو حنبلی المذہب بتایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: (غير أن مذهبه لم يكتب له الانتشار كما كتب للمذاهب الثلاثة السالفة، وإن كان قد ازدهر حديثا بين الوهابيين) (۴۸) ''مگر امام احمد بن حنبل کا مذہب سابقہ تین مذاہب کی طرح رواج نہ پا سکا گرچہ عصر حاضر میں وہابیوں کے مابین اس مذہب کی ترقی ہوئی''

ان تحریروں کے پس منظر میں وہابیوں کا وہ شور شامل ہے جس کا راگ وہ الاپتے رہتے ہیں اور ایک طرف تو اپنے حنبلی کا دعوی کرتے ہیں تو دوسری طرف تقلید اور دوسری ضروریات دین کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ درحقیقت یہی مزاج متضاد غالی سلفیت کے فکری اضطراب کا عکاس ہے۔ اب ہم پیش کرتے ہیں امام کی چند ایسی فکریں جن سے خود بخود وہابیت کے حنبلی تانے بانے ان سے بیزار دکھائی دیں گے۔

امام احمد بن حنبل کی نظر میں تقلید کا مقام:- ابن قیم نے اعلام الموقعین میں حضرت امام احمد بن حنبل کے تعلق سے لکھا ہے:

(وقال الإمام أحمد لبعض أصحابه: إياك أن تتكلم في مسألة ليس لك فيه إمام) (۴۹)

''حضرت امام احمد نے اپنے بعض شاگرد سے کہا: خبردار! کسی ایسے مسئلے میں کلام مت کرو جس میں تمہارا کوئی امام نہ ہو''

علاوہ ازیں صحابہ کرام اور تابعین عظام کے فتاوے کے تعلق سے آپ کا پرعزم اور محتاط موقف تقلید کے لئے زریں دلیل ہے کہ آپ اس وقت تک اجتہاد اور قیاس سے کام نہیں لیتے تھے جب تک کہ آپ کے سامنے نصوص یا صحابہ اور تابعین کے فتاوے موجود رہتے بلکہ آپ ایسی صورت میں صحابہ اور تابعین یا کسی بڑے امام کے مقلد ہوتے۔ ہاں جب یہ سب کچھ آپ کا ساتھ چھوڑ دیتے تب آپ اجتہادی رائے قائم فرماتے جس سے جہاں یہ واضح ہوتا کہ آپ ایک بہت بڑے مجتہد صاحب مذہب فقیہ تھے وہیں آپ کے سلوک وعمل سے تقلید کا بھی ثبوت

ہوتا ہے- سالم عقل چاہیے سالم فکر کے لئے!

امام احمد کی نظر میں تبرکات کا مقام :- عام طور پر غالی سلفیت تبرکات کی توہین میں پیش پیش رہتی ہے- بزرگوں کے آثار واسلاف کی تعظیم سے اس جماعت کو ہمیشہ شرک ہی کی بو آتی ہے- ایسی نشانیوں کو مٹانا اور ان کے خلاف جنگی پیمانہ پر تحریک چھیڑنا جن سے بزرگوں کی محبت کی خوشبو پھوٹے، اس جماعت کا اولین مقصد اور جہاد فی سبیل اللہ ہوتا ہے، مگر آیئے دیکھیں تبرکات کے تعلق سے اس ذات کا کیا موقف ہے جس کی طرف یہ جماعت اپنے آپ کو منسوب کرتی ہے-

مروی ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو آزمائش کے دنوں میں خلیفہ کے حکم سے ٹکٹکی کے پاس لے جا کر کھڑا کیا گیا- جلادوں نے آگے بڑھ کر ان کا کرتہ اتار لیا، اس میں ایک طرف ایک گرہ میں کوئی چیز بندھی تھی، ان سے پوچھا اس گرہ میں کیا ہے، انھوں نے جواب دیا: اس میں میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ کے مبارک بال ہیں جو ابن الفضل بن ربیع نے مجھے بطور عطیہ دیے تھے- (۵۰)

سبحان اللہ! چہ نسبت خاک را با عالم پاک! یہ ہے ستودہ صفات ہستی جس کی نبی کریم ﷺ سے محبت کا عالم یہ تھا اور آج کا حنبلی جسے اسی ذات گرامی ﷺ کے روضے کی زیارت میں شرک نظر آیا تو کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی کذب وافترا ہے ؟(فليعلم الذين ظلموا أي منقلب ينقلبون)

مآخذ ومراجع

(۱) دیکھئے: تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص: ۱۰۱ طبع مصر

(۲) ضحی الإسلام ۲،/۱۹

(۳) البدایۃ والنہایۃ: ابن کثیر، ۱۰/ ۷ ۱۴ طبع مصر

(۴) طبقات الحنابلۃ: محمد بن أبي یعلی البغدادي، ۱/ ۸

(۶) دیکھئے: ابوزہرہ کی کتاب ''ابن حنبل- '' حیاتہ وعصرہ، آراؤہ وفقھہ'' ص: ۲۵-۲۶

(۷) دیکھئے: البدایۃ والنہایۃ، ۱۰/ ۴۳۵-۴۳۷.

(۸) دائرۃ معارف اسلامیۃ (اردو) ۲/ ۶۴

(۹) دیکھئے: دائرۃ معارف اسلامیۃ (اردو) ۲/ ۶۴

(۱۰) دیکھئے: البدایۃ والنہایۃ، ۱۰/ ۴۲۰-۴۲۳.

(۱۱) دائرۃ معارف اسلامیہ (اردو) ۲/ ۶۲

(۱۲) دیکھئے: البدایۃ والنھایۃ، ۱۰/ ۴۱۸

(۱۳) دائرۃ معارف اسلامیہ (اردو) ۲/ ۶۲

(۱۹) ابن حنبل: ابوزہرہ ص: ۳۵-۳۶.

(۲۰) ابن حنبل: ابوزہرہ ص: ۱۶۸.

(۲۱) دیکھئے تحریک اعتزال کی تفصیل: ظہر الاسلام: احمد امین، طبع مصر ۴/ ۹.

(۲۲) دیکھئے: داستان عزیمت: البدایہ والنہایہ: ابن کثیر، ۱۰/ ۴۲۳-۴۲۹ اور ملاحظہ کریں: ابن حنبل: ابوزہرہ ص: ۴۳-۶۸.

(۲۳) طبقات حنابلہ ۱/ ۱۰

(۲۴) البدایہ والنہایۃ، ۱۰/ ۴۱۸

(۲۵) طبقات حنابلہ ۱/ ۱۰

(۲۶) دیکھئے: ضحیٰ الاسلام: احمد امین، ۲/ ۱۰۶

(۲۷) دیکھئے: ضحیٰ الاسلام: احمد امین، ۲/ ۱۰۷

(۲۸) دیکھئے: ضحیٰ الاسلام: احمد امین، ۲/ ۱۰۸، ۱۰۹

(۲۹) ابن حنبل: ابوزہرہ، ص ۱۰۹

(۳۲) ابن حنبل، ص: ۱۵۹

(۳۳) ضحیٰ الاسلام، ۲/ ۲۳۵.

(۳۴) طبقات حنابلہ، ۱/ ۱۰.

(۳۵) طبقات حنابلہ، ۱/ ۱۲

(۳۶) طبقات حنابلہ، ۱/ ۱۵-۱۶.

(۳۷) ابن حنبل: محمد ابوزہرہ ص: ۱۹۹

(۳۸) ابن حنبل: محمد ابوزہرہ ص: ۲۷۳.

(۳۹) ضحیٰ الاسلام: احمد امین

(۴۰) ضحیٰ الاسلام، ۲/ ۱۵۷، ۱۵۸.)

(۴۱) ضحیٰ الاسلام، ۲/ ۱۵۸.

(۴۲) ابن حنبل: ابوزہرہ، ص: ۲۷۳.

(۴۳) ابن حنبل، ص: ۲۷۳.

(۴۴) ابن حنبل، ص: ۲۷۳.

(۴۵) ابن حنبل، ص: ۲۰۱.

(۴۶) ابن حنبل، ص: ۱۹۹-۲۰۰.

(۴۷) ابن حنبل، ص: ۲۷۳-۲۷۴.

(۴۸) دیکھئے: دائرۂ معارف اسلامیہ اردو ۲/ ۶۴

(۴۹) تاریخ الادب العربي- العصر العباسی الاول: شوقی ضیف ص: ۳۳۲.

(۵۰) دیکھئے: ابن حنبل لأبی زھرۃ ص: ۲۰۱

(۵۱) دیکھئے: البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر، ۱۰/ ۳۲۷، ۳۲۸ ☆☆☆

باب ۴

تحقیق وتنقید

- مولانا منظر الاسلام ازہری ــــــــ امام اعظم کے مخالفین اور ان کے الزامات کا تحقیقی جائزہ
- مولانا سید الحق محمد عاصم قادری ــــــــ امام اعظم اور عمل بالحدیث
- ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی ــــــــ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نظریہ تقلید و اجتہاد
- مولانا کوثر امام قادری ــــــــ ائمہ حدیث اور تقلید
- مولانا رفعت رضا نوری ــــــــ علمائے تفسیر اور تقلید
- مسانید امام اعظم ــــــــ مولانا دلشاد احمد قادری
- مولانا ملک الظفر سہسرامی ــــــــ امام اعظم کے مخالفین کے الزامات پر ایک نظر

مولانا منظر الاسلام ازہری☆

امام اعظم کے مخالفین اور ان کے الزامات کا تحقیقی جائزہ

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ (۸۰ھ/۱۵۰ھ) کے حاسدین یا مخالفین پر قلم اٹھانا جرأت کا کام ہے کیونکہ اس ضمن میں بڑے بڑے سلاطین عصر، علماء وقت، فقہاء بے مثال اور محدثین زمانہ یکساں نظر آتے ہیں، کسی کے اختلاف یا حسد کی وجہ غلط فہمی تھی تو کسی کا عناد اور تعصب ان کے علم کا بڑھتا ہوا اثر تھا، کسی نے اپنی حکومت وریاست کے لئے انہیں خطرہ سمجھا تو کسی نے امراء وخلفاء کے نزدیک اپنی مقبولیت کے آگے اٹل چٹان جانا، کوئی تشبیہ وتجسیم کا قائل تھا تو کوئی جبر وقدر کے فروغ میں انہیں روڑا سمجھتا تھا، وجہ کچھ بھی ہوا تنا طے ہے کہ امام اعظم کی بڑھتی ہوئی علمی مقبولیت نے لوگوں کو آپ سے حسد کرنے پر مجبور کردیا۔

ائمہ ومحدثین، علماء اور سلاطین نے جن مسائل کو بنیاد بنا کر امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ (۸۰ھ-۱۵۰ھ) کو ہدف تنقید بنایا ہے ان میں ''ایمان کی کمی بیشی'' ''قرآن مخلوق ہے یا نہیں'' ''حدیث رسول کے خلاف قیاس سے استدلال'' اہم مسائل ہیں، جن محدثین نے ان مسائل کو ہوا دیا اور اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ان میں علامہ ابن عدی (م۳۶۵ھ) علامہ عقیلی (م۳۲۲ھ) عبدالرحمن بن ابی حاتم (م۳۲۷ھ) علامہ ابن حبان بستی (م۳۵۴ھ) علامہ ابوبکر بیہقی (م۴۵۸ھ) ابونعیم (م۴۳۰ھ) اور خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) سرفہرست ہیں، ان علماء کی تمام عبارتوں اور اس پر جرح وقدح کرنے کی تو یہاں گنجائش نہیں تاہم اول الذکرتین کی بعض روایتوں کا ذکر کرکے ان کا تجزیہ ضرور کریں گے، یوں ہی تمام الزامات پر تحقیقی گفتگو نہ کرکے صرف اس بات کا محاسبہ کریں گے کہ اس اعتراض میں کس حد تک دم ہے کہ امام ابوحنیفہ نے حدیث کی قسم ''مرسل'' (جو بعض محدثین کے نزدیک ضعیف بعض کے نزدیک کچھ شرطوں کے ساتھ صحیح سمجھی جاتی ہے) اور ''خبر واحد'' کے بالمقابل ''قیاس'' کو ترجیح دی ہے۔ واضح رہے کہ ہماری اس تحریر کا مقصد قطعا کسی بھی امام کی پگڑی اچھالنا یا ان کی گستاخی کرنا نہیں، جس طرح امام اعظم ابوحنیفہ ہمارے لئے قابل احترام ہیں اسی طرح دیگر ائمہ کرام کا احترام بھی ہمارے قلبی سکون کا باعث ہے، میزان کے مقدمہ میں علامہ ذہبی (۷۴۸ھ) کا یہ قول میرے لئے نقش راہ ہے:

لا أذكر في كتابي من الأئمة المتبوعين في الفروع أحدا لجلالتهم في الاسلام و عظمتهم في النفوس مثل أبي حنيفة والشافعي والبخاري، فان ذكرت أحدا منهم فأذكره على الانصاف ذلك عند الله ولا عند الناس.

علامہ عقیلی (۳۲۲ھ) اور امام اعظم ابوحنیفہ (۱۵۰ھ):- علامہ ابو جعفر محمد بن عمرو بن موسی عقیلی علم درایت اور رجال حدیث کا ایک بڑا نام ہے، علم رجال کے مصنفین نے آپ کی بہت تعریف کی ہے، اپنے وقت کے مسلم امام تھے، حفظ واتقان میں آپ کا کوئی مثل نہیں تھا، متعدد تصانیف کے مالک ہیں ان سب کے باوجود تشدد اور تعصب مذہبی میں بھی نمایاں تھے، تشدد کی مثال تو یہ ہے کہ صحیح بخاری اور مسلم کے متعدد رجال پر کلام کردیا، حد تو یہ کہ علم حدیث کے متفق امام، رجال حدیث پر گہری نظر رکھنے والے، علامہ امام علی بن مدینی (م۲۳۴ھ) بخاری و مسلم میں جن کی روایت بھری پڑی ہے اور جن کے بارے میں امام بخاری جیسا عظیم محدث نے فرمایا: میں نے اپنے آپ کو اگر کسی محدث کے نزدیک چھوٹا پایا تو وہ علی بن مدینی کی شخصیت ہے، اگر اپنی کتاب میں علی بن مدینی، اصحاب محمد اور ان کے شیخ عبدالرزاق کی حدیث کا ذکر نہ کروں تو مطلب یہ ہے کہ علم حدیث کا دروازہ اسی جگہ بند ہوگیا، مرویات وآثار کی انتہاء ہوگئی اور علم حدیث پر زنادقہ کا قبضہ ہو چکا اور دجال پیدا ہورہے ہیں۔ (میزان الاعتدال ۵/ ۱۶۹، تذکرہ علی بن مدینی) ایسی بلند قد شخصیت کو علامہ عقیلی نے اپنی کتاب ''ضعفاء'' میں شامل کرکے ان کی تضعیف کردی، اس واقعہ نے علامہ ذہبی اور دیگر ائمہ کو اس حد تک تعجب میں ڈال دیا کہ وہ پکار اٹھے:

افمالك عقل يا عقيلي اتدري فيمن تتكلم وانما تبعناك في ذكر هذا النمط لنذب عنهم ولنزيف ماقيل فيهم

☆200 W Market Centre Dr High Point, N Carolina (U.S.A) E-mail:manzarulislamq@yahoo.com

کانک لا تدری ان کل واحد من ھؤلاء أوثق منک بطبقات، بل و أوثق من ثقات کثیرین لم تورد ھم فی کتابک فھذا مما لایرتاب فیه محدث. (میزان الاعتدال ۵/۱۵۹)

عقیلی تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے، !کس کے بارے مین زبان کھول رہے ہو!! ہم نے یہ طریقہ صرف اس لئے اپنایا ہے تا کہ ان ائمہ کرام کا دفاع کرسکیں، گویا تمہیں پتہ ہی نہیں کہ ان میں ہر ایک تم سے کئی گنا زیادہ ثقہ ہیں، بلکہ بہت سارے ان ثقات سے بھی زیادہ ثقہ ہیں جن کا ذکر تم نے اپنی کتاب میں نہیں کیا، اس میں کسی محدث کو شک بھی نہیں۔

یہ تو علامہ عقیلی کے تشدد کی مثال تھی اور مذہبی تعصب کی انوکھی مثال ملاحظہ کرنے کے لئے ان کی کتاب ''الضعفاء'' کے تذکرے بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی کا تذکرہ پڑھنا چاہئے، امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ سے متعلق انہوں نے ایسی ایسی بے بنیاد روایتیں نقل کی ہیں کہ الامان والحفیظ!!! ایک جگہ انہوں نے امام سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) کے حوالہ سے لکھا کہ انہوں نے فرمایا: ابوحنیفہ جیسا خطرناک بچہ اسلام میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا (کتاب الضعفاء ۴/۲۱۸)، حضرت عبداللہ بن مبارک (م ۱۸۱ھ) کی طرف منسوب کرتے ہوے ایک قول نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا: ابوحنیفہ کی حدیث کو کچل ڈالو.. (کتاب الضعفاء ۴/۲۸۲) اور اس طرح کی نہ معلوم کیسی کیسی بے بنیاد حکایتیں ائمہ اعلام کے حوالہ سے نقل کیا ہے، جن کے ساتھ امام اعظم کا اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا اور اگر ہم نشینی نہ بھی ہوتو ایسے پاک طینت لوگوں کے بارے میں کبھی بھی یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی رائے امام اعظم کے بارے میں اس درجہ غلط تھی!! آیئے ذیل میں ہم ان دونوں قول کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں:

سند حکایت: عقیلی کہتے ہیں: ہم سے حاتم بن منصور نے بیان کیا، ان سے حمیدی نے، انہوں نے سفیان کو کہتے ہوے سنا:

اس کی سند میں ''حمیدی'' ہیں، امام سبکی شافعی نے اپنی کتاب ''طبقات ۱/۲۲۴'' میں علامہ محمد بن عبداللہ بن الحکم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ''حمیدی'' لوگوں سے بات چیت کے دوران جھوٹ بولا کرتے تھے، تعصب ان کی رگوں میں بسا ہوا تھا، ان کی روایتوں میں سخت اضطراب ہوتا ہے، کبھی تو وہ ''حمزہ بن حارث'' سے روایت کرتے ہیں اور کبھی بلا واسطہ ''حارث'' سے روایت کرتے ہیں۔ (تانیب الخطیب ۴۷)

ٹھیک یہی قول خطیب نے بھی اپنی کتاب ''تاریخ بغداد'' میں اپنی سند سے امام اوزاعی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، خطیب کی سند میں متواتر تین ایسے راوی ہیں جن میں سے ایک کو امام احمد بن حنبل نے ''ضعیف جدا'' کہا، ابوحاتم نے اپنے نزدیک ان کی ثقاہت سے انکار کیا، جبکہ دیگر دو رواۃ پر دوسرے ائمہ نے جرح کی ہے، لہذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ امام سفیان ثوری نے کبھی بھی اس طرح کا قول امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے متعلق نہیں کیا، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سفیان ثوری امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔

سفیان ثوری اور امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ: - اگر سفیان ثوری کے پاس کوئی جاتا اور کہتا کہ میں امام ابوحنیفہ کے پاس سے آرہا ہوں تو فرماتے تم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہو کہ روئے زمین پر اس جیسا فقیہ عالم نہیں ہے (خیرات الحسان، ص:۸۲)

ایک شخص سفیان ثوری کی مجلس میں آیا وہ مرجہ علوم کا ماہر تھا، اس نے سفیان ثوری سے پوچھا، آپ امام ابوحنیفہ کی بدگوئی کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے پوچھا وہ کیسے؟ اس نے کہا میں نے سنا ہے وہ ہر بات نہایت تحقیق صحت اور انصاف سے کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں ہر مسئلہ کتاب اللہ سے بیان کرتا ہوں، اس میں نہ ملے تو سنت رسول سے لیتا ہوں، اس میں نہ ہو تو صحابہ کرام کے اقوال و اعمال سے لیتا ہوں، اگر صحابہ کے اقوال و افعال میں اختلاف ہو تو کبھی کبھی بعض اقوال کو چھوڑ دیتا ہوں، جہاں جمہور صحابہ کی رائے ہو قبول کرتا ہوں، جہاں ایک صحابی کا قول ہو اس کو چھوڑ بھی دیتا ہوں، میں صحابہ کے اعمال و اقوال پر کسی دوسرے کی رای کو ترجیح نہیں دیتا، مثلا ابراہیم، شعبی، حسن، ابن سیرین، سعید بن مسیب اور دوسرے جلیل القدر تابعی علماء کے اقوال کو صحابہ کے اقوال کے سامنے وزن نہیں دیتا - ان بزرگوں نے اجتہاد کیا ہے، میں نے بھی ایسے مسائل میں اجتہاد کیا ہے اور یہ میرا حق ہے - یہ بات سن کر حضرت سفیان ثوری تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے، پھر فرمایا: (آپ کے یہ کلمات حاضرین مجلس نے لکھ لئے ہیں) ہم حدیث کی شہادت سن کر خوفزدہ ہوتے ہیں، اور لوگوں کی بداعمالیوں پر سرزنش کرتے ہیں، زندوں کا محاسبہ کرتے ہیں، مرنے والوں کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں، ان کی باتیں سنتے ہیں، جو قابل قبول ہو مان لیتے ہیں، جن امور پر ہم آگاہ نہیں ہوتے علماء کرام کے سپرد کردیتے ہیں - ہم اپنی رائے کو متہم کرسکتے ہیں، لیکن علماء اسلام کو متہم نہیں کرسکتے۔ (مناقب امام اعظم،

صدر الائمہ امام موفق بن احمد مکی، متوفی ۵۷۸ھ، ترجمہ مطبوعہ، مکتبہ نبویہ، لاہور، مولانا فیض احمد اویسی)

عبداللہ بن مبارک اور امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ: -اس سند میں ''ابراہیم بن شماش'' کا وجود ہی اس بات پر دال ہے ہے کہ ''عبداللہ بن مبارک'' کی طرف منسوب اس قول میں کچھ صداقت نہیں ،اتنی بات ضرور ہے کہ ابتداء میں ''ابن مبارک'' امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے متعلق اچھا تاثر نہیں رکھتے تھے لیکن جب دونوں کی ملاقات ہوگئی تو اس کے بعد امام صاحب کے اتنے مداح ہوگئے کہ یہ فرمایا کرتے: فقہ میں ابوحنیفہ کا ثانی کوئی نظر نہیں آیا!!

علامہ ابن عبد البر نے یہاں تک نقل کیا ہے کہ سلمہ سلیمان نے ایک مرتبہ ''ابن مبارک'' سے کہا: آپ ابوحنیفہ کی رائے کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جبکہ امام مالک کو آپ اس قدر اہمیت نہیں دیتے؟ جواب دیا مجھے اس میں گہرائی نظر نہیں آتی ہے!! (جامع بیان العلم ۲/۱۵۷)

عبداللہ بن مبارک نے فرمایا امام ابوحنیفہ اللہ کی آیات میں سے ایک آیت ہیں، کسی نے آپ سے سوال کیا کہ: آیت خیر ہیں یا آیت شر؟ ابن مبارک نے کہا: اے بندہ خدا، تم قرآن مجید کی روشنی میں اس آیت کے لفظ کو تلاش کرو ''وجعلنا بن مریم و أمه آیة'' کیا آیات شر سے بھی بن سکتی ہیں؟ (سابق، ص ۳۱۷)

ابن مبارک نے فرمایا؛ جب میں امام مالک کے پاس تھا تو آپ کے پاس ایک شخص آیا، میں نے ابھی امام ابوحنیفہ کو نہیں دیکھا تھا، امام مالک نے مجھ سے پوچھا جانتے ہو یہ کون ہیں، میں نے عرض کیا میں نہیں جانتا، آپ نے فرمایا، یہ اتنے ذہین وفطین ہیں کہ اگر کہہ دیں کہ یہ سونے کا ستون ہے تو ثابت کردیں گے واقعی سونا کا ہے، وہ فقہ میں اس قدر بلند رتبہ رکھتے ہیں، اللہ تعالی نے انہیں اس علم میں بے پناہ توفیق بخشی ہے، یہ باتیں ہورہی تھیں کہ امام مالک کی مجلس مین سفیان ثوری آگئے-آپ نے بیٹھنے کے لئے آپ کو وہ جگہ نہ دی جہاں امام ابوحنیفہ بیٹھے تھے جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے آپ سے پوچھا: آپ نے سفیان ثوری کو اس احترام سے نہیں بٹھایا جس احترام سے امام ابوحنیفہ کو بٹھایا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ جو ورع وتقوی امام ابوحنیفہ میں پایا جاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا-(سابق ص، ۳۱۷، ۳۱۸)

ایک مرتبہ فرمایا: میں نے مسعر بن کدام کو ابوحنیفہ کے درس میں مستفید ہوتے دیکھا، اگر خدا تعالی ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کے سبب میری دست گیری نہ کرتا، تو میں بھی اور عام آدمیوں کی طرح ایک آدمی ہوتا (مناقب امام اعظم، کردری ۱/۱۰۸)

قارئین کرام! دیکھا آپ نے عبداللہ ابن مبارک جیسی قدآور شخصیت امام ابوحنیفہ کی تعریف کس طرح کررہی ہے، کیا اس کے باوجود یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ کی حدیث کو کچل ڈالنے کا حکم دیا ہو!! قاتل الله التعصب المقیت-

سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ): -حمیدی کہتے ہیں سفیان بن عیینہ نے فرمایا: دو چیزیں ایسی ہیں کہ ہم کو تصور بھی نہ تھا کہ وہ کوفہ کے پل کے آگے نکلیں گی ایک حمزہ کی قرأت اور دوسری ابوحنیفہ کی فقہ لیکن وہ دونوں تمام آفاق میں پہنچ گئیں-(مناقب الائمہ، ص ۲۰)

غالبا عقیلی کا یہی وہ تعصب تھا جس نے ان کے شاگرد علامہ ابن دخیل کو اپنے استاذ کا رد کرنے پر مجبور کردیا، اور امام اعظم ابوحنیفہ کے مناقب میں ایک رسالہ تحریر فرمایا جس میں عقیلی کی روایت اور اس جیسی دیگر بے بنیاد باتوں کا بہت اچھی طرح تجزیہ کرکے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردکھایا، یونہی علامہ ابن عبد البر مالکی نے اپنی کتاب ''الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمہ'' میں بھی شرح وبسط کے ساتھ ان باطل حکایتوں کا جائزہ لیا ہے، جس کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا-

عقیلی کا علم حدیث میں اگر ایک طرف بلند وبالا مقام ہے تو دوسری طرف چوک بھی کوئی کم نہیں، انہوں نے متعدد قابل قبول حدیثوں کو رد کرنے کی کوشش بھی کی ہے، جس کا بڑا تحقیقی جائزہ علامہ ابن قیم جوزیہ نے اپنی کتاب ''المنار المنیف فی الصحیح والضعیف'' میں لیا ہے-

عقیلی سے متعلق ائمہ اعلام کی ان آراء کے بعد کیا اب بھی بخاری کی دو حدیث رٹ لینے والے کسی غیر مقلد کے لئے یہ روا ہے کہ ''کتاب الضعفاء'' کے حوالہ سے امام اعظم ابوحنیفہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائے؟؟

امام اعظم اور علامہ ابن عدی (م ۳۶۵ھ): -امام علامہ حافظ ابواحمد عبداللہ بن عدی جرجانی (۲۷۷ھ-۳۶۵) محدثین اور اہل علم کے مابین مشہور نام ہے، محدثین نے آپ کی بہت تعریف کی ہے ،حفظ حدیث اور ضبط رجال میں خاصہ مہارت رکھتے تھے، دیگر محدثین کے مقابلہ میں آپ کی قوت حافظہ کو طبعی اور فطری بتایا گیا ہے، حفظ و اتقان اور علم وفضل کے باوجود تعصب مذہبی سے محفوظ نہیں رہ سکے، رواۃ

حدیث بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہ کی شان میں جب روایتیں نقل کرنے لگے تو اخذ روایت کے تمام ضابطوں کو نظر انداز کر گئے اور تذکرہ میں وضاع، کذاب اور ضعیف راویوں کی حکایت کو بھی لینے سے باز نہ آئے، امام اعظم ابوحنیفہ سے متعلق ان کی تمام روایتوں کا بالاستیعاب جائزہ لینے کے لئے تو دفتر درکار ہے ہم یہاں ''الکامل'' میں مذکور صرف ایک روایت مع سند ذکر کرتے ہیں اور پھر اس کا تجزیہ کریں گے۔

ابن عدی ''الکامل'' جلد ۷، صفحہ ۹۷ پر نقل کرتے ہیں:

اخبرنا عبد الله بن محمد بن حيان بن مقير، أخبرنا محمود بن غيلان، ثنا مؤمل قال: كنت مع سفيان الثورى فى الحجر فجاء رجل فسأله عن مسألة فأجاب، فقال الرجل: ان أبا حنيفة قال كذا و كذا، فخرق سفيان نعليه حتى خرق الطواف ثم قال: لا ثقة ولا مأمان.

ابن عدی اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ مؤمل کا بیان ہے کہ وہ سفیان ثوری کے ساتھ حرم اقدس میں حجر اسود کے پاس تھے کہ ایک شخص آیا اور ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، سفیان ثوری نے مسئلہ کا جواب دے دیا، پھر اس شخص نے کہا ابوحنیفہ اس مسئلہ میں کچھ الگ نظریہ رکھتے ہیں، مؤمل کا بیان ہے کہ سفیان ثوری نے اپنی جوتی سنبھالی اور طواف سے جب فارغ ہو گئے تو کہا: ابوحنیفہ نہ تو ثقہ ہیں اور نہ ہی مأمون۔ (لہذا ان کی بات معتبر نہیں ہوگی)

یہ اور اس طرح کی درجنوں روایتیں ابن عدی نے اپنی کتاب ''الکامل'' میں نقل کی ہیں، گہرائی میں اتر کران روایتوں کا مطالعہ کیجیے تو اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی، اوران کے رواۃ متکلم فیہ نظر آتے ہیں، بالخصوص ''مؤمل'' کو ائمہ حدیث نے ''متروک'' کہا ہے۔

ابن عدی کی ان تمام روایتوں کا بھرم اس وقت کھل جاتا ہے جب امام اعظم کا تذکرہ رقم کرتے ہوئے اخیر میں لکھتے ہیں:

قال الشيخ و ابو حنيفه له أحاديث صالحة و عامة ما يرويه غلط و تصاحيف و زيادات فى أسانيدها و متونها وتصاحيف فى الرجال و عامة مايرويه كذلک، ولم يصح له فى جميع مايرويه الا بضعة عشر حديثا، وقد روى من الحديث لعله أرجح من ثلاثمأة حديث من مشاهير و غرائب و كله على هذه الصورة لأنه ليس هو من أهل الحديث، ولا يحمل على من تكون هزه صورته فى الحديث.

یہ تو میرا موضوع نہیں ہے کہ ابوحنیفہ کو کتنی حدیث میں مہارت تھی، کیا انہیں صرف چوبیس پچیس حدیثوں کا علم تھا اور غریب و مشہور کو شمار کرنے کے بعد ابن عدی کے شیخ کے نزدیک ان کی تعداد صرف تین سو تک پہنچتی ہے، یا کچھ اور؟ ورنہ میں ثابت کردکھاتا کہ ابوحنیفہ کا علم حدیث میں کیا مقام تھا، یہاں قارئین کرام یہ ملاحظہ کرتے چلیں کہ جو کچھ بھی ابن عدی کہہ رہے ہیں اپنے شیخ کے حوالہ سے کہہ رہے ہیں جن کا نام ''اباء ابن جعفر نجیرمی'' ہے، علماء حدیث نے ان کو کذاب کہا ہے، علامہ ذہبی ابوحاتم البستی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

رأيته وضع على أبى حنيفة أكثر من ثلاثمأة حديث مالم يحدث به أبو حنيفة قط. (ميزان الاعتدال ۱۰/۸)

ابوحاتم بستی کہتے ہیں کہ ''ابان بن جعفر نجیرمی'' کو میں نے دیکھا ہے کہ ابوحنیفہ کے بارے میں تین سو سے زیادہ ایسی حدیثیں گڑھی ہیں جنہیں کبھی بھی ابوحنیفہ نے بیان نہیں کیا۔

ٹھیک یہی بات ابوحاتم نے بھی ''المجروحین'' ۱۴۸ پر درج کی ہے مگر اس میں اتنا اضافہ ہے:

فقلت له يا شيخ اتق الله ولا تكذب على رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم فما زادنى على أن قال لى لست منى فى حل فقمت و تركته وانما ذكرته لأن أحداث أصحابنا لعلهم يشتغلون بشئى من روايته. (المجروحين ۱۴۸/۱)

یہ بات ایک واقعہ کے ضمن میں صاحب ''مجروحین'' نے کہی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ: جب انہوں نے ابوحنیفہ کے بارے میں حدیثیں گڑھ کر سنائیں تو میں نے کہا: اے شیخ اللہ کا خوف کرو، نبی اکرم ﷺ پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ۔ میری اس بات پر اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکے کہ تمہارا میرے نزدیک آنا روا نہیں، پھر کہتے ہیں کہ میں ان کے پاس سے چلا گیا، میں نے صرف اس لئے بیان کیا تاکہ میرے اصحاب اس سے ہوشیار رہیں۔

ابن عدی کا تو یہ حال تھا کہ بخاری کے رجال پر بھی کلام کرنے سے باز نہ آئے، چنانچہ ''ابان بن یزید'' بخاری، مسلم اور ابو داؤد کے رواۃ میں سے ہیں، ابن عدی نے ان پر کلام کرتے ہوئے کہا کہ یہ ''حسن الحدیث ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ اہل صدق میں ہوں گے'' علامہ ذہبی نے اس پر یہ تعاقب کیا ہے:

بلکہ وہ ثقہ ہیں، حجت ہیں، یہ دیکھو امام احمد بن حنبل جب ان کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں وہ اپنے تمام مشائخ میں ثبت ہیں، ابن معین اور نسائی نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ (میزان الاعتدال ۱/۱۳۱، تذکرہ ابان بن یزید)

ابن عدی کا یہی وہ افراط تھا جس کی بنیاد پر ذہبی نے اپنے ''میزان'' کے مقدمہ میں یہ لکھا ہے:

فلولا أن ابن عدی أو غیرہ من مولفی کتب الجرح ذکروا ذلک الشخص لما ذکرتہ لثقتہ ولم أر من الرای أن أحذف اسم أحد ممن لہ ذکر بتلیین ما فی کتب الأئمہ المذکورین خوفا من أن یتعقب علی لا أنی ذکرتہ لضعف فیہ عندی الا ماکان فی کتاب البخاری و ابن عدی و غیرھما من الصحابۃ فانی نحتمل لجلالۃ الصحابۃ ولا أذکرھم فی ھذا المصنف فان الضعف انما جاء من جھۃ الرواۃ الیھم وکذا لا أذکر فی کتابی من الأئمہ المتبوعین فی الفروع أحدا لجلالتھم فی الاسلام و عظمتھم فی النفوس مثل أبی حنیفۃ والشافعی والبخاری۔

محترم قارئین! یہ ہے علامہ ذہبی کا کمال احتیاط اور ائمہ مجتہدین کا ادب، امام ذہبی ابن عدی کے افراط سے جس طرح بخوبی واقف تھے اسی طرح امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقام و مراتب کا بھی انہیں پورا لحاظ تھا۔ اس لئے ابن عدی کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر امام اعظم کا ذکر کیا۔

اتنا جان لینے کے بعد کے ابن عدی کے شیخ ناقدین رجال کے نزدیک غیر معتبر ہیں، امام اعظم کی مخالفت میں حکایتیں گڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ کیا ابن عدی یا ان کے شیخ کی ذکر کردہ روایتوں کے حوالہ سے امام اعظم ابو حنیفہ پر جرح کیا جاسکتا ہے؟ نہیں ہر گز نہیں! اگر اس کا سہارا لے کر وقت کے جلیل القدر امام کی شان میں گستاخی کی گئی تو کل رب قدیر کے حضور جواب دینا بہت مشکل ہو جائے گا۔

امام اعظم ابو حنیفہ اور ابو عبد الرحمٰن بن ابی حاتم (۳۲۷ھ):۔ تیسری ہجری کے اخیر میں اہل علم کی جماعت میں اس وقت ایک اور نام کا اضافہ ہوا جب ''عبد الرحمٰن بن ابی حاتم رازی'' کی پیدائش ہوئی، دیکھتے ہی دیکھتے اکناف عالم میں آپ کی شہرت ہوگئی، محدثین نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، فن رجال میں کامل دسترس حاصل کیا اور اہل علم و تحقیق کے لئے جہاں بہت ساری تصنیف چھوڑی وہیں اہم کتاب ''الجرح والتعدیل'' بھی چھوڑ کر ۳۲۷ ہجری میں انتقال کر گئے۔

ابو حاتم کی نیک نیتی، علمی کمال میں کچھ شک نہیں مگر صرف حدیث اور رجال کے حافظ تھے، قاسم نعمت کی طرف سے فقہ و فہم اور عقل و دانش کا حصہ شاید نہیں مل سکا تھا، غالبا یہی وجہ تھی کہ متکلمین اہل سنت پر یہ حکم لگانے سے باز نہیں آئے کہ یہ کہنا کہ: ''قرآن کے جو الفاظ ہم ادا کرتے ہیں وہ مخلوق ہے، کفر ہے، ایسا شخص دین اسلام سے خارج ہے،،

فساد عقیدہ اور علم کلام سے دوری ہی کی وجہ سے امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری پر بھی یہ حکم لگا بیٹھے کہ: ابو زرعہ اور ابو حاتم نے ان سے روایت ترک کردی ہے۔

انہیں اس بات کا اعتراف تھا کہ علم کلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں، دیکھئے ان کی کتاب ''الرد علی الجہمیہ''، جب امیر المومنین فی الحدیث جیسی قد آور شخصیت پر انہوں نے طعن کر دیا تو پھر ان سے کیسے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ فقہ و حدیث کے سنگم، علم کلام اور علوم عقلیہ میں کامل دسترس رکھنے والے امام اعظم ابو حنیفہ کی شخصیت مسلم رہ سکے، چنانچہ دیگر مؤلفین جرح و تعدیل کی طرح انہوں نے بھی امام اعظم کے بارے میں بے سرو پا حکایتیں آنکھ موند کر ذکر کر دیں۔ امام صاحب کے بارے میں ان کی کتاب ''الجرح والتعدیل'' سے کچھ نمونہ ہم قارئین کی نذر کرتے ہیں اور پھر اس روایت و حکایت کی حیثیت بھی اجاگر کریں گے:

۱۔ أخبرنا ابراھیم بن یعقوب الجوزجانی فیما کتب الی ،حدثنی اسحاق بن راھویہ، قال سمعت جریرا یقول: قال محمد بن جابر الیمامی: سرق أبو حنیفہ کتب حماد منی !!

ابن ابی حاتم اپنی روایت سے کہتے ہیں کہ محمد بن جابر یمامی نے کہا کہ ابو حنیفہ نے حماد کی کتاب مجھ سے چوری کر لی۔

قارئین کرام! غور کیجیے امام ابو حنیفہ جو امام حماد کے منظور نظر اور حماد کی علمی یادگار تھے، حماد کی وفات کے بعد جن کو لوگوں نے زبردستی مسند درس پر حماد کا اہل سمجھ کر بٹھا دیا تھا ان کے بارے میں ابو حاتم کی یہ حکایت کس حد تک مقبول ہو سکتی ہے؟

اس رویات کی سند کا جائزہ لیجیے تو اس کے بطلان کے لئے صرف ابراہیم بن یعقوب جوز جانی (۲۵۹ھ) کا وجود ہی کافی ہے، جن کے بارے میں تقریبا ناقدین رجال کا اتفاق ہے کہ اہل کوفہ سے متعلق

ان کی کوئی بھی بات معتبر نہیں ہوگی۔

علامہ ذہبی ''اسماعیل بن ابان الوراق'' پر ابن عدی کے حوالہ سے جوز جانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: وہ حق سے دور تھے... چند سطور بعد ذہبی کہتے ہیں کہ حق سے دور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اہل کوفہ کے اندر عام طور پر تشیع (یعنی حب علی) پایا جاتا تھا اور ''اسماعیل بن ابان'' بھی اسی کیفیت سے دوچار تھے۔ جوز جانی چونکہ دمشق میں رہا کرتے تھے اہل دمشق کا مذہب عام طور پر حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے بارے میں تحامل کا رہا ہے اس لئے انہوں نے راوی مذکور پر حق سے دور ہونے کا قول کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اہل دمشق عام طور پر نصبی تھے، جیسا کہ کسی وقت رفض ان کا مذہب تھا، پھر دھیرے دھیرے نصبیت تو ان کے اندر سے دور ہوگئی مگر رفض کا اثر برقرار رہا۔ (میزان ۱/۲۰۵، تذکرہ ابراہیم بن یعقوب جوز جانی، بیروت، الکامل ۱/۳۱۰ دار الفکر، بیروت)

جوز جانی کا حریزی یا نصبی مذہب ہونا واضح تھا، حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے متعلق ان کا طرز گفتگو اچھا نہیں ہوتا تھا ملاحظہ کیجیے ''تہذیب التہذیب'' کی یہ عبارت:

قال السلمي عن الدارقطني بعد أن ذكر توثيقه لكن فيه انحراف عن علي اجتمع على بابه أصحاب الحديث فأخرجت جارية له فروجة لتذبحها فلم تجد من يذبحها فقال سبحان الله فروجة لا يوجد من يذبحها و علي يذبح في ضحوة نيفا وعشرين ألف مسلم....رأيت في نسخة من كتاب بن حبان حريزي المذهب...نسبة الى حريز بن عثمان المعروف بالنصب.(تهذيب التهذيب ١/١٥٩،تذكرة ابراهيم بن يعقوب الجوزجاني،دار الفكر بيروت)

سلمی دار قطنی کے حوالہ سے ''ابراہیم بن یعقوب جوز جانی'' کی توثیق کرنے کے بعد کہتے ہیں: حضرت علی کے بارے میں ان کے خیالات اچھے نہیں تھے، ایک مرتبہ ان کے دروازہ پر کچھ محدثین آئے تو ان کی ایک باندی نے مرغی ذبح کرنے کے لئے باہر نکالا، ذبح کرنے والا کوئی نہیں ملا تو کہا، سبحان اللہ مرغی ذبح کرنے والا کوئی نہیں مل رہا ہے اور علی نے دن کی روشنی میں چوبیس سے پچیس ہزار مسلمانوں کو ذبح کر دیا۔

علامہ ابن حجر کہتے ہیں: ابن حبان کے ایک نسخہ میں میں نے یہ لکھا دیکھا ہے کہ وہ ''حریزی المذہب'' تھے... یعنی حریز بن عثمان جو نصبی ہیں ان کی طرف منسوب کرتے ہوئے ان کو حریزی کہا جاتا ہے۔

اس حکایت کے دوسرے راوی ''محمد بن جابر یمامی'' ہیں ان کے بارے میں بھی ناقدین رجال کے اقوال کچھ کم نہیں، امام احمد بن حنبل نے فرمایا؛ اس سے وہی شخص روایت کر سکتا ہے جو اس سے بدتر ہو، امام یحی بن معین اور نسائی نے ان کو ضعیف کہا دیکھئے ''الکامل ۶/۱۴۸، تذکرۃ محمد بن جابر الیمامی، دار الفکر بیروت، الضعفاء الصغیر ۱/۹۹ دار الوعی ،حلب، الضعفاء ۴/۴۱، المکتبۃ العلمیہ ، بیروت)

ان جیسے راویوں کی حکایت کو ابو حاتم جیسا شخص اگر اپنی کتاب میں جگہ دے تو اسے تعصب اور حسد نہیں تو اور کیا کہا جائیگا۔ واضح رہے کہ امام اعظم کے مسلمہ اصول میں سے یہ بھی ہے کہ راوی صرف اپنے لکھے پر اعتماد کر کے روایت نہیں کر سکتا جب تک کہ مروی عنہ کا ذکر نہ کرے، ایسی کڑی شرط کے باوجود یہ کیسے متصور ہو سکتا ہے کہ ابو حنیفہ نے محمد بن جابر کی کتاب چرالیا اور مروی عنہ کا ذکر کئے بغیر حدیث بیان کرنا شروع کر دیا۔

قارئین کرام! مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر جرح و تعدیل کی ان تین ہی کتابوں اور ان کے مؤلفین کا پس منظر ذکر کیا گیا، ان تین کتابوں کا ذکر ہی اس بات کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے کہ امام اعظم رضی اللہ تعالی عنہ سے حسد کی آگ لوگوں کے دلوں میں کس قدر بیٹھی ہوئی تھی، لہذا ان کتابوں اور ان کے مؤلفین کا سہارا لے کر اگر امام پر جرح کرنے کی کوشش کی جائے تو آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس میں کچھ صداقت نہیں، سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ اور دیگر ائمہ کی طرف جو باتیں امام اعظم کے تعلق سے منسوب کی گئیں ہیں ان میں بھی کوئی وزن اس لئے نہیں کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ ان حضرات کے دلوں میں امام صاحب کا زبردست احترام تھا۔

امام اعظم ابوحنیفہ پر ترک حدیث کا الزام:- اما اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ حدیث کو ترک کر کے قیاس کا سہارا لیتے تھے، احادیث پر اگر عمل ہوتا بھی تو ضعیف حدیثوں پر عمل پیرا ہوتے، خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں ابن مبارک کے حوالہ سے ذکر کیا کہ ابو حنیفہ حدیث میں یتیم تھے، ابوقطن نے کہا کہ حدیث میں بہت کمزور تھے۔

اگر انسان تعصب سے دور ہوکر، خالص تحقیق کی غرض سے اسلاف کی کتابوں کا مطالعہ کرے تو یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

اس الزام میں کہیں سے کہیں تک کوئی دم نہیں بلکہ تاریخی شواہد اس بات کی تائید بھی کرتی ہے کہ جن لوگوں نے حقائق کی جستجو کی غرض سے علمائے احناف بالخصوص امام ابو حنیفہ کی حیات کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ احناف کے پاس حدیث نہیں احادیث کا ذخیرہ تھا، در اصل جن لوگوں نے اس الزام کو ہوا دیا انہوں نے احناف کے اخذ روایت کی شرطوں پر غور نہیں کیا، حدیث خواہ ''مرسل'' ہو یا ''مسند'' احناف نے ان کو قبول کرنے کے لیے ایسے اہم قواعد مقرر کئے ہیں جو کسی بھی محدث کے پاس نہیں ملتیں، ہماری گفتگو کا موضوع ان قواعد وضوابط سے بحث کرنا نہیں ہے اس لیے ہم ان کی تفصیلات میں نہیں جائیں گے البتہ بحث کے دوران بعض قاعدوں کی تشریح ضرور کریں گے۔

حدیث مرسل:۔ یار لوگوں نے اگر یہ تسلیم کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے متبعین حدیث سے استدلال کرتے ہیں تو ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ ان کا اعتماد حدیث ضعیف اس کی خاص قسم ''مرسل'' پر زیادہ ہے، لہذا ہم یہ سمجھنے کی کوشس کریں گے کہ ''حدیث مرسل'' کی حجیت صرف احناف کے نزدیک ہے یا دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس کی حجیت کا اعتراف کرتے ہیں، پھر یہ کہ احناف مطلقا ''مراسیل'' سے استدلال کرتے ہیں یا اس کے کچھ شرائط وقیود بھی ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ''حدیث مرسل'' کی قبولیت میں احناف تنہا نہیں ہیں، محدثین کی ایک جماعت ''حدیث مرسل'' کو قبول کرتی رہی ہے اور اس کو حجت بھی مانتی رہی ہے، سفیان ثوری، مالک بن انس اور امام اوزاعی جیسے قدآور محدثین نے ''حدیث مرسل'' کو قبول کیا اور اس سے استدلال کیا، تاریخ علم حدیث میں اس قسم کی حدیث پر کلام کرنے والے سب سے پہلے امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ ہیں، امام المحدثین امام ابو داؤد (مؤلف سنن ابی داؤد) اہل مکہ کے نام لکھے گئے اپنے ایک پیغام میں لکھتے ہیں:

وأما المراسيل فقد كان يحتج بها العلماء فيما مضى مثل سفيان الثورى، و مالك بن أنس، والأوزاعى حتى جاء الشافعى فتكلم فيها و تابعه على ذلک أحمد بن حنبل وغيره (رسالة أبى داؤد الى أهل مكة، دار العربية، بيروت)

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں: **لم يزل الناس على العمل بالمرسل وقبوله حتى حدث بعد المأتين القول برده ... أجمع التابعون بأسرهم على قبول المراسيل، ولم يأت عنهم انكاره، ولا عن أحد من الأئمة بعدهم الى رأس المأتين. (الأحكام ٢/ ١٧٨، بيروت. تدريب الراوى، ١/ ١٩٨ دار الكتب العلمية، بيروت. توضيح الأفكار ١/ ٢٩١ السعادة، مصر، تيسير التحرير ٣/ ١٠٣ مصطفى الحلبى، مصر، جامع التحصيل، عالم الكتب، بيروت ص ٧٠)**

ابتداء سے علماء (محدثین) ''مرسل حدیث'' کو قبول کرتے آئے یہاں تک کہ دوسو ہجری کے بعد اسے رد کرنے کا قول سامنے آیا... تمام تابعین نے ''مراسیل'' کے قبول کرنے پر اجماع کیا، کسی نے بھی ان میں سے ''مرسل'' کی قبولیت سے انکار نہیں کیا اور نہ ہی ان کے بعد دوسو ہجری تک کسی امام نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔

علماء کی اس جماعت نے تنبیہ کی ہے کہ اگر مرسل کے رد کرنے کا قول کر لیا جائے تو بہت سارے معتمد رواۃ پر حرف آئے گا جبکہ علمائے اسلام اور محدثین ابتداء سے ان کی حدیثوں کو قبول کرتے آئے ہیں:

ان الراوى الثقة كان لايرسل الحديث الا بعد صحته عنده، ماجاء عن الأعمش قال: قلت لابراهيم النخعى اذا حدثتنى فأسند، فقال: اذا قلت لک: قال عبد الله فقد حدثنى جماعة عنه، واذا قلت لک: حدثنى فلان عن عبد الله فهو الذى حدثنى... (جامع التحصيل، ص٧٧، التمهيد، ١/ ٣٨)

ثقہ راوی ارسال اسی وقت کرتا ہے جبکہ حدیث اس کے نزدیک صحیح ہوتی ہے، اعمش سے مروی ہے کہ انہوں نے ابراہیم نخعی سے کہا کہ جب مجھ سے حدیث بیان کیا کرو تو اسناد کے ساتھ بیان کرو، ابراہیم نے جواب دیا: اگر میں ''قال عبداللہ'' کہوں تو یہ سمجھ لینا کہ محدثین کی ایک ایسی جماعت سے میں روایت کر رہا ہوں جنہوں نے ان سے روایت کیا ہے اور جب یہ کہوں کہ ''حدثنی فلان عن عبداللہ'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک شخص نے ہی مجھ سے روایت کیا ہے۔

متعدد مذاہب کے علما کے اقوال سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حدیث ''مرسل'' کو قبول کرنے کا رواج ابتداء سے ہی تھا، امام ابو داؤد کے مطابق امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ نے سب سے پہلے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا، علامہ طبری کی تصریح سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ دوسو ہجری کے بعد اس بدعت کا آغاز ہوا، اگر مقام میں اتنی گنجائش

ہوتی تو یقیناً میں منکرین کے دلائل کا بھی تجزیہ کرتا، تنگی مقام کی وجہ سے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں، یہاں یہ ملاحظہ کیجیے کہ کیا احناف کے نزدیک ''مرسل'' مطلقا حجت ہے یا اس کی کچھ شرطیں بھی ہیں؟

علمائے شافعیہ کا یک گروہ اس بات پر مصر ہے کہ احناف ''مرسل'' کو مطلقا حجت مانتے ہیں، اس فکر کو ترویج دینے والے سرکردہ علما میں سے علامہ شیرازی، علامہ قرافی علامہ آمدی اور امام رازی ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے اللمع فی أصول الفقه، ص ۷۴، مطبوعه مصطفى البابى، مصر. شرح تنقيح الفصول، ص ۲۷۹، مطبوعه الكليات الأزهريه، المحصول، ۲/ ۶۵۰ دار الكتب العلميه، بيروت)

سچ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک ''مراسیل'' مطلقا حجت نہیں، اس کے مقبول ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ اگر ارسال کرنے والے راوی کا تعلق قرون ثلاثہ سے ہے تو اس کی ''مرسل روایت'' اس وقت تک قابل حجت ہوگی جبتک کہ اس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ غیر عادل اور غیر ثقہ سے روایت کرتا ہے، اگر یہ پتہ چل جائے کہ ارسال کرنے والا راوی غیر ثقہ سے روایت کرتا ہے تو اس کی ''مرسل روایت'' مقبول نہیں ہوگی، قرون ثلاثہ کے بعد اگر کوئی راوی ''ارسال'' کر رہا ہے تو اس کی روایت اس وقت تک قابل احتجاج نہیں ہوگی جب تک اس کے بارے میں یہ مشہور نہ ہو کہ وہ ثقہ اور عادل سے ہی روایت کرتا ہے، مزید وضاحت کے لئے علامہ سرخسی کی یہ عبارت ملاحظہ کیجیے:

و أصح الأقاويل فى هذا ما قاله أبو بكر الرازى: ان مرسل من كان من القرون الثلاثة حجة مالم يعرف منه الرواية مطلقا عمن ليس بعدل ثقة، ومرسل من كان بعدهم لا يكون حجة الا من اشتهر بأنه لا يروى الا عمن هو عدل ثقة، لأن النبى ﷺ شهد للقرون الثلاثة بالصدق والخيرية فكانت عدالتهم ثابتة بتلك الشهادة مالم يتبين خلافهم، وشهد على من بعدهم بالكذب بقوله "ثم يفشو الكذب" فلا تثبت عدالة من كان فى زمن شهد على أهله بالكذب الا برواية من كان معلوم العدالة يعلم أنه لا يروى الا عن عدل. (أصول السرخسي ۱/ ۳۶۴، دار الكتاب العربى ،بيروت)

علامہ نسفی کی عبارت اور بھی واضح ہے وہ فرماتے ہیں:

الفصل الأول : فى الانقطاع الظاهر وهو المرسل من الأخبار، وهو على أربعة أوجه: أحدها: ما أرسله الصحابى. ثانيها : ما أرسله القرن الثانى. ثالثها: ما أرسله العدل فى كل عصر. رابعها: ماأرسله من وجه، و أسند من وجه. فأما الأول: فمقبول بالاجماع. و أما الثانى فحجة عندنا وهو قول مالك و جمهور المعتزلة. وأما الثالث: فكذلك عند الكرخى فانه لا يفرق بين مراسيل أهل الأعصار ويقول : من تقبل روايته مسندا تقبل روايته مرسلا...و أما الرابع: فلا شبهة فى قبوله عند من تقبل المرسل، وأما من لم يقبله فقد اختلفوا فيه. قال بعض أهل الحديث :انه مردود لأن حقيقة الارسال تمنع القبول فشبهته تمنع أيضا احتياطا. وعامتهم على أنهم حجة لأن المرسل ساكت عن حال الراوى، والمسند ناطق، والساكت لا يعارض الناطق. (أصول السرخسى ۱/ ۳۵۹. ۳۶۴ دار لكتاب العربى ،بيروت. كشف الأسرار على أصول البزدوى ۳/ ۲. ۸. كشف الأسرار شرح المصنف على المنار ۲/ ۴۲. ۴۵، دار الكتاب الاسلامى، مصر)

پہلی فصل ظاہری انقطاع کے بارے میں یہ مرسل ہے اور اس کی چار قسمیں ہیں:

اول: ارسال کرنے والا راوی صحابی ہو۔

دوم: ارسال کرنے والے راوی کا تعلق قرن ثانی سے ہو۔

سوم: کسی بھی زمانہ میں ارسال کرنے والا راوی عادل ہو۔

چہارم: ایسی روایت جو ایک سند سے مرسل ہو اور کسی دوسری سند سے ''مسند'' ہو

پہلی قسم بالاجماع مقبول ہے، دوسری قسم ہمارے نزدیک حجت ہے یہی امام مالک اور جمہور معتزلہ کا بھی قول ہے

تیسری قسم کرخی کے نزدیک مقبول ہے ان کے نزدیک اہل عصر کے ''مراسیل'' میں کوئی فرق نہیں، ان کا ماننا ہے کہ جس کی ''مسند'' روایت مقبول ہے اس کی ''مرسل'' بھی مقبول ہے۔

چوتھی قسم جو لوگ ''مرسل'' کو قبول کرتے ہیں ان کے نزدیک چوتھی قسم کے مقبول ہونے میں بھی کوئی شبہہ نہیں، جو لوگ اسے قبول نہیں

کرتے ان کے نزدیک اس چوتھی قسم میں اختلاف ہے، بعض اہل حدیث کا کہنا ہے کہ وہ مردود ہے کیونکہ ''مرسل'' (علی الاطلاق) غیر مقبول ہے احتیاطا جہاں شبہہ ہوگا وہ بھی روایت غیر مقبول ہوگی۔ اکثر محدثین کا ماننا ہے کہ یہ حجت ہے، کیونکہ ''مرسل'' (''س'' کے کسرہ کے ساتھ) راوی کے حال سے خاموش ہوتا ہے اور ''مسند'' (''س'' کے کسرہ کے ساتھ) راوی کے حال کو بیان کرتا ہے لہذا ساکت ناطق کا معارض نہیں ہوسکتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ احناف کے نزدیک حدیث ''مرسل'' مطلقا قابل قبول نہیں بلکہ ارسال کرنے والا اگر عادل و ثقہ ہے تو اس کا ارسال قبول کیا جائیگا اور وہ روایت حجت ہوگی، اگر ارسال کرنے والا راوی ثقہ و عادل نہیں تو اس کی روایت قابل قبول نہیں اس تصریح کے بعد اب بھی اگر کوئی یہ کہے کہ احناف ''مرسل'' جو کہ ضعیف ہوتی ہے، کو قبول کرتے ہیں، تو ایہ اس کا اپنا نظریہ ہوگا، احناف کے اصول کی ترجمانی نہیں ہوگی، مجتہد مطلق امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ (م: ۲۰۴) جو حدیث ''مرسل'' کی قبولیت سے انکار کرنے میں سر فہرست ہیں، کا قول مضطرب ہے کیونکہ مرسل کی قبولیت اور اس کے حجت ہونے کا تو انکار کردیا مگر جب قواعد کی تطبیق کرنے آئے تو ''مراسیل'' سے استدلال کر بیٹھے، کبھی انہوں نے یہ کہا کہ ''مراسیل ابن مسیب کے علاوہ کوئی بھی مرسل حجت نہیں، پھر کہیں ''ابن مسیّب'' کے ''مرسل'' کو بھی رد کردیا، پھر کہیں ''ابن مسیّب'' کے علاوہ دیگر ''مراسیل'' کو قبول کرلیا، پھر یہ کہا کہ اگر ''مرسل'' کی تقویت کسی ''مسند'' سے ہوجائے تو اسے قبول کرلیا جائیگا، ان سب کی تفصیل اگر ملاحظہ کرنا چاہیں تو امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ کی کتاب ''الرسالہ'' مطبوعہ دار التراث، قاہرہ کا فقرہ نمبر ۱۲۶۴ اور اس کے بعد کا مطالعہ کریں وہاں کافی تفصیل موجود ہے اس لئے ہم ان تمام عبارت کو نقل کرنے سے قاصر ہیں، یونہی ''مراسیل ابن مسیّب'' سے متعلق امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ کے مضطرب اقوال کو ملاحظہ کرنے کے لئے، امام شافعی کی کتاب ''الام ۲/۱۵۸'' پر علامہ مزنی شافعی کا مطبوع حاشیہ بنام ''مختصر مزنی''، امام ابن ابی حاتم کی ''المراسیل'' ص ۱۲، مکتبہ مثنّی بغداد، امام نووی کی کتاب ''المجموع'' ۱/۹۹، حافظ علائی کی کتاب ''جامع التحصیل فی احکام المراسیل، الدار العربیہ بغداد، ص ۴۵ اور ''تدریب الراوی'' وغیرہ کا مطالعہ کیجئے۔

''تدریب الراوی'' کے مطابق تو امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں ''مراسیل'' کی تخریج کی ہے، یہ اور بات ہے کہ اس تخریج سے ان کا مقصد استدلال نہیں ہے۔ تاہم اپنے مقدمہ میں بطور استدلال ضرور ذکر کیا ہے، اگر بعض علماء کے مطابق ''مرسل'' کا عام معنی یعنی جو متصل السند نہ ہو انقطاع خواہ کہیں بھی ہو کا اعتبار کیا جائے تو امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ کی کتاب ''مسند شافعی'' میں بھی آپ کو اس کی بہتیرے مثال ملے گی، ان سب کے باوجود صرف امام ابو حنیفہ کو مورد الزام ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے؟

خبر واحد اور امام اعظم ابو حنیفہ: معترضین نے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ جس طرح امام ابو حنیفہ احادیث کی دوسری قسموں کو رد کردیتے ہیں اسی طرح ''خبر واحد'' کو بھی رد کردیا ہے بلکہ ''احاد'' کی موجودگی میں قیاس کو ترجیح دیتے ہیں، جبکہ دیگر الزام کی طرح اس الزام میں بھی کوئی حقیقت نہیں ہے، احناف کے فقہی قواعد اور حدیثی اصول کا اگر آپ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ دوسرے ائمہ کے بہ نسبت امام ابو حنیفہ ''خبر واحد'' کو کہیں زیادہ قابل قبول سمجھتے ہیں، امام اعظم کا ''امان عبد'' کے مسئلہ سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے قول کی طرف رجوع کرلینا کوئی ڈھکا چھپا مسئلہ نہیں جو شخص حضرت عمر کی رائے کی طرف رجوع کرسکتا ہے، کیا اس کے لئے نبی اکرم ﷺ کی حدیث عمر کے قول سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں، خبر واحد کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہ کا موقف اگر جاننے کا ارادہ ہو تو امام ابو یوسف اور امام محمد کی کتاب ''الآثار'' کا مطالعہ کیجیے، احناف کے نزدیک خبر واحد کی کیا حیثیت ہے اس کو جاننے کے لئے امام محمد کی کتاب ''المبسوط'' بھی بہت مفید ثابت ہوگی جہاں انہوں نے صحابہ کرام کے مواقف کی متعدد مثال کے ذریعہ ''خبر واحد'' کی حجیت اور احناف کا اس سے استدلال کرنے پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

تاہم جیسا کہ گذر چکا کہ امام ابو حنیفہ کے اصول روایت حدیث کے سلسلہ میں بہت سخت تھے ہمیں یہاں بھی وہی بات نظر آتی ہے، چنانچہ کسی خبر کے مقبول ہونے میں جس طرح تمام ائمہ نے راوی کے عادل اور ضابط ہونے کی قید لگائی ہے اسی طرح امام ابو حنیفہ نے بھی اس قید کو معتبر سمجھا ہے مگر ضبط کی جو تفسیر احناف نے کیا ہے اس کی مثال نہ تو کسی محدث کے ہاں ملتی ہے اور نہ ہی کسی فقیہ کے نزدیک، علامہ فخر الاسلام بزدوی ''ضبط'' کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وأما الضبط فان تفسيره هو سماع الكلام كما يحق سماعه ثم فهمه بمعناه الذي أريد به ثم حفظه ببذل المجهود،

ثم الثبات عليه بمحافظة حدوده، ومراقبته بمذاكرته على اسائة الظن بنفسه الى حين أدائه، وهو نوعان: ضبط المتن بصيغته و معناه لغة ،والثانی : أن يضم الى هذه الجملة ضبط معناه فقها وشريعة، و هذا أكملها والمطلق من الضبط يتناول الكامل ولهذا لم يكن خبر من اشتدت غفلته خلقة مسامحة و مجازفة حجة لعدم القسم الاول من الضبط، ولهذا قصرت رواية من لم يعرف بالفقه عند معارضة من عرف بالفقه فی باب الترجيح او المراد منه (اصول فخر الاسلام ۲/۷۱۷)

علامہ بزدوی کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ احناف نے ضبط کی بڑی گہری تشریح کی ہے، اوراس کے ساتھ ساتھ راوی کی فقہ کو بھی ضبط کا حصہ شمار کیا ہے، روایتوں بالخصوص خبر واحد سے متعلق اتنی کڑی شرط کے باوجود یہ کہنا کے احناف کے نزدیک احاد کی کوئی حیثیت نہیں کتب ائمہ کا مطالعہ نہ ہونے کی دلیل ہے، یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جن لوگوں نے اماا عظم ابوحنیفہ پر روایتیں کم کرنے کا الزام لگایا ہے وہ درحقیقت علم حدیث میں ان کا کمال احتیاط ، روایت حدیث میں ان کی ٹھوس شرطیں تھیں، کشف الاسرار میں ہے:

قلت الرواية عند أبي حنيفة حتى قال بعض الطاعنين انه لا يعرف الحديث وليس الأمر كما ظنوا بل كان أعلم عصره بالحديث ولكن لمراعاة شرط كمال الضبط قلت روايته(كشف الأسرار ۲/۱۸۷)

امام اعظم ابوحنیفہ سے کم تعداد میں حدیثیں مروی ہونے کی وجہ سے بعض مخالفین یہ کہہ دیا ہے کہ انہیں حدیث کا علم ہی نہیں تھا، جبکہ معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے عظیم اور سب سے بڑے محدث تھے، کمال ضبط کی شرط ان کی نگاہ میں تھی اس لئے روایتیں کم کرتے تھے۔ (کشف الاسرار ۲/۷۰۰، بیروت)

خبر واحد سے متعلق احناف کا نظریہ جان لینے کے بعد اب ذرا اس الزام کی نقاب کشائی کی جائیگی کہ امام اعظم ''خبر واحد'' اور ''قیاس'' کے تعارض کے وقت ''خبر'' کو چھوڑ کر ''قیاس'' کو ترجیح دیتے ہیں!!

علامہ ابن عبدالبر مالکی ایک قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كثير من أهل الحديث استجازوا الطعن على أبي حنيفة لرده كثيرا من أخبار الأحاد العدول، لأنه كان يذهب فی ذلک الی عرضها علی ما اجمع عليه من الأحاديث ومعانی القرآن الكريم فما شذ من ذلك رده وسماه شاذا.

بہت سارے محدثین نے امام اعظم ابوحنیفہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے عادل راویوں کی ''اخبار آحاد'' کو نظر انداز کردیا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خبر واحد کا قرآن کریم کے معنی اور متفق علیہ احادیث سے اگر تعارض ہوجائے تو ایسی روایت کو رد کردیا جائیگا اور یہ روایتیں شاذ کہلائیں گی۔

خبرواح اور قیاس کے متعارض ہونے کی صورت میں محدثین فقہاء کا ماننا ہے کہ خبر واحد کو ترجیح ہوگی خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، امام اعظم ابوحنیفہ کے موقف کو سمجھنے کے لئے اصحاب مذہب کی عبارتوں کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آراء اس باب میں مختلف ہیں علامہ عیسی ابن ابان اور فخر الاسلام علامہ بزدوی کچھ تفصیل کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ''اخبار احاد'' فقیہ اور عادل راوی سے مروی ہوں تو قیاس پر اس کو مقدم کرنا واجب ہوگا اور اگر راوی عادل تو ہے مگر فقیہ نہیں تو اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے گا، صحابہ کرام کے مابین راوی کے غیر فقیہ ہونے کی صورت میں ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے راوی کی روایت کو چھوڑ دیا اور قیاس پر عمل کیا، مثلا حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث ''الوضوء مما مسته النار'' کا پتہ جب حضرت عبد اللہ ابن عباس کو چلا تو آپ نے فرمایا: اگر تم گرم پانی سے وضو کرو تو کیا دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت پڑے گی؟!! یہ اور ان جیسی کئی ایک مثال علامہ عیسی ابن ابان نے پیش کرکے یہ بتانے کی کوشس کی ہے راوی اگر فقیہ نہیں تو اس کی روایت میں اجتہاد کے بعد قیاس کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔

ان كان راوی خبر الأحاد عادلا فقيها وجب تقديم خبره على القياس والا كان موضع الاجتهاد، (کشف الاسرار ۲/۶۹۴)

ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ قیاس کی حجیت پر سلف کا اجماع ہے لیکن خبر واحد کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہونے میں مشتبہ ہے، لہذا قیاس سے ثابت ہونے والا مسئلہ گویا اقوی دلیل سے ثابت ہوا کیونکہ اس کا ثبوت اجماع سے ہے اور یہ خبر واحد سے اقوی ہوتا ہے۔ (سابق)

علامہ فخر الاسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر ''خبر واحد'' قیاس کے خلاف ہوگی تو اسے کسی خاص ضرورت یا قیاس کے عمل کو جاری رکھنے کی غرض سے ترک کردیا جائے گا۔ (سابق)

دوسری طرف علامہ ابوالحسن کرخی کا ماننا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ کسی بھی صورت میں قیاس کو ''خبر واحد'' پر مقدم نہیں کرتے تھے، کسی خاص ضرورت کا تحقق ہو یا نہ ہو یونہی قیاس کا عمل جاری رہے یا نہ رہے بہر صورت ''خبر'' ہی کی تقدیم ہوگی، التقریر میں ہے:

اذا تعارض خبر الواحد والقياس بحيث لاجمع بينهما ممكن قدم الخبر مطلقا عند الأكثرين، منهم أبو حنيفة والشافعي و أحمد (التقرير والتحبير شرح تحرير الكمال، ۳۱۸/۲)

فقہائے احناف کے مختلف نظریات کا ذکر کرنے کے بعد راقم اپنے محدود مطالعہ کی روشنی میں علامہ ابوالحسن کرخی کی رائے اور امام اعظم ابوحنیفہ سے متعلق ان کی تشریح کو رائج قرار دیتا ہے، جہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ امام اعظم رضی اللہ تعالی عنہ نے ''خبر واحد'' کو چھوڑ کر قیاس کو ترجیح دی ہے، اس کی کئی توجیہ کی جاسکتی ہے اس کی تفصیل کا یہاں مقام نہیں، ایک یہ ہے کہ امام کے پاس اس حدیث کو ترک کرنے کی فخر الاسلام کی ذکر دہ وجہوں کے علاوہ کوئی ایسی ٹھوس وجہ یقیناً رہی ہوگی جو ہماری سمجھ سے باہر ہے، کیونکہ جس کی سوچ وفکر اور تقوی کا عالم یہ ہو کہ اپنے فتوی کے خلاف کسی صحابی کا قول مل جائے تو اس کی طرف وہ رجوع کر لے تو کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس کے نزدیک تمام چیزوں سے بڑھ کر محبوب نہیں ہوگی؟

قارئین کرام!! اس مختصر سی بحث کے بعد آپ نے یقیناً یہ جان لیا ہوگا کہ امام اعظم ابوحنیفہ کے مخالفین جو ان پر الزامات لگاتے ہیں ان میں کوئی سچائی نہیں، مخالفت کرنے والے یا تو ایسے تھے جنہیں فقہ وفہم سے کچھ حصہ نہیں ملا تھا، یا ایسے تھے جو عقیدہ کے اعتبار سے گمراہ فرقہ ''جہمیہ'' یا حشویہ'' سے متاثر تھے، یا مذہبی تعصب انہیں امام صاحب کے علم وفضل کا اعتراف کرنے میں مذہبی تعصب ان کے آگے دیوار بن کر حائل تھی... حقیقت پسند اور نیک نیت علماء مثلا امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام اوزاعی، امام عبد اللہ بن مبارک، امام سفیان ثوری، امام ابن عیینہ رضی اللہ تعالی عنھم نے جب ان کا احترام کیا، ان کی تعریف کی، فقہ وفن کا امام تسلیم کیا تو پھر کسی اور کو ان پر جرح کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے، اور اگر کسی متعصب نے کوئی الزام لگا بھی دیا تو نیر تاباں کی روشنی پر اس سے کچھ فرق بھی نہیں پڑتا- اللہ تعالی ہم سب کو حق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور تمام ائمہ ومحدثین کا احترام کرنے کی سعادت سے بہرہ ور کرے-

☆☆☆

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری☆

امام اعظم اور عمل بالحدیث

امام الائمہ، سراج الامۃ، امام اعظم ابوحنیفہ جیسا مجتہد، محدث اور فقیہ عطا فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امت پر عظیم احسان فرمایا، قرآن فہمی میں رسوخ، معانی حدیث کا درک، آثار صحابہ اور فتاویٰ تابعین پر گہری نظر، ملکۂ استخراج و استنباط، خداداد قوت حفظ، کمال زہد و تقویٰ اور اس خیر امت کے صلحاء، اولیاء، مفسرین، محدثین، فقہاء اور علماء کی اکثریت کا اعتماد و اعتبار جب یہ ساری خوبیاں کسی شخصیت میں یکجا ہو جائیں تو کہیں جا کر ایک ابوحنیفہ بنتا ہے۔امام اعظم کے علمی اور دینی کارناموں اور خدمات پر تفصیلی گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، آپ کی جلیل القدر خدمات اپنی جگہ مگر آپ کا سب سے عظیم کارنامہ "فقہ اسلامی کی تدوین" ہے۔آپ نے اپنے اصحاب کی ایک ٹیم کو لے کر یہ عظیم کام شروع کیا، طہارت سے لے کر میراث تک کتاب وسنت سے لاکھوں مسائل کا استنباط فرما کر باضابطہ فقہ اسلامی کو مدون فرمادیا۔آپ کے تلامذہ نے آپ کے متخرجہ مسائل کو اپنی کتب میں محفوظ کر دیا تاکہ آنے والی نسلیں ان سے استفادہ کر سکیں، ان تلامذہ میں امام محمد اور امام قاضی ابویوسف کے نام سرفہرست ہیں۔

جہاں اس امت کی اکثریت نے امام اعظم کے فضل و کمال کا اعتراف کیا اور ان کے ذریعہ تدوین کی گئی فقہ کو حرز جان بنایا وہیں بعض حضرات ان کے مخالف بھی ہو گئے، امام اعظم کے مخالفین کو ہم تین طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) وہ حضرات جو محض بغض و حسد کی بنیاد پر آپ کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے، اور آپ کے خلاف مکروہ پروپگنڈہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

(۲) وہ حضرات جو امام اعظم کے بارے میں درست معلومات نہ ہونے کی وجہ سے حاسدین کے ذریعہ پھیلائے ہوئے پروپگنڈہ کا شکار ہو گئے، اور پھر خود بھی ان خلاف حقیقت باتوں کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔

(۳) وہ حضرات جو غلط فہمی کی بنیاد پر امام اعظم سے بدظن ہو گئے، مگر بعد میں جب حقیقت منکشف ہوئی تو اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر کے امام صاحب کے فضل و کمال کے معترف اور آپ کے گرویدہ ہو گئے۔(مگر کچھ لوگ اب بھی ان حضرات کے پہلے والے اقوال نقل کر کے امام اعظم کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کرنے میں رات دن کوشاں ہیں)

ان تینوں طبقوں کی نمائندگی کرنے والے حضرات کے اسماء گرامی مستند تاریخی حوالوں سے پیش کئے جا سکتے ہیں مگر ہم فی الحال ان سے قطع نظر کر رہے ہیں۔ان "یاران نکتہ داں" نے امام اعظم کے خلاف کیا کیا شگوفہ چھوڑے اور کس کس طرح ان کے خلاف فضا ہموار کی یہ ایک الگ داستان ہے، اس کی اگر ایک جھلک دیکھنا ہو تو خطیب بغدادی کی "تاریخ بغداد" کا مطالعہ کافی ہے (۱)۔اس پروپگنڈہ کے نتیجے میں امام اعظم کے اوپر بے شمار الزامات عائد کر دیے گئے۔مثلاً:

(۱) ابوحنیفہ مُرجئی فرقے کے تھے جو ایک گمراہ فرقہ ہے

(۲) ابوحنیفہ حدیث پاک کا بہت کم علم رکھتے تھے

(۳) ابوحنیفہ صحیح احادیث کو ترک کر کے ان کے مقابلے میں اپنی رائے اور قیاس کو ترجیح دیا کرتے تھے، اسی لئے فقہ حنفی کی بنیاد یں کتاب وسنت پر نہیں بلکہ یہ ابوحنیفہ کے قیاسوں کا مجموعہ ہے جس کے اکثر مسائل سنت صحیحہ ثابتہ کے خلاف ہیں۔

(۴) فقہ حنفی کا ایک بڑا حصہ ضعیف اور منکر احادیث پر مبنی ہے۔

پہلے دونوں الزامات سے قطع نظر سر دست ہم ان آخری دو الزامات کا جائزہ لیں گے۔

تیسرے الزام کے سلسلہ میں ایک بنیادی بات یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ کوئی بھی وہ شخص جس کے رتبۂ اجتہاد مطلق پر فائز ہونے کے سلسلہ میں اس امت کے اصحاب علم و فضل کا اتفاق ہو اس کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جان بوجھ کر محض اپنی ہوائے نفس کی وجہ سے حدیث کو ترک کرے گا اور رسول اکرم ﷺ کا فرمان مبارک

☆Madrasa Alia Qadria,Molvi Mohalla,Budaun(U.P) E-mail:qadriusaid@yahoo.com

پس پشت ڈال کر اپنے قیاس اور رائے کی بنیاد پر فتویٰ دے گا۔ ہمارے اکابر اہل سنت نے اس سلسلہ میں بے شمار دلائل پیش کئے ہیں بلکہ خود جماعت اہل حدیث کے امام و پیشوا شیخ ابن تیمیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے "رفع الملام عن ائمة الاعلام" اس میں انہوں نے ائمہ متبوعین اور مجتہدین امت کی جانب سے اس الزام کا دفاع کیا ہے ۔(تفصیل کے لیے دیکھئے: راقم سطور کا مضمون "ائمہ مجتہدین پر ترک حدیث کا الزام" مطبوعہ جام نور، اپریل ۲۰۰۶ء)

جہاں تک صحیح احادیث کے ترک کرنے کا الزام ہے تو اس سلسلہ میں پہلے چند بنیادی مقدمات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

(۱) جس طرح بعد کے محدثین نے حدیث کی صحت وضعف اور ردوقبول کے لئے کچھ شرائط وضع کئے، ہیں جب کوئی حدیث ان کی وضع کردہ شرائط پر پوری اترتی ہے اسی وقت وہ اس پر عمل کرتے ہیں، اور اگر وہ حدیث ان کی وضع کردہ شرائط کے مطابق نہ ہو تو وہ اس کو قبول نہیں کرتے خواہ وہ کسی اور محدث کے نزدیک صحیح ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح ائمہ متقدمین اور اصحاب اجتہاد نے بھی احادیث کے ردوقبول کے کچھ اصول بنائے ہیں ، جب کوئی حدیث ان کے ان اصولوں پر پوری اترتی ہے اسی وقت وہ اس پر عمل کرتے ہیں، اور اگر ان کے وضع کردہ اصولوں پر پوری نہ اترے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتے ، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جب مطلوبہ شرائط نہ پائے جانے کی وجہ سے بعد کے محدثین "ترک حدیث" کرتے ہیں تو ان کے بارے میں "حسن ظن" سے کام لیا جاتا ہے، مگر جب امام ابوحنیفہ شرائط کے فقدان کی وجہ سے کوئی حدیث ترک کریں تو آخر ان کو اس حسن ظن کی "رعایت" سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے؟

(۲) دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ متقدمین کا کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینا متاخرین کے لئے تو حجت ہو سکتا ہے مگر متاخرین کی تصحیح وتضعیف متقدمین پر حجت نہیں ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ائمہ متقدمین کی اسناد عالی ہوا کرتی تھی اور وہی حدیث بعد کے محدثین کے پاس نازل سند کے ساتھ پہنچا کرتی تھی ، مثلاً اگر کسی متقدم امام و مجتہد کے پاس کوئی حدیث دو یا تین واسطوں سے پہنچی تھی اب وہی حدیث آگے جا کر سو سال بعد سات آٹھ واسطوں سے کسی اور محدث کے پاس پہنچی ، جس کے پاس حدیث میں صرف دو یا تین واسطے تھے اس کے نزدیک وہ حدیث صحیح اور قابل اخذ تھی ، مگر پانچویں یا چھٹے واسطے کا راوی ضعیف تھا اب ظاہر ہے کہ جس کے پاس وہ حدیث آٹھ واسطوں سے پہونچی ہے اس کے نزدیک وہ حدیث ضعیف اور ناقابل عمل ہوگی ، اب آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں مجتہد نے اس ضعیف حدیث پر عمل کیا ہے ، اس لئے کہ یہ حدیث ضعیف تو اس مجتہد کے سو سال بعد ہوئی ہے۔

(۳) یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی مجتہد کا کسی حدیث پر عمل کرنا اس مجتہد کے نزدیک اس حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے ، ظاہر ہے کہ اگر ان کے نزدیک وہ حدیث صحیح اور قابل حجت نہ ہوتی تو وہ اس پر ہرگز عمل نہ کرتے۔

ان بنیادی مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب آپ دیکھیں کہ جس طرح بعد کے محدثین نے احادیث کے ردوقبول کے لئے اپنے اصول بنائے ہیں، اسی طرح امام اعظم بھی اپنے بعض اصول وقواعد کی بنیاد پر حدیث کے ردوقبول کا فیصلہ کیا کرتے تھے ، حدیث اور فقہ دونوں پر گہری نگاہ رکھنے والے جلیل القدر علماء نے امام اعظم کے استخراج کردہ جزئیات فقہیہ اور احادیث احکام کے گہرے تقابلی مطالعہ کے نتیجہ میں ان اصول وقواعد کو اخذ فرمایا ہے۔ علامہ محمد بن یوسف الصالحی (صاحب سیرت شامیہ) نے اپنی کتاب "عقود الجمان فی مناقب ابی حنیفة النعمان" میں ان میں سے بعض اصول وقواعد کا ذکر فرمایا ہے ، علامہ زاہد الکوثری نے بھی اپنی معرکہ آرا تصنیف "تأنیب الخطیب فیما ساقه فی ترجمة ابی حنیفة من الاکاذیب" میں ان قواعد کو نقل کیا ہے، اسی سے استفادہ کرتے ہوئے ہم یہاں تلخیص واختصار کے ساتھ ان اصول وقواعد میں سے بعض کا تذکرہ کریں گے۔

(۱) اخبار احاد کو کتاب اللہ کے عمومات پر پیش کیا جائیگا ، اگر وہ خبر واحد کتاب اللہ کے عموم یا ظاہر کے مخالف ہے تو اس کو ترک کر کے کتاب اللہ کے عموم وظاہر پر عمل کیا جائے ۔ کیوں کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب دو دلیلیں ہوں تو ان میں سے قوی دلیل کو لیا جاتا ہے، کتاب اللہ قطعی الثبوت ہے اور اس کا عموم وظاہر قطعی الدلالہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ خبر واحد کے مقابلہ میں زیادہ قوی دلیل ہے۔

(۲) ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ خبر واحد کسی سنت مشہورہ کے معارض نہ ہو، یہ سنت مشہورہ خواہ قولی ہو یا فعلی ، یہاں بھی مخالفت وتعارض کے وقت اقویٰ دلیل کو اختیار کیا جائے گا ، اور ظاہر ہے کہ خبر واحد کے مقابلہ میں سنت مشہورہ ثبوت کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے۔

(۳) خبر واحد اپنی ہی طرح کی کسی دوسری خبر واحد کے معارض نہ ہو، اگر دو اخبار احاد میں تعارض ہو تو ان میں سے کسی ایک کو راجح قرار دے کر اخذ کیا جائے گا اور دوسری کو مرجوح قرار دے کر ترک کیا جائے گا، دو متعارض حدیثوں کے درمیان ترجیح دینے کے سلسلہ میں ائمہ مجتہدین کے الگ الگ نظریات اور الگ الگ وجوہ ترجیح ہیں، مثلاً دونوں روایتوں میں سے جس روایت کا راوی فقیہ ہو اس کی روایت کو ترجیح دی جائے گی اور اگر دونوں راوی فقیہ ہوں تو ان میں سے افقہ (زیادہ تفقہ والے) کی روایت کو ترجیح ہوگی، یہ احناف کی وجوہ ترجیح ہیں، جبکہ بعض مجتہدین ومحدثین کے نزدیک اس خبر کو ترجیح ہوگی جس کی سند دوسری کے مقابلہ میں زیادہ عالی ہوگی۔

(۴) امام اعظم کا خبر واحد کے سلسلہ میں ایک اصول یہ ہے کہ اس خبر واحد کا راوی خود اپنی ہی روایت کے خلاف فتویٰ نہ دے، اگر ایسا ہوگا تو اس کی روایت کو ترک کر کے اس کے فتویٰ کو لیا جائیگا، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث کہ ''اگر کتا برتن میں منھ ڈال دے تو اس کو سات بار دھویا جائے گا'' مگر خود حضرت ابو ہریرہ کا فتویٰ اس کے برخلاف تھا، لہٰذا ان کے فتویٰ کو ترجیح دی جائے گی۔

(۵) حدود وعقوبات کے سلسلہ میں اگر اخبار احاد آپس میں متعارض ہوں تو ان میں سے ''اخف'' کو اختیار کیا جائے گا۔

(۶) اس خبر کو اخذ کیا جائیگا جس کی جانب آثار زیادہ ہونگے۔

(۷) خبر واحد پر عمل کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ صحابہ اور تابعین کے عمل متوارث کے خلاف نہ ہو۔

(۸) خبر واحد کے سلسلہ میں ایک اصول یہ ہے کہ سلف میں سے اس پر کسی کا طعن منقول نہ ہو۔

ان اصولوں کو نقل کرنے کے بعد امام صالحی تحریر فرماتے ہیں۔ ''فبمقتضی هذه القواعد ،ترک الامام ابو حنیفة رحمه الله العمل بأحادیث کثیرة من الآحاد (۲) (ترجمہ) ''انہیں قواعد کی بنیاد پر امام ابو حنیفہ نے بہت سی اخبار احاد پر عمل نہیں کیا ہے''۔

آگے چل کر فرماتے ہیں: ''والحق انه لم یخالف الأحادیث عناداً، بل خالفها اجتهاداً لحجج واضحة ودلائل صالحة، وله بتقدیر الخطأ اجر وبتقدیر الاصابة اجران ،والطاعنون علیه اما حساد، او جهال بمواقع الاجتهاد''۔ (۳) (ترجمہ) ''اور حق یہ ہے کہ انہوں نے ازروئے عناد احادیث کی مخالفت یا ان کا ترک نہیں کیا ہے بلکہ ان کا ترک حدیث اجتہاد کی بنیاد پر تھا جس کے لئے ان کے پاس واضح دلائل وبراہین موجود ہیں، اگر ان سے سہو ہوا ہے تو ان کے لئے ایک اجر ہے اور اگر وہ صواب کو پہونچے ہیں تو ان کے لئے دو اجر ہیں، ان پر طعن کرنے والے یا تو حاسدین ہیں یا پھر مراتب اجتہاد سے نا آشنا ہیں''۔

جہاں تک اس الزام (نمبر۴) کا سوال ہے کہ فقہ حنفی کی بنیاد ضعیف اور منکر احادیث پر ہے تو اس کے لئے آپ ہمارے بیان کردہ تین بنیادی مقدمات میں سے نمبر۲ راور نمبر۳ رکو بغور ملاحظہ فرمائیں ۔مزید یہ کہ امام عبدالوہاب شعرانی نے اپنی کتاب ''میزان شریعة الکبری'' میں ایک مستقل فصل اس الزام کے جواب کے لئے وضع فرمائی ہے، اس فصل کا عنوان ہے ''فصل فی تضعیف قول من قال: ان ادلة مذهب الامام ابی حنیفة ضعیفة غالباً'' (فصل اس شخص کے قول کی تضعیف میں جو یہ کہتا ہے کہ مذہب امام ابوحنیفہ کی مستدل احادیث اکثر ضعیف ہیں) اس فصل میں آپ ارشاد فرماتے ہیں:

''فان قیل :اذا قلتم بان ادلة مذهب الامام ابی حنیفة رضی الله عنه لیس فیها شئ ضعیف لسلامة الرواة بینه وبین رسول الله ﷺ من الصحابة والتابعین من الجرح فما جوابکم عن قول بعض الحفاظ عن شئ من ادلة الامام ابی حنیفةبانه ضعیف؟ (۴) (ترجمہ) ''اگر کہا جائے کہ آپ نے کہا امام ابوحنیفہ کے مذہب کے دلائل میں کوئی ضعیف حدیث نہیں ہے، اس لئے کہ ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان کے راوی صحابہ وتابعین ہیں، اور صحابہ وتابعین جرح سے محفوظ ہیں، مگر بعض حفاظ حدیث نے امام ابوحنیفہ کی مستدل بعض احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟''۔

اس سوال کے جواب میں امام شعرانی فرماتے ہیں۔ ''فالجواب یجب علینا حمل ذلک جزماً علی الرواة النازلین عن الامام فی السند بعد موته رضی الله تعالی عنه اذا روا ذلک الحدیث من طریق غیر طریق الامام اذ کل حدیث وجدناه فی مسانید الامام الثلاثة،فهو صحیح لانه لو لا صح

عنده ما استدل بـه ولا يقدح في وجود كذاب او متهم بالكذب مثلاً في سنده النازل عن الامام و كفانا صحة لحديث استدلال مجتهد به ثم يجب علينا العمل به ولو لم يروه غير فتأمل هذه الدقيقة التي نبهتك عليها فلعلك تجدها في كلام احد من المحدثين، واياك ان تبادر الى تضعيف شئ من ادلة مذهب الامام ابي حنيفة الا بعد ان تطالع مسانيده الثلاثة ولم تجد ذلك الحديث فيها .(۵)

(ترجمہ) ''ہم پر واجب ہے کہ ہم اس کو اس بات پر محمول کریں کہ یقینی طور پر یہ ضعف امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد ان کے نیچے کے راویوں میں پیدا ہوا ہے، اور انہوں نے یہ حدیث امام اعظم کے علاوہ کسی اور سند سے روایت کی ہے، اس لئے کہ امام اعظم کی تینوں مسانید میں ہم نے جتنی حدیثیں دیکھیں وہ سب صحیح ہیں، اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر وہ احادیث امام اعظم کے نزدیک صحیح نہ ہوتیں تو آپ ہرگز ان سے استدلال نہ کرتے، اور اگر ایسی کسی حدیث کی سند میں امام اعظم کے بعد کوئی راوی کذاب یا متہم بالکذب ہو تب بھی کوئی حرج نہیں کیوں کہ اس حدیث کی صحت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ایک مجتہد نے اس سے استدلال کیا ہے، لہٰذا ہمارے اوپر اس حدیث کے مطابق عمل کرنا واجب ہے، خواہ اس حدیث کو کسی اور نے روایت کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس نکتہ پر اچھی طرح غور وفکر کرو، شاید یہ نکتہ جس کی طرف ہم نے توجہ دلائی ہے تمہیں کسی اور محدث کے کلام میں نہ ملے، اور امام ابوحنیفہ کی مستدل احادیث کو ہرگز ضعیف قرار دینے میں سبقت نہ کرو جب تک کہ تم ان کی مسانید ثلاثہ کا مطالعہ نہ کرلو اور تمہیں اس میں وہ حدیث نہ ملے''۔

امام زاہد الکوثری فرماتے ہیں: ''واما تضعيف بعض احاديثه من جهة بعض شيوخه ،او شيوخ شيوخه بناء على قول بعض المتأخرين فيهم ،فليس بمستساغ ،لظهور انه ادرئ بأحوال شيوخه و شيوخ شيوخه، وليس بينه وبين الصحابى الا راويان اثنان في الغالب ''.(۶)

(ترجمہ) ''رہا یہ کہ بعض متاخرین کے اقوال جو امام ابوحنیفہ کے شیوخ یا شیوخ کے شیوخ کے بارے میں ہیں ان کی بنیاد پر امام ابو حنیفہ کی احادیث کو ضعیف قرار دیا جائے، تو یہ درست نہیں ہے، کیوں کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ اپنے شیوخ اور ان کے شیوخ کے شیوخ کے بارے میں (متاخرین کے مقابلے میں) زیادہ بہتر جانتے تھے، امام ابوحنیفہ اور صحابی کے درمیان عام طور پر دو راوی ہیں''۔

فقہ حنفی کے ضعیف روایت پر مبنی ہونے کے الزام کا ہم جائزہ لے رہے ہیں تو اس اہم بات کو بھی پیش نظر رکھیں کہ محدثین اور اصولیین کے درمیان حدیث مرسل کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے سلسلہ میں ایک اصولی اختلاف ہے-ہم یہاں اس اختلاف پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔ محدثین کے نزدیک مرسل وہ روایت ہے جس کی سند کے آخر سے تابعی کے بعد راوی مذکور نہ ہو، بالفاظ دگر مرسل وہ روایت ہے جس کو کوئی تابعی بغیر صحابی کا ذکر کئے براہ راست حضور اکرم ﷺ سے روایت کرے، مگر اصولیین اور فقہا کے نزدیک مرسل اس روایت کو کہتے ہیں جس کی سند متصل نہ ہو، یعنی کوئی ایک راوی یا چند راوی سند سے ساقط ہوں۔ جمہور محدثین کے نزدیک مرسل کا حکم یہ ہے کہ یہ ضعیف و مردود ہے، اور قابل احتجاج نہیں، جب کہ امام شافعی اور بعض دیگر علما کے نزدیک مرسل کی بعض قسمیں چند شرائط اور قیود کے ساتھ معتبر ہیں، اس سلسلہ میں احناف کا اصول وہ ہے جس کو امام سرخسی حنفی نے امام ابو بکر رازی کے حوالے سے لکھا ہے، آپ فرماتے ہیں:

''و أصح الأقاويل في هذا ما قاله أبو بكر الرازي: ان مرسل من كا من القرون الثلاثة حجة مالم يعرف منه الرواية مطلقا عمن ليس بعدل ثقة ، ومرسل من كا بعدهم لا يكون حجة الا من اشتهر بأنه لا يروى الا عمن هو عدل ثقة، لأن النبى ﷺ شهد للقرون الثلاثه بالصدق و الخيرية فكانت عدالتهم ثابتة بتلك الشهادة مالم يتبين خلافهم، وشهد على من بعدهم بالكذب بقوله "ثم يفشو الكذب" فلا تثبت عدالة من كان في زمن شهد على أهله بالكذب الا برواية من كان معلوم العدالة يعلم أنه لا يروى الا عن عدل.''(۷)

(ترجمہ) ''اس سلسلہ (یعنی مرسل کی قبولیت یا عدم قبولیت) میں سب سے صحیح ترین بات وہ ہے جو ابوبکر رازی نے کہی ہے، کہ جس شخص کا تعلق قرون ثلاثہ سے ہے، اس کی مرسل اس وقت تک حجت ہے جب تک اس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ غیر ثقہ اور غیر عادل سے روایت کرتا تھا، قرون ثلاثہ کے بعد کے لوگوں میں اس شخص کی مرسل حجت ہے جس کے بارے میں یہ شہرت ہو کہ یہ غیر ثقہ اور غیر عادل سے روایت

نہیں کرتا، اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان تینوں زمانوں کے لئے صدق اور خیر کی بشارت دی ہے، لہٰذا اس بشارت کی وجہ سے ان تین زمانوں کے لوگوں کی عدالت ثابت مانی جائے گی، جب تک کہ اس کا خلاف ثابت نہ ہو جائے، اور اس کے بعد کے زمانے کے لئے حضور ﷺ نے کذب عام ہونے کی خبر دی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا ثم یفشو الکذب ''اور پھر جھوٹ عام ہو جائے گا'' لہٰذا جس زمانے کے بارے میں جھوٹ کی خبر وارد ہے، اس میں کسی شخص کی عدالت اس وقت ثابت ہوگی جب کوئی ایسا شخص روایت کرے کہ جس کی عدالت ثابت ہے، اور یہ معلوم ہو کہ یہ اسی سے روایت کرتا ہے جو عادل ہو''۔

اب اگر امام اعظم کے استنباط کردہ کسی مسئلہ کی بنیاد مرسل حدیث پر ہو تو بعد کا کوئی شخص یہ کہنے کا حق نہیں رکھتا کہ فقہ حنفی کے فلاں مسئلہ کی بنیاد مرسل حدیث پر ہے اور مرسل حدیث ضعیف و نامقبول ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر بعد کے محدثین کے نزدیک مرسل سے احتجاج جائز نہ ہو نہ سہی مگر امام اعظم کے نزدیک وہ قابل احتجاج ہے۔ امام اعظم کے پاس جو احادیث پہونچیں ان میں ایک بڑا حصہ ان احادیث کا تھا جو انہوں نے براہ راست تابعین کی مقدس جماعت سے سنی تھیں، اور بے شمار احادیث آپ نے تبع تابعین سے سماعت کیں، آپ نے ان تابعین یا تبع تابعین کے ارسال کو قبول فرمایا، کیونکہ ثقہ تابعی جب تک کوئی بات اپنے ہی جیسے ثقہ شخص سے نہ سن لے اور اس پر اعتماد نہ کرے اس وقت تک کوئی بات اللہ کے رسول ﷺ کی طرف منسوب کر کے نہیں کہے گا، اسی اعتماد کی بنیاد پر قرون فاضلہ میں مراسیل کو عام طور سے قبول کرنے کا مزاج تھا، اور ان کو قابل احتجاج سمجھا جاتا تھا۔ ابن جریر کے حوالے سے امام سیوطی فرماتے ہیں: ''قال ابن جریر اجمع التابعون بأسرهم علی قبول المرسل ولم یأت عنهم انکاره ولا عن احد من الأئمة بعد هم الی رأس المائتین'' (۷) (ترجمہ) ''ابن جریر نے کہا کہ تمام تابعین مرسل کو قبول کرنے پر متفق ہیں، نہ تابعین میں سے اور نہ ہی ان کے بعد ائمہ میں سے کسی نے دوسری صدی تک مرسل کی قبولیت کا انکار کیا''۔

علامہ زاہد کوثری فرماتے ہیں: ''والاحتجاج بالمرسل کان سنة متوارثة، جرت علیه الامة فی القرون الفاضلة، حتی قال ابن جریر رد المرسل مطلقا بدعة حدیث فی رأس المائتین'' (۸)

(ترجمہ) ''مرسل حدیث سے احتجاج کرنا سنت متوارثہ تھی، قرون فاضلہ میں امت کا یہی طریقہ تھا، بلکہ ابن جریر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مرسل کو مطلقاً رد کر دینا یہ بدعت ہے، جو دوسری صدی میں پیدا ہوئی ہے''۔

جس طرح مرسل حدیث کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے سلسلہ میں محدثین اور فقہا کے اصول و قواعد مختلف ہیں اسی طرح مجہول راوی کی روایت قبول کرنے یا نہ کرنے میں بھی علما کے اپنے اپنے اصول ہیں، کسی کے اصول کے مطابق مجہول کی روایت مقبول نہیں، جب کہ کسی کے اصول کے مطابق کچھ شرائط کے ساتھ ایسے راوی کی روایت مقبول اور قابل احتجاج ہے۔ اب اگر کوئی مجتہد یا فقیہ اپنے اصول کے مطابق کسی مجہول کی روایت قبول کرتا ہے تو اب یہ کہنا بڑی ناانصافی اور خلاف دیانت ہے کہ فلاں مجتہد نے اس مسئلہ میں مجہول کی روایت سے احتجاج کیا ہے جب کہ مجہول کی روایت فلاں فلاں محدثین کے نزدیک غیر مقبول اور ضعیف ہے۔ یہ بات اس لئے درست نہیں کہ ایک مجتہد کے اصول و قواعد دوسرے پر حجت نہیں ہیں۔ یہاں ہم مجہول راوی کے سلسلہ میں بھی ایک سرسری اشارہ کرنا چاہتے ہیں تا کہ بات اور واضح ہو سکے۔

کسی راوی کے اوپر طعن یا جرح دو طرح ہوتی ہے، کبھی راوی کی عدالت پر جرح کی وجہ سے اس کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے، اور کبھی اس کے ضبط پر جرح کے سبب اس کی روایت غیر مقبول ہوتی ہے۔ راوی کی عدالت پر طعن کی کئی وجوہ ہیں، مثلاً کذب، اتہام کذب، فسق، بدعت وغیرہ، عدالت میں طعن کی ایک وجہ ''جہالت راوی'' بھی ہے۔ جہالت راوی کی بھی چند قسمیں ہیں مثلاً کبھی راوی مجہول العین ہوتا ہے اور کبھی مجہول الحال ہوتا ہے، مجہول العین کا مطلب یہ ہے کہ اس سے صرف ایک ہی راوی نے روایت کی ہو، مجہول الحال کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عدالت ظاہری اور باطنی دونوں معلوم نہ ہوں، ایسے راوی کی روایت کو ''مبہم'' کہا جاتا ہے، مجہول کی ایک قسم مستور ہے اس سے وہ راوی مراد ہوتا ہے جس کی عدالت ظاہری تو معلوم ہو مگر عدالت باطنی کی تحقیق نہ ہو۔ مجہول الحال کی روایت جمہور محدثین کے نزدیک مقبول نہیں ہے، اور آخر الذکر دونوں قسم کے مجہولوں کی روایت محققین کے نزدیک صالح اور قابل احتجاج ہے۔ امام اعظم کے نزدیک مجہول الحال کی روایت مقبول ہے۔ امام ابن صلاح نے مقدمہ میں فرمایا ہے: ''احدهما فی

العدالة من حيث الظاهر والباطن جميعاً وروايته غير مقبولة عند الجماهير"۔(۹)(ترجمہ)''ان میں سے ایک مجہول العدالت ہے ظاہری اور باطنی دونوں طرح، ایسے راوی کی روایت جمہور کے نزدیک غیر مقبول ہے''

اس قول کی شرح کرتے ہوئے علامہ بدرالدین ابوعبداللہ محمد ''النکت علیٰ مقدمۃ ابن الصلاح'' میں لکھتے ہیں:''وانما قبل ابو حنيفة ذلك في عصر التابعين لغلبة العدالة عليهم''(۱۰)(ترجمہ)''ابوحنیفہ نے تابعین کے دور میں ایسے راوی کی روایت کو قبول کیا ہے، کیونکہ اس دور میں عدالت کا غلبہ تھا''۔

اسی طرح مجہول العین راوی کو بھی امام اعظم نے قبول کیا ہے بشرطیکہ سلف میں سے کسی نے اس کی روایت کو مردود قرار نہ دیا ہو۔ مجہول کی روایت قبول کرنے کا یہ اصول دراصل اس نظریہ پر مبنی ہے کہ جب کسی کے عادل یا غیر عادل ہونے کے بارے میں کوئی علم نہ ہوتو چونکہ مسلمان کے حق میں اصل عادل ہونا ہے، لہٰذا اس کی اصل کو دیکھتے ہوئے ایسے مجہول شخص کے عادل ہونے کو ترجیح دی جائے گی، اور اس کی روایت کو قبول کیا جائے گا -س اصول کی بنیاد پر امام اعظم اور بعد کے فقہاے احناف نے مجہول کی روایت قبول کی ہے، اب اگر کسی مجہول کی روایت پر امام اعظم نے کسی مسئلہ کی بنیاد رکھی ہوتو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ امام ابوحنیفہ نے ضعیف حدیث پر اس مسئلہ کی بنیاد رکھی ہے، کیونکہ یہ حدیث ضعیف تو ان مجتہدین یا محدثین کے نزدیک ہے جو جہالت راوی کی بنیاد پر حدیث پر ضعف کا حکم لگاتے ہیں، لیکن چونکہ امام اعظم اپنے مذکورہ اصول کی وجہ سے ایسے راوی کی حدیث قبول کرتے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک یہ حدیث ضعیف نہیں ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ یہ محض پروپگنڈہ ہے کہ فقہ حنفی عمل بالحدیث سے بہت دور ہے یا فقہ حنفی کی بنیادیں ضعیف اور منکر روایتوں پر قائم ہیں، اور آج بھی یہ پروپگنڈہ کیا جارہا ہے، اس کے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں مگر شاید اس کا ایک بڑا سبب سطحی مطالعہ اور علم کی کمی ہے، امام ابوحنیفہ نے فلاں مسئلہ میں خطا کی ہے، فلاں فلاں مسائل میں حدیث کو ترک کیا ہے، فلاں فلاں مسائل میں احناف کی پیش کردہ حدیث ضعیف ہے، یہ باتیں آپ کو وہ لوگ کرتے ہوئے نظر آئیں گے جو حدیث اور علوم حدیث میں مہارت تو دور کی بات شاید علم حدیث کی ابتدائی اصطلاحات سے بھی کماحقہ واقف نہیں ہیں، ان کا مبلغ علم چودہویں صدی کے بعض متعصب علما کی غیر علمی اور غیر سنجیدہ اردو کتابیں، یا شیخ ناصرالدین البانی اور شیخ ابن باز کی کتابوں کے اردو ترجے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید کو حرام وشرک سمجھتے ہیں مگر امام اعظم پر ترک حدیث کا الزام لگانے میں ان مذکورہ علما کی اندھی تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بات ختم کرنے سے پہلے اس روایت کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس کو خطیب بغدادی نے ابن کرامۃ سے روایت کیا ہے۔

''ابن كرامة قال كنا عند وكيع يوماً، فقال رجل: اخطأ ابو حنيفة، فقال وكيع: كيف يقدر ابو حنيفة يخطئ؟ ومعه مثل ابي يوسف، وزفر في قياسهما ومثل يحيىٰ بن ابي زائدة، وحفص بن غياث، وحبان، ومندل في حفظهم الحديث، والقاسم بن معين في معرفة باللغة العربية، وداؤد الطائي، وفضيل بن عياض في زهدهما وورعهما، ومن كان هؤلاء جلساء ه، لم يكد يخطئ''(۱۱) ترجمہ:''ابن کرامہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضرت وکیع کی بارگاہ میں حاضر تھے کہ ایک شخص نے کہا''ابوحنیفہ نے غلطی کی ہے''اس پر حضرت وکیع نے فرمایا ''ابو حنیفہ غلطی کیسے کر سکتے ہیں؟ حالانکہ ان کے ساتھ ابو یوسف اور زفر جیسے ماہرین قیاس ہیں، اور یحیٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان، اور مندل جیسے حفاظ حدیث ہیں، ان کے پاس قاسم بن معین جیسے لغت عرب کے جاننے والے ہیں، داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے اصحاب زہد وتقویٰ ہیں، جس شخص کی مجلس میں بیٹھنے والے یہ حضرات ہوں وہ کیسے غلطی کر سکتا ہے''

مضمون کا اختتام ہم مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اس ایمان افروز ارشاد پر کرنا چاہتے ہیں جو آپ نے اپنی کتاب ''فیوض الحرمین'' میں فرمایا ہے-شاہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں:''عرفني رسول الله ﷺ ان في المذهب الحنفي طريقة انيقة هي ادق الطرق بالسنة المعروفة التي جمعت ونقحت في زمان البخاري واصحابه وذلك ان يوخذ من اقوال الثلاثة قول اقربهم بهافي المسئلة ثم بعدذلك يتبع اختيارات الفقهاء الحنفيين الذين كانوا من علماء

الحدیث فرب شئی سکت عنه الثلثة فی الاصول وما یعرضوا نفیه ودلت الاحادیث علیه فلیس بد من اثباته والکل مذهب حنفی". (۱۲) (ترجمہ) اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے بتایا کہ مذہب حنفی میں ایک ایسا بہترین طریق ہے جو سنت معروفہ و مشہورہ کے طریقوں میں سب سے زیادہ دقیق ہے، وہ سنت معروفہ جس کی جمع وتدوین اور تنقیح امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں ہوئی ہے، اور وہ طریق یہ ہے کہ تینوں اماموں (یعنی امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد) میں سے مسئلہ میں جس کا قول سنت سے زیادہ قریب ہو اختیار کر لیا جائے، اس کے بعد حنفی فقہا میں سے جو اصحاب حدیث ہیں ان کے اختیار کردہ موقف کی اتباع کی جائے، کچھ ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں مذکورہ تینوں اماموں نے اصول میں کچھ نہیں فرمایا، اور نہ ہی ان کی نفی کی ہے، لیکن احادیث ان پر دلالت کر رہی ہیں، تو ان کو تسلیم کرنا ضروری ہے، اور یہ سب مذہب حنفی ہی ہے۔

مراجع

(۱) دیکھئے: تاریخ بغداد: ج ۱۳، از صفحہ ۳۲۳ تا ص ۴۵۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت
(۲) عقود الجمان: بحوالہ تانیب الخطیب الکوثری: ص: ۲۴۲، المکتبة الازهریه للتراث، القاهره ۱۹۹۸ء
(۳) مرجع سابق
(۴) میزان شریعة الکبری، ج: ا رص: ۸۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت
(۵) مرجع سابق ص: ۸۴، ۸۵
(۶) تانیب الخطیب: الکوثری، ص: ۲۴۲، المکتبۃ الازہریہ للتراث، القاہرہ
(۷) اصول سرخسی: ج ا رص ۳۶۴، دار الکتاب العربی، بیروت
(۸) تدریب الراوی: امام سیوطی، ج ا رص ۱۹۸، مکتبۃ الریاض الحدیثہ، الریاض
(۹) تانیب الخطیب، ص: ۲۳۹، المکتبہ ازهریہ للتراث، القاهره ۱۹۹۸ء
(۱۰) مقدمہ ابن صلاح: ص: ۱۱۰، دار الفکر المعاصر، بیروت، ۱۳۹۷ھ
(۱۱) النکت علی مقدمة ابن صلاح: ج ۳ رص ۳۷۴، مکتبہ اضواء السلف، الریاض، ۱۹۹۸ء
(۱۲) تاریخ بغداد: خطیب بغدادی: ج ۱۴ رص ۲۴۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت
(۱۳) فیوض الحرمین: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ص ۴۸، مطبع احمدی دہلوی، ۱۳۰۸ھ۔ ☆☆

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟

جام نور کا زیر نظر خصوصی شمارہ "اجتہاد و تقلید" کے موضوع پر ایک معتدلانہ پیش کش ہے، ہم نے بھرپور کوشش کی ہے کہ یہ شمارہ مسئلہ کی صحیح تعبیر و تشریح کر کے امت کے لیے یسر اور اعتدال کی راہ روشن کرے۔ ہم اپنی اس کوشش میں کتنے کامیاب ہیں، براہ کرم ہمیں ضرور لکھ بھیجیں اور اپنی رائے سے مطلع کریں۔ یہ شمارہ بہت ہی کم وقت میں سامنے آیا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ بعض گوشے تشنہ بھی رہ گئے ہوں، لیکن مجموعی طور پر ہم نے اس بحث کے ہر پہلو کا احاطہ کر لیا ہے۔ اس خصوصی شمارے میں اگر کوئی بات خلاف واقع شائع ہو گئی ہو تو اہل علم اس کی جانب توجہ دلائیں، ہم سراپا شکر گزار ہوں گے............ادارہ

بقیہ: شہید ناز کی تربت کہاں ہے؟

خدارا ارباب حکومت اور اصحاب دولت سے کوئی پوچھے کہ یہ نشانیاں آخر کیوں بے نام ونشان ہوئیں؟ کیوں بے نام ونشان ہوئیں یہ نشانیاں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ دولت کی فراوانی نے عقیدتوں میں افلاس پیدا کر دیا ہے۔ شاہراہوں کی کشادگی نے دلوں میں تنگی پیدا کر دی ہے۔ عمارتوں کی بلندی نے عقیدتوں میں پستی پیدا کر دی ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ مکانات کی اقامت نے ان مکان کی عظمت و تقدس ختم کر دی ہے۔ بجلیوں کے رنگین تیز بلب نے محبتوں کی دنیا کو تاریک کر دیا ہے، کاروں کی صبار فتاری نے ایمان کے جذبات کو سست کر دیا ہے اور وسعت حرم کی مہم نے صاحب حرم کی عظمت و محبت کو پس پشت ڈال دیا ہے، اگر ایسا ہے تو دنیا کان کھول کر سن لے کہ ان کے گنہ گار غلاموں کو پر شکوہ عمارت نہیں، ان کے قدموں سے لگا ہوا کھنڈر چاہیے۔ صاف سڑکیں نہیں ان کے قدموں کی دھول اور خاک رہ گزر چاہیے۔ صفا و مروہ کا سائبان نہیں اسلام کی اولین خاتون کے مزار اقدس کے قبہ پاک کا سایہ چاہیے۔ تیز بلب نہیں سیدہ فاطمہ کی چکی کا ٹکڑا چاہیے۔ کوئی عبد العزیز نہیں ام ہانی کے نام کی عظمت چاہیے۔ خدا کے لیے اپنی تمام مادی آسائش و سہولتیں لے لو ہماری روحانی یادگاریں اور ایمانی نشانیاں دے دو۔

وہ اندھیرا ہی بھلا تھا کہ قدم راہ پہ تھے
روشنی لائی ہے منزل سے بہت دور ہمیں

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی ☆

شاہ ولی اللہ اور مسئلہ تقلید

غالب کے میں بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے ایک صدی پہلے پیدا ہو گئے تھے، دراصل اردو ادب میں معروف و متداول اس فقرے کا اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہے کہ ان کا عہد ان کے فکر وفن کی عظمت و بلندی کی معرفت سے قاصر تھا اور ایک صدی بعد والوں کو اس کی قدر و قیمت کا ادراک ہوا۔

اگر یہ بات اسلامیان ہند میں کسی مذہبی شخصیت کے بارے میں کہی جا سکتی ہے تو شاید وہ شخصیت مسند ہندوستان حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۱۶ھ-۱۱۷۶ھ) کی ہے۔ اردو والوں نے غالب کی تعریف وتوصیف اور قبولیت واعتراف کی وہ ساری کمیاں بعد میں پوری کردیں، جس کے غالب زندگی بھر شاکی رہے، اس طرح ان کا حقیقی عہد آکر گزر بھی گیا۔ لیکن شاولی اللہ کے عہد کا اب بھی انتظار ہے۔

اسلام وسنت کے نام پر قائم برصغیر کی ہر جماعت ان کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے اور ہر کوئی اپنے فکر وعقیدے کے لیے ان کے اقوال و فرمودات سے دلائل فراہم کرتا ہے، لیکن انہیں پوری طرح سے قبول کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہے، نہ مقلد نہ غیر مقلد، نہ صوفی نہ سلفی، اور نہ سنی نہ غیر سنی، دراصل شاہ صاحب کی شروع میں جس قسم کی صورت گری کی گئی وہ اتنی ملفق اور غیر واقعی ہے کہ ان کی شخصیت اس شعر کا مصداق ہوگئی۔

مفتی شرع متیں نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

شاہ صاحب کی جانشینی کو لے کر شروع ہی سے دو مشہور جماعتوں میں ایسا جھگڑا پڑا کہ ان کے حقیقی وارثین اپنے حق سے ہی دست بردار ہو گئے اور اپنی کم آگہی کے سبب انہوں نے شاہ صاحب کو انہیں دونوں متحارب فریقین میں سے کسی ایک کا سمجھ لیا اور ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ علاوہ ازیں چونکہ شاہ صاحب ایک مجتہدانہ شان کے عالم تھے، لہٰذا انہوں نے معاصر کورانہ تقلید اور بے روح خانقاہی رسوم کی مخالفت ومذمت کی تھی اس کے سبب بھی ان کے بارے میں ہونے والے بہت سے پروپیگنڈے کو تسلیم کرلیا گیا اور اس طرح شاہ صاحب کے فکر وعمل سے قریب تر جماعت ان کی عظمت وعبقریت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکی، جبکہ ان کی بعض اصلاحی نوعیت کی اور بعض محرف تحریروں کا سہارا لے کر کئی ایسی جماعتوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور آج تک اٹھا رہی ہیں، جنھیں شاہ صاحب کے فکر ومسلک سے دور دور تک کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

فکر ولی اللہی میں تین طرح سے تحریف کی گئی:

۱- جعلی وفرضی کتاب

۲- ان کی معروف تصنیفات میں دسیسہ کاریاں

۳- اور ان کی فکر کی خود ساختہ تعبیرات وتوجیہات

شاہ رفیع الدین کے نواسے اور حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کے ایک ناشر سید ظہیر الدین احمد نے دو جعلی کتابوں کا ذکر کیا ہے، یہ دونوں کتابیں تحفۃ الموحدین اور البلاغ المبین ہیں (۱)

مشہور اہل حدیث مورخ غلام رسول مہر نے بھی شاہ صاحب کی طرف البلاغ المبین کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے (۲) علامہ شبلی نعمانی اور بابائے اردو مولوی عبد الحق نے شاہ صاحب کے نام سے دو کتاب ۱- قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسین اور ۲- الجنۃ العالیہ فی مناقب معاویہ'' کو فرضی کتابیں قرار دیا ہے (۳) شاہ صاحب کے نام سے ایک اور جعلی کتاب ملتی ہے جس کا نام ''قول سدید'' ہے (۴) وکیل احمد سکندر پوری نے تو صراحت کی ہے کہ البلاغ المبین ''فلاں'' فرقے کی طرف سے شائع کی گئی ہے (۵)

یہ پانچوں کتابیں ایسی ہیں جن کا تذکرہ نہ شاہ صاحب کی کتابوں میں ملتا ہے، نہ ان کا ذکر ان کے کسی شاگرد و مرید نے کیا ہے او رنہ ہی فقیر محمد جہلمی (۶) سے لے کر پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی (۷) تک ان کے کسی معتبر سوانح نگار نے ان کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ (۸)

ان فرضی کتابوں سے بھی زیادہ خطرناک جو تحریف ہوئی ہے وہ

☆Department of Arabic,M.A.N.U.University,Gachchi Bawli,Hyderabad-32(A.P)

ان کی معروف کتابوں میں حذف واضافہ اور تغیر وتبدیل ہے- حجۃ اللہ البالغۃ ہو یا التفہیمات الالٰھیۃ ان میں متعدد ایسے اجنبی وغریب افکار ملتے ہیں جو شاہ صاحب کی عمومی فکر سے ہم آہنگ نہیں ہیں (۹)

تحریف کی تیسری قسم وہ خود ساختہ تعبیرات وتوجیہات ہیں جن کے ذریعے فکر شاہ ولی اللٰہی کو حسب منشا پیش کیا گیا- اس کی بدترین مثال یہ ہے کہ مولانا مسعود عالم ندوی نے شاہ ولی اللہ کو ہندوستان میں شیخ ابن عبدالوہاب نجدی کے مانند قرار دیا ہے (۱۰) عقل حیرت زدہ ہے کہ اس جرأت کو کیا نام دیا جائے، فیوض الحرمین، انفاس العارفین، الدر الثمین، القول الجمیل، الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ اور القول الجلی فی ذکر آثار الولی کے مصنف کا موازنہ صاحب ''کتاب التوحید فیما یجب من حق اللہ علی العبید'' سے کیا جائے اور دلائل الخیرات، حزب البحر، جواہر خمسہ، قصیدہ بردہ اور دعائے سیفی وغیرہ کے عامل، سند یافتہ اور اجازت دہندہ کو اسلامی تاریخ میں تصوف کی سب سے بڑی مخالف تحریک کے بانی کے دوش بدوش کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے (۱۱) لیکن جب حضرت شاہ صاحب کی تصوف کی کتابیں منظر عام پر آئیں اور ان کی تشہیر ہوئی تو یہ ممکن نہیں رہا کہ پہلے کی طرح شاہ صاحب کی حسب منشا صورت گری کی جائے -لہذا تاویلات و توجیہات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، اس کی ایک مثال پیش ہے-

حضرت شاہ صاحب نے القول الجمیل میں اصحاب کہف کے ناموں کی تاثیر بیان کی ہے کہ ''یہ نام پانی میں ڈوبنے، آگ میں جلنے اور چوری ڈکیتی سے محفوظ رہنے کے لیے اکسیر وامان ہے'' مولانا سید ابوالحسن ندوی صاحب نے پہلے تو اسے شاہ صاحب کے محدثانہ ومجتہدانہ مقام سے متصادم قرار دیا اور پھر اس کی یہ توجیہ کی کہ ''اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کتاب سفر حرمین ۱۱۴۳-۱۱۴۵ھ سے پیشتر کی تصنیف ہے'' (۱۲) اور یہ توجیہ قوم میں بہت مقبول ہے اور ہر خورد وکلاں کے نوک زبان پر رہتی ہے، جب بھی شاہ صاحب کی فکر میں کوئی بات خلاف مرضی ملی، اسے حرمین سے قبل کا قرار دے دیا گیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر مظہر بقا (۱۳) اور دوسرے کئی مصنفین نے شاہ صاحب کی تصنیفات کی توقیت میں القول الجمیل کو سفر حرمین کے بعد کی تصنیف قرار دیا ہے-

اور اس طرح ان سہ گانہ تحریفات کے ذریعے حضرت شاہ صاحب کو شیخ ابن تیمیہ اور شیخ ابن عبدالوہاب نجدی کا ہم مسلک بلکہ خود اپنے پوتے شیخ اسماعیل دہلوی کا متبع بنا کر پیش کیا گیا اور انہیں ابن حزم ظاہری، ابن قیم اور شوکانی یمنی جیسے غیر مقلدین کی صف میں کھڑا کر دیا گیا، بلکہ بعض نے تو انہیں ہندوستان میں غیر مقلدیت کا بانی قرار دے دیا حالانکہ یہ ساری باتیں خلاف واقعہ اور بے اصل ہیں- البتہ یہ صحیح ہے کہ شاہ صاحب اپنے زمانے میں رائج کورانہ تقلید اور فقہی جدال کو پسند نہیں فرماتے تھے، متاخرین مقلدین کی وضع کردہ تقلیدی شرائط کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور فقہائے محدثین کی طرح بعض مسائل میں اختلاف کو تقلید کے منافی نہیں سمجھتے تھے، ہندوستانی مقلدین کے لیے یہ افکار بالکل نئے تھے، شاہ صاحب کی شخصی اور خاندانی وجاہت کے پیش نظر ان کے خلاف کوئی محاذ تو قائم نہیں ہوا، البتہ مقلدین کی بڑی تعداد نے ان کی طرف سے بے اعتنائی کا رویہ اختیار کر لیا اور بہتوں نے ان کے بارے میں غیر مقلدین کے پروپیگنڈے کو تسلیم کر لیا اور بعض حضرات نے خود کو نمایاں کرنے کے لیے بھی ان کی بلند قامت شخصیت سے صرف نظر اور اعراض کیا اور ان میں خانقاہی وغیر خانقاہی دونوں قسم کے افراد شامل تھے-

بہر کیف ان تحریفات کے پیش نظر ہر مسئلے میں بالخصوص اجتہاد و تقلید کے باب میں شاہ صاحب کے نظریات کو جاننے کے لیے براہ راست ان کی کتابوں پر اعتماد کرنا چاہیے اور ان کی طرف کسی بھی بات کی نسبت کرنے میں ان کی عمومی فکر کی رعایت کرنی چاہیے- یوں تو شاہ صاحب نے اس موضوع پر اپنے افکار کو اپنی بہت سی کتابوں میں ذکر کیا ہے لیکن ان کی تین کتابیں اس ضمن میں خاص اہمیت کی حامل ہیں-

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ (۲) غایۃ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف (۳) اور عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید-

یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ بے حد ضروری ہے کہ شاہ صاحب کی تحریروں اور نظریات سے قطع نظر وہ عملی طور پر ایک حنفی مقلد تھے، حرمین شریفین کے سفر سے پہلے بھی عملاً حنفی تھے اور بعد میں بھی حنفی رہے، ان کے تمام فرزندان، خلفا وتلامذہ کا اس بات پر اتفاق ہے-

الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی کے مولف شیخ محسن تیمی، شیخ عبدالغنی کی ایک سند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

ومن لطائف ھذا الاسناد انہ اجتمع فی اولہ اربعۃ، آخرھم ابو عبد العزیز، اشترکوا فی أربعۃ خصال: ذلک أنھم دھلویون سکنی و عمریون صلبۃ، وأنھم صوفیۃ

أصحاب الزهد والورع، و أنهم حنفيون على مذهب النعمان أبي حنيفة وصاحبيه رضي الله عنهم (۱۵)

''اس سند کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے شروع میں چار لوگ ہیں، جن کے آخری شخص ابو عبد العزیز (یعنی شاہ ولی اللہ) ہیں، یہ چاروں چار صفتوں میں باہم شریک ہیں، یہ سب دہلی کے رہنے والے ہیں اور نسباً فاروقی ہیں اور یہ سب اصحاب زہد وورع صوفی ہیں اور یہ سبھی ابوحنیفہ اور صاحبین رضی اللہ عنہم کے مطابق حنفی المسلک ہیں''۔

مشہور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں کہ:

أن الشاه ولى الله الدهلوى قد بنى طريقتهٔ على عرض المجتهدات على السنة والكتاب وتطبيق الفقهيات بهما فى كل باب.......... وطريقته هذا كله مذهب حنفى (۱۶)

''شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنا یہ طریقہ بنایا کہ وہ اجتہادی مسائل کو کتاب وسنت پر پیش کرتے تھے اور فقہی مسائل کو ان دونوں سے تطبیق دیتے تھے...... اور ان کا یہ سارا طریقہ مذہب حنفی ہی ہے''

اب آیئے! خود حضرت شاہ صاحب کی طرف، سب سے پہلے تقلید کی تائید میں ان کے اقوال کا جائزہ لیتے ہیں۔ شاہ صاحب اپنی کتاب عقد الجيد فی احكام الاجتهاد والتقليد میں باب سوم کا یہ عنوان مقرر کرتے ہیں:

تاكيد الأخذ بهذه المذاهب الأربعة والتشديد فى تركها والخروج عنها'' ان چاروں مسالک کو اختیار کرنے کی تاکید اور انہیں چھوڑنے اور ان سے باہر نکلنے کی ممانعت''۔

اس باب کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں:

اعلم أن فى الأخذ بهذه المذاهب الأربعة مصلحةً عظيمة وفى الاعراض عنها كلها مفسدة كبيرة ونحن نبين ذلک بوجوه............ (۱۷)

''جانو کہ ان چاروں مذاہب کو اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اور ان سب سے روگردانی کرنے میں بڑی خرابی ہے، جسے ہم بچند وجوہ بیان کریں گے۔''

پہلی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ شریعت کو جاننے کے لیے متقدمین پر اعتماد کیا جائے، چنانچہ صحابہ پر تابعین اور ان پر تبع تابعین نے اعتبار کیا، اور اسی طرح علماء نے اپنے سے پہلے کے علما پر بھروسہ کیا، اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کیونکہ شریعت کی معرفت دو طرح سے ہوتی ہے، ایک نقل سے اور دوسرے استنباط سے اور نقل کی صحت کے لیے ضروری ہے ہر طبقہ متصلا اپنے سے پہلے والے طبقے سے لیتا رہے اور استنباط میں بھی قدماء کے طریقوں کی معرفت ضروری ہے تاکہ ان کے اقوال کی مخالفت کر کے اجماع کی مخالفت نہ کرے (۱۸)

ائمہ اربعہ کی تقلید کے ضروری ہونے کی ایک اور وجہ بیان کرتے ہیں کہ:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اتبعوا السواد الأعظم ولما اندرست المذاهب الحقة الاهذه المذاهب كان اتباعها اتباع السواد الأعظم (۱۹)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: سواد اعظم کی پیروی کرو۔ چونکہ ان مذاہب اربعہ کے علاوہ بقیہ حق مذاہب باقی نہیں رہے، لہٰذا انہی کا اتباع ہی سواد اعظم کا اتباع ہے''۔

شاہ صاحب نے ''الحجۃ'' اور ''العقد'' دونوں میں ابن حزم ظاہری کا ایک تفصیلی قول نقل کیا ہے، جس میں تقلید کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے، بعض حضرات ابن حزم کے اس قول کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کر کے ان کی غیر مقلدیت تک ثابت کرنے لگ جاتے ہیں۔ جبکہ شاہ صاحب نے اس قول کا رد کیا ہے اور اس کا مصداق متعین کرنے کی کوشش کی ہے، فرماتے ہیں:

وليس محله فيمن لايدين الابقول النبى صلى الله عليه وسلم ولايعتقد حلا لاالاماأحله الله ورسوله، ولا حراما الا ماحرمه الله ورسوله، ولكن لما لم يكن له علم بما قاله النبى صلى الله عليه وسلم ولا بطريق الجمع بين المختلفات من كلامه ولابطريق الاستنباط من كلامه، اتبع عاملًا راشدا على انه مصيب فيما يقول ويفتى'' (۲۰)

''ابن حزم کی بات اس شخص کے بارے میں بے محل ہے جو صرف فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دین سمجھتا ہے اور صرف اللہ و رسول کے بنائے ہوئے حلال وحرام کو حلال وحرام جانتا ہے۔ لیکن چونکہ اسے حضور کے فرمودہ کا علم نہیں، نہ وہ آپ کے مختلف کلاموں میں

جمع و توفیق کی صلاحیت رکھتا ہے، نہ آپ کے کلام سے استنباط کر سکتا ہے، اس لیے وہ کسی صحیح عالم کا اتباع کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے قول اور فتوی میں برحق ہے''۔

وہ عوام کے لیے ائمہ اربعہ کی تقلید کو امت کا اجماعی مسئلہ قرار دیتے ہیں اور تقلید شخصی کے مصالح کا کھل کر اعتراف کرتے ہیں:

''ان هذه المذاهب الأربعة المدونة المحررة قداجتمعت الأمة- أو من يعتد به منها- على جواز تقليد ها الى يو منا هذا و ذلک من المصالح مالا يخفى لاسيمافى هذه الأيام التى قصرت فيها الهم جدا واشربت النفوس الهوىٰ واعجب كل ذى راىٍ برائه''(۲۱)

''بے شک پوری امت یا اس کی غالب اکثریت نے ان چاروں مدون اور تنقیح شدہ مسالک کی تقلید کے جواز پر آج تک اجماع کر رکھا ہے، اور اس تقلید کی مصلحتیں پوشیدہ نہیں ہیں، خاص کر اس زمانے میں جس میں ہمتیں بہت پست ہو گئی ہیں اور انسانی نفوس خواہشات میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ہر صاحب رائے اپنی رائے میں خوش اور مست ہے''۔

ایک مقام پر تو آپ نے تقلید شخصی کو الہامی راز قرار دیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

''بالجملة فالتمذ هب للمجتهدين سرٌ الهمه الله تعالىٰ العلماء و جمعهم عليه من حيث يشعرون أو لايشعرون''(۲۲)

''مختصر یہ کہ مجتہدین کرام کی تقلید ایسا راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علماء پر الہام فرمایا اور انہیں اس پر جمع کر دیا، خواہ انہیں اس کا شعور ہوا ہو خواہ نہ ہوا ہو''۔

عقد الجید میں امام بغوی سے نقل کیا ہے کہ: ''جو شرائط اجتہاد کا جامع نہیں اسے پیش آمدہ مسائل میں تقلید واجب ہے'' (۲۳) شاہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں عہد صحابہ سے لے کر مسالک اربعہ کے ظہور تک تقلید کے تسلسل کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''کسی بھی قابل اعتبار شخصیت نے تقلید کا انکار نہیں کیا ہے'' ولو كان باطلا لا نكروه'' یعنی اگر تقلید باطل ہوتی تو لوگ ضرور اس پر اعتراض کرتے (۲۴) حضرت شاہ صاحب ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ تقلید ایک ایسا فطری مظہر ہے، جس کے جواز پر صرف امت اسلامیہ ہی کا اتفاق نہیں، بلکہ دنیا کی ساری قومیں اس پر عمل کرتی ہیں، یعنی تقلید ایک فطری تقاضا ہے۔

''قد اتفقت الأمة على صحته قرنا بعد قرن بل الأمم كلها اتفقت على مثله فى شرائعهم'' (۲۵)

''تقلید کے درست ہونے پر ہر زمانے میں امت اسلامیہ کا اتفاق رہا ہے، بلکہ اپنی اپنی شریعت میں ہر قوم تقلید جیسے نظام پر اتفاق کرتی ہے۔''

بعض غیر مقلد حضرات جب شاہ صاحب کی مذکورہ بالا یا ان کے مثل دوسری بہت سی عبارتوں سے رو برو ہوتے ہیں تو عموماً سفر حرمین والی تاویل کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ شاہ صاحب کے درجات بلند فرمائے کہ انہوں نے ایک ایسی تحریر چھوڑی ہے جو اس تاویل کو جڑ سے کاٹ دیتی ہے۔ ان کی کتاب فیوض الحرمین کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کی تصنیف سفر حرمین شریفین کے بعد ہوئی، شاہ صاحب اپنی اسی کتاب میں ایک مقام پر فرماتے ہیں: ''میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے تین ایسی باتوں سے آگاہ ہوا جن کے بارے میں میں دوسرا خیال رکھتا تھا...... دوسری بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی کہ میں ان چار مذاہب ہی کی تقلید کروں اور ان سے باہر نہ نکلوں'' (۲۶)

اس عبارت سے تو صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب اس سفر کے بعد زیادہ بڑے مقلد ہو گئے تھے۔ لہٰذا انہیں قطب دائرہ، ترجمان حق اور صاحب الزمان ماننے والوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ کم از کم اتنے مقلد ہو جائیں، جتنے شاہ صاحب تھے، تصوف کی ان باتوں سے اتفاق کر لیں جو شاہ صاحب کی کتابوں سے صراحتاً ثابت ہیں اور ان معمولات کو شرک و بدعت کہنے سے باز آ جائیں، جن پر ساری زندگی ان کا عمل رہا ہے یا پھر شاہ صاحب سے دست برداری اختیار کر لیں۔

صرف یہی نہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ صاحب کو مسالک اربعہ کی تقلید کی وصیت کی بلکہ انہیں فقہ حنفی کی ایک امتیازی خصوصیت سے بھی مطلع فرمایا:

عرفنى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن فى المذهب الحنفى طريقةً أنيقة هى أو فق الطرق بالسنة المعروفة التى جمعت فى زمان البخارى وأصحابه'' (۲۷)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ حنفی مسلک میں ایک ایسا عمدہ طریقہ ہے جو دوسروں کے مقابلے میں اس سنت مشہورہ

کے زیادہ موافق ہے، جس کی جمع وتدوین کا کام امام بخاری اور ان کے اصحاب کے عہد میں ہوا''۔

عام ہندوستانی کے بارے میں شاہ صاحب حنفی مسلک کی تقلید کو ضروری اور اسے چھوڑنے کو صراحت کے ساتھ حرام قرار دیتے ہیں بلکہ یہاں حنفیت کے ترک کو ترک اسلام کا مساوی مانتے ہیں:

وجب عليه أن يقلد بمذهب ابي حنيفة و يحرم عليه ان يخرج من مذهبه لأنه حيئذٍ يخلع من عنقه ربقة الشريعة ويبقى مهملا'' (۲۸)

''اس پر واجب ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسلک کی تقلید کرے اور ان کے مذہب سے باہر نکلنا اس کے لیے حرام ہے، کیونکہ ایسا کر کے وہ شریعت کی طوق ہی اپنی گردن سے اتار دے گا اور یونہی بے کار رہ جائے گا۔''

آج بہت سے غیر مقلد حضرات بھی اس حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں کہ شاہ صاحب خواہ کیسے بھی مقلد رہے ہوں، لیکن تھے مقلد ہی اور ان کے بزرگوں اور اساتذہ نے ان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ صحیح نہیں تھا، شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام شاہ صاحب پر ہونے والے سمیناروں میں کئی لوگوں نے برملا اعتراف کیا کہ ہمارے بزرگ شاہ صاحب کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھے، بعض نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ اگر شاہ صاحب کے یہی معتقدات ومعمولات تھے تو شرک وبدعت کے حوالے سے کسی خاص شخصیت کو ہی ہدف تنقید کیوں بنایا جائے اور بعض نے واقعی جرأت کا اظہار کرتے ہوئے شاہ صاحب سے اپنی براءت کا اعلان تک کر دیا۔

لیکن یہ فکر ولی اللہی کا صرف ایک رخ ہے، جس سے کم از کم اتنا واضح ہے کہ شاہ صاحب عموماً مقلد تھے اور عام طور پر مذہب حنفی پر عمل پیرا تھے، اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ان کی تقلید مروجہ تقلید سے قدرے مختلف تھی، یہ اختلاف کتنا تھا اور کس نوعیت کا تھا، آئندہ سطور میں اس کا جائزہ لیا جائے گا لیکن اس سے پہلے دو اہم باتوں کا ذکر ضروری ہے۔

(۱) شاہ صاحب نے اگر روایتی تقلید سے کہیں اور کسی قدر اختلاف کیا ہے تو اس کا اصطلاحی غیر مقلدیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، انہوں نے اپنی کتابوں میں متعدد مقامات پر فقہائے محدثین اور اصحاب ظواہر یعنی روایتی غیر مقلدین میں فرق کیا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

'' والظاهری: من لا يقول بالقياس ولا بآثار الصحابة والتابعين كداؤد وابن حزم'' (۲۹)

''ظاہری وہ ہے جو قیاس اور آثار صحابہ وتابعین کا قائل نہیں ہے، جیسے داؤد ظاہری اور ابن حزم۔''

عقد الجید میں امام بغوی اور امام بیہقی کو بطور فقہائے محدثین ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

'' وهم غير الظاهرية من أهل الحديث الذين لا يقولون بالقياس ولا الاجماع، وغير المتقدمين من أصحاب الحديث ممن لم يلتفتوا الى اقوال المجتهدين اصلا'' (۳۰)

''یہ (فقہائے محدثین) فرقہ ظاہر یہ والے اہل حدیث سے الگ ہیں جو نہ قیاس کو مانتے ہیں اور نہ اجماع کو، اور یہ قدیم اصحاب حدیث سے بھی جداگانہ ہیں جنہوں نے مجتہدین کے کلام کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔''

شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات میں متعدد مقام پر فقہائے محدثین کی صحبت اختیار کرنے اور ان کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے اور غیر مقلد اہل حدیث سے پرہیز کرنے کو کہا ہے:

'' ولا تصحب جهال الصوفية ولا جهال المتعبدين ولا المتقشفة من الفقهاء، ولا الظاهرية من الحديث ولا الغلاة من أصحاب المعقول والكلام بل يكون عالما صوفيا زاهدا فى الدنيا، دائم التوجه الى الله منصبغاً بالاحوال العلية، راغبا فى السنة متبعا لحديث رسول الله صلى الله عليه وسلم وآثار الصحابة، طالبا لشرحها وبيانها من كلام الفقهاء المحققين'' (۳۱)

''جاہل صوفیہ، جاہل عبادت گزاروں، متقشف فقہاء، ظاہر پرست اہل حدیث اور غالی قسم کے معقولیوں اور متکلمین کی صحبت اختیار مت کرو، بلکہ ایک صوفی عالم بن کر رہو جو دنیا سے کنارہ کش اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو، بلند احوال میں رنگا ہو، سنت میں رغبت رکھتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے آثار کا پیرو ہو اور ان احادیث وآثار کا شرح وبیان محققین فقہاء کے فرمودات کی روشنی میں کرنے والا ہو''۔

التفهيمات الالهيه میں اصحاب ظواہر اور غیر مقلدین سے اپنی براءت کا اعلان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ولیس منا من ترک ملازمة العلماء أعنی الصوفیة الذین لهم حظ من الکتاب والسنة أوالرا سخین فی العلم الذین لهم حظ من الصوفیة أوالمحدثین الذین لهم حظ من الفقه، أوالفقهاء الذین لهم حظ من الحدیث، وأما الجهال من الصوفیة والجا حدون للتصوف فاولئک قطاع الطرق و لصوص الدین فایاک وایاهم" (۳۲)

''وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے ایسے علماء کی صحبت ترک کردی ہے جوصوفیہ ہیں اور جنہیں کتاب سنت کا معتد بہ علم ہے، یا جو ایسے علمائے راسخین سے کنارہ کش ہو گیا ہو جو تصوف آگاہ ہیں، یا ایسے محدثین کی ہم نشینی چھوڑ دی ہو جنہیں فقہ سے وافر حصہ ملا ہے، یا ایسے فقہا کی رفاقت ترک کردی جو حدیث پر نظر رکھتے ہیں- باقی رہے جاہل صوفیہ اور منکرین تصوف تو دونوں چور اور دین کے رہزن ہیں ان سے بچ کر رہو''-

ان واضح حقائق کی روشنی میں بلا تکلف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شاہ صاحب کی غیر مقلدیت کا پرچار یا شیخ ابن عبدالوہاب اور شیخ اسماعیل دہلوی سے ان کی فکری ہم آہنگی کا پروپگنڈہ ایک علمی خیانت ہے-

شاہ صاحب کے نزدیک عام روش سے تھوڑا الگ ہٹنا انہیں دائرۂ تقلید سے باہر نہیں کرتا ہے، ان کے نزدیک ہر فقہی مسلک کے علمائے محققین کا یہی طریقہ رہا ہے جنہیں اقوال فقہیہ کے قوی وضعیف اصلی والحاقی، راجح ومرجوح کی بصیرت کے ساتھ ساتھ علم حدیث پر قدرت ہوتی تھی، جیسے امام طحاوی، امام ابن ہمام، حافظ حدیث قاسم بن قطلو بغا اور ابن امیر الحاج وغیرہ- یہ وہ حضرات ہیں جو متعدد مسائل میں اپنا خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے، اس کے باوصف حنفی تھے، شاہ صاحب کے نزدیک ہر فقہی مسلک میں ایسے علمائے محققین اور فقہائے محدثین کی ایک طویل فہرست ہے-

قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے اپنے تمام تفردات میں انہی علمائے مقلدین کو سند بنایا ہے اور انہی کے اقوال پر اعتماد کیا ہے اور ان کی رائے میں ان کا طریقہ ہی جمہور مقلدین کا طریقہ ہے اور فقہائے متشددین اقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں- یعنی انہوں نے باب تقلید میں اپنے فکری توسع میں بھی تقلید سے کام لیا ہے- چونکہ ہندوستان میں یہ پہلی آواز تھی لہٰذا مقلدین حضرات کی جانب سے اس کی پذیرائی نہیں ہوئی اور میدان خالی دیکھ کر غیر مقلدین نے انہیں اپنا لیا جو ایک زمانے سے کسی بلند قامت اور گراں قدر ہمنوا وحامی کی تلاش میں تھے اور آسانی کے ساتھ ان کے توسع کو غیر مقلدیت کا نام دے دیا-

(۲) دوسری اہم بات جس کا لحاظ یہاں بے حد ضروری ہے یہ ہے کہ تقلید کی حمایت میں تو شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے اقوال پر پوری طرح سے اعتماد و یقین کیا جاسکتا ہے، لیکن اس باب میں جو ان کا تفرد و توسع ہے یا بلفظ دیگر اجتہاد کے بارے میں ان کے نظریات کو اختیار کرنے میں بڑے حزم واحتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کی صحت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے، جب ان کے نام سے پوری پوری کتابیں شائع کی جاسکتی ہیں تو ان کی اپنی تصنیفات کے ساتھ کیا کیا ہوا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، خاص کر اس تناظر میں کہ ان کی ''مجتہدانہ'' شان رکھنے والی تمام کتابیں شروع سے یعنی مخطوطہ کے مرحلے ہی سے انہی ہاتھوں میں رہی ہیں جو تقلید کے قائل نہیں تھے یا اس کے بارے میں بے حد نرم ومتساہل رویہ رکھتے تھے- انہیں لوگوں نے ان کتابوں کو اولاً شائع کیا اور ان کی تشریح وتعلیق کا کام کیا اور آج تک ان کتابوں کی طباعت واشاعت انہی لوگوں کے ذریعے ہو رہی ہے-

یہاں یہ عرض کردوں کہ تحریف کا یہ الزام انہی لوگوں تک محدود ہے ،جنہوں نے یہ کام کیا ہے اور کوئی پوری جماعت اور پورا گروہ مورد الزام نہیں ہے، لیکن دو باتیں متعین ہیں، اول یہ کہ شاہ صاحب کی کتابوں میں تحریف ہوئی ہے اور دوم یہ کہ اسی نے کی ہے جو تقلید یا تصوف کو پسند نہیں کرتا ہے- لہٰذا شاہ صاحب کے ان اقوال کو لینے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے، جن میں روایتی تقلید کی مخالفت یا اجتہاد کی حمایت ملتی ہے-

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی کتابوں میں تحریفات کی شہرت اور ثبوت کو ذریعہ بنا کر ان کے تمام تفردات ومختارات اور باب تقلید میں ان کے توسع کا مطلق انکار کردیا جائے، کیوں کہ تقلید میں ان کا توسع، معاصر مقلدین کی عام روش سے ان کی علاحدگی، مذاہب ومسالک کے درمیان جمع وتوفیق کی کوشش، عمل بالحدیث اور اوراوفق بالسنۃ کا اختیار وغیرہ فکر شاہ ولی اللہی کے وہ عناصر ہیں جو تواتر کے ساتھ منقول ہیں اور ہندوستانی تناظر میں ان کے ان تفرذات پر ان کی کتابیں ہی نہیں بلکہ ان کی اولاد، ان کے تلامذہ اور مرید اور ان کے سارے تذکرہ نگار متفق ہیں-

اسی طرح یہ قاعدہ بڑی حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب کے توسعات وتفردات میں جو کچھ مذاہب اربعہ کے ائمہ وعلماء

کے اقوال کے دائرے میں ہیں، اس کی نسبت ان کی طرف کی جاسکتی ہے اور جو بات بالاتفاق مذاہب اربعہ کے علما کے خلاف ہو اور کسی بھی فقیہ و مقلد نے اس کا قول نہ کیا تو ایسی بات ضرور محرف اور مدسوس ہوگی۔

حجة الله البالغه اور غاية الانصاف میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اسلام میں فقہی اختلاف کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، صحابہ و تابعین کے درمیان کے اختلاف کو بیان کیا ہے اور ان کے اسباب کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر فقہی مذاہب کے ارتقاء اور ان کے مابین ہونے والے اختلافات اور ان کے وجوہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اصحاب رائے اور علماے حدیث کے درمیان اختلاف کا بھی جائزہ لیا ہے، شاہ صاحب کے مطابق قرون مشہود لہا بالخیر میں تقلید تھی مگر شخصی نہیں تھی، دو صدیوں کے بعد معین مجتہد کی تقلید کا رجحان پیدا ہوا اور دھیرے دھیرے تقلید شخصی کا رواج بڑھتا گیا لیکن چوتھی صدی تک کسی مذہب معین کی تقلید پر عام اتفاق نہیں تھا اور اس عہد تک اجتہاد و تقلید دونوں شانہ بشانہ چل رہے تھے اور شاہ صاحب کے نزدیک یہاں تک قابل قبول تھا۔ (۳۳)

پھر ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ لوگ تقلید پر قانع ہوتے گئے، ان میں نمایاں تین سبب تھے (۱) فقہاء کا مسلسل باہمی جدال حتی کہ صورت حال یہ ہوگئی کہ ہر مفتی (مجتہد) کے فتوے پر مناقشہ ہوتا اور اسے اپنی حقانیت کے لیے متقدمین سے نظیر لانی پڑتی اور اس طرح اجتہاد کا دائرہ غیر شعوری طور پر سمٹتا چلا گیا (۲) تقلید کے انتشار میں دوسرا سبب قاضیوں کا ظلم تھا، چونکہ لوگوں کو ان کی امانت پر بھروسہ کم ہوگیا تھا، لہٰذا ان کے اجتہاد کی ضرورت نہ رہی اور لوگ قدماء کے اقوال پر قناعت کرنے لگے (۳) تیسرا سبب علما کی ناواقفیت اور کم علمی تھی جو تقلید کے رائج ہونے میں معاون ہوئی۔ لوگوں میں توسع کے بجائے تعمق، قیل و قال، مناظرہ اور جدال نے رواج پایا اور دھیرے دھیرے نوبت بایں جا رسید کہ آج کا فقیہ فضول گو اور منہ پھاڑ پھاڑ کر بات کرنے والا بن گیا ہے، جس نے بلا امتیاز صحت و ضعف کے اقوال فقہاء کو حفظ کرلیا ہے اور جھاگ بھرے منہ سے انہیں بیان کرتا رہتا ہے اور آج محدث کا یہ حال ہے کہ صحیح و سقیم ہر قسم کی روایت کا شمار کرتا رہتا ہے اور داستان گو کی طرح انہیں بیان کرتا ہے اور ایسے علماء بہت کم ہیں جو حقیقت میں علم رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ اور اس طرح ہر بعد کی صدی پہلی سے بدتر ہوتی گئی، تقلید کا رواج بڑھتا گیا اور لوگوں نے دین کے معاملے میں غور کرنا ہی بند کردیا، خدا ہی سے اس صورت حال کی فریاد ہے۔ (۳۴)

اس طویل اقتباس کے خلاصے سے یہ بات ظاہر ہے کہ شاہ صاحب اپنے دور کے تقلیدی رجحان سے اتفاق نہیں رکھتے تھے اور اجتہاد کے عمل کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔

شاہ صاحب نے صاف طور پر لکھا ہے کہ چار قسم کے لوگوں کے لیے تقلید جائز نہیں ہے:

۱۔ وہ شخص جسے اجتہاد کی کسی قدر اہلیت حاصل ہے۔ خواہ کسی ایک مسئلے میں کیوں نہ ہو "ممن له ضرب من الاجتهاد ولو في مسئلة واحدة" (۳۵) یعنی شاہ صاحب کے نزدیک جو تمام مسائل میں مجتہد ہو اس کے لیے تمام مسائل میں جو کسی ایک مسئلے میں اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو اسے اس ایک مسئلے میں تقلید کرنا جائز نہیں ہے۔

یہاں ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب اجتہاد میں تجزی کے قائل تھے اور یہ ان کے یہاں موضوع میں توسع کی ایک بڑی وجہ ہے۔ شوکانی یمنی نے امام غزالی، امام رافعی، صفی الدین ہندی وغیرہ کو جزوی اجتہاد کے قائلین میں شمار کیا ہے (۳۶) بعض علماء نے جزوی اجتہاد کا انکار کیا ہے ان کی دلیل ہے کہ اجتہاد کا تعلق ایک یا چند مسئلے سے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ایک ملکہ اور اضافی صلاحیت ہے جس کے ذریعے انسان نصوص کو سمجھنے پر قادر ہوتا ہے اور جہاں نصوص نہ ہوں، وہاں مناط کی تحقیق، تخریج اور تطبیق کر کے استنباط کرتا ہے۔ قدماء میں جزوی اجتہاد کا انکار کرنے والے بہت ہیں، معاصرین میں عبدالوہاب خلاف (م:۱۹۵۶ء) (۳۷) اور شیخ ابوزہرہ (۳۸) جزوی اجتہاد کے جواز کے قائل نہیں ہیں، مؤخر الذکر کے نزدیک اجتہاد و تقلید دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک شخص میں جمع نہیں ہوسکتی ہیں۔

بہر کیف! شاہ صاحب کے نزدیک جو شخص جس قدر اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے اس قدر اس کے لیے تقلید روا نہیں ہے۔ دوسرے شخص کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

۲۔ دوسرا وہ شخص ہے جس پر یہ بات خوب اچھی طرح ظاہر ہو جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں بات کا حکم دیا ہے، یا فلاں بات سے منع کیا اور یہ منسوخ بھی نہیں ہے، بایں طور کہ وہ احادیث اور جانبین کے اقوال میں خوب غور کرچکا ہے لیکن نسخ کو نہیں پایا ہے، یا پھر ماہر علماء کے ایک جم غفیر کو اس قول کی حمایت میں پایا ہے اور اس کی

مخالفت میں اس کے پاس قیاس و استنباط کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۳-تیسرا وہ عامی ہے جو کسی معین فقیہ کی تقلید کرتا ہے اور اپنے امام سے صدور خطا کو محال سمجھتا ہے اور اس کے اقوال میں حق کو محصور جانتا ہے اور اس نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا ہے کہ امام کے خلاف کیسی ہی دلیل کیوں نہ ملے وہ اس کی تقلید نہیں چھوڑے گا۔

شاہ صاحب نے ایسے شخص کو اس حدیث کے مصداق بتایا ہے جسے امام ترمذی نے اپنی جامع کی کتاب التفسیر میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: **واتخذ وا احبار هم ورهبا نهم اربابامن دون الله**'' کے ضمن میں حضرت عدی بن حاتم سے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' **أنهم لم يكونو ايعبدو نهم ولكنهم كانوا اذا أحلوالهم شئياً استحلوه، و اذا حرموا عليهم شيئاً حرموه**''

''وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کی عبادت نہیں کرتے تھے۔لیکن جس چیز کو وہ ان کے لیے حلال کرتے تھے، اسے حلال سمجھتے تھے اور جس چیز کو ان پر حرام کرتے تھے اس کو حرام سمجھتے تھے''۔

۴-چوتھا اور آخری شخص جس کے لیے تقلید جائز نہیں ہے بقول شاہ صاحب وہ ہے: جو شخص یہ بات جائز نہ سمجھتا ہو کہ حنفی شافعی سے اور شافعی حنفی سے مسئلہ دریافت کرے یا کوئی حنفی شافعی امام کی اقتدا کرے (۳۹)

شاہ صاحب کی آخری بات عجیب اور نا قابل فہم ہے، کسی کے نزدیک یہ بات غیر مرغوب فیہ تو ہو سکتی ہے لیکن اس کی وجہ سے کسی پر تقلید حرام ہو جائے یہ بات سمجھ سے پرے ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے فقہ کی کتابوں میں مذکور اجتہاد کی سخت اور نا قابل حصول شرائط کا انکار کیا ہے اور اس بات کو بھی گمان فاسد قرار دیا ہے کہ آج کے زمانے میں کوئی مجتہد نہیں ہو سکتا ہے۔(۴۰)

شاہ صاحب نے مجتہد کے مختلف مراتب اور ان کی تعریفات میں بھی فقہائے احناف سے اختلاف کیا ہے یا اس تقسیم کے التزام کو غیر ضروری سمجھا ہے۔انہوں نے شوافع کے طور پر مجتہدین کی تقسیم کرتے ہوئے مجتہد مطلق کو مجتہد مستقل اور مجتہد منتسب میں تقسیم کیا ہے، مجتہد منتسب احناف میں مجتہد فی المذہب کی طرح ہے۔اس کے بعد مجتہد کے دو درجے مجتہد فی المذہب اور مجتہد فی الفتوی کا بیان کیا ہے اور بقول شاہ صاحب یہ سب مرتبہ اجتہاد پر فائز ہوئے ہیں۔(۴۱)

شاہ صاحب اپنی بیشتر کتابوں کے متعدد مقامات پر فقہاء کے ترک حدیث اور محدثین کے فقہ و استنباط سے بے اعتنائی کا شکوی کرتے ہیں اور اسے سخت ناپسندیدہ بتاتے ہیں:

''**ان التخريج على كلام الفقهاء و تتبع لفظ الحديث لكل منهما اصل اصيل في الدين ولم يزل المحققون في كل عصر يا خذون بهما**''

''فقہائے مجتہدین کے کلام پر تخریج اور الفاظ حدیث کی پیروی ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے دین میں مضبوط اصل ہے اور ہر دور میں علماء محققین ان دونوں اصل پر عمل کرتے رہے ہیں''۔

پھر محدث کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسے غلو سے کام نہیں لینا چاہیے اور صرف اپنے بزرگوں کے بتائے ہوئے قواعد کے سبب کسی حدیث یا قیاس کو رد نہیں کرنا چاہیے، فقہاء کو بھی نصیحت کرتے ہیں انہیں اپنے اکابر کے کلام سے کوئی ایسا مسئلہ مستنبط نہیں کرنا چاہیے جو اس سے مفہوم نہ ہو رہے ہوں اور نہ کسی ثابت شدہ حدیث اور اثر صحابی کو ان قواعد کے سبب نظر انداز کرنا چاہیے، جیسے'' حدیث مصراۃ'' کو احناف نے چھوڑ دیا جبکہ اس کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے۔(۴۲)

واضح رہے کہ حدیث مصراۃ ایک متفق علیہ روایت ہے اور مصراۃ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے مالک نے خریدار کو دھوکہ دینے کے لیے اس کا دودھ روک لیا ہو، حدیث میں ہے کہ اس خریدار کو تین دن تک کا اختیار ہے چاہے تو بکری واپس کر دے اور فروخت کنندہ کو ایک صاع کھجور دے دے۔

تقلید کی تعریف کی جاتی ہے: **العمل بقول الغير من غير حجة**'' (۴۳)'' یعنی بغیر دلیل کے کسی کے قول پر عمل کرنے کا نام تقلید ہے'' اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دلیل میں مطلق غور ہی نہ کیا جائے اور اس سے سروکار نہ رکھا جائے۔علماء فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اولا دلیل کا مطالبہ نہ ہو اور نہ عمل دلیل پر موقوف ہو بلکہ صرف حسن ظن کی بنیاد پر امام کی پیروی ہو، اور اگر بعد میں دلیل معلوم ہو جائے یا اسے تلاش کیا جائے تو یہ تقلید کے منافی نہیں ہے ورنہ آج عام آدمی بھی استفتاء کرتا ہے تو مدلل جواب مانگتا ہے اور ہر مسلک والوں کی کتابیں عقلی و نقلی دلائل سے بھری ہوئی ہیں۔

لیکن ایسا لگتا ہے کہ شاہ صاحب ''من غير حجة'' کے مبدأ سے اصلاً اتفاق نہیں رکھتے ہیں اور وہ ہر ایک کے لیے ہر مرحلے میں حسب

استطاعت دلیل کی تلاش و تتبع کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ آنکھ بند کر کے کسی بھی دلیل کو ماننے سے منع کرتے ہیں اور اپنے اس رویہ کو تمام مسالک کے قدیم و جدید محققین علماء کا طرز عمل قرار دیتے ہیں (۴۴) ان کے نزدیک فتوی دینے کے لیے بھی دلیل کی معرفت ضروری ہے، چنانچہ امام ابو یوسف اور امام زفر وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان حضرات نے فرمایا: "لایحل لأحد ان یفتی بقولنا مالم یعلم من این قلنا" (۴۵) "کسی کو بھی ہمارے قول پر فتوی دینا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ ہم نے کس دلیل سے وہ بات کہی ہے"۔

اگر کسی مقلد عالم کو اپنے مسلک کے خلاف کوئی صحیح حدیث مل جائے تو وہ کیا کرے؟ شاہ صاحب اس کا جواب ابن الصلاح (م: ۶۴۳ھ) کے حوالے سے دیتے ہیں کہ: "قال ابن الصلاح: من وجد من الشافعية حديثا يخالف مذهبه: نظر، ان كملت له آلة الاجتهاد مطلقا، اوفي ذلك الباب اوفي تلك المسئلة، كان له الاستقلال بالعمل به، و ان لم تكمل، وشق عليه مخالفة الحديث بعد أن بحث فلم يجد جوابا شافيا، فله العمل به ان كان عمل به امام مستقل غير الشافعي و يكون هذا عذرا له في ترك مذهب امامه ههنا، وحسنه النوی وقرره" (۴۶)

"ابن الصلاح کہتے ہیں کہ اگر کوئی شافعی اپنے مسلک کے خلاف کوئی حدیث پائے تو غور کرے، اگر اس کے اندر اجتہاد کی صلاحیت ہے، خواہ مطلقا خواہ اس باب میں، خواہ اس مسئلے میں، تو وہ بالاستقلال اس حدیث پر عمل کر سکتا ہے اور اگر وہ قابل اجتہاد نہیں اور حدیث کی مخالفت اسے گراں گزر رہی ہے اور اسے بعد تحقیق مخالفین حدیث (یعنی شوافع) کے پاس کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا ہے تو وہ دیکھے کہ کیا کسی غیر شافعی مجتہد مطلق نے اس پر عمل کیا ہے، اگر کوئی ملے تو اس شخص کو اس امام کے مذہب پر عمل کرنا چاہیے اور اس صورت میں اس کے لیے عذر ہوگا کہ وہ اپنے امام کے مذہب کو چھوڑ دے۔ امام نووی نے ابن الصلاح کی اس بات کو پسند کیا ہے اور برقرار رکھا ہے"۔

یہاں لطف کی بات یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ابن الصلاح کا یہ قول ان کی کتاب "ادب المفتی والمستفتی" سے نقل کیا ہے لیکن مذکورہ عبارت سے متصل ہی ابن الصلاح کے اس قول کو نظر انداز کر دیا ہے، ابن الصلاح کہتے ہیں:

"و ليس هذا بهين فليس كل فقيه يسوغ له ان يستقل بالعمل بما يراه حجة من الحديث" (۴۷)

"یہ کام آسان نہیں ہے، لہذا ہر فقیہ کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بالاستقلال اس حدیث پر عمل کرنے لگے، جسے وہ حجت مانتا ہے"۔

شاہ صاحب کے نزدیک مذاہب کے مابین فروعی مسائل میں اکثر راجح و مرجوح اور افضل وغیر افضل کا اختلاف ہے، خاص کر ان مسائل میں جن میں فریقین کے پاس صحابہ کے اقوال ہیں:

"كتكبيرات التشريق و تكبيرات العيدين و نكاح المحرم و تشهد ابن عباس و ابن مسعود والاخفاء والجهر بالبسملة و بآمين"

"جیسے تکبیرات تشریق اور تکبیرات عیدین، احرام والے کا نکاح، ابن عباس اور ابن مسعود کا تشہد اور بسم اللہ اور آمین میں اخفاء کیا جائے یا جہر"۔

یہاں شاہ صاحب سے واضح طور پر چوک ہوگئی ہے (بشرط عدم تحریف) کیونکہ محرم کے نکاح میں جواز وعدم جواز کا اختلاف ہے، امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک محرم کا نکاح درست ہے صرف صحبت حرام ہے، جبکہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک مجرد نکاح بھی باطل ہے۔

شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں کہ: مذاہب اربعہ کے درمیان بیشتر اختلاف چونکہ صرف اولیت اور افضلیت کا ہے لہذا......

"لم يزل العلماء يجوزون فتاوى المفتين في المسائل الاجتهادية و يسلمون قضاء القضاة، ويعملون بعض الأحيان بخلاف مذهبهم.........يقول احدهم: هوأحوط، و هذا هو المختار، وهذا أحب اليّ، و يقول: ما بلغنا الا ذلك - وهذا كثير في المبسوط و آثار محمد رحمه الله و كلام الشافعي رحمه الله" (۴۸)

"علمائے کرام ہمیشہ اجتہادی مسائل میں سبھی مفتیوں کے فتووں کو قبول کرتے تھے اور سب قاضیوں کے فیصلوں کو تسلیم کرتے تھے اور کبھی کبھی اپنے مسلک کے خلاف پر بھی عمل کرتے تھے.....کوئی فقیہ کہتا ہے: یہ زیادہ محتاط بات ہے، یہ پسندیدہ ہے، یہ مجھے پسند ہے، کوئی کہتا ہے: ہم کو صرف یہی بات معلوم ہوئی۔ اور یہ (تعبیرات) مبسوط میں، امام محمد

رحمہ اللہ کی کتاب الآثار میں اور امام شافعی کے کلام میں، بہت ہیں“۔

شاہ صاحب کے نزدیک متقدمین کے یہاں تو یہی توسع اور فراخ نظری رہی لیکن بعد میں آنے والے اسے قائم نہیں رکھ سکے اور پھر شا صاحب خود ہی اس کے ایسے اسباب بیان کرتے ہیں جو معقول بھی ہیں اور مقبول بھی۔

حجۃ اللہ البالغہ میں پرزور اور مدلل انداز میں مسلکی رواداری کی ضرورت کو بیان کیا ہے اور اسے اسلاف کے عمل سے ثابت کیا ہے، جس کی کچھ باتیں تلخیص واختصار کے ساتھ درج ذیل ہیں:

”صحابہ کرام، تابعین عظام اور ان کے بعد کے لوگوں میں گہری باہمی رواداری تھی اور مسائل میں اختلاف اس پر قطعا اثر انداز نہیں ہوتے تھے، کوئی نماز میں بسم اللہ پڑھتا تھا تو کوئی نہیں پڑھتا تھا، کوئی زور سے پڑھتا تھا، کوئی آہستہ پڑھتا تھا، کچھ لوگ پچھنے لگانے کو اور نکسیر وقے کو ناقض وضو مانتے تھے، کچھ ایسا نہیں مانتے، تھے لیکن ان اختلاف کے باجود سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، ایک بار ہارون رشید نے فصد کرایا اور بغیر نئے وضو کے امامت کی، اس نماز کے مقتدیوں میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ بھی تھے، حالانکہ ان کے نزدیک بدن سے خون نکل کر بہنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، صاحبین عید کی نماز پڑھاتے تھے تو بارہ تکبیر کہتے تھے کیونکہ ہارون رشید عباسی اپنے جد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول پر عمل کرنا چاہتا تھا، فتاویٰ بزازیہ میں ہے کہ ایک بار امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ایک حمام کے کنویں سے غسل کر کے نماز پڑھا دی بعد میں اس کنویں میں مرا ہوا چوہا پایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم اہل مدینہ (حجاز یعنی شوافع) کے قول پر عمل کر لیتے ہیں کہ جب پانی دو مٹکہ ہو جائے تو ناپاک نہیں ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ (۴۹)

شاہ صاحب کے نزدیک حنفی فقہ میں اصلی مسائل کے ساتھ ساتھ بہت سے مسائل بعد میں بڑھائے گئے ہیں، یہ مسائل تخریجات و متزاد ہیں اور ان کے ساتھ ”قال ابو حنیفۃ“ کہنا درست نہیں ہے۔ مثلاً امام اعظم سے بلی کے جوٹھے کی کراہت منقول ہے، جو تحریمی و تنزیہی دونوں کا احتمال رکھتی ہے، امام طحاوی نے گوشت کی حرمت کے پیش نظر اس کے جوٹھے کو مکروہ تحریمی قرار دیا جبکہ امام کرخی نے صرف اس کا خیال کیا کہ بلی ناپاکی سے نہیں بچتی ہے اور اس کے جوٹھے کو مکروہ تنزیہی ٹھہرایا۔ یہ تخریج کی مثال ہے، متزاد مسائل میں تعلیم قرآن اور اذان واقامت پر اجرت کے جواز کا مسئلہ ہے“۔ (۵۰)

شاہ صاحب نے احناف کے سات ایسے اصول کا ذکر کیا جو ان کی رائے میں غیر منصوص بھی ہیں اور مخدوش بھی ہیں، ذیل میں بطور نمونہ ان میں سے صرف ایک اصل اور اس پر اختصار کے ساتھ شاہ صاحب کا تبصرہ نقل کیا جاتا ہے۔

”حنفی اصول فقہ کا ایک قاعدہ ہے کہ: مفہوم شرط ووصف کا قطعی اعتبار نہیں“ لیکن جب یہ حدیث سامنے آئی کہ: ”چرنے والے (سائمہ) اونٹوں میں زکاۃ ہے تو اس قاعدے کا برقرار رہنا دشوار ہو گیا کیونکہ اس میں وصف سائمہ بالاتفاق معتبر ہے۔ اس کے لیے جواب دینے میں احناف کو بہت تکلف سے کام لینا پڑا۔ ایسے مستخرج اور غیر اصلی قاعدے کے لیے تکلفات کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے ترک کر کے حدیث پر عمل کرنا چاہیے۔ (۵۱)

یہ مقالہ انتہائی ہجوم کار اور مدیر ماہنامہ جام نور کے بے حد مختصر مدت نوٹس پر تحریر کیا گیا ہے، چنانچہ مواد اور پیش کش دونوں اعتبار سے ناقص ہے، یقین ہے کہ اس میں کئی اہم گوشے چھوٹ گئے ہوں گے اور بعض تشنہ رہ گئے ہوں گے۔ عجلت کے سبب ترتیب میں بھی تقدیم وتاخیر ہو گئی ہوگی، لیکن بایں ہمہ امید ہے کہ یہ کوشش تقلید واجتہاد کے باب میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کو سمجھنے میں کسی حد تک معاون ہوگی۔

حواشی وحوالے

(۱) انفاس العارفین، مطبوعہ احمدی، دہلی، غیر مورخ
سید ظہیر الدین کے اہتمام میں شائع اس کتاب کے آخر میں ”التماس ضروری“ کے عنوان سے ایک اعلان ہے، جس میں خانوادہ ولی اللہ کے بزرگوں کے نام سے شائع جعلی کتابوں کی فہرست ہے، جس میں یہ دونوں کتابیں بھی شامل ہیں۔

(۲) مقدمہ الدر الثمین، محمد اسلم علوی قادری، کتب خانہ علویہ رضویہ، لائل پور، بار سوم، ۱۳۸۶ھ

(۳) ان دونوں کتابوں کا ذکر مرزا علی لطف نے اپنی کتاب گلشن ہند میں کیا ہے، جس پر شبلی نعمانی کا حاشیہ اور مولوی عبد الحق کا مقدمہ ہے۔ دیکھیے: گلشن ہند، حیدر آباد ۱۹۰۶ء، ۲۴، ۲۵

(۴) شاہ ولی اللہ اور تقلید، محمد علی کاندھلوی، سیالکوٹ غیر مورخ، ۵۳

(۵) وسیلہ جلیلہ، وکیل احمد سکندر پوری، مطبع یوسفی لکھنؤ غیر مورخ، ۲۳

(۶) حدائق حنفیہ نولکشور لکھنؤ، ۱۹۰۶ء، ۴۴۷

(۷) الشاہ ولی اللہ، عرض موجز لحیاتہ وفکرہ، لیسین مظہر صدیقی، عربی ترجمہ: سید علیم اشرف جائسی، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی

گڑھ،۲۰۰۱ء

(۸) بعض غیر مقلدین حضرات نے شاہ صاحب کی سوانح میں ان کتابوں کا حوالہ دیا ہے، مگر اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

(۹) دیکھیے :راقم السطور کا مقالہ:'' شاہ ولی اللہ کی تنقید تصوف اور اس کی حدیں'' مجلّہ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، دسمبر ۲۰۰۴ء

(۱۰) دیکھیے :ماہنامہ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر ص:/۴۰

(۱۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: پیش لفظ رسائل شاہ ولی اللہ، از سید محمد فاروق قادری، تصوف فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۹ء اور تحقیقات اسلامی کا شائع شدہ راقم کا مقالہ

(۱۲) تاریخ دعوت وعزیمت، ادارۂ نشریات اسلام، کراچی، ۵/ ۴۰۸

(۱۳) اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، ڈاکٹر مظہر بقا، ادارہ تحقیقات اسلامی، پاکستان، ۲۸

(۱۴) دیکھیے :الشاہ ولی اللہ عرض موجز لحیاتہ وفکرہ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی

(۱۵) الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی ص: ۶ بحوالہ ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، شاہ ولی اللہ نمبر ص:۴۰۰

(۱۶) ماہنامہ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، ۳۹۹

(۱۷) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۴، ۳۱

(۱۸) نفس مرجع نفس صفحہ

(۱۹) نفس مرجع، ۳۳

(۲۰) نفس مرجع، ۳۹، وحجۃ اللہ البالغہ، دار الکتب الحدیثہ، قاہرہ، تعلیق: سید سابق، غیر مورخ ۱/ ۳۲۸

(۲۱) حجۃ اللہ البالغہ، ۱: ۳۲۵

(۲۲) غایۃ الانصاف، مطبوعہ دہلی غیر مورخ، ۲۳

(۲۳) عقد الجید، ۹

(۲۴) نفس مرجع، ۳۳

(۲۵) نفس مرجع، ۲۹

(۲۶) غایۃ الانصاف، ۲۴

(۲۷) فیوض الحرمین، مطبع احمد، دہلی، ۱۳۰۷ھ، ۷۰

(۲۸) غایۃ الانصاف، ۷۰، ۷۱

(۲۹) رحمۃ اللہ الواسعہ، ترجمہ و تعلیق: حجۃ اللہ البالغہ، سعید احمد پالن پوری، مکتبہ حجاز، دیو بند، بار اول: ۲۰۰۲ء، ۲/ ۳۶۷

(۳۰) عقد الجید :۴۴

(۳۱) القول الجمیل، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، لاہور غیر مورخ، ۱۰۷

(۳۲) التفہیمات الالہیہ، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، مطبوعہ ڈھابیل میں "الجاحدون للتصوف" کے بجائے "المجاھدون للتصوف" ہے جو تحریف کا ایک نمونہ ہے۔

(۳۳) رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۶۷۵

(۳۴) حجۃ اللہ البالغۃ ۱: ۲۹۶، ۳۲۴

(۳۵) حجۃ اللہ بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۶۸۱

(۳۶) ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من الاصول، الشیخ شوکانی یمنی، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۹۹۹، ۲: ۳۰۲

(۳۷) علم الاصول، عبد الوہاب خلاف، دار القلم، کویت، ۸، ۱۹۷، ۲۲

(۳۸) اصول الفقہ، شیخ ابوزہرہ، دار الفکر العربی، بیروت، غیر مورخ، ۴۰۰

(۳۹) حجۃ اللہ البالغہ بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۶۸۱، ۶۸۲، وعقد الجید، ۳۶-۳۹

(۴۰) عقد الجید، ۶، ۷، (۴۱) نفس مرجع، ۱۰، ۱۱، ۵۱

(۴۲) حجۃ اللہ البالغہ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۶۹۰،

(۴۳) عام کتب الفقہ

(۴۴) حجۃ اللہ البالغہ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۶۹۶- ۶۹۹

(۴۵) حجۃ اللہ البالغہ بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۰۳

(۴۶) حجۃ اللہ البالغہ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۰۹

(۴۷) ادب المفتی والمستفتی، ۱۱۸، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۰۹

(۴۸) حجۃ اللہ البالغہ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۱۳، ۷۱۴

(۴۹) حجۃ اللہ البالغہ بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۱۶، ۷۱۷

(۵۰) حجۃ اللہ البالغہ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۲۲

(۵۱) حجۃ اللہ البالغہ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۳۱

☆☆☆

بقیہ: ائمہ حدیث اور تقلید

(۷) حافظ ابن ابی العوام سعدی حنفی (۸) حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی (۹) حافظ ابو محمد حارثی حنفی (۱۰) حافظ حسین بن اسماعیل مالکی (۱۱) حافظ عبد الباقی حنفی (۱۲) حافظ ابن البر بر مالکی (۱۳) حافظ ابو بکر رازی جصاص حنفی (۱۴) حافظ ابوالولید ارباقی مالکی (۱۵) حافظ ابو محمد سمرقندی حنفی (۱۶) حافظ عبد الغنی مقدسی حنبلی (۱۷) حافظ قطب الدین حلبی حنفی (۱۸) حافظ ابو الفرج بن الجوزی حنبلی (۱۹) حافظ علاء الدین ماردینی حنفی (۲۰) حافظ ابن قدامہ حنبلی (۲۱) حافظ جمال الدین زیلعی حنفی (۲۲) حافظ علاء الدین مغلطائی حنفی (۲۳) حافظ بدر الدین عینی حنفی

یہ وہ مشاہیر حفاظ ہیں جن کی حکومت پوری دنیائے علم وفن پر مسلم ہے اور تاریخی شہادت موجود ہے کہ سارے ائمہ مقلد تھے۔

مولانا کوثر امام قادری ☆

ائمہ حدیث اور تقلید

اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن عظیم پوری انسانیت کے لیے منارہ رشد وہدایت ہے، جس کی توضیح، تشریح، تفصیل وتفہیم کے لیے قادر مطلق نے اپنے پیارے رسول اللہ علیہ وسلم کو معلم کتاب وحکمت بنا کر مبعوث فرمایا، چونکہ آپ کی حیات مبارکہ کا ایک ایک لمحہ اس صحیفۂ بے مثال کی روشن تفسیر تھا، اس لیے آپ کے قول، فعل، تقریر، احوال سب کو اسلامی شریعت کا سرچشمہ تسلیم کیا گیا، اس طرح بنیادی طور پر دو چیزیں شریعت اسلامیہ کا ماخذ بن گئیں- ایک ''قرآن'' دوسری ''احادیث رسول'' اور جب شریعت نبویہ کو صبح قیامت تک کے لیے غیر متبدل شکل میں باقی رکھنا تھا تو اس کے بنیادی ماخذوں کی حفاظت بھی ضروری ٹھہری، لہٰذا تحفظ قرآن کو رب قدیر نے اپنے ذمۂ کرم کے حوالے کیا اور لوگوں کے دلوں میں اسے یاد رکھنے کا شوق پیدا کر دیا نتیجے میں ہر زمانے میں حفاظ قرآن کی خاصی تعداد دنیا میں موجود رہی اور یہ سلسلہ یوم آخر تک یونہی چلتا رہے گا- جبکہ دوسری طرف ایسے افراد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے جنھوں نے احادیث مشرفہ کو یکجا و یاد رکھنے کا بیڑا اٹھایا، دور دراز سفر کی صعوبتوں کو برداشت کیا- در در کی خاک چھانی اور احادیث کریمہ کا گراں نقدر ذخیرہ جمع فرما دیا-

جن لوگوں نے اس میدان کو سر کیا انہیں محدثین کا نام دیا جاتا ہے- ان میں بعض وہ ہیں جنھیں اس فن میں درجۂ امامت حاصل تھا، ان کے سینے عظیم لائبریری تھے، ان کی ذہانت وذکاوت اور قوت حافظہ قدرت الٰہیہ کا نادر کرشمہ تھا، حضرت امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں-

''امام احمد بن حنبل نے کہا میں نے مسند کو ساڑھے سات لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے- امام ابو زرعہ نے کہا: امام احمد کو دس لاکھ احادیث حفظ تھیں، یحییٰ بن معین نے کہا میں نے دس لاکھ احادیث اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں- امام بخاری نے کہا مجھے ایک لاکھ احادیث صحیحہ اور دو لاکھ احادیث غیر صحیحہ حفظ تھیں، امام مسلم نے کہا میں نے اپنی مسند صحیح کو ان تین لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے، جو میں نے خود سنی تھی، حاکم نے مدخل میں لکھا ہے کسی ایک حافظ حدیث کو پانچ لاکھ احادیث حفظ ہوتی تھیں اور ابو زرعہ کو سات لاکھ احادیث حفظ تھیں ان میں آثار صحابہ اور اقوال تابعین بھی شامل ہیں'' (تدریب الراوی جلد اول ۵۴)

جس زمانے میں احادیث نبی کو سینوں سے سینوں تک اور قلوب سے سفینوں تک منتقل کرنے کی دھوم مچی ہوئی تھی، حفظ حدیث، روایت حدیث، تخریج کی گہما گہمی تھی، ایک اور طبقہ نئی شان وجدید پہچان کے ساتھ پردہ وجود پر نمودار ہوا اور اس نے مروجہ طریقہ تعلیم یعنی حفظ متون و تحقیق رواۃ پر اکتفانہ کیا بلکہ حفظ متون کے ساتھ تفہیم حدیث کو بھی مرکز توجہ بنایا- استنباط مسائل کا دروازہ کھولا- اور جماعت فقہاء کے نام سے مشہور ہوا- اگرچہ بعض لوگوں نے اسے صاحب رائے اور اہل رائے جیسے ناموں سے موسوم کر کے اس کی وقعت گھٹانے کی سعی لاحاصل بھی کی-

یہاں یہ بات بھی گوشۂ ذہن میں محفوظ رہے کہ طبقۂ فقہاء کا وجود دراصل ایک بہت بڑی ضرورت کی تکمیل تھی، دور اول میں فیض نبوی کی برکت سے صحابہ کے اذہان منور ومجلی تھے اور صحابہ کے وجود سے تابعین کے قلوب مزکی ومطہر تھے اس لیے اس مبارک عہد میں محدثات کا وجود نہ ہو سکا لیکن جب یہ نادر ہستیاں یکے بعد دیگرے اٹھنے لگیں اور اسلامی سرحدوں میں وسعت پیدا ہوئی، اسلام حدود عرب سے نکل کر عجم تک کو اپنی آغوش میں لینے لگا- نئی نئی قومیں مسلمان ہوئیں، تو نت نئے مسائل پیدا ہونے لگے، خرافات کا دور آیا، عبادات میں قسم قسم کی غلطیاں اور معاملات میں جدید گوشے پیدا ہوئے تو ایسے ماحول میں ضرورت تھی ایک ایسے گروہ کی جس کا ذہن صرف حفظ متون ہی تک محدود نہ ہو بلکہ حفظ حدیث کے ساتھ تخریج مسائل کی بھی اہلیت سے سرفراز ہو-

جس طرح قرآن مجید کی آیات کو تجوید کے ساتھ یاد کر لینا ایک الگ چیز ہے اور اس کے مطالب ومفاہیم تک رسائی دوسری شئی ہے، اسی طرح احادیث رسول کو بھی بصحت حفظ کر لینا ایک الگ امر ہے اور اس کے مقاصد ومعانی کی تہہ تک پہنچ جانا علیحدہ چیز ہے-

☆Darul Uloom Quddusia, Parsoni Bazar, Mahraj Ganj (U.P)

ہاں! یہ بھی واضح رہے کہ تخریج حدیث وتعین مراتب حدیث کوئی بہت آسان کام نہیں بلکہ یہ بھی لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے، ایک محدث کو تین ایسے دشوار ترین مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جس کے تصور ہی سے آدمی لرز اٹھے، وہ مراحل کچھ اس طرح ہیں۔

پہلی منزل: ۔نقد رجال کہ ان کے مراتب ثقہ وصدوق وحفظ و ضبط اور ان کے بارے میں ائمہ شان کے اقوال و وجوہ طعن، مراتب توثیق ومواضع تقدیم جرح وتعدیل وحوامل طعن ومناشئ توثیق ومواضع تحامل وتساہل وتحقیق پر مطلع ہو۔ استخراج مرتبہ اتقان راوی بنقد روایات وضبط مخالفات واوہام وخطیات وغیرہ پر قادر ہو، ان کے اسامی والقاب وکنی وانساب وجوہ مختلفہ تعبیر رواۃ، اصحاب تدلیس شیوخ وتعین مبہمات، ومتفق ومفترق ومختلف ومؤتلف سے ماہر ہو۔

ان کے موالید و وفیات، وبلدان ورحلات، ولقاو سماعات و اساتذہ وتلامذہ وجوہ اداوتدلیس وتسویہ (محدثین) واختلاط وآخذین من قبل وآخذین من بعد وسامعین وحالین وغیرہا تمام امور ضروریہ کا حال اس پر ظاہر ہو۔ ان سب کے بعد صرف سند حدیث کی نسبت اتنا کہہ سکتا ہے کہ یہ حدیث صحیح یا حسن یا صالح یا ساقط یا باطل یا معضل یا مقطوع یا مرسل یا متصل ہے۔

دوسری منزل: ۔صحاح وسنن ومسانید وجوامع ومعاجیم واجزاء وغیرہا کتب احادیث میں اس کے طرق مختلفہ والفاظ متنوعہ پر نظر تام کرے کہ حدیث کے تواتر یا شہرت یا فردیت نسبیہ یا غرابت مطلقہ یا شذوذ یا نکارت واختلافات رفع و وقف وقطع و وصل ومزید فی متصل الاسانید واضطربات سند ومتن وغیرہا پر اطلاع پائے نیز اس جمع طرق و احاطہ الفاظ سے رفع ابہام و دفع اوہام وایضاح خفی واظہار مشکل و ابانت مجمل وتعیین محتمل ہاتھ آئے۔

تیسری منزل: ۔اب علل خفیہ وغوامض دقیقہ پر نظر کرے، جس پر صدہا سال سے کوئی قادر نہیں، اگر بعد احاطہ وجوہ اعلال تمام علل سے منزہ پائے تو یہ تین منزلیں طے کر کے صرف صحت حدیث بمعنی مصطلح اثر پر حکم لگا سکتا ہے۔

یہ تمام حفاظ حدیث واجلہ نقاد وناواصلان ذروہ شامخہ اجتہاد کی رسائی صرف اس منزل تک ہے'' (الفضل الموہبی ۱۳)

مذکورہ تینوں منازل کا تعلق متن حدیث وتحقیق رواۃ سے ہے نہ کہ تفہیم حدیث واستنباط مسائل سے۔ یہاں یہ شبہ نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ جنہوں نے ان مراحل کو طے کر لیا ان کے اندر ملکۂ اجتہاد بھی پیدا ہو گیا، وہ استخراج مسائل پر قادر اور فقہاء کے فکر وتدبر سے بے نیاز ہو گئے، کیونکہ تاریخ ان کے خلاف شہادت دیتی ہے۔

(۱) محمد بن یزید مستملی نے امام احمد بن حنبل سے ان کے استاذ شیخ عبدالرزاق صاحب مصنف کے متعلق پوچھا'' کیا ان کو تفقہ حاصل تھا تو اس کے جواب میں امام صاحب نے فرمایا کہ اصحاب حدیث (محدثین) میں تفقہ کم پایا جاتا ہے (طبقات الحنابلہ جلد اول، ص:۳۲۹)

(۲) امام اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ میں عراق میں احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین اور اپنے دوسرے اصحاب کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ ہم احادیث کا مذاکرہ کرتے تھے، کبھی ایک طریق سے کبھی دو طریق سے اور کبھی تین طریق سے اور ان کے درمیان یحییٰ بن معین بول پڑتے کہ فلاں طریق بھی تو ہے، میں کہتا کہ اس کی صحت پر کیا ہمارا اجماع نہیں ہو گیا؟ سب کہتے کہ بیشک۔ میں کہتا کہ اچھا اس حدیث کی مراد اور اس کی تفسیر بتاؤ اور اس سے کیا مسئلہ مستنبط ہوتا ہے؟ یہ سن کر سب خاموش ہو جاتے، صرف احمد بن حنبل بولتے (مناقب الامام احمد بن حنبل مصنفہ امام ابن جوزی ص:۶۳)

(۳) حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اختیار دیا، اس نے اپنے آپ کو اختیار کیا تو کیا مسئلہ ہو گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس کے متعلق اہل علم سے پوچھو۔ (الماٗثر شمارہ ۲ جلد ۵ ص:۴۶)

(۴) ایک صاحب علم کی بیوی کا انتقال ہوا، وہ یحییٰ بن معین اور ذواتی کے پاس آئے کہ ایک میت کو غسل دینے کے لیے بجز ایک حائضہ عورت کے اور کوئی نہیں ملی۔ (انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اتنے میں) امام احمد بن حنبل تشریف لائے، پوچھا کیا بات ہے؟ بتایا گیا کہ ایک حائضہ عورت کے سوا اور کوئی نہیں ہے، جو اسے غسل دے سکے، امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ آپ حضرات تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار نے فرمایا یا عائشہ نا ولنی الحمزۃ قالت انی حائض فقال ان حیضتک لیست فی یدک۔ اے عائشہ رومال دے دو انہوں نے عرض کیا، میں حیض سے ہوں، فرمایا حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حائضہ عورت اسے نہلا

سکتی ہے، اس پر وہ لوگ شرمندہ ہو گئے۔ (طبقات الحنابلہ اول ۱۳۱)

(۵) ایک علمی مجلس میں یحییٰ بن معین، زہیر بن حارث، خلف بن صالح اور دیگر اصحاب حدیث مذاکرہ کر رہے تھے، اسی درمیان ایک خاتون نے آ کر عرض کیا، حائضہ عورت میت کو غسل دے سکتی ہے؟ یہ سن کر وہ لوگ خاموش ہو گئے اور سوچنے لگے تو حضرت ابو ثور نے فرمایا ہاں! غسل دے سکتی ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سرکار اقدس کے زلف مبارک میں کنگھا کرتی تھیں۔ حالانکہ وہ حائضہ ہوتیں تو اس سے معلوم ہوا کہ جب حائضہ عورت زندہ کو چھو سکتی ہے تو وہ مردہ کو بدرجہ اولیٰ چھو سکتی ہے اور غسل دے سکتی ہے۔ یہ سن کر محدثین کہنے لگے کہ یہ حدیث ازفلاں ازفلاں مروی ہے، اس خاتون نے کہا اب تک تم لوگ کہاں تھے، جب انہوں نے بتا دیا تو اب روایت بیان کرنے لگے (ہدایۃ الموفقین الی الصراط المستقیم ص:۴۷)

(۶) حضرت سلیمان اعمش رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کچھ مسائل پوچھے گئے، اس وقت وہاں امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ موجود تھے، امام اعمش نے ان سے دریافت کیا، امام نے فوراً جواب دیا، امام اعمش نے کہا، آپ نے یہ جواب کہاں سے پیدا کیا، کہا ان حدیثوں سے جو میں نے خود آپ سے ہی سنی اور ان احادیث کو مع سند روایت فرما دیں۔ امام اعمش نے فرمایا:

حسبک ماحد ثتک به مائة یوم تحدثنی به فی سائة واحدة ما علمت انک تعمل بهذه الاحادیث یا معشر الفقها، انتم الاطباء ونحن الصیادلة وانت ایها الرجل اخذت بکلا الطرفین (الفضل الموهبی ص:۱۳)

”بس کیجیے جو حدیثیں میں نے سو دن میں آپ کو سنائیں آپ نے گھڑی بھر میں مجھ کو سنا دی ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ان حدیثوں پر یوں عمل کرتے ہیں: اے فقہ والو! تم طبیب ہو اور ہم محدث لوگ عطار ہیں یعنی دوائیں ہمارے پاس ہیں مگر ان کا طریق استعمال تم مجتہدین جانتے ہو۔ اے ابو حنیفہ تم نے تو فقہ و حدیث دونوں کنارے لے لیے“۔

چنانچہ اسی نکتہ کی طرف ذیل کی حدیث میں اشارہ فرمایا گیا:

نضر الله عبد اسمع مقالتی فحفظها و وعاها واداها فرب حامل فقه غیر فقیه ورب حامل فقه الی من هوافقه منه رواه احمد والترمذی ابو داؤد و ابن ماجه (مشکوۃ ص:۳۵)

اس بندے کو اللہ تروتازہ رکھے، جس نے میرے ارشاد کو سنا پھر یاد کیا، اور محفوظ رکھا اور دوسرے تک پہنچایا، کتنے فقہ کے حامل ہیں، کتنے فقہ کے حامل سے زیادہ فقیہ وہ ہے جس کو اس نے پہنچایا۔

اب لگے ہاتھوں چوتھی منزل کو بھی دیکھیں:

چوتھی منزل: -اس کے لیے واجب ہے کہ جمیع لغات عرب وفنون ادب وجوہ تخاطب وطرق تفاہم واقسام نظمہ وصنوف معنی وادراک علل وتنقیح مناط واستخراج جامع وعرفان مانع وموارد تعدیہ ومواضع قصر ودلائل حکم آیات واحادیث واقاویل صحابہ وائمہ فقہ قدیم وحدیث ومواقع تعارض واسباب ترجیح ومناہج توفیق ومدارج دلیل ومعارک تاویل ومسالک تخصیص ومناسک تقلید ومشارع قیود وشوارح مقصود وغیرہ ذالک پر اطلاع تام ووقوف عام ونظر غائر وذہن رفیع وبصیرت منیع رکھتا ہو (الفضل الموہبی ص:۱۳)

ائمہ حدیث وہ ہیں جنہوں نے اول کی تین منزلوں کو حاصل کیا جبکہ فقیہ مجتہد وہ ہوئے جنہوں نے چاروں منازل کو بحسن وخوبی طے کیا، بایں سبب فقیہ، ائمہ حدیث پر فائق ہو گئے اور ائمہ حدیث ان کے اجتہاد سے بے نیاز نہ ہو سکے لاکھوں حدیثیں یاد ہونے کے باوجود عملی زندگی ان ہی فقہا مجتہدین کے اقوال، فکر وتدبر پر بھروسہ کیا، ان کے استخراج کردہ مسائل ہی کو عملی جامہ پہنانے میں دین ودنیا کی بھلائی محسوس کی گویا کہ انہوں نے محدث ہونے کے باوجود کسی نہ کسی فقیہ کی تقلید ضروری سمجھا۔

تقلید کی تعریف: -علامہ سید شریف جرجانی فرماتے ہیں: التقلید عبارة عن قبول قول الغیر بلا حجة ولا دلیل (التعریفات ص:۵۷) حجت ودلیل کے بغیر کسی کی بات مان لینا تقلید ہے۔

حاشیہ حسامی میں ہے:

التقلید اتباع الرجل غیره فیما سمعه یقول اوفی فعله علی زعم انه محقق بلا نظر فی الدلیل۔ ”کسی شخص کا اپنے غیر کی اطاعت کرنا اس میں جو اس کو کہتے ہوئے سن لے یا کرتے ہوئے دیکھ لے یہ سمجھ کر کہ وہ اہل تحقیق میں سے ہے، بغیر دلیل میں نظر کیے ہوئے“ (حاشیہ حسامی باب متابعت رسول ص:۸۶)

تقلید قرآن وسنت میں: -واذاجا امر من الامن اوالخوف اذا عوابه ولو ردوه الی الرسول والی اولی

الامر منهم لعلمه الذین یستبنطونه منهم (النساء ص: ۸۳) اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا معاملہ آتا ہے تو اسے مشہور کردیتے ہیں اگر پیغمبر خدا یا اپنے سے اولی الامر کے پاس لے جاتے تو جوان میں اہل استنباط ہیں اسے اچھی طرح جان لیتے۔

آیت مذکورہ میں اہل استنباط کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو اہل استنباط بتائیں کہ اس پر عمل کرنا ہوگا تو ان کی باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے اور یہی تقلید ہے۔

عن ابی حذیفة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اقتد وابالذین من بعدی ابی بکرو عمر۔ (ترمذی جلد دوم ص: ۳۰۷) حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان دونوں کی اقتدا کرو جو میرے بعد ہوں، یعنی ابوبکر و عمر کی۔

تقلید کے وجوب پر متعدد آیات واحادیث پیش کی جاسکتی ہیں، سردست اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ لیکن دو غیر مقلد عالموں کا قول بھی نقل کردوں تو مناسب موقع ہوگا۔

غیر مقلد عالم نواب وحید الزماں حیدرآبادی فرماتے ہیں:

لا بد للعامی من تقلید مجتهد اومفت (نزل الابرار جلد اول ص: ۷) عوام کے لیے کسی مجتہد یا مفتی کی تقلید ضروری ہے۔

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی لکھتے ہیں:

ووجب علی العامی تقلیده والاخذ بفتواه (لقطة العجلان ص: ۱۳۷ ماخوذ مسلک غیر مقلدین ص: ۲۲) عوام پر واجب ہے کہ مجتہد کی تقلید کریں اور ان کے فتوی پر عمل کریں۔

اب ہم تاریخی حقائق پیش کریں گے تاکہ معلوم ہوجائے کہ ائمہ حدیث نے کسی فقیہ کی تقلید کی ہے یا نہیں شاید اس سے ان لوگوں کو اپنے فکر وخیال پر نظر ثانی کا موقع مل سکے، جن کا عقیدہ ہے کہ تقلید ایک باطل چیز ہے، جسے اکابر علماء وائمہ حدیث نے مخدوش تصور کیا ہے۔

(۱) امام بخاری: ۔حضرت امام قسطلانی تاج الدین سبکی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وقد ذکره ابو عاصم فی طبقات اصحابنا الشافعية۔ (ارشاد الساری اول ص: ۳۶) ''ابوعاصم نے بخاری کو ہمارے طبقات شافعیہ میں بیان کیا ہے۔''

اور تاج الدین سبکی لکھتے ہیں:

وسمع بمكة عن الحميدی وعليه تفقه عن الشافعی۔ (طبقات شافعیہ کبری دوم ص: ۳)

یعنی امام بخاری نے مکہ میں حمیدی سے سماع کیا اور ان ہی سے فقہ شافعی پڑھی۔

نواب صدیق حسن خاں غیر مقلد بھوپالی لکھتے ہیں:

ولنذكر بعد ذالك نبذاً من ائمة الشافعية ليكون الكتاب كامل الطرفين حائز الشرفين و هؤلاء صنفان احد هما من تشرف بصحبته الامام الشافعی الاخر من تلاهم من الائمة اما الاول فمنهم احمد الخلال ابو جعفر البغدادی و اما الصنف الثانی فمنهم محمد بن ادريس ابو حاتم رازی، محمد بن اسماعيل و محمد بن علی الحكيم الترمذی۔ (ابجد العلوم ص: ۸۱۱)

اور ہمیں چاہیے کہ اب کچھ ائمہ شافعیہ کا تذکرہ کریں تاکہ ہماری کتب حنفی اور شافعی دونوں کتابوں کی جامع ہوجائے اور ائمہ شافعیہ دو قسموں پر ہیں ایک وہ جو امام شافعی کی صحبت سے مشرف ہوئے جیسے احمد خلال، اور ابوجعفر بغدادی دوسری قسم کے ائمہ شافعیہ یہ ہیں محمد بن ادریس رازی محمد بن اسماعیل بخاری اور حکیم ترمذی۔

(۲) امام مسلم: ۔حضرت امام مسلم صاحب الجامع الصحیح بھی مقلد تھے چنانچہ مولانا محمد حنیف گنگوہی لکھتے ہیں۔

''نواب صدیق حسن خاں غیر مقلد نے انہیں شافعی شمار کیا ہے، صاحب کشف فرماتے ہیں الجامع الصحیح الامام المسلم الشافعی'' (احوال المصنفین ص: ۱۱۸)

(۳) امام ابوداؤد: ۔صاحب سنن ابی داؤد کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں:

تاریخ ابن خلکان میں مذکور ہے کہ شیخ ابواسحاق شیرازی نے ان کو طبقات الفقہاء میں امام احمد بن حنبل کے اصحاب میں شمار کیا ہے، حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے بھی علامہ ابن تیمیہ کے حوالے سے ان کو حنبلی فرمایا ہے (مرجع سابق ص: ۱۲۶)

(۴) امام ابن ماجہ: ۔مولانا محمد حنیف لکھتے ہیں

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک امام احمد بن

حنبل کے مسلک کی طرف میلان تھا (مرجع سابق ص:۱۴۰)

(۵) امام نسائی: ۔حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کے نزدیک آپ شافعی المذہب تھے جیسا کہ آپ کے مناسک سے پتہ چلتا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں نے بھی شاہ صاحب کی تائید کرتے ہوئے امام نسائی کو شوافع میں شمار کیا ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک بھی ان کا انتساب مسلک شافعی کی جانب مناسب ہے (مرجع سابق ص:۱۵۴)

(۶) امام طحاوی: ۔حضرت امام طحاوی پرانی راہ مسلک شافعی کو خیر آباد کہتے ہوئے نئی راہ مسلک حنفی پر گامزن ہو گئے (مرجع سابق ص:۱۶۲)

(۷) صاحب مصابیح: ۔محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی صاحب مصابیح کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں: "آپ اپنے زمانے کے مشہور محدث ومفسر اور بلند پایہ قراء میں سے ہیں ،فقہ میں قاضی حسین بن محمد کے شاگرد ہیں اور صاحب تعلیقہ اور اجل شوافع میں سے ہیں" (مرجع سابق ص:۱۷۰)

ابو عمرو تقی الدین ابن صلاح شہرزوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ان کے والد صلاح الدین بڑے جلیل القدر عالم اور نہایت متبحر فقیہ تھے ،اس لیے ابن صلاح نے ابتداء میں اپنے والد محترم سے علم فقہ حاصل کیا اور تھوڑی ہی مدت میں علم فقہ میں ایسا رسوخ حاصل کرلیا کہ فقہ شافعی کی کتاب المہذب کا درس دینے اور تکرار کرنے لگے" (مرجع سابق ص:۱۷۳)

(۹) صاحب مسند حمیدی: ۔ابو بکر عبد اللہ بن زبیر حمیدی صاحب مسند حمیدی امام بخاری کے شیوخ میں سے ہیں اور سفیان بن عیینہ کے شاگرد ہیں، کبار اصحاب شافعی میں شمار ہوتے ہیں۲ (قرۃ العیون:۱۷)

(۱۰) صاحب صحیح ابن عوانہ: ۔صاحب صحیح ابن عوانہ شافعی المذہب تھے ، اسفرائین میں شافعی مذہب کی ابتداء ان ہی سے ہوئی (قرۃ العیون ص:۴۷)

(۱۱) امام دار قطنی: ۔ابو الحسن علی بن عمر دار قطنی شافعی المذہب تھے (مرجع سابق ص:۴۷)

(۱۲) صاحب سنن بیہقی: ۔آپ بھی شافعی المذہب تھے، ان کی تصنیف معرفۃ الشافعی بالسنن والا ثار سے واضح ہے، شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں کہ امام الحرمین نے احمد بیہقی کے بارے میں فرمایا کہ دنیا میں بیہقی کے سوا اور کسی کا امام شافعی پر احسان اتنا نہیں جتنا کہ ان کا ہے۔مرجع سابق ص:۸۵)

(۱۳) وکیع بن الجراح: ۔وکیع بن جراح کی حیثیت ومقام فن حدیث کی دنیا میں محتاج بیان نہیں ، فوائد بہیہ میں ہے۔

عن ابن معین مارأیت افضل من وکیع قیل ولا ابن المبارک قال قد کان لا بن المبارک فضل ولکن ما رأیت افضل من وکیع کان یستقبل القبلہ و یحفظ حدیثہ و یقوم اللیل ویفتی بقول ابی حنیفہ (الفوائد البھیہ فی تراجم الحنفیہ ص: ۹۲)

امام بن معین نے کہا میں نے وکیع سے افضل کوئی شخص نہیں دیکھا، کسی نے پوچھا ابن مبارک بھی نہیں؟ جواب دیا، ابن مبارک کی اپنی فضیلت ہے لیکن میں نے وکیع سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں دیکھا وہ ہمیشہ قبلہ رخ بیٹھتے تھے، احادیث یاد کرتے تھے، قائم اللیل تھے، ہمیشہ امام ابوحنیفہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔

(۱۴) یحییٰ بن سعید القطان: ۔یہ فن جرح وتعدیل کے امام اور زبردست محدث ہیں مگر یہ بھی امام اعظم کے مطابق فتویٰ دیتے تھے، تذکرۃ الحفاظ میں ہے:

وکان یحییٰ بن سعید القطان یفتی بقول ابی حنیفہ (مرجع سابق ص:۹۲) (تذکرۃ الحفاظ اول ص:۳۰۷)

"یحییٰ بن سعید القطان بھی امام اعظم کے قول پر فتویٰ دیتے تھے"

اس طرح سیرت وسوانح کی کتابوں میں مطالعہ کیا جائے تو کثیر محدثین وحفاظ حدیث کسی نہ کسی امام کی تقلید کرتے نظر آئیں گے، کوئی فقہ حنفی سے وابستہ ہے تو کوئی مسلک شافعی سے کوئی حنبلی مذہب سے کوئی مالکی فقہ کا مقلد ہے۔ یہاں اجمالاً چند ائمہ حدیث کے اسماء درج کرنے پر اکتفا کروں گا۔

مشاہیر حفاظ حدیث: ۔(۱) حافظ ابو بشر دولابی حنفی (۲) حافظ عز یز الدین بن سلام شافعی (۳) حافظ اسحٰق بن راہویہ حنفی (۴) حافظ ابن دقیق العید شافعی (۵) حافظ ابو جعفر طحاوی حنفی (۶) حافظ شمس الدین شافعی

بقیہ: صفحہ ۱۸۹ر پر ملاحظہ کریں

مولانا رفعت رضا نوری ☆

علمائے تفسیر اور تقلید

تاریخی طور پر تقلید کا باضابطہ آغاز ٹھیک اسی زمانے میں ہوا جس میں مذاہب فقہ کی تدوین ہوئی اور اکابر فقہا کے اتباع سے اس کا ظہور ہوا، کیوں کہ ہر شخص کے اندر یہ اہلیت وقابلیت نہیں تھی کہ مسائل شرعیہ اور احکام دینیہ کو اس کے اصل ماخذ سے استنباط کرسکے۔ اس لیے عام لوگوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ اکابر فقہا اور ائمہ اجتھاد کی پیروی کریں۔ تیسری صدی میں اس میں مزید وسعت آئی اور وقت کے بڑے بڑے نامور اصحاب علم وفضل نے ائمہ کی تقلید کی۔ جب کہ ان میں بعض علمائے راسخین تھے جو خود قرآن وحدیث پر گہری بصیرت اور دقیق نظر رکھتے تھے اور مذاہب اربعہ کے دلائل سے بھی واقف تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ کس دلیل کی بنا پر ایک امام کا قول دوسرے امام کے قول پر راجح ہے گویا وہ مقلد محض نہیں تھے۔ مگر پھر بھی احکام شرعیہ میں امام کی رائے کی موافقت کرتے تھے۔ اس سے ائمہ کے مذاہب کو زیادہ تقویت ملی کہ بڑے بڑے علمائے راسخین نے ان ائمہ کی اصابت رائے اور فکر کی پختگی پر مہر تصدیق ثبت کی اور دوسری طرف علمائے راسخین کی بھی عظمت بڑھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہمہ دانی کے باوجود مقلد ہی گردانا۔ تیسری صدی کے اواخر میں اس بات پر اجماع منعقد ہوگیا کہ عام آدمی کے لیے ائمہ اربعہ کی تقلید کرنا واجب ہے کیوں کہ واقعات سے ثابت ہوگیا کہ قرون اولی کے فقہا میں جو دقت نظر، باریک بینی، علم میں وسعت، گہرائی اور گیرائی پائی جاتی تھی وہ بعد کے فقہا میں نہیں پائی اور احکام شرعیہ کو اصل ماخذ سے بذات خود استنباط کرنے کا ملکہ اور مہارت اور ایسی فقہی بصیرت جس میں فقیہہ استنباط اور اجتھاد کے اصول وضع کرتا ہے متاخریں کے حصے میں نہیں آئی تو اہل علم اس پر متفق ہوگئے کہ اب ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کرنا ضروری ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش کرنا فائدے سے خالی نہیں ہوگا کہ ہر چند کہ ”ظاہریہ (سلفیہ، غیر مقلدین یا اہل حدیث) اپنے آپ کو تقلید سے آزاد اور اصحاب حجت کہتے ہیں لیکن نواب صدیق حسن بھوپالی نے لکھا ہے کہ داؤد بن علی ظاہری فرقہ ظاہریہ کا امام ہے۔ لہذا وہ بھی ان کی آرا کے مقلد ہیں۔ شیعہ حضرات بھی تقلید کے قائل ہیں لیکن وہ زندہ مجتہد کی تقلید کے قائل ہیں، حاصل یہ کہ زندہ لوگوں میں کوئی ایسا طبقہ نہیں جو تقلید سے آزاد ہے“۔

(بحوالہ شرح صحیح مسلم از مولانا غلام رسول سعیدی ۳/۳۳۰)

جس زمانے میں مذاہب فقہ کی تدوین ہوئی اسی دور میں تفسیر قرآن بھی مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے اپنے دور تدوین میں داخل ہوچکی تھی، اسی دور میں جہاں نامور فقہا پیدا ہوئے وہیں مفسرین نے بھی قرآن کریم سے فقہی احکام کا استنباط کرنے کے لیے فقہی اصول و ضوابط کو تفسیر قرآن کے ساتھ ملا دیا۔ اس دور میں اہل سنت کے مفسرین نے علوم عقلیہ، علوم ادبیہ، علوم کلامیہ اور علوم فقہیہ سے متعلق متعدد تفسریں تحریر کیں۔ تاریخی طور پر اس عصر تدوین میں تفسیر بالماثور کی کتابیں زیادہ دستیاب ہیں کچھ مفسرین نے صرف فقہی فروعات اور اس کے دلائل پر مشتمل تفسیریں بھی مرتب کیں مثلاً ابوبکر جصاص حنفی کچھ مفسرین نے تاریخی واقعات واخبار پر مشتمل تفسیریں لکھیں مثلاً امام ثعلبی اور امام خازن وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ جس امام کو جس فن سے یا مذہب ومسلک سے زیادہ دل چسپی اور اس پر مہارت تھی تفسیر قرآن میں اسی علم سے متعلق نکتہ آفرینی کرنے کی سرتوڑ کوشش کی گئی مگر تمام مفسرین میں یہ بات قدرے مشترک رہی کہ انہوں نے اپنے دلچسپ فن کے علاوہ دوسرے فنون کو تفسیر میں جگہ دی ہے۔ اتنی بات عرض کرنے کے بعد عصر تدوین سے لے دور حاضر تک کہ مفسرین کے طبقات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو تاریخی ماخذ ومراجع سے پتہ چلتا ہے کہ سوائے ابن جریر طبری کے علاوہ اہل سنت سواد اعظم سے تعلق رکھنے والے تمام مفسرین ائمہ اربعہ کے پیروکار تھے۔ کسی نے اپنے آپ کو تقلید سے آزاد نہیں گردانہ

ذیل میں علمائے تفسیر کی ایک مختصر فہرست درج کی جارہی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ تقلید شخصی پر امت کے اجماع میں مفسرین کا عظیم گروہ بھی شامل تھا۔ اس فہرست میں انہیں چند مفسرین کے اسمائے گرامی درج ہیں، جنہوں نے تفسیر میں نمایاں خدمات انجام دی

☆ G-9/1, Muradi Road, Batla House, Okhla New Delhi

ہیں۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی رہے کہ مندرجہ ذیل مفسرین کے اسما کے ساتھ حنبلی، شافعی، مالکی اور حنفی کی صراحت تراجم وطبقات اور کتب تاریخ وسیر کی ان کتب میں موجود ہے جو اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیات کی سوانح میں مستند ماخذ ومراجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس سے ہمیں یہ ثبوت ملتا ہے کہ وہ عملی طور پر مقلد تھے، کیوں کہ اگر وہ کسی امام کے مقلد نہ ہوتے تو تاریخی ماخذ میں یہ صراحت نہیں ملتی۔ فہرست درج ذیل ہے:-

اسمائے علمائے تفاسیر وحوالہ جات

۱- ابواللیث نصر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی حنفی (م ۳۷۵ھ)۔ طبقات المفسرین از داوٗدی۔ کشف الظنون

۲- ابواسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی نیساپوری شافعی (م ۴۲۷ھ)۔ معجم الادبا۔ وفیات الاعیان۔ شذرات الذہب

۳- ابومحمد حسین بن مسعود الفراء بغوی شافعی (م ۵۱۰ھ)۔ طبقات المفسرین از سیوطی۔ وفیات الاعیان لابن خلکان۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی۔

۴- ابومحمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ اندلسی غرناطی مالکی (م ۵۴۲ھ)۔ الدیباج المذہب لابن فرحون۔ الاعلام للزرکلی۔ بغیۃ الوعاۃ لسیوطی۔

۵- عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بصری شافعی (م ۷۷۴ھ) ۔ طبقات المفسرین از داوٗدی۔ الدرر الکامنۃ۔ شذرات الذہب

۶- ابوزید عبدالرحمٰن بن محمد بن مخلوف ثعالبی جزائری مالکی (م ۸۷۵ھ)۔ الضوء اللامع۔ نیل الابتہاج۔

۷- جلال الدین ابوالفضل عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی شافعی (م ۹۱۱ھ) شذرات الذہب۔ الاعلام للزرکلی۔

۸- ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ بن عمر بن محمد بیضاوی (م ۶۹۱ھ یا ۶۸۵ھ ۱۲۸۶ء)۔ شذرات الذہب۔ طبقات المفسرین طبقات الشافعیہ۔ کشف الظنون۔

۹- ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی حنفی (م ۷۰۱ھ)۔ الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ۔ الفوائد البھیۃ فی تراجم الحنفیۃ۔ الاعلام للزرکلی

۱۰- علاء الدین ابوالحسن علی بن محمد بن ابراہیم خازن شافعی (م ۷۴۱ھ) الدرر الکامنۃ، طبقات المفسرین از داوٗدی، شذرات الذہب۔

۱۱- شہاب الدین ابوالثنا سید محمود آفندی شافعی آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) الاعلام للزرکلی۔ التفسیر والمفسرون از محمد حسین ذہبی۔

۱۲- محمد بن محمد بن مصطفیٰ ابوالسعود دعمادی حنفی (م ۹۸۲ھ) الفوائد البھیۃ، العقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم۔

۱۳- ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی (م ۳۷۰ھ)۔ الجواہر المضیۃ، الفوائد البھیۃ۔ شرح الازہار۔

۱۴- ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محمد معافری اشبیلی مالکی (م ۵۴۳ھ) الدیباج المذہب۔ التفسیر والمفسرون۔ الاعلام للزرکلی

۱۵- ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری قرطبی اندلسی مالکی (م ۶۷۱ھ ۱۲۷۳ء) ۔ الدیباج المذہب۔ مقدمہ احکام القرآن۔ الاعلام للزرکلی۔

۱۶- ابوالحسن علی بن محمد بن علی طبری شافعی (م ۵۰۴ھ)۔ البدایۃ والنھایۃ لابن کثیر۔ وفیات الاعیان لابن خلکان۔

۱۷- قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی (م ۱۲۲۵ھ۔ ۱۸۱۰ء)۔ تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی۔ الاعلام از عبدالحی لکھنوی۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، حیدرآباد۔

۱۸- احمد بن ابوسعید معروف بہ ملاجیون حنفی۔ تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی الاعلام از عبدالحی لکھنوی۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، حیدرآباد۔

۱۹- شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ دہلوی حنفی۔ تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی۔ الاعلام از عبدالحی لکھنوی۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، حیدرآباد۔

ہم نے اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان مشاہیر مفسرین کا ذکر کیا ہے جو اپنے اپنے وقت میں مسلمہ حیثیت کے مالک تھے اور جن کی ثقاہت آج تک اہل علم کے نزدیک مسلم ہے، اگر عالم اسلام کے تمام ائمۂ مفسرین کے اسما جمع کیے جائیں تو ضخیم دفتر بن جائے گا جس کا یہ محل نہیں۔

تقلید کے سلسلے میں علمائے تفسیر کا نظریہ:- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فاسئلو اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون" (النحل/۴۳) ''جس چیز کو تم نہیں جانتے ہو جاننے والوں سے اس کی دریافت کرو'' اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام جو مسائل شرعیہ اور احکام دینیہ کو بذات خود معلوم نہیں کر سکتے ان پر ضروری ہے کہ اہل علم یعنی اہل اجتہاد سے دریافت کریں کیوں کہ ائمہ مجتہدین ہی براہ راست تمام احکام شرعیہ اصل مرجع سے حاصل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور یہی تقلید ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی، علامہ جلال الدین محلی اور علامہ

آلوسی کا نظریہ:- علامہ سید محمود آلوسی اس آیت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں- علامہ جلال الدین سیوطی نے الاکلیل میں اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عام آدمی کے لیے مسائل فرعیہ میں مجتہد کی تقلید ضروری ہے- آلوسی کے نزدیک فروع کی قید محل نظر ہے چنانچہ اس میں عموم پیدا کرنے کے لیے اگلی سطر میں علامہ جلال الدین محلی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غیر مجتہد خواہ وہ عام آدمی یا نہ ہو مندرجہ بالا آیت کے سبب مجتہد کی تقلید ضروری ہے خواہ مجتہد باحیات ہوں یا انتقال کر گئے ہوں۔ یونہی دریافت شدہ مسائل اعتقادی ہوں یا نہ ہوں'' خود علامہ آلوسی کا بھی یہی نظریہ ہے کیوں کہ اس بحث کی آخری سطر میں ان کی فیصلہ کن بات شاہد عدل ہے- (روح المعانی از آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) ۷/ ۳۸۷- دار الکتب العلمیۃ بیروت لبنان طبع دوم ۲۰۰۵ء ۱۴۲۶ھ)

ایک بے غبار عبارت کی غلط تشریح:- ہندوستان کے غالی غیر مقلدین حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی صاحب تفسیر فتح العزیز کی ایک تفسیری تحریر جو آیت کریم ''فلا تجعلوا للہ انداداً و انتم تعلمون '' کے ذیل میں درج ہے اس کو تقلید کے خلاف بڑے طمطراق کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور سادہ لوح عوام کی آنکھوں میں بڑی چابک دستی سے دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں- جب کہ شاہ صاحب کی تحریر سے غیر مقلدین کو ذرا بھی فائدہ نہیں مل رہا ہے بلکہ وہ تحریر آج تک خود انہیں کے گلے کی ہڈی بنی ہوئی ہے- دراصل اپنی تحریر میں شاہ صاحب نے یہ فکر دینے کی کوشش کی ہے کہ اطاعت بالاستقلال اللہ ہی کو زیبا ہے۔ جو کسی دوسرے کو احکام کی تبلیغ میں اطاعت بالاستقلال کے لائق گردانے اور اللہ کی مخالفت کے باوجود غیر اللہ کی تقلید کا پٹہ اپنی گردن میں ڈالے رہے (جیسا کہ یہودی عوام علمائے یہود کی تقلید کرتے تھے) تو یہ بھی اتخاذ انداد (خدا بنانے) کی قبیل سے ہے (جو ناجائز و حرام ہے) بلاشبہ ایسی اطاعت کفر کی دہلیز تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ صرف شاہ صاحب ہی نہیں بلکہ امت کا سواد اعظم کہہ رہا ہے کیوں کہ اس بات پر ائمہ امت کا اجماع ہے کہ اصل اطاعت و اتباع اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور امام صرف مبلغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اہل علم پر واجب ہے کہ جب انہیں کوئی آیت یا کوئی حدیث سند صحیح سے مل جائے جو ان کے کسی امام کے قول کے خلاف تو امام کے قول کو چھوڑ کر قرآن و حدیث پر عمل کریں۔ لیکن ایسی صورت میں وہ خارق تقلید نہیں ہوگا کیوں کہ یہ بات صحیح سند سے ثابت ہے کہ جب حدیث صحیح مل جائے تو وہی ائمہ کا مذہب ہے- امام ابن عبد البر اور امام شعرانی نے ائمہ اربعہ سے روایت کیا ہے کہ جب حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے (رد المختار علی الدر المختار از ابن عابدین شامی ۱/ ۶۳)

اب اس تناظر میں شاہ کی تحریر پڑھیے اور یہ فیصلہ کیجیے کہ ''سلفیوں کو'' اس سے کون سی حمایت مل رہی ہے؟

لکھتے ہیں: ''دریں جابا ید دانست چنانچه عبادت غیر خدا شرک و کفر است. اطاعت غیر او تعالی نیز بالا ستقلال کفر است و معنی اطاعت غیر بالاستقلال آنست که اورا در مبلغ احکام نادانسته ربقۂ تقلید او در گردن اندازد. واورا لازم شمارد و باوجود ظهور مخالفت او باحکم او تعالی است- از اتباع بر ندارد و ایں هم نوع است از اتخاذ انداد که در آیت کریمه اتخذو احبارهم اربا بامن دون الله و المسیح ابن مریم نکوئش آن فرموده اند (تفسیر عزیزی ص- ۱۲۸ مطبوعہ دہلی)

شاہ صاحب جس ٹھوس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں ہم نے مندرجہ بالا سطور میں عرض کر دیا ہے کہ یہ امت کا اجماعی موقف ہے نیز اکثر ائمہ تفسیر نے اسی مفہوم کو قدرے اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ درحقیقت اس مسئلے کا مسلۂ تقلید اسلامی سے کوئی تعلق نہیں، دونوں الگ نوعیت کے مسئلے ہیں۔ تقلید اسلامی میں کوئی بھی مقلد خدا اور رسول کی مخالفت کر کے امام کے قول کی اطاعت نہیں کرتا جب کہ مذکورہ آیت کی روشنی میں یہود و نصاریٰ کا عالم اس سے مکمل مختلف تھا اب جہاں تک شاہ صاحب کا تعلق ہے ان کے سلسلے میں تراجم و سوانح کی ساری کتابیں ان کے حنفی مقلد ہونے کی شہادت فراہم کرتی ہیں۔ غیر مقلدین کی محض ان کی ایک عبارت کی ناجائز تشریح کے آگے شاہ صاحب کے سلسلے میں کیا تمام تاریخی ماخذ کو بھینٹ چڑھا دیا جائے؟......ع

ہم نے ہر شخص کا معیار نظر دیکھ لیا

قاضی بیضاوی کا نظریہ:- قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''فلولا نفرا من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون (توبه

/۱۲۲) ''ہر گروہ میں سے ایک جماعت علم دین حاصل کرنے کے لیے کیوں نہ نکلی تاکہ جب واپس آئے تو گروہ کو احکام پہنچائے تاکہ وہ (گناہوں سے) بچیں'' امام بیضاوی لکھتے ہیں ''اس آیت سے یہ دلیل فراہم ہوتی ہے کہ تفقہ اور تذکیر فروض کفایہ سے ہیں البتہ اس چیز کو حاصل کرنے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ صاحب طلب خود سلامت رہے اور دوسرے کو سلامتی کی راہ دکھائے۔لوگوں پر (علمی) بڑائی اور ممالک پر قبضہ جمانا ان کا مقصد نہیں ہونا چاہیے

(تفسیر بیضاوی ۱/۴۲۴-دار الکتب العلمیۃ طبع اول ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء)

ملا احمد جیون امیٹھوی کا نظریہ:- برصغیر کے مستند اور نامور مفسر ملا احمد جیون لکھتے ہیں (آیت کا ایک معنی دینی علم میں تفقہ حاصل کرنا ہے اور) تفقہ سے مراد اجتہاد ہے اور یہ بھی فرض کفایہ ہے۔ ہاں مسائل کا علم فرض عین ہے۔ تفقہ اور اجتہاد فرض عین نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة'' واللہ اعلم بالصواب۔ (تفسیرات احمدیہ فی بیان آیات الشرعیہ ص۔ ۵۶۵۔ ناشر قرآن کمپنی لمیٹیڈ، لاہور، پاکستان)

دونوں مفسر کے بقول بعض مسلمان تفقہ حاصل کریں اور باقی مسلمانوں کا ان کی اقوال پر عمل کرنا ضروری ہے کیوں کہ عمل ہی پر گناہوں سے بچنا موقوف ہے اور اصطلاح فقہا میں اسی کو تقلید کہتے ہیں۔وضاحت کے لیے ذیل کی تحریر پڑھیے:

محقق عصر مولانا غلام رسول سعیدی کا نظریہ: -صاحب تفسیر تبیان القرآن سعیدی صاحب اپنی مشہور کتاب ''شرح صحیح مسلم'' میں اس آیت کو تقلید کی دلیل میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف بعض مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ علم حاصل کرنے کے بعد اپنی پوری قوم کو احکام پہنچائیں یعنی صرف بعض مسلمان تفقہ حاصل کریں اور باقی تمام مسلمان ان کے اقوال پر عمل کریں۔اس آیت میں فقہا کے اقوال کو واجب العمل قرار دیا ہے کیوں کہ اس پر گناہوں سے بچنا موقوف ہے اور یہی تقلید ہے۔ (شرح صحیح مسلم از مولانا غلام رسول سعیدی ۳/۳۳۶۔ ناشر المجمع الامصباحی، مبارک پور، اعظم گڑھ۔یو۔پی۔)

علامہ ابن العربی مالکی کا قول:- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول (النساء ۴/۵۹) ابن العربی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس سے امرا اور علما دونوں مراد ہیں۔امرا اس لئے کہ اصل امر انہیں کی طرف سے ہے اور وہی صاحب اختیار ہیں اور علما اس لئے مراد ہیں کہ لوگوں پر (نامعلوم مسائل کی) دریافت اور علما کے فتاوے پر عمل واجب ہے۔ جب کہ علما پر ان مسائل کا جواب دینا ضروری ہے۔(احکام القرآن از ابن العربی اندلسی ۱/۱۸۹ امطبۃ السعادۃ بجوار محافظۃ مصر طبع دوم ۱۳۳۱ھ)۔

تقلید میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ عام آدمی مسائل فرعیہ دریافت کرتا ہے اور مجتہد احکام کا استنباط کر کے ان کا جواب دیتا ہے۔یاد دور حاضر کی فقہی کتابوں میں جو مسائل متخرج شدہ ہیں اور ان کے سلسلے میں ائمہ کا جو رجحان ہے عام آدمی مفتیان کرام سے مسائل دریافت کرتا ہے مفتیان کرام فتاوی نقل کر کے جواب دیتے ہیں اور یہی ائمہ کی تقلید ہے۔

علامہ عبد الحق حقانی دہلوی کی چشم کشا تحریر:-صاحب تفسیر حقانی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ''جو احکام کہ کتاب وسنت میں بصراحت مذکور ہیں ان میں تو ان علما کا قول عامیوں پر ماننا فرض واجب ہے۔اس میں شاید کسی کو اختلاف نہ ہو۔ رہے وہ احکام و مسائل کہ جو بصراحت کتاب وسنت میں نہ پائے جائیں بلکہ بہ حکم ''تفصیلا لکل شئی'' ۔بطور اسرار مودوعہ پردۂ الفاظ میں مستور ہوں اور علما میں سے جو خواص و مستنبط ہیں جیسا کہ اگلی آیت میں ہے ''وردوہ الی الرسول والی اولی الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه'' جن کو مجتہد کہتے ہیں وہ ان مسائل کو استنباط اور اجتہاد کر کے نصوص سے ظاہر کرتے ہیں۔آیا ان مسائل میں بھی پیروی غیر مجتہد لوگوں کو چاہیے یا نہیں؟ (اور اس پیروی کو عرف فقہا میں تقلید کہتے ہیں)۔اہل اسلام میں جمہور سلف سے خلف تک ان مسائل میں بھی اتباع کرنا واجب اور ضروری کہتے ہیں۔(اس کے بعد علامہ حقانی نے اس کے وجوہات بیان کیے ہیں)۔ اخیر میں لکھتے ہیں: کہ یہ اعتراض کی چار امام ابوحنیفہ، مالک، احمد، شافعی کو معین کرنا اور آئندہ اجتہاد کا دروازہ بند کرنا اور انہیں کی تقلید پر انحصار کرنا اور حنفی، شافعی کہلانا بدعت وشرک ہے سو یہ محض تعصب ہے۔(تفسیر حقانی ۳/۱۹۹/۲۰۰ دار الاشاعت تفسیر حقانی، دہلی)

تقلید کے سلسلے میں اختصار کے پیش نظر ہم نے صرف چند مفسرین کا نظریہ پیش کیا ہے۔جس میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ کچھ آیتوں کی تفسیر میں

مفسرین نے پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ نظریۂ تقلید پر دلائل فراہم کیے ہیں۔ بعض مفسرین نے گرچہ ان آیات کے ذیل میں تقلید کی بحثیں نہیں اٹھائی ہیں مگر عملاً وہ بھی مقلد ہی تھے۔ جیسا کہ ابھی چند سطور پہلے آپ نے مستند ماخذ کے حوالے سے ان کے ناموں کے ساتھ مقلد ہونے کی صراحت ملاحظہ فرمایا ہے۔ آئندہ صفحات میں کچھ مفسرین کی حالات زندگی اور ان کی تقلید کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے جس میں حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ احکامی آیات کے ذیل میں ان کی تفاسیر میں جس طرح کی فقہی مباحث ہیں ان کے بارے میں بھی آپ کو باخبر کر دیا جائے تاکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے کہ احکامی آیات کے ذیل میں علمائے تفاسیر نے ائمہ اربعہ کے مسالک کے مطابق ہی مسائل کا استنباط کیا ہے یا مستنبط شدہ مسائل کو نقل کیا ہے۔ ساتھ ہی کچھ تفاسیر میں مسائل کے ذیل میں مذاہب کے دلائل بھی ذکر کیے گئے ہیں بلکہ مفسر جس امام کا مقلد ہے اس مسلک کا پلڑا بھاری دکھانے کی شعوری کوشش بھی کی ہے۔ گرچہ اکثر مفسرین نے محض مسائل اور مسالک کے دلائل کی وضاحت وتشریح کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔

مشاہیر علمائے تفسیر اور ان کی تفاسیر کا مختصر جائزہ

محمد بن عمر بن حسین رازی شافعی (۵۴۴ھ/۶۰۶ھ): امام فخر الدین رازی شافعی ابن الخطیب کے نام سے مشہور تھے۔ ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے والد گرامی ضیاء الدین خطیب شافعی کے نام سے معروف تھے۔ امام رازی نے والد گرامی ہی سے علمی استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ کمال سمعانی المجد جیلی اور دیگر معاصر علمائے کرام سے بھی خوب خوب استفادہ کیا۔ آپ اپنے دور کے یگانہ روزگار عالم، بے مثال متکلم تھے، علم کلام اور علم فلسفہ میں غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ آپ نے اسلامی فلسفہ اور یونانی فلسفہ کے دوران خط فاصل کھینچا۔ علم تفسیر، لغت، بلاغت، بدیع، بیان، قرأت اور علم ونقد وجرح میں آپ امامت کے مرتبے پر فائز تھے۔ (الأعلام للزركلي ۷/۲۰۳) علوم شرعیہ کے علاوہ علم تصوف سے آپ کا گہرا لگاؤ تھا۔ اس علم میں حضرت شیخ نجم الدین کبری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے پیر ومرشد اور شیخ طریقت تھے۔ حضرت شیخ نجم الدین کبری نہ صرف عظیم صوفی تھے بلکہ حافظ ابن حجر اور صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق آپ ہی نے اپنے شاگرد کی کتاب تفسیر کبیر کا تکملہ لکھا یا اس کے ناقص حصے کی تکمیل بعینہ اسی اسلوب میں لکھی۔ اہل علم آج تک اس تفسیر میں شیخ کی تکمیل کا نقطۂ آغاز تلاش کرنے سے قاصر ہیں۔ علم تفسیر کے لیے علوم شرعیہ اور دوسرے علوم پر کس قدر مہارت ضروری ہے، اہل بصیرت سے یہ بات پوشیدہ نہیں۔

آپ کی حیات مستعار کا بیشتر حصہ علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت اور تصنیف وتالیف میں صرف ہوا۔ آپ نے متعدد علوم وفنون پر تصانیف کا خاصا ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ یہ ذخیرہ اپنی قدر وقیمت کی وجہ سے ہر دور میں اپنی معنویت تسلیم کروانے پر مجبور کرتی رہی ہے۔ آپ کی مقبول تصانیف میں "تفسیر کبیر" کا نام سرفہرست ہے۔ یہ تفسیر لاتعداد خصوصیات کی جامع ہیں۔ اس کی مقبولیت اور شہرت کا سورج آج بھی نصف النہار پر ہے۔ اس کی وجہ مختلف علوم وفنون سے متعلق اس کے ٹھوس علمی اور فنی مباحث ہیں۔ بالخصوص علم کلام، علم ریاضی، علم فلسفہ اور دیگر علوم مثلاً علم الافلاک وغیرہ کا ذکر بھی کثرت سے کرتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ احکامی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے امام رازی فقہا کے مذاہب کا ذکر کرتے ہیں۔ شافعی ہونے کی وجہ سے امام شافعی کے مسلک کی تائید وحمایت میں بہ کثرت دلائل و براہین کا ذکر کرتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ابن خلکان نے لکھا ہے کہ "امام رازی نے اس تفسیر میں ہر انوکھی بات یکجا کر دی ہے۔ (وفیات الاعیان لابن خلکان ۲/۲۶۷)۔

ابو اسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی نیساپوری شافعی (م ۴۲۷ھ): امام ثعلبی کا شمار اوائل پانچویں صدی کی نادر روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے۔ آپ کثیر الشیوخ تھے آپ کے شیوخ کی تعداد تین سو بتائی جاتی ہے جن سے آپ نے علمی اسرار ورموز حاصل کیے۔ وہ بیک وقت مختلف علوم و فنون پر مہارت رکھتے تھے۔ علم تفسیر، علم حدیث، علم رجال، علم نقد وجرح، پر دسترس رکھتے تھے، علم تاریخ سے ان کی واقفیت گہری تھی۔ عربی زبان کے صاحب اسلوب ادیب تھے۔ اس کے علاوہ موثر خطیب اور دین دار اور باعمل واعظ بھی تھے۔ امام ثعلبی کی ثقاہت علمائے ناقدین کے درمیان متنازع فیہ ہے۔ امام ثعلبی کو علم تفسیر سے فطری دلچسپی تھی۔ اس کے حصول کے لیے انہوں نے سوجتن کیا۔ ان کے مقدمے کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عہد طفولیت ہی سے علما کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور علم تفسیر کے حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان کی محنت وکاوش کی حد یہ ہے کہ وہ رات بھر جاگتے تھے حتی کہ اللہ تعالی نے ان پر علم کے

دروازے وا کر دیے جس سے وہ حق و باطل، ادنی و اعلی، جدید و قدیم، اور سنت و بدعت میں فرق کرنے لگے۔ ساتھ ہی ان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوگئی کہ وہ ایک ایسی جامع تفسیر تصنیف کریں جو متقدمین کی تمام صفات کی حامل ہو۔ ارادے کو عملی جامہ پہنایا اور اپنی تفسیر کی تمام خصوصیات کی حامل بنانے کی کوشش کی ان کا بیان ہے کہ میں نے اس کتاب میں قریب سو کتابوں کا منتخب مواد جمع کر دیا ہے۔ تعلیقات اور متفرق اجزا اس پر مستزاد۔ (التفسیر والمفسرون، از: محمد حسین ذہبی ۱/۲۷۷- داراحیاء التراث العربی طبع دوم ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۶ء)

امام ثعلبی امام شافعی کے مقلد تھے وہ اپنی تفسیر میں دوسری بحثوں کے علاوہ فقہی احکام و مسائل پر بہت کچھ لکھتے ہیں۔ احکام کی آیات کی تفسیر میں ائمہ دین کے فقہی اختلافات کے ساتھ ان کے دلائل و براہین پر بھی کھل کر روشنی ڈالتے ہیں کہ نفس مسئلہ کا گوشہ گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ قرآن میں فرمایا:

وان کنتم مرضی او علی سفر او جاء احد منکم من الغائط (النساء / ۴۳)

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا کوئی شخص حاجت پوری کر کے آئے

اس آیت کی تفسیر میں مؤلف نے لمس، ملامسہ کا مفہوم واضح کرنے کے بعد اس مسئلے کے متعلق فقہا کے پانچ مذاہب کے بارے میں بتاتے ہیں۔ بالخصوص شافعی ہونے کے ناطے امام شافعی کے مسلک کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد تیمم سے متعلق علما کے اقوال و مذاہب پر روشنی ڈالتے اور تمام مسالک کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اور اس تجزیے میں امام شافعی کا مسلک باوزن ثابت کرتے ہیں۔ (دیکھیے الکشف ج ۲/۱۳۵)

ابو محمد حسین بن مسعود الفراء بغوی شافعی (م ۵۱۰ھ): امام بغوی شافعی المسلک فقیہ، عظیم محدث اور بے مثال مفسر تھے۔ آپ کا لقب محی السنہ ہے۔ آپ نے قاضی حسین سے حدیث و فقہ کا درس لیا۔ عابد شب زندہ دار اور نہایت ہی صابر و قانع تھے۔ صوفی از م تحریک کے نامور اور فاضل صوفی تھے۔ ہمیشہ پاک و صاف حالت میں درس دیتے تھے، شبہات سے بچتے تھے، تعلیم و تعلم، تصنیف و تالیف، خدمت دین اور خدمت مخلوق، تزکیۂ نفس ہی آپ کی پوری زندگی تھی، علامہ سبکی لکھتے ہیں۔

''بغوی بڑے جلیل القدر امام عابد و زاہد، محدث، مفسر، فقیہ، علم و عمل کے جامع اور طریق سلف پر گامزن تھے۔ قرآن کریم کی تفسیر اور احادیث نبویہ کی مشکلات کے حل کرنے کے سلسلے میں کتابیں تصنیف کیں۔ حدیث رسول کی نقل و روایت اور درس و مطالعہ میں حد درجہ دل چسپی لیتے تھے۔

آپ کی مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) معالم التنزیل (۲) شرح السنة (۳) المصابیح (۴) الجمع بین الصحیحن (۵) التهذیب فی الفقه.

امام خازن نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ معالم التنزیل تفسیر کی بلند پایہ اور گراں قدر کتاب ہے۔ یہ صحیح اقوال کی جامع، احادیث نبویہ سے آراستہ اور احکام شرعیہ سے پیراستہ ہے۔ شبہات و تبدیلی سے پاک ہے۔ لیکن اس میں عجیب و غریب واقعات اور نادر و نایاب قصے اور کہانیاں بھی ہیں۔ (**التفسیر والمفسرون از محمد حسین الذهبی ۱/۲۳۶ داراحیاء التراث العزلی ۱۹۷۶ء**)

تفسیر بغوی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آیتوں کی تشریح، فقہی احکام اور ائمہ کے مذاہب اور ان کے دلائل اور دیگر امور شرعیہ کی توضیح میں احادیث ضرور ذکر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ امام بغوی خود بتاتے ہیں کہ وہ کسی آیت کی تشریح یا حکم شرعی کی توضیح کے سلسلے میں جہاں کہیں احادیث درج ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب الٰہی کی وضاحت و صراحت کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ کتاب اللہ کی توضیح سنت سے طلب کی جاتی ہے اور امور دین کا مدار و انحصار سنت ہی پر ہے- احادیث نبویہ میں نے معتبر ائمۂ حدیث کی کتب سے اخذ کی ہے اور منکر وغیرہ سے متعلق روایات سے احتراز کیا ہے (**معالم ج ۱/ص ۹**)

ابو محمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ اندلسی غرناطی مالکی (۴۸۱ھ/۵۴۲ھ): ابن عطیہ مالکی چھٹی صدی ہجری کے نامور اور عادل قاضی (Justice)، جلیل القدر فقیہ، معتمد مفسر، بلند پایہ محدث، عربی زبان کے مایۂ ناز ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز تھے- علم لغت اور علم نحو کے بے مثال عالم تھے اس کے علاوہ دوسرے علوم پر بھی آپ امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ علم تفسیر اور علم فقہ میں مہارت کا کوئی جواب نہیں تھا (**اعلام للزرکلی ۴/۵۳**)۔ مشہور مفسر ابو حیان اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے بھی تفاسیر قرآن مرتب کی ہیں ان سب میں ابن عطیہ کا مقام بلند تر ہے۔'' (**البحر المحیط ج ۱/۹**)

بحوالہ التفسیر و المنصرون ۱/۲۳۹)

''ابن فرحون صاحب الدیباج المذہب نے آپ کو مالکی فقہ کا ستون قرار دیا ہے''

مشہور مفسر ابو حیان ہی نے کشاف اور ابن عطیہ کی تفسیر کا مقابلہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ابن عطیہ کی کتاب زیادہ جامع اور غیر صحیح مواد سے پاک ہے۔ اس کے مقابلے میں زمخشری کی تفسیر زیادہ گہری اور مختصر ہے (البحر ۱۰/۱، بحوالہ سابق ۱/۲۱۹)

''ابن عطیہ نے دینی تصانیف کا جو ذخیرہ یادگار چھوڑا ان میں ان کی تفسیر المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز جملہ مفسرین کے نزدیک کتب تفسیر میں اہم مقام رکھتی ہے۔ ابن خلدون نے اس کو جملہ تفاسیر کا نچوڑ قرار دیا ہے۔ ان کے بقول اس میں صرف صحیح مواد کو جگ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب دیار مغرب واندلس (اسپین) میں نہایت مقبول و مستحسن خیال کی جاتی ہے۔ صاحب التفسیر و المفسرون ان کے متعلق رقم طراز ہیں کہ ابن عطیہ ایک آیت ذکر کے نہایت شریں اور بلیغ عبارت میں اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ پھر تفسیر میں وارد شدہ روایت و آثار تحریر کرتے ہیں۔ ابن جریر سے انہوں نے استفادہ کیا ہے بعض اوقات ابن جریر کی عبارت نقل کر کے اس پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ قرآنی الفاظ کی تشریح کے سلسلے میں وہ اکثر عربی اشعار اور ادبی شواہد سے استدلال کرتے ہیں۔ نحوی مسائل سے بھی انہیں دل چسپی ہے۔ وہ اکثر مختلف قرائتیں ذکر کر کے ان کے جداگانہ معانی و مطالب پر روشنی ڈالتے ہیں''

(التفسیر و المفسرون ۱/۲۳۹ تا ۲۴۰)

عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بصری شافعی (۷۰۰ھ/۷۷۴ھ): ابن کثیر بصرہ میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں اپنے بھائی کی رفاقت میں دمشق چلے آئے۔ یہیں حصول تعلیم میں مشغول ہو گئے، ابن شحنہ آمدی اور ابن عساکر جیسے بلند پایہ محدثین سے علمی استفادہ کیا۔ عرصہ دراز تک علامہ مزی کی صحبت میں رہے۔ ان سے تہذیب الکمال کا درس لیا۔ علامہ مزی نے آپ کو دامادی کا شرف بخشا۔ آپ نے ابن تیمیہ حرانی سے کافی استفادہ کیا۔ بلکہ بعض نظریات میں آپ ان کے حامی بھی رہے۔ آپ کی وفات ماہ شعبان ۷۷۴ھ میں ہوئی۔

ابن کثیر کا علمی مقام و مرتبہ مختلف زاویے سے کافی بلند ہے۔ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت وطباعی کی وجہ سے متعدد اسلامی اور سماجی علوم پر مہارت رکھتے تھے۔ علم نقد و جرح پر بھی گہری بصیرت کے مالک تھے۔ بالخصوص اسلامی علوم میں تفسیر و حدیث، نقد و جرح، علم اسماء الرجال اور سماجی علوم میں تاریخ پر عبور رکھتے تھے۔ ان کی کتاب ''البدایہ و النہایہ'' کو آج تک اسلامی تاریخ کا اہم ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے۔ علم فقہ سے بھی کافی دلچسپی تھی جبھی دینی احکام پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ بھی بنایا تھا بلکہ ایک عرصہ تک ابن کثیر مسند فقہ وافتا پر بھی فائز تھے۔

ابن کثیر نے مختلف علوم وفنون پر تصانیف کا بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا ہے۔ علم تفسیر پر ان کی تفسیر ''تفسیر القرآن الکریم'' چار جلدوں پر مشتمل بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ یہ تفسیر متعدد اور متنوع خوبیوں سے عبارت ہے۔ ابن کثیر آیات کی تفسیر و تشریح میں حدیث، قرآنی آیات اور سلف صالحین کے اقوال کا سہارا لیتے ہیں۔ مگر وہ لکیر کے فقیر نہیں کہ اگلوں نے جو کہہ دیا اس پر مہر لگادی بلکہ اپنی ناقدانہ نگاہ سے ان کے اقوال کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں، پھر کسی حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں۔ اس تفسیر کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ احکامی آیات کی تفسیر میں مؤلف فقہی احکام اور علما وفقہا کے اقوال و دلائل ذکر کرتے ہیں اختلافی مسائل میں مختلف مسالک و مذاہب کے دلائل کی تفصیلات بھی ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ طلاق اور صوم سے متعلق آیتوں کی تفسیر میں خاصی تفصیل سے کام لیا ہے۔ ابن کثیر فقہا کے اختلاف میں دخل دیتے اور ائمہ کے مذاہب و دلائل ذکر کرنے کے بعد اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کرتے ہیں۔ شافعی ہونے کے ناتے اسی مسلک کی تائید وحمایت اور تقویت میں دلائل کا انبار لگاتے ہیں۔

(التفسیر و المفسرون ۱/۲۴۲ تا ۲۴۶ ملخصاً)

ابو زید عبد الرحمٰن بن محمد بن مخلوف ثعالبی جزائری مالکی (۷۸۶ھ/۸۷۵ھ): امام ثعالبی مالکی تھے، آپ بلند پایہ عالم دین، عظیم محدث، بے مثال مفسر، جلیل القدر محقق ہونے کے ساتھ عابد وزاہد صوفی بھی تھے اور صاحب کرامت ولی بھی۔ ابن سلام البکری لکھتے ہیں:۔ ''ہمارے شیخ محترم ثعالبی نہایت عابد وزاہد اور اکابر اولیاء اللہ میں شمار ہوتے تھے'' (التفسیر و المفسرون ۱/۲۴۷)

علمی مقام:۔ امام ثعالبی مشرق ومغرب کی نادر ہستیوں اور عظیم دانش وروں میں شمار کیے جاتے تھے وہ اپنا تعارف خود کراتے ہوئے رقم طراز ہیں'' آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں طلب علم کے لیے الجزائر

سے نکلا۔ پہلے تونس پھر مصر پہنچا۔ پھر تونس لوٹ آیا۔ ان دنوں تونس میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو علم حدیث میں مجھ پر فائق ہو۔ میں جب بولنے لگتا تو اہل علم خاموش ہو کر میری باتیں سنتے اور حق کا ساتھ دیتے میری روایت کو قبول کر لیتے۔ جب میں مشرق سے عازم مغرب ہوا تو بعض علمائے مغرب نے کہا کہ "علم حدیث میں آپ یگانہ عالم ہیں"۔
(مرجع سابق ۱/۲۴۷)

آپ کو تصنیف و تالیف سے خاصا لگاؤ تھا بالخصوص علوم قرآن سے غایت درجہ دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ آپ کی اکثر تالیفات اسی علم سے متعلق ہیں۔ آپ نے مندرجہ ذیل تصنیفات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا:۔

(۱) الجواهر الحسان فی تفسیر القرآن (۲) الذهب الابریز فی غرائب القرآن العزیز (۳) تحفة الاخوان فی اعراب بعض آیات القرآن (۴) جامع الامهات فی احکام العبادات (۵) الانوار (فی المعجزات النبویة (الضوع اللامع ۴/۱۵۲)

تفسیری خصوصیات:- ان کی تفسیر الجواہر الحسان متنوع خوبیوں کی وجہ سے دوسری تفاسیر سے ممتاز ہے۔ مثلاً اس میں ثقہ، مستند مفسرین کی تفسیر سے مواد کشید کیا گیا ہے بالخصوص ابن عطیہ کی تفسیر سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ تفسیری اقوال روایت کرنے میں روایت بالمعنی کی بجائے روایت باللفظ پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ یہ کتاب تقریباً سو کتابوں کا عطر مجموعہ ہے۔ اور مصنف علام کے بقول "(اس کتاب میں میں نے) ائمۂ ثقات کی کتب سے مواد اخذ کر کے مفید اضافے کیے ہیں"۔ اسرائیلی واقعات ذکر کرنے کے بعد ان پر شدید نقد و جرح کیا ہے۔ کہیں کہیں فقہی مسائل کا ذکر بھی ہے مگر اس کی تفصیل سے انہوں نے احتراز کیا ہے۔
(التفسیر والمفسرون از محمد حسین ذہبی ۱/۲۴۸ تا ۲۵۱)

جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر سیوطی شافعی (م ۸۴۹ھ/۹۱۱ھ): امام سیوطی بارہویں صدی ہجری کے مجدد، عالم اسلام کے مرجع، احادیث نبویہ کے حافظ، کثیر علوم و فنون کے ماہر اور کثیر التصانیف عالم دین تھے۔ علوم اسلامیہ پر مہارت کے علاوہ کئی سماجی علوم سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے، امام سیوطی زود نویس اور بسیار نویس کے ساتھ خوب نویس بھی تھے یہ ایک ایسی خوبی ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں ہی کو عطا کرتا ہے۔

آپ کی تصانیف کی تعداد پانچ سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔ یہ تصانیف آپ کے دور میں مشرق و مغرب میں معروف و مشہور ہوئیں۔ امام سیوطی اصلاحی، دعوتی، تدریسی اور تصنیفی خدمات کے علاوہ اپنے دور کے تقاضے کے مطابق علوم اسلامیہ میں بکھرے ہوئے مواد کو جمع کرنے کا کام زیادہ کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام سیوطی اختراعی طبیعت کے مالک نہیں تھے۔ کیوں کہ انہوں نے زمانے کی تصنیفات اور لوگوں کے حافظے کو دیکھ کر جامع کتابیں لکھنی شروع کیں ایک جگہ خود تحریر فرماتے ہیں "دور حاضر میں ہمت پست ہو چکی ہے اور لوگ اسانید سے قطع نظر صرف متن حدیث کا مطالعہ کرنا چاہتے اور طوالت سے گھبراتے ہیں۔"

تفسیر کے تعلق سے بھی آپ کے ذہن میں ایک جامع خاکہ تھا جو علم تفسیر اور قرآنی آیات کی تفسیر سے متعلق جملہ مواد پر مشتمل ایک بیش قیمت ذخیرہ ہوتا اس تفسیر کا نام بھی آپ نے "مجمع البحرین و مطلع البدرین" منتخب کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ الاتقان کو آپ نے اسی تفسیر کا مقدمہ قرار دیا ہے جو ایک زمانے سے مستقل تصنیف کے نام سے معروف ہے۔ لیکن امام کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا مگر پھر بھی اختصار کو مد نظر رکھ کر "ترجمان القرآن" کے نام سے تفسیر لکھی، مگر اس میں بھی حدیثوں کی سندیں مذکور تھیں بعد میں طوالت ہی کے سبب آپ نے سندیں بھی کو حذف کر کے اس کا نام **الدر المنثور فی التفسیر الماثور** رکھ دیا۔ (**التفسیر والمفسرون ۱/۲۵۱**)

امام سیوطی نے ایک مختصر تفسیر جلالین کے نام سے بھی لکھی جو برسوں سے ہندوستانی مدارس کے درس نظامی میں داخل نصاب ہے آپ مسلکاً شافعی تھے اس لیے احکام و مسائل کی آیات کی تفسیر میں امام شافعی کے مسلک کے مطابق تفسیر بھی فرماتے ہیں۔

فتویٰ نویسی، تدریس اور وعظ گوئی آپ کے مشغلے میں شامل تھا مگر بعد میں عملی تصوف کی طرف طبیعت کا میلان بڑھ گیا تھا اس لیے چالیس سال کے بعد ذکر و عبادت میں وقت کا زیادہ حصہ صرف کرتے تھے۔ (**الاعلام للزرکلی ۴/۷۱**) آپ کے مناقب و کرامات کی خاصی تعداد ہے جن کو مؤرخین نے نقل کیا ہے۔

ناصر الدین ابو الخیر عبد اللہ بن عمر بن محمد بیضاوی (م ۶۹۱ھ یا ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء): قاضی بیضاوی ساتویں صدی ہجری کے نامور قاضی ایران، عظیم فقیہ، علوم اسلامیہ کے معتبر عالم، عربی زبان کے فن کار ادیب

اور لاثانی مفسر گزرے ہیں۔ آپ فارس میں شیراز کے قریب بیضا شہر میں پیدا ہوئے۔ اسی وجہ سے بیضاوی کہلائے۔ علوم اسلامیہ میں مہارت حاصل کی۔ غیر معمولی استعداد کی وجہ سے شیراز کے قاضی القضاہ (Chief Justice) کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ آپ مدتوں اس منصب پر فائز رہ کر عدل وقسط کے انمٹ نقوش ثبت کیے۔ لوگ آپ کے منصفانہ فیصلے سے مطمئن تھے۔ ایک دور میں آپ منصب قضا سے دست بردار ہو کر تبریز چلے آئے اور یہیں ۶۸۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

آپ نے بے پناہ مصروفیات کے باوجود بھی تصنیف و تالیف کا گراں قدر ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ یہ تصانیف علوم وفنون اور مواد کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) انوار التنزیل و اسرار التاویل. معروف به تفسیر بیضاوی (۲) طواع الانوار (علم توحید میں) (۳) منهاج الوصول الی علم الاصول (۴) لب اللباب فی علم الاعراب (۵) نظام التواریخ (فارسی) (۶) (کتابچه) موضوعات العلوم و تعاریفها (۷) الغایة القصوی فی دارية الفتوی (فقہ شافعی سے متعلق) (الاعلام للزرکلی ۴/ ۲۴۸)۔

تفسیر بیضاوی، کشاف، امام راغب اصفہانی اور امام رازی کی تفاسیر سے کشید کی گئی ہے لیکن صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں کہ جو نکات و دقائق بیضاوی اپنی فکر رسا سے اختراع کرتے ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں۔ یہ تفسیر کئی اعتبار سے ممتاز ہے امام بیضاوی اسرائیلیات کو ضعف و قیل سے بیان کرتے ہیں۔ مختلف قرأتوں سے مختلف نکتے پیدا کرتے ہیں۔ سورت کے آخر میں ایمان کی تازگی اور روحانی تسلی کے لیے سورت اور آیتوں کی فضیلت سے متعلق حدیثیں ذکر کرتے ہیں۔ آیتوں میں بلاغت اور صنائع و بدائع دکھا کر امام بیضاوی بین السطور سے قرآن کے پنہاں مطالب و معانی کی طرف جو اشارے دینا چاہتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ آپ مسلکاً شافعی تھے، فقہ شافعی پر مستند اور قابل قدر کتاب بھی لکھی، اپنی تفسیر میں احکامی آیات کی تفسیر میں فقہی مسائل کی تفصیلات شافعی مسلک کے مطابق بیان کرتے ہیں گرچہ اس سے زیادہ دل چسپی نہیں لیتے، فقہی مسائل کے تذکرہ کے دوران امام شافعی کے مسلک کی تائید وتقویت میں دلائل وشواہد بھی ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ "المطلقات يتربصن بانفسهن ثلثة قروء" میں قاضی بیضاوی نے قروء سے مراد طہر لینے پر کئی شواہد پیش کیے ہیں اور امام شافعی کے مسلک کی پوری ترجمانی کی ہے، نیز وہ اپنی تحریر کے بین السطور سے حنفیہ کی تردید بھی کر رہے ہیں۔ یہ صرف ایک مثال جو ان کے مقلد ہونے کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کافی ہے اس طرح سیکڑوں مثالیں ان کی کتاب میں موجود ہے بلکہ فقہ شافعی سے متعلق ان کی مستقل تالیف الغایة القصوی کا ذکر اوپر آچکا ہے جو ان کے مقلد ہونے پر شاہد عدل ہے۔

ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی حنفی (م ۷۰۱ھ): امام نسفی حنفی فقہ وتفسیر کی اس قد آور شخصیت کا نام ہے جس کا نام اہل علم کی زبان پر آتے ہی اعتبار، استناد، ثقاہت جیسے معتبر اور باعزت الفاظ کی گہما گہمی ذہنوں میں محسوس ہونے لگتی ہے۔ آپ ماوراء النهر میں شہر نسف میں جلوہ بار ہوئے۔ آپ نے علامہ شمس الائمہ کردی اور احمد بن عتابی جیسے مشائخ عصر سے استفادہ کیا۔ تصوف وسلوک سے گہرا لگاؤ تھا، عبادت و ریاضت اور زہد وتقوی آپ کی داخلی اور شخصی زندگی کے معیارات تھے۔ حدیث، فقہ، اصول اور تفسیر ولغت میں گہری بصیرت اور بے پناہ خداداد صلاحیت کی وجہ سے علما کی نگاہ میں معتبر ومقبول تھے۔ آپ کی تصانیف علوم ومعارف کا خزانہ ہیں ان میں بیشتر اصول اور علم فقہ سے متعلق ہیں اور یہ مندرجہ ذیل ہیں: (۱) متن الوافی (فی الفروع) (۲) الکافی فی شرح الوافی (۳) کنز الدقائق (فی الفقه) (۴) المنار (فی اصول الفقه) (۵) عمدة العقائد (۶) مدارک التنزيل و حقائق التاويل (فی التفسير) (الاعلام للزرکلی ۴/ ۱۹۲)

امام نسفی کی کتاب کنز الدقائق فقہ حنفی میں ایک مستند اور جامع متن کی حیثیت سے متداول ہے۔ اس میں فقہ حنفی کے مطابق مسائل بیان کیے گئے ہیں اس کی شروحات میں "البحر الرائق اور تبیین الحقائق" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ تفسیر نسفی میں متنوع خصوصیات کے علاوہ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ امام نسفی نے احکامی آیات کی تفسیر میں فقہی احکام و مسائل بیان کرتے ہیں کہیں مسالک کے دلائل بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس موقع پر وہ حنفیت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہوئے دوسرے مسالک کی پرزور تردید بھی کرتے ہیں۔ تفصیل کے لیے طلاق وغیرہ مسائل سے متعلق آیتوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا

ہے امام نسفی نہ صرف روایتی مقلد تھے بلکہ ان کی کتابوں اور ان کی تفسیر کے ذریعے فقہ حنفی کو مزید تقویت ملی۔ انہوں نے بہت سے فقہی نکات کا اضافہ کیا۔ ان کی تفسیر کو ایک معتدل اور مستند تفسیر ہونے کی حیثیت سے خواص میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔

علاء الدین ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم خازن شافعی (م ۶۷۸ھ/۷۴۱ھ): امام خازن بغداد میں پیدا ہوئے۔ یہیں ابن الدوالیبی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، پھر دمشق آکر قاسم بن مظفر اور وزیرہ بنت عمر سے علمی استفادہ کیا، محنت و دلچسپی سے علم و عمل اور فکر وفن میں یگانہ روزگار بن گئے مسلکا شافعی تھے۔ مشرباً صوفی تھے، مخلوق سے ہمدردی اور محبت کرتے تھے۔ ابن شیبہ کہتے ہیں کہ ”آپ عظیم عالم دین اور بہت بڑے مصنف تھے۔ متعدد علوم وفنون پر کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں مندرجہ ذیل تصانیف کو خوب شہرت حاصل ہوئی۔

(۱) لباب التأویل فی معانی التنزیل معروف بہ تفسیر خازن (۲) عدۃ الأفهام فی شرح عمدۃ الاحکام (فقہ شافعی کی فروعات سے متعلق) (۴) مقبول المنقول (حدیث میں دس جلدوں پر مشتمل (شذرات الذهب ۶/ ۱۳۱)

امام خازن کی تفسیر لباب التاویل متعدد خوبیوں کی مالک ہے اس میں تفصیلات ہیں آیات اور سورتوں کی فضیلت میں امام خازن نے زیادہ تفصیلات سے کام لیا ہے۔ تاریخی واقعات بھی تفصیلاً مذکور ہیں۔ تفسیر بغوی اس کا خاص ماخذ ہے۔ اس میں زیادہ مواد نقل و انتخاب پر مشتمل ہے۔ اختراعی باتیں کم ہیں امام خازن آیتوں کی صوفیانہ تفسیر بھی کرتے ہیں۔ جن میں تزکیۂ روح اخلاق و عمل کی پاکیزگی کے لیے ترغیب وترہیب کی حدیثیں بہ کثرت ذکر کر کے ان میں ایسی نکتہ آفرینی کرتے ہیں کہ ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور روح جھوم اٹھتی ہے۔

فقہی مسائل:- امام خازن علم فقہ میں مسلکاً امام شافعی کے مقلد تھے انہوں نے اپنی تفسیر میں فقہی مسائل کی تفصیلات کا ذکر خوب کیا ہے۔ احکامی آیات میں فقہا کے مذاہب و دلائل پر روشنی ڈالتے ہیں اور امام شافعی کے مسلک کا پلڑا بھاری دکھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، نیز آیتوں سے نمبر وائز مسائل نقل کرتے ہیں۔ اطمینان کے لیے نکاح، طلاق، خلع، ظہار، عدت، اور ایلاء سے متعلق احکام کی تفصیلات کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

غالباً اسی وجہ سے صاحب التفسیر والمفسرون نے ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ سب کچھ ہیں، مگر مفسر کم۔

(التفسیر والمفسرون ۱/ ۳۱۴-۳۱۵)

محمد بن یوسف بن علی اندلسی غرناطی شافعی معروف بہ ابوحیان (۶۵۴ھ/۷۴۵ھ):- افریقہ اور دیار مغرب کے نامور عالم دین، فاضل نحو وصرف، ماہر شعر وسخن، مختلف قرأتوں کے رمز شناس، طبقات وتراجم رجال کے واقف کار علامہ ابوحیان کا نام تاریخ اسلام کے صفحات میں ہمیشہ انمٹ نقش کی طرح ثبت رہے گا۔ جن کی صلاحیتوں اور لافانی خدمات سے پورا عالم اسلام فیض یاب ہوا اور ہو رہا ہے۔ ابوحیان نے اسپین کے فضلا سے استفادہ کیا۔ بعدہ اسکندریہ میں عبد النصیر بن علی مریوطی، ابو طاہر اسماعیل بن عبد اللہ ملیجی سے علم قرأت پڑھ کر عبور حاصل کیا۔ اس کے بعد مصر میں شیخ بہاء الدین بن نحاس سے آپ نے استفادہ کیا، ابوحیان خود کہتے ہیں کہ میں نے چار سو پچاس ۴۵۰ اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ ابوحیان اپنے دور میں نحو وصرف کے یگانۂ روزگار عالم تسلیم کیے جاتے تھے۔ علم تفسیر میں بھی ابوحیان کو گہری واقفیت حاصل تھی۔ ابوحیان نے جمال الدین ابو عبد اللہ محمد بن سلیمان المقدسی معروف بہ بابن النقیب کی کتاب ”التحریر و التحبیر لاقوال ائمۃ التفسیر“ سے خوب استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب علم تفسیر میں سو جلدوں پر مشتمل ہے۔ لکھنا، پڑھنا اور روایات سننا، سنانا ان کی زندگی کا خوبصورت مشغلہ تھا، صفدی کہتے ہیں ”میں نے ہمیشہ ابوحیان کو لکھتے، پڑھتے اور روایات سنتے دیکھا اس کے سوان کا کوئی مشغلہ نہ تھا“، ان کی تصانیف علم وفن، نکتہ آفرینی میں لاجواب ہیں مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) البحر المحیط (علم تفسیر میں) (۲) غریب القرآن (۳) شرح التسهیل (۴) نهایة الاعراب (۵) خلاصة البیان۔

ابوحیان شافعی تھے آپ کی تفسیر میں احکامی آیات کے ذیل میں فقہ شافعی کے مطابق جزئیات پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز اس سلسلے میں مختلف آراء واقوال بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ اس تفسیر میں زیادہ تر نحوی و صرفی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان مسائل میں ابوحیان زمخشری اور ابن عطیہ جیسے بلند پایہ نحویوں کی بھی خبر لی ہے۔ مگر ان کے علمی قدو

قامت کا وہ کھلے دل سے معترف ہیں۔ اور اہل علم کی یہی شان بھی ہوتی ہے۔ (التفسیر والمفسرون ۱/۳۱۹)

محمد بن محمد بن مصطفیٰ ابوالسعود عمادی حنفی (۸۹۳ھ/۹۸۲ھ):

امام ابوالسعود دسویں صدی ہجری کے نامور مفسر، صاحب رائے دانش ور، نکتہ راس فقیہہ، بلند پایہ ادیب اور اپنے وقت کے عادل قاضی تھے۔ آپ نے ۸۹۳ھ کو قسطنطنیہ کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھ کھولی، آپ کے علم وفضل کے بارے میں علما کی رائے ہے کہ ''(آپ) علم و فضل کی گود میں پلے، بڑھے اور پروان چڑھے۔ زندگی بھر علوم وفنون کی خدمت میں مشغول رہے۔ اپنے والد سے اکثر علمی کتب پڑھیں اور دیگر اکابر علما سے کسب فیض کیا۔ ترکی کے بہت سے مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مختلف اوقات میں بروسہ قسطنطنیہ اور علاقہ عسکری میں منصب قضاء پر متمکن ہوئے اور برابر تیس (۳۰) سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس مدت میں انہوں نے فتوی نویسی میں کامل مہارت وبراعت کا ثبوت بہم پہنچایا۔

آپ کی خدمات کے متعلق مؤرخین کا بیان ہے ''کہ آپ سائل کے سوال کے مطابق فتوی لکھتے۔ اگر سوال نظم میں ہوتا تو اسی وزن و قافیہ میں اس کا منظوم جواب دیتے۔ اگر سوال مسجع نثر میں ہوتا تو جواب بھی ویسا ہی لکھتے۔ اگر سائل ترکی یا عربی میں لکھتا تو آپ اسی زبان میں جواب دیتے۔ آپ نے جمادی الاولی ۹۸۲ھ کو قسطنطنیہ میں وفات پائی۔ اور میزبان صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پڑوس میں مدفون ہوئے۔ (التفسیر والمفسرون از محمد حسین الذھبی ۱/۳۴۵-۳۴۶ داراحیاء التراث العربی۱۹۷۶ء)

آپ نے مشاغل کے ہجوم میں زندگی کا بیشتر حصہ بتایا۔ تدریس، منصب افتا وقضا کے علاوہ آپ نے تالیف کے لیے بھی وقت کا کچھ حصہ صرف کیا جس میں آپ کی تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم معروف به تفسیر ابوا لسعود ''وجود میں آئی۔ مؤرخین فقہا اور علمائے فصاحت وبلاغت نے اس کی شان میں حقیقت پسندانہ تاثرات اور مدحیہ کلمات کا اظہار کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تفسیر حسن تعبیر اور طرز ادا کی دلکشی، بلاغی اسرار ورموز کی عقدہ کشائی، دلائل وبراہین کی ندرت اور لطائف ونکات کی جامعیت کی وجہ سے عدیم النظیر اور لاجواب ہے۔ علامہ عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں۔ ''(یہ تفسیر ان گنت لطائف ونکات اور فوائد واشارات کی جامع ہے...... حسن تعبیری کی بنا پر ابوالسعود کو ''خطیب المفسرین'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک برہنہ حقیقت ہے کہ تفسیر کشاف اور بیضاوی کے بعد کوئی تفسیر اس مرتبہ کو نہیں پہنچی۔ (الفوائد البھیه فی تراجم الحنفية. ص. ۸۲)

امام ابوالسعود حنفی المسلک تھے۔ ان کی تفسیر میں بھی فقہی احکام و مسائل، اصول وفروغ اور دلائل و براہین کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ فقہی تفصیلات سے وہ گریز کرتے ہیں۔ صرف ائمہ کے فقہی مسالک بیان کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں امام ابوالسعود جس طرح خود معتدل مزاج اور معتدل فکر کے حامل تھے یونہی ان کی تفسیر بھی اعتدال وتوازن کا اعلی نمونہ ہے۔ (مرجع سابق ۱/۳۵۱)

شہاب الدین ابو الثنا سید محمود آفندی شافعی آلوسی (۱۲۱۷ھ/۱۲۷۰ھ): امام آلوسی اپنے دور کے سرخیل علمائے عراق میں شمار کیے جاتے تھے، علوم اسلامیہ کے علاوہ کئی سائنسی اور سماجی علوم پر درک رکھتے تھے، بے مثال خطیب، باکمال مدرس تھے، وسیع المطالعہ فقیہہ، مفتی اور عدیم النظیر محدث ومفسر تھے۔ قدرت نے آپ کو بلا کا حافظہ عطا کیا تھا۔ خود کہتے ہیں ''میں نے اپنے ذہن کے حوالے کوئی ایسی امانت نہیں کی جس میں اس نے خیانت کی ہو اور اپنے ناخن فکر وتدبر کو جس مشکل کام کی گرہ کشائی کے لیے بھی استعمال کیا تو اس نے اس امر کی پرتیں نہ کھولا ہو''۔

وہ احکامی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فقہا کے مذاہب و دلائل بیان کرتے ہیں اور آخر میں کبھی کبھی شافعی مسلک کو قوی قرار دیتے ہیں۔ ''المطلقات یتربصن الخ'' والی آیت کی تفسیر کے بعد لکھتے ہیں کہ یہاں شافعیہ کا مسلک قوی معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ جو شخص ان کے دلائل دیکھتا ہے اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات ملاحظہ کرتا ہے وہ اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہتا۔'' آپ نے ۱۲۱۷ھ میں کرخ بغداد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد گرامی، شیخ خالد نقش بندی اور شیخ علی سویدی کے علاوہ اکابر علمائے کرام سے علمی استفادہ کیا۔ تیرہ (۱۳) سال کی عمر میں تدریس وتالیف میں مصروف ہو گئے۔ کثیر طلبہ نے آپ چشمۂ علم سے سیرابی حاصل کی۔ آپ طلبہ کے لیے علمی درس کے علاوہ ہوسٹل اور اس کے لوازمات کا بھی انتظام فرماتے تھے اور ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ کو اخلاق کی تہذیب، نفس کے تزکیہ، اور

انسانیت و آدمیت کی تعمیر کا سلیقہ بھی سکھاتے تھے- حضرت شیخ آلوسی کی زندگی کا سب سے پرکشش پہلو یہ ہے کہ انہوں نے علوم کی ترویج و اشاعت ان کی نوک پلک سنوارنے میں پوری زندگی صرف کر دی- بتایا جاتا ہے آپ اکثر یہ شعر گنگنایا کرتے تھے-

سہری لتفقیح العلوم الذلی — من فصل غانیة و طیب عناق علوم (معارف) کی نوپلک سنوارنے کے لیے میری شب بیداری حسین وجمیل عورت کی ملاقات سے لذیزتر ہے-

۱۲۴۸ھ میں آپ کو مفتی احناف مقرر کیا گیا۔ ماہ شوال ۱۲۶۳ھ میں افتا کے منصب سے الگ ہوکر تفسیر قرآن کی تالیف میں مصروف ہو گئے۔ ۱۲۶۷ھ میں قسطنطنیہ واپس لوٹ کر سلطان عبدالمجید خاں کی خدمت اپنی تفسیر پیش کی۔ سلطان نے اس کو خوب سراہا۔ آپ نے اس کا آغاز ۱۶رشعبان ۱۲۵۲ھ بوقت شب کیا اور اس کی تکمیل ۴رربیع الآخر ۱۲۶۷ھ کو کی- اس وقت کے وزیر اعظم علی رضا پاشا نے اس کا نام ''روح المعانی فی تفسیر القرآن و السبع المثانی'' تجویز کیا-

(التفسیر و المفسرون ۱/ ۳۵۳)

علامہ آلوسی ادیان و مذاہب کے زبردست عالم تھے- آپ مسلکاً شافعی تھے۔ لیکن کچھ مسائل میں حنفیہ کی تقلید کرتے تھے- آپ کی تفسیر لاتعداد ظاہری اور باطنی خصوصیات کی جامع کے باوصف فقہی احکام و مسائل کی ترسیل و تفہیم میں اپنا جواب نہیں رکھتی-

وہ احکامی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے کے مذاہب اور اس کے دلائل بیان کرتے ہیں اور آخر میں کبھی کبھی شافعی مسلک کو قوی قرار دیتے ہیں ''المطلقات یتربصن'' والی آیت کی تفسیر کے بعد لکھتے ہیں کہ یہاں شافعیہ کا مسلک قومی معلوم ہوتا ہے جو شخص ان کے دلائل دیکھتا ہے اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات ملاحظہ کرتا ہے وہ اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہتا'' امام آلوسی نہ صرف رسمی مقلد تھے بلکہ ہمہ دانی کے باوجود تقلید پر ان کا عمل اس نظریے کو مزید استحکام عطا کر رہا ہے۔

ابو بکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی (۳۰۵ھ/۳۷۰ھ):

حضرت ابو بکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ چوتھی صدی ہجری کے نامور حنفی فقیہ اور عالم قرآن تھے، اہل علم کے مشہور ترین فضلا میں شمار کیے جاتے تھے- ۳۲۴ھ میں بغداد پہنچے اور یہیں مستقل سکوت اختیار کر لی- یہاں علی بن الحسین الکرخی کے حلقۂ درس میں فقہ کا مطالعہ کیا، العاصم اور عبد الباقی قائع استاذِ دارقطنی سے احادیث کی روایت کی اور پھر علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے- آپ نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ علم و فن کی خدمت، درس و تدریس، فقہ و افتا اور دیگر علمی مصروفیات میں صرف کیا- جس زمانے میں بغداد میں آپ کا قیام تھا۔ فقہ حنفی کی مملکت میں آپ ہی کا سکہ رائج الوقت تھا۔ آپ کی خدمات سے مسلک حنفی کو استحکام اور قرار ملا، آپ کے بحر علم سے لاتعداد تشنہ گان علوم نے سیرابی حاصل کی، ان میں قدوری، ابو بکر خوارزمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علمی جاہ جلال کی وجہ سے منصب قضا کے لیے دو مرتبہ نامزد کیے گئے لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے محدثین اور فقہا کے درمیان ثالثی کے فرائض انجام دیے جس کے نتیجہ خیز اثرات رونما ہوئے۔ آپ نے ۷رذی الحجہ ۳۷۰ھ میں بمقام نیشاپور وفات پائی- آپ علمی انہماک کے باوجود بہت سی قابل قدر تصانیف یادگار چھوڑیں- جن میں (۱) کتاب الاصول شرح الجامع الکبیر لشیبانی (۲) امام طحاوی کی المختصری فی الفقہ کی شرح اور تفسیر میں ''احکام القرآن'' قابل ذکر ہیں- (التفسیر و المفسرون ۲/ ۴۳۸)

علمائے اسلام کے نزدیک جصاص کی تفسیر فقہی تفسیر کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے جس میں آیات کے ذیل میں فقہی احکام، مسائل کا استنباط، اور اختلافی مسائل میں دلائل و براہین کا بکثرت تذکرہ ہے امام جصاص نے فقہی تفسیر کے نظریے کے مطابق اس کی ترتیب و تبویب بھی کی ہے- اور پوری تفسیر امام ابو حنیفہ کی تائید و تقویت اور دوسرے مسالک کی تردید سے عبارت ہے، یہی وجہ ہے اس میں آیتوں کی دیگر خصوصیات پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے-

ابو بکر محمد بن عبد اللہ بن محمد معافری اشبیلی مالکی (۴۶۸ھ/۵۴۳ھ): اسپین (اندلس) کے مشہور قاضی اسلام، حافظ حدیث، فقہی اصول و فروغ کے بے نظیر عالم، تاریخ و ادب کے رمز شناس اور علم تفسیر کے فقید المثال عالم قرآن علامہ ابن العربی مالکی کی ذات کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ زرکلی لکھتے ہیں کہ "بلغ رتبة الاجتهاد فی علوم الدین'' کہ ابن العربی علوم دینیہ میں مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے۔

ابن بشکوال کہتے ہیں۔ ''ختام علماء الاندلس و أخر أئمتها و حفاظها'' کہ ابن العربی اندلسی علما کی آخری کڑی، اور حفاظ وائمہ کرام کے سلسلے کا آخری حصہ ہیں۔ (الاعلام للزرکلی ۶/ ۱۰۶) ہیں۔

آپ اشبیلہ (Seville) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے ہمراہ آپ نے مشرق کا سفر کیا، بغداد، شام اور مصر کے مشہور فقہا مثلاً الطرطوشی، ابوبکر الشاشی اور الغزالی وغیرہ سے تحصیل علم کیا۔ اور علوم دینیہ پر کامل عبور حاصل کیا- بالخصوص ادب میں غیر معمولی مہارت حاصل کی ۔۴۸۹ھ میں حج کیا، ۴۹۳ھ میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو آپ دوبارہ اشبلیہ (Seville) تشریف لائے اور یہاں قاضی القضاء (Chief Justice) کے عہدہ پر فائز کیے گئے- اس کے بعد آپ فارس آ گئے اور یہیں ۵۴۳ھ/ ۱۱۴۸ء میں وفات پائی- علامہ ابن العربی نے جس جگہ بھی سکونت اختیار کی علم وفن اور تصنیف وتالیف سے ان کا تعلق ضرور جڑا رہا- آپ کی تصانیف کی تعداد ۴۰ سے زائد بتائی جاتی ہے مگر ان میں اکثر ناپید ہیں مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں-

(۱) العواصم من القواصم (۲) عارضة الاحوذی فی شرح الترمذی (۳) القبس (فی شرح المؤطا) (۴) الانصاف فی مسائل الخلاف (۲۰ جلدیں) (۵) اعیان الاعیان (۶) المحصول (اصول فقه میں) (۷) کتاب المتکلمین (۸) قانون التاویل (۹) احکام القرآن (تفسیر میں) (الاعلام للزرکلی ۶/۱۰۶) اردو دائرہ معارف اسلامیہ حیدرآباد ۱/۶۰۵ ان کی تفسیر فقہ مالکیہ میں اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے- ابن العربی مالکی تھے اس لیے فقہ مالکی کا دفاع اور اس کی پرزور تائید وحمایت کرتے ہیں- وہ احکامی آیات کی تفسیر میں نمبر وائز مسائل کا استخراج کرتے ہیں اور کسی آیت کی تفسیر میں فقہ سے متعلق اکثر چیزوں کو بیان کر ڈالتے ہیں۔ اختلافی مسائل میں ان کا مناظرانہ اسلوب خاص طور پر دیکھنے کے قابل رہتا ہے۔ ابن العربی اپنی باتوں میں مخلص ہیں۔ آپ افراط وتفریط سے الگ ہو کر اعتدال پسندی کی راہ پر گامزن ہیں کچھ لوگ ابن العربی پر ائمہ کے تئیں تعصب کا الزام عائد کرتے ہیں جو کسی طرح درست نہیں-

ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری قرطبی اندلسی مالکی (م ۶۷۱ھ /۱۲۷۳ء): امام قرطبی عظیم عالم دین عارف باللہ اور عابد شب زندہ دار تھے- دنیاوی کاموں سے الگ ہو کر ذکر وعبادت اور اخروی کاموں میں مصروف رہتے تھے- تکلف وتصنع سے پاک صاف سادگی کے دل دادہ تھے- عالم یہ تھا کہ صرف ایک لباس زیب تن کرتے اور سر پر ایک ٹوپی رہتی تھی- تمام اوقات اللہ کی عبادت وریاضت یا تصنیف و تالیف میں بسر کرتے تھے- آپ نے تصانیف کا بیش بہا ذخیرہ یادگار چھوڑا جو مندرجہ ذیل ہے-

(۱) الجامع الاحکام القرآن (۲۰ جلدیں) معروفه به تفسیر قرطبی (۲) قمع الحرص بالزهد والقناعة (۳) الاسنی فی شرح اسماء الحسنی (۴) التذکار فی افضل الاذکار (۵) التذکرة باحوال الموتیٰ واحوال الأخرة.

(الأعلام ۶/۲۱۸)

تفسیر قرطبی ایک معتدل، متوسط اور پاک باز صاحب بصیرت کی تالیف ہونے کی حیثیت سے اہل علم کے نزدیک معروف ومتداول ہے۔ قرطبی کے یہاں کچھ دوسرے مفسرین کی طرح شدت وسختی نہیں۔ مالکی ہونے کے باوجود اگر کوئی قوی دلیل وبرہان مذہب مالکی کے خلاف ہے تو اس وقت دلیل وحدیث کی پیروی کرتے ہیں لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں وہ تقلید کے مخالف ہیں جیسا کہ غیر مقلدین دلیل میں اس بات کو شدومد کے ساتھ پیش کرتے ہیں کیوں کہ جب حدیث صحیح مل گئی اور قرطبی نے اسی پر عمل کیا تو اب امام مالک کا صحیح مسلک ومذہب ان کے نزدیک وہی ہوا کیوں کہ امام مالک سے ثابت ہے کہ جب حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مسلک ہے۔ اس لیے یہ عمل تقلید کے خلاف نہیں بلکہ نظریہ تقلید کو مزید قوت عطا کر رہا ہے- قرطبی نے زیر نظر تفسیر احکام ومسائل کے استنباط واستخراج ہی کے تعلق سے مرتب کی ہے اس لیے یہی عنصر ان کے ہاں غالب ہے وہ آیتوں کی تفسیر میں نمبر وائز مسائل کا استخراج کرتے ہیں اختلافی مسائل میں تمام مسالک کے دلائل وبراہین ذکر کرنے کے بعد اپنی فیصلہ کن رائے سے نوازتے ہیں- تفصیل کے لیے کسی بھی آیت کے ذیل میں ان کی فقہی تفسیر کے شہد پارے دیکھے جاسکتے ہیں۔ (التفسیر والمفسرون ۲/۴۵۹/۴۶۰)

خلاصہ یہ کہ امام قرطبی کی تفسیر اپنی جامعیت غیر جانبداری اور اعتدال وتوازن کی وجہ سے اہل علم کے نزدیک زیادہ مسلم ومقبول ہے- امام قرطبی کے بارے میں مؤرخین کا ماننا ہے کہ ان کی قوت استخراج و استنباط اتنی تیز اور پختہ تھی کہ ایک آیت کی تفسیر میں مسائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ امام قرطبی اس وصف کے مالک ہوتے ہوئے آیتوں کی تفسیر کو اپنی فکر کے تابع نہیں بنایا بلکہ فقہا اور ائمہ مجتہدین نے جو اصول اور ضوابط فراہم کیے تھے اسی کے آئینے میں آپ

نے گفتگو کی ہے اور ان کے مسالک و مذاہب کو غیر جانب دارانہ طور پر بیان کیا۔ نیز کہیں کہیں مذہب مالکی کی قوت بھی ثابت کی ہے امام کا یہ عمل کھلے بندوں ان کے مقلد ہونے کا ثبوت فراہم کرر ہا ہے

قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی (۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء/ ۱۲۲۵-۱۸۱۰):

قاضی ثناء اللہ حنفی مجددی برصغیر کے نامور عالم دین اور بے مثال مفسر گزرے ہیں- مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے، دہلی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ- ۱۷۶۲ء) سے حدیث سنی اور دیگر اکابر علماو مشائخ دہلی سے علوم عقلیہ ونقلیہ حاصل کیے- حافظ محمد عابد لاہوری نقشبندی سے علم طریقت حاصل کیا نیز مشہور زمانہ صوفی حضرت شیخ مرزا مظہر جان جاناں سے بھی علم تصوف حاصل کیا- مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی باطنی خوبیوں کو دیکھ کر "علم الهدی" کا لقب دیا- تحصیل علم کے بعد قاضی صاحب وطن مالوف پہنچ کر تصنیف وتالیف اور علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت میں لگ گئے چنانچہ آپ نے تفسیر و کلام، تصوف اور دیگر علوم پر اپنی بیش بہا تصانیف کا ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ قاضی صاحب اپنے دور میں اپنی جودت طبع، صلابت فکر، اور پختگی عقل میں مشہور تھے اسی لیے پانی پت میں منصب قضا پر فائز رہ کر اس کا حق ادا کیا- آپ کی تحقیقی خدمات اور ذہانت کو دیکھ "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے آپ کو "بیہقی وقت" کا خطاب دیا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تیس سے زائد بتائی جاتی ہے-مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) وصیت نامه (۲) مالا بد منه (۳) ارشاد الطالبين (۴) جواهر القرآن (۵) شهاب ثاقب (۶) تذكرة المعاد (۷) رساله دراباحت و حرمت سرود (۸) رساله در مسئله سماع ووحدت وجود (۹) السيف المسلول (۱۰) رد مذهب شيعه (۱۱) رساله حرمت متعة اور (۱۲) التفسير المظهري

اپنی تفسیر میں قاضی صاحب نے محدثانہ عظمت دکھائی ہے، نیز علم قرأت لغت اور دیگر متعلقہ بحثوں کو بھی اختصاراً جگہ دی ہے- اس تفسیر میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ اس میں احکامی آیات کی تفسیر میں فقہی مسالک کا بیان ملتا ہے- اختلافی مسائل میں مختلف مسالک کے دلائل و براہین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تفسیر مظہری قدیم مفسرین کے اقوال کی جامع اور تاویلات صحیح سے مزین ہے-

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۶/۱۰۳۲-۱۰۳۳) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں تقلید کے متعلق مفسرین اور ان کی تفاسیر کے حوالے سے جس طرح کی بحثیں پیش کی گئیں اس کا مقصد یہ ہے کہ علوم قرآن اور اللہ کے کلام کے اسرار ورموز سے واقف کاروں کی ایک مستند اور معتبر جماعت جن کے علمی جاہ وجلال پر امت کا سواد اعظم یقین و ایمان رکھتا ہے وہ جماعت بھی تقلید کے سلسلے میں نیت کے اعتبار سے نہ صرف مخلص ہے بلکہ خود ان کا عمل بھی، اسی کا مطابق رہا ہے- یونہی قرآن کریم کی فقہی تفسیر میں بھی ان کا قلم شتر بے مہار کی طرح بہکا نہیں ہے اور نہ قلم نے خود ساختہ باتیں گڑھا ہے بلکہ مذاہب کے آئینے میں جو باتیں صحیح ہوسکتی تھیں، انہیں کو رقم کیا ہے، اگر کسی مفسر نے نکتہ آفرینی اور مسائل واحکام کے استنباط واختراع میں داد تحریر دی ہے، تو اس میں بھی ائمہ مجتہدین کے وضع کردہ اصول وضوابط کی پوری پوری پاسداری نظر آتی ہے- جب امت کا اتنا بڑا ثقہ گروہ ائمہ کی تقلید سے اپنے آپ کو آزاد نہیں گردانا تو آج کے اس علمی زوال اور قحط الرجال کے دور میں مسلمان کیوں کہ شرعی احکام ومسائل تقلید سے اپنے آپ کو آزاد کرسکتا ہے- یہ بات ائمہ تفسیر سے اندھی عقیدت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ وقت کی ایک ٹھوس اور ناقابل انکار حقیقت کا اظہار ہے، جس کے بغیر مسلمان ہی نہیں، کوئی بھی انسان ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا ہے- کیونکہ یہ دنیا کی ریت رہی ہے ہر ناواقف کار شخص اپنے سے زیادہ جاننے والے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے، اسی طرح وہ شرعی امور واحکام جن کو اللہ و رسول کے کلام سے براہ راست کوئی شخص اخذ نہیں کرسکتا ایسے مسائل میں اگر وہ مجتہدین کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس میں حیرت کیوں؟ جب کہ یہی فطری آزادی ہے ورنہ اگر ہر شخص شریعت میں بھی ہر طرح کی آزادانہ تجدد پسندی کا مظاہر کرنے لگے، جیسا کہ غیر مقلدین کرتے ہیں تو اسلامی شریعت کا اللہ ہی حافظ- جس طرح معاشرے میں زیادہ آزادی اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے، یونہی شریعت میں بھی نامناسب تجدد پسند اور ناموزوں آزادی کی وجہ سے عدم توازن کا شکار ہو جائے گی- اس لیے افراط وتفریط سے ہٹ توازن واعتدال کی راہ اپنانے میں قوم، ملت اور شریعت کی بھلائی ہے-

☆☆☆

مولانا دلشاد احمد قادری☆

مسانیدِ امامِ اعظم

سراج امت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا علم حدیث میں جو مقام ومرتبہ ہے، وہ کسی پر مخفی نہیں ہے، جہاں ایک جانب آپ امام الفقہ ہیں، وہی دوسری جانب آپ امام الحدیث بھی ہیں، بعض لوگ تعصب کی بنا پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ علم حدیث میں بہت کم درک رکھتے تھے، آپ کا علم حدیث میں مبلغ علم چند احادیث ہیں، ان متعصبین ومخالفین کی یہ الزام تراشی حقیقت سے انتہائی دور ہے، امام اعظم علیہ الرحمہ نے ہزار ہا مسائل کا استخراج واستنباط فرمایا، جس کے احسان سے امت مسلمہ تا قیامت سبکدوش نہیں ہوسکتی، یہ استخراج واستنباط آپ کی وسعت علم حدیث پر واضح طور پر دلالت کررہا ہے۔

استخراج مسائل سے صرف نظر آپ کی وسعت علم حدیث پر آپ کی مسانید بین ثبوت فراہم کرتی ہیں، جس کثرت سے مسانید ابی حنیفہ لکھی گئیں، شاید ہی کسی شخص کی مسانید لکھی گئیں ہوں، صحاح، سنن، جوامع، مسانید، معاجم وغیرہ مختلف عنوانات حدیث پر بے شمار کتابیں تالیف کی گئیں۔لیکن کسی ایک شخص کی روایت کو مستقل مجموعہ کی شکل میں قلم بند کرنے کا رواج نہ تو علمائے متقدمین کے دور میں ہوا اور نہ ہی علمائے متاخرین کے دور میں ہوسکا، میرے انتہائی ناقص ومحدود مطالعہ کی روشنی میں امام اعظم کی فرید العصر شخصیت ایسی ہے، جن کی روایات کے ساتھ معمول سے زیادہ اعتناء کیا گیا اور کثرت سے ان کی مسانید مرتب کی گئیں، مسانید ابی حنیفہ کو مرتب کرنے والے اشخاص معمولی نہیں ہیں، بلکہ اپنے زمانے کے ائمہ وقت اور حفاظ حدیث ہیں یہ حضرات خود اس لائق تھے کہ ان کی مسانید لکھی جائیں امام اعظم کی اس خصوصیت میں اگر آپ کا کوئی ہمسر ہوسکتا تھا تو وہ امام مالک علیہ الرحمہ کی ذات ہوسکتی تھی۔

ان مسانید کی موجودگی میں آپ پر یہ الزام لگانا کہ آپ کا مبلغ علم حدیث چند احادیث ہیں، انتہائی بے انصافی وبددیانتی کی بات ہے۔اب ہم ذیل میں ان محدثین وحفاظ حدیث کی تحقیق پیش کرتے ہیں، جنہوں نے امام اعظم کی مرویات کو مستقل طور پر علیحدہ تصنیفات میں مدون فرمایا ہے۔

(۱) حافظ ابن عساکر: -ابو القاسم علی بن الحسن الدمشقی الشافعی مشہور اور نامور محدث ہیں آپ کی ولادت ۴۹۹ھ میں اور وفات ۱۱ر رجب ۵۷۱ھ میں ہوئی - حافظ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں آپ کا ذکر ان الفاظ سے شروع کیا ہے ابن عساکر الامام الحافظ الکبیر محدث الشام فخر الائمة صاحب التصانیف والکتب (تذکرۃ الحفاظ، ص:۱۲۲، ج:۴) ابن عساکر حافظ کبیر محدث شام فخر ائمہ اور صاحب تصنیف شخص ہیں، حافظ ابن عساکر نے امام اعظم کی روایت کردہ احادیث کو یکجا فرمایا، ان کی تالیف کردہ کتاب مسند ابی حنیفہ کا ذکر محدث زاہر کوثری صاحب اور ڈاکٹر کرد علی صاحب نے بھی کیا ہے، ابن عساکر کی مسند ابی حنیفہ کا شمار جامع مسانید میں ہوتا ہے۔

(۲) حافظ ابن شاہین: -ابو حفص بن احمد بن عثمان بغدادی معروف بہ ابن شاہین کی ولادت باسعادت ۲۹۷ھ میں ہوئی اور آپ کا وصال ۳۸۵ھ میں ہوا آپ کا شمار بلند پایہ محدثین اور نامور مصنفین میں ہوتا ہے، آپ اپنی خود نوشت میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں نے تین سو تیس کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں تفسیر کبیر کے ایک ہزار، مسند کے تیرہ سو، تاریخ کے ڈیڑھ سو جز ہیں''۔

(تذکرۃ الحفاظ ص:۱۹۶، ج:۳)

حافظ ذہبی ان کے بارے میں رقم طراز ہیں: ابن شاهين الحافظ المفيد المكثر محدث العراق صاحب التصانيف (تذکرۃ الحفاظ ص:۱۹۵، ج:۳) ابن شاہین محدث عراق، صاحب تصانیف، حافظ حدیث تھے۔انہوں نے محمد بن الباغندی، محمد بن ہرون الحضر اور ابوحبیب بن العباس وغیرہ سے احادیث سنی اور کثیر لوگوں نے آپ سے روایت کی ہے، حافظ ابن شاہین نے امام اعظم کی جو مسند لکھی ہے، اس کا تذکرہ محمد زاہد کوثری نے اپنی تالیف 'تانیب الخطیب فی ماساقه فی ترجمة ابی حنیفة من الاکاذیب'' میں کیا ہے۔

(۳) حافظ ابن خسرو: -ابو عبد اللہ حسین بن محمد بن خسرو البلخی

☆Madrasa Alia Qadria,Molvi Mohalla,Budaun(U.P)

المتوفی ۵۲۲ھ بڑے پائے کے محدث گزرے ہیں، فن حدیث میں حافظ ابن عساکر کو آپ سے شرف تلمذ حاصل تھا، انہوں نے طلب حدیث میں بڑی جانفشانی سے کام لیا، یہاں تک کہ ان شیوخ سے بھی سماعت حدیث کی جو خود نیچے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، دور دراز سے آنے والے تشنگان علم حدیث کو سیراب کیا اور امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی مسانید کو جمع فرمایا، آپ فقاہت میں بھی یکتائے زمانہ تھے، حافظ شمس الدین ابو المحاسن محمد علی حسینی المتوفی ۷۶۵ھ نے صحاح ستہ، موطا، مسند شافعی، مسند احمد اور مسند ابی حنیفہ کے رجال کے حالات ایک مبسوط کتاب میں تحریر فرمائے ہیں۔ جس کا نام **التذکرة برجال العشر** ہے اس میں حافظ حسینی نے امام ابوحنیفہ کی تمام مسانید میں سے جس مسند کا انتخاب کیا ہے، وہ حافظ ابن خسرو کی مسند ہے، اس انتخاب سے ابن خسرو کی تالیف کردہ مسند ابی حنیفہ کے مرتبے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۴) حافظ محمد بن مخلد بن حفص وری: - ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے اور عطاء کی نسبت سے شہرت ہے، ۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۱ھ میں وفات ہوئی، فن حدیث کی تحصیل یعقوب دورقی زبیر بن بکار، حسن بن عرفہ اور امام مسلم بن حجاج وغیرہ سے کی، ان سے دارقطنی، ابن عقدہ اور ابن اعظفر جیسے اکابر حفاظ نے اس فن عظیم کو حاصل کیا۔ ("تذکرة الحفاظ" ۳/ ۸۲۸، دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان ۱۳۷۴ھ) میں ذہبی لکھتے ہیں "**کان معروفا بالثقة والصلاح والاجتهاد فی الطلب**" محمد مخلد ثقاہت صلاح و نیکی اور طلب حدیث کے لیے کوشش کرنے میں معروف و مشہور تھے، محدث دارقطنی سے ایک بار ان کے متعلق دریافت کیا گیا، آپ نے جواب دیا ھو ثقة مامون وہ ثقہ مامون ہیں، حافظ ابن مخلد رحمۃ اللہ علیہ نے امام اعظم ابوحنیفہ کی روایات کو ایک مستقل تالیف میں علیحدہ جمع فرمایا ہے، جس کا ذکر محدث خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد میں متعدد جگہ آیا ہے۔ لہٰذا محمد ابن الحسن بن الوازع ابو داؤد الجمال کے تذکرة میں لکھتے ہیں "**روی عنه محمد بن مخلد الدوری فی جمعه حدیث ابی حنیفة**" ان سے محمد بن مخلد دوری نے اپنی کتاب جمع حدیث ابی حنیفہ میں روایت کی ہے۔

(۵) حافظ محمد بن المظفر: - ابوالحسین محمد بن المظفر بغدادی کی ولادت ۲۸۶ھ میں ہوئی، کم سنی سے ہی حدیث کی سماعت شروع کر دی، جب آپ کی عمر صرف چودہ سال تھی، اسی وقت سے آپ طلب حدیث میں مصروف ہو گئے۔ طلب حدیث کے سلسلے میں مصر، شام، جزیرہ اور عراق کی خاک چھانی، انہوں نے امام محمد بن جریر طبری سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا، اکابر محدثین دارقطنی، ابن شاہین، برقانی اور ابونعیم جیسے اپنے وقت کے یگانہ روزگار حضرات نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔ دارقطنی نے ہزار ہا احادیث کریمہ کی سماعت آپ سے کی ہے، اسی سبب دارقطنی آپ کی انتہائی تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ کبھی آپ کی موجودگی میں سہارا لگا کر نہیں بیٹھے، ہمیشہ آداب تلمذ کو پیش نظر رکھ کر باادب بیٹھے۔ حافظ امام ذہبی اپنی شہرہ آفاق کتاب تذکرۃ الحفاظ میں آپ کے بارے لکھتے ہیں "**محمد بن المفظر الحافظ الامام الثقة محدث العراق**" (تذکرۃ الحفاظ ص: ۳/ ۱۸۹) حافظ و امام محمد بن مظفر ثقہ اور محدث عراق تھے۔ پھر آگے چلے کر لکھتے ہیں: "**وجمع والف و عن مطالق هذا الفن لم يتخلف روى عنه الدار قطنى و ابن شاهين و ابو الفتح ابى الفوراس و المالينى و ابو نعيم**" انہوں نے احادیث جمع فرمائی اور کتب تالیف فرمائی، جو اس مبارک فن کے اصول سے تجاوز نہیں کرتی ہیں، ان سے دارقطنی، ابن شاہین، ابوالفتح ابی الفوارس، المالینی اور ابو نعیم نے روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے "**تعجیل المنفعة بزوائد رجال الائمة الاربعة**" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے جو مسند ابی حنیفہ لکھی ہے، وہ حافظ ابوبکر المقری کی مسند ابی حنیفہ کے برابر ہے، جس میں صرف امام ابوحنیفہ سے مروی احادیث مرفوعہ درج نہیں اور یہ امام حارث کی تصنیف سے چھوٹی ہے۔

(۶) حافظ ابونعیم اصبہانی: - حافظ ابونعیم اصبہانی مشہور محدث اور مصنف ہیں ۳۳۶ھ میں ولادت ہوئی، صغر سنی میں ہی ساری دنیا کے مشہور مشائخ کرام سے روایت حدیث کی اجازت مل چکی تھی، حافظ ذہبی ان کے متعلق لکھتے ہیں: "**له تهيا له من لقى الكبار مالم يقع لحافظ**" کبار محدثین سے جس قدر ان کو شرف ملاقات حاصل ہوا وہ کسی اور حافظ حدیث کو نہ ہو سکا، امام ذہبی نے آپ کا ذکر تذکرۃ الحفاظ میں "**ابو نعيم الحافظ الكبير محدث العصر**" کے الفاظ سے کیا ہے (تذکرۃ الحافظ ص: ۲۹۱، ج: ۳ مطبع دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد) حافظ ابونعیم نے ضخامت کے اعتبار سے اگرچہ چھوٹی مسند ابی حنیفہ لکھی ہے۔ مگر وہ بہت جامع ہے، انہوں نے انتہائی تحقیق کے بعد اس کے

متابعات کوذکر کیاہے، نیز رواۃ کے اوہام کی بھی نشاندہی کر دی ہے-

(۷) حافظ ابن المقری: -حافظ ابن المقری اصبہانی بڑے مشہور مصنف اور اکابر حافظ حدیث میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں، فن حدیث میں امام طحاوی کے شاگرد ہیں اور ان کی مشہور و معروف تصنیف ''شرح معانی الآثار'' کے ان سے راوی ہیں، کثیر لوگوں نے آپ سے روایت کی ہے، حافظ امام ذہبی ان بارے میں فرماتے ہیں ''محدث کبیر، صاحب مسانید سمع مالا یحصی کثرۃ'' وہ محدث کبیر عالم مسانید ہیں اور بے شمار احادیث نبویہ کی سماعت کی، خود ابن المقری کا بیان ہے کہ میں نے طلب حدیث میں چار مرتبہ مشرق و مغرب کا سفر کیا ہے، آپ کی وفات ۳۸۱ھ میں ہوئی، انہوں نے ''مسند ابی حنیفہ'' لکھی، جس کا اعتراف امام ذہبی کو بھی ہے، تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں وقد صنف مسند ابی حنیفۃ'' انہوں نے مسند ابی حنیفہ تصنیف فرمائی (ص: ۳/۱۸۳) حافظ زین الدین قاسم بن قطلو بغا نے ابن المقری کی مسند ابی حنیفہ کے رجال کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے، حافظ قاسم نے اس مسند کی احادیث کو ابواب فقہیہ پر بھی مرتب کیا ہے-

(۸) حافظ عصر ابن عقدہ: -عقدہ آپ کے والد کا نام تھا جو ایک نیک سیرت، وجیہہ صورت شخص تھے اور نحو کی تعلیم دیا کرتے تھے، حافظ ذہبی نے ابن عقدہ کو حافظ عصر اور محدث بحر کے لقب سے ملقب کیا ہے، پھر آگے چل کر ان کے بارے میں لکھتے ہیں ''وکان الیہ المنتہی فی قوۃ الحفظ و کثرۃ الحدیث و صنف و جمع فی الابواب والتراجم'' (تذکرۃ الحفاظ ص: ۳/۸۵) قوۃ حافظ اور کثیر حدیث کی ان پر انتہا ہوگئی، انہوں نے ابواب و تراجم کے دونوں عنوانوں کے تحت تصنیف و تالیف کی، اور احادیث جمع فرمائی- حافظ ابن الجوزی المنتظم میں لکھتے ہیں کہ آں موصوف خود اکابر حفاظ میں سے تھے اور ان سے اکابر حفاظ ابوبکر بن الجعائی، عبد اللہ بن عدی طبرانی، ابن المظفر، دارقطنی اور ابن شاہین نے احادیث روایت کی ہیں، حافظ بدرالدین محمود عینی شارح بخاری نے ''تاریخ کبیر'' میں لکھا ہے کہ ''ان مسند ابی حنفیۃ لا بن عقدہ یحتوی وحدہ علی مایزید علی الف حدیث'' ابن عقدہ کی مسند ابی حنیفہ ایک ہزار سے زائد احادیث پر مشتمل ہے-

(۹) حافظ ابن عدی: -ابو عبد اللہ بن عدی کی ۲۷۷ھ میں ولادت ہوئی -فن جرح و تعدیل میں ان کا بڑا شہرہ ہے، فن جرح و تعدیل میں شہرۂ آفاق کتاب ''الکامل فی الجرح والتعدیل'' تصنیف فرمائی، حدیث میں امام نسائی اور ابو یعلی موصلی کے شاگرد ہیں، حافظ نے بہت جامع مسند ابی حنیفہ لکھی ہے اور اس مسند کے دیباچہ میں امام ممدوح کے مناقب و فضائل بھی ذکر کیے ہیں-

(۱۰) حافظ دار قطنی: -ابو الحسن علی بن عمر مشہور معروف محدث اور صاحب تصانیف شخص ہیں، ۳۰۶ھ میں ان کی پیدائش ہوئی اور ۳۸۵ھ میں وفات پائی، دارقطنی نے امام اعظم ابوحنیفہ کی جو مسند لکھی ہے اس کا ایک نسخہ خطیب بغدادی کے پاس بھی تھا-

(۱۱) حافظ ابو القاسم: -عبد اللہ بن محمد ابی العوام السعدی المتوفی ۳۳۵ھ یہ امام نسائی اور امام طحاوی کے شاگرد رشید ہیں، آپ نے امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے مناقب میں بھی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، یہ مسند ابی حنیفہ بھی اسی کتاب کا ایک جزو ہے، یہ مصر میں عہد قضاء پر بھی فائز رہے ہیں-

(۱۲) مسند الدنیا: -قاضی ابو بکر محمد بن عبد الباقی المعروف بقاضی المرستان بہت مشہور محدث تھے، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابو القاسم اسماعیل اصفہانی کے تذکرہ میں ان کا ذکر بھی کیا ہے، ترانوے سال کی عمر میں بھی ان کے حواس میں ذرا تغیر نہیں ہوا-سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا-

المیز ان میں حافظ ابن خسرو کے تذکرہ میں اس امر کے ماننے سے انکار کیا ہے کہ قاضی صاحب موصوف نے امام ابوحنیفہ کی کوئی مسند تالیف کی ہے، حالانکہ خود ان کے نامور شاگرد حافظ شمس الدین سخاوی قاضی صاحب سے ان کی مسند کو بسند ذیل روایت کرتے ہیں عن التدمری عن المیدوی عن النجیب، عن ابن الجوزی عن جامع المسند قاضی المرستان اور حافظ عبد القادر قرشی نے ''الجواہر المضیہ'' میں نصر بن سیار بن صاعد کے تذکرہ میں حافظ سمعانی سے نقل کیا ہے کہ:

''میں نے نصر سے امام ابوحنیفہ کی کتاب الاحادیث کا سماع کیا، جس کو عبد اللہ بن محمد بن انصاری نے جمع کیا ہے، نصر اس کتاب کی روایت اپنے دادا صاعد سے کرتے ہیں اور صاعد خود قاضی صاحب سے-محدث خوارزمی نے بھی جامع المسانید میں اس کتاب کی متعدد

سندیں اپنے سے لے کر قاضی مرستان تک ذکر کی ہیں۔

(۱۳) حافظ طلحہ: ۔طلحہ بن محمد جعفر الشاہد ابو القاسم ۲۹۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۸۰ھ میں وفات پائی اور اپنے وقت کے بے مثال محدث ہیں، علامہ خوارزمی لکھتے ہیں، حافظ تقی الدین سبکی نے ''شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام'' میں ان کی مسند سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے، جس کی سند ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ ''وفی مسند الامام ابی حنیفہ رحمہ اللہ کی تصنیف ابی القاسم طلحہ بن جعفر الشاھد العدل حدثنی'' محدث خوارزمی نے ان کی مسند کے متعلق لکھا ہے کہ وہ حروف معجم پر مرتب ہے۔

(۱۴) حافظ اشنانی: ۔یہ نامور محدث اور صاحب تصانیف شخص ہیں، حافظ طلحہ بن محمد ان کے بارے میں لکھتے ہیں ''کان من اجلۃ اصحاب الحدیث المجو دین واحد الحفاظ و قد حدث حدیثا کثیرا، حمل الناس عنہ قدیما و حدیثا'' یعنی یہ بڑے پایہ کے جلیل القدر محدثین اور حفاظ حدیث میں سے تھے، انہوں نے کثرت سے احادیث بیاں کی ہیں اور لوگوں نے ہر دور میں ان سے روایات کی ہیں، انہوں نے امام ابوحنیفہ کی جو مسند تالیف کی ہے، محدث خوارزمی نے اس سے جامع المسانید میں نقل فرمائی ہے۔

(۱۵) امام حارثی: ۔مشاہیر ائمہ احناف میں سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے رسالہ ''الانتباہ'' میں ان کو اصحاب الوجوہ میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اپنے زمانے میں فقہائے حنفیہ کا مرجع تھے۔ فقہ کی تحصیل آپ نے امام ابوحفص صغیر سے کی تھی، طلب حدیث میں امام حارثی نے خراسان، عراق اور حجاز کا سفر کیا اور بہت سے شیوخ وقت سے اس فن عظیم کی تحصیل کی۔ ماہر فن رجال امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں قاسم بن اصبغ کے ترجمے میں بضمن وفیات ۳۴۰ھ ان کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا ہے، امام ذہبی لکھتے ہیں: ''فیھا مات عالم ماوراء النھر و محدثہ الامام العلامۃ ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن یعقوب بن الحارث الحارثی البخاری الملقب بالاستاذ جمع ابی حنیفۃ الامام ولہ اثنتان و ثمانون سنۃ (تذکرۃ الحفاظ، ص:۷۲، ج:۳)

اسی سال ماوراء النہر کے عالم حدیث علامہ ابومحمد عبد اللہ بن محمد بن یعقوب بن الحارث الحارثی کی وفات ہوئی، جن کا لقب استاذ تھا، انہوں نے امام ابوحنیفہ کی مسند جمع فرمائی، بیاسی سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تعجیل المنفعہ میں ان کو حافظ حدیث تسلیم کیا ہے، بڑے بڑے حفاظ حدیث جیسے حافظ ابن مندہ، حافظ ابن عقدہ اور حافظ ابوبکر جعائی فن حدیث میں ان کے شاگرد تھے۔

(۱۶) حافظ ابن القیسرانی: ۔ابو الفضل محمد بن طاہر بن علی معروف بہ ابن القیسرانی ۴۴۸ھ میں پیدا ہوئے اور ماہ ربیع الاول ۵۰۷ھ کو وفات پائی۔ بہت بڑے حافظ حدیث گزرے ہیں، طلب حدیث میں اتنا سفر طے کیا کہ دو مرتبہ پیشاب سے خون آنے لگا، یہ برہنہ پا بغیر سواری کے سفر کرنے کا نتیجہ تھا، رجال و متون کی بڑی معرفت رکھتے تھے، کثیر التصانیف تھے، انہوں نے اطراف احادیث ابی حنیفہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس کتاب کا ذکر ان کی مشہور تصنیف ''الجمع بین الرجال الصحیحین'' کے آخر میں موجود ہے، اطراف پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں متن حدیث کے ابتدائی ٹکڑے کو مع سند کے بیان کی جاتی ہیں، اس لیے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں امام ابوحنیفہ کی مختلف مسانید سے ان کی حدیث کے اطراف کو لے کر جمع کر دیا ہے۔

(۱۷) محدث عیسی الجعفری المغربی: ۔محدثین متاخرین میں سے ہیں، ان کی وفات ۱۰۸۰ھ ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ''انسان العینین فی مشائخ الحرمین'' میں ان کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

''یکے از علماء متقنین بود و وے استاد جمہور اہل حرمین است و یک از ادعیہ حدیث'' (محدث عیسی الجعفری) ثقات میں سے ہیں اور جمہور اہل حرمین کے استاد ہیں، نیز داعی حدیث ہیں، محدث عیسی باوجودیکہ دور آخر کی پیداوار ہیں اور ان کا زمانہ بہت ہی بعد کا ہے تاہم جس شان کی انہوں نے امام اعظم ابوحنیفہ کی مسند تالیف کی اور جن شروط کا اس میں اہتمام کیا وہ خود شاہ صاحب ہی کی زبان سے سننے کے لائق ہے فرماتے ہیں:

''مسند برائے امام ابوحنیفہ تالیف کردہ در آنجا عنعنہ متصلہ ذکر کردہ در حدیث از آنجا بطلان زعم کسانیکہ گویند سلسلہ حدیث امروز متصل نماندہ واضح تر می گردد''

انہوں نے امام ابوحنیفہ کی ایک ایسی مسند تالیف کی ہے کہ جس میں اپنے سے لے کر امام موصوف تک حدیث کے اتصال سند کو بیان کیا ہے اور یہاں سے ان لوگوں کے دعویٰ کا باطل ہونا خوب ظاہر ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا سلسلہ آج کل متصل نہیں رہا۔

فی الجملہ یہ ان مشاہیر کرام کا تذکرہ تھا جو میدان حدیث کے ماہرین ہیں، ان میں سے ہر ایک نے امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کی مرویات کو مستقل تصانیف میں اپنی اسانید کے ساتھ جمع کیا ہے، پھر قاضی القضاۃ ابوالموید محمد بن محمد خوارزمی المتوفی ۶۵۵ھ نے جامع مسانید الامام الاعظم میں امام اعظم کی مسانید کے پندرہ نسخوں کو یکجا جمع کرنے کی قابل ستائش کوشش کی ہے- چنانچہ جامع مسانید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے شام میں بعض جہلاء کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ امام ابو حنیفہ کی کوئی مسند نہیں ہے اور وہ فقط چند احادیث کے راوی ہیں، یہ سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا اور مجھے حمیت مذہبی نے آگھیرا، میں نے اسی وقت یہ عزم مصمم کرلیا کہ امام اعظم کی ان پندرہ مسانید کو جنہیں یکتائے روزگار علماء ومحدثین کی جماعت نے بڑی جانفشانی کے ساتھ مرتب کیا ہے، یکجا کروں گا''

خوارزمی کی جامع مسانید کا ذکر شاہ عبدالعزیز صاحب نے بھی بستان المحدثین میں کیا ہے فرماتے ہیں کہ:

''مسند حضرت امام اعظم کہ بالفعل مشہور است تالیف قاضی القضاۃ ابوالموید محمد بن محمد الخوارزمی است، کہ در سنہ شش صدو ہفتاد وچہار آنرا رائج ساختہ، مسانید امام اعظم را کہ علماء سابق پر داختہ بودند دریں سند جمع کردہ بزعم خود ہیچ چیز راازمرویات امام اعظم درک نہ کردہ وقبل از وے ہر چند مسانید بسیار برای مرویات امام اعظم ساختہ بودند چنانچہ خودش در خطبہ ایں مسند نام آنہا و مصنفین آنہا و سند خود بآں مصنفین بیاں نمودہ امابیشہ رائج ومشہور دو مسند بود و تا حال موجود و متد اول است اول مسند حافظ الحدیث عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی، دویم مسند حافظ الوقت حسین بن محمد بن خسر ورحمۃ اللہ علیہ چنانچہ اجازت ایں ہر سہ براقم حروف نیز از شیوخ خود رسیدہ''

ترجمہ: مسند امام اعظم جو دور حاضر میں مشہور ومعروف ہے قاضی القضاۃ ابوالموید محمد بن محمد الخوارزمی کی تالیف ہے، جس کو انہوں نے ۶۷۴ھ میں رواج دیا ہے، علمائے سابقین نے جن مسانید امام اعظم کی تالیف کی، خوارزمی نے ان کو اپنی مسند میں جمع کر دیا ہے اور اپنے خیال میں امام اعظم کی مرویات میں سے کوئی چیز ترک نہیں کی، ان سے پہلے بھی اگر چہ بہت سی مسندیں امام اعظم کی مرویات کے سلسلہ میں لکھی گئیں ہیں- چنانچہ خود خوارزمی نے اس مسند کے دیباچہ میں ان کے نام اور ان کے مصنفین کے نام اور ان مصنفین تک اپنی سند کو بیان کیا ہے- لیکن ان میں زیادہ تر مشہور اور رائج دو مسندیں رہی ہیں جو تاحال موجود ومتداول ہیں، اول مسند حافظ الحدیث عبداللہ بن یعقوب الحارثی، دوم مسند حافظ الوقت حسین بن محمد بن محمد خسرو، لہٰذا ان تینوں مسندوں کی اجازت راقم الحروف (شاہ ولی اللہ) کو اپنے اساتذہ سے پہنچی ہے-

مسند ابی حنیفہ کا علمی مقام: -شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے '' قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین'' میں مسند ابی حنیفہ کو احناف کی امہات کتب میں شمار کیا ہے، فرماتے ہیں کہ ''مسند ابی حنیفہ کہ آثار محمد بنائے فقہ حنفیہ است،، فقہ حنفی کی اساس مسند ابی حنیفہ اور آثار امام محمد پر ہے، حافظ حسینی فرماتے ہیں کہ:

'' مسند الشافعی موضوع لادلة علی ماصح عنده مروياته و كذالک مسند ابی حنیفه'' مسند امام شافعی ان ادلہ پر مشتمل ہیں کہ جو امام ممدوح کی مرویات میں ان کے نزدیک صحیح ہیں اور یہی حال امام ابو حنیفہ کا ہے-

حافظ حسینی علیہ الرحمہ نے اس امر کا واضح طور پر اعتراف واقرار کیا ہے کہ مسند امام شافعی کی طرح امام ابو حنیفہ کی مسند بھی امام ممدوح کے ان ادلہ پر مشتمل ہے، جو امام کی مرویات میں ان کے نزدیک صحیح تھے، یہ حسینی حنفی المذہب نہیں بلکہ شافعی ہیں اور ان کا شمار معمولی محدثین میں نہیں، حفاظ وقت اور ناقدین فن میں ہے، علامۃ الدہر شافعی المذہب عبدالوہاب شعرانی کی رائے مسانید امام حنیفہ کی نسبت ملاحظہ کیجیے- فرماتے ہیں:

وقد من الله تعالیٰ علی بمطالعة مسانيد الا مام ابی حنيفه الثلاثة من نسخته صحيحة عليها خطوط الحفاظ آخرهم الحافظ الدمياطی فرائيته لا يروی حديثا الا عن خيار التابعين العدول الثقات الذين هم من خير القرون بشهادة رسول الله عليه وسلم كالا سد و علقمة و عطاء، مجاهد و مكحول والحسن البصری واضرابهم رضی الله عنهم اجمعين- فكل الرواة الذين هم بينه وبين رسول الله صلی الله عليه وسلم ولا منهم بكذب و ناهيک يا اخی بعد الته من ارتضا هم الا مام ابو حنيفه رضی الله عنه لان يا خذ عنهم احكام دينه مع شدة تروعه و تحرزه و شفقته علی الامة المحمدية-

ترجمہ: اللہ رب العزت کا مجھ پر احسان عظیم رہا کہ امام ابوحنیفہ کی تین مسندوں کا ان کے صحیح نسخوں سے مطالعہ کرنے کی توفیق ملی، ان نسخوں پر حفاظ حدیث کے قلم کی تحریریں تھیں، جن میں آخری شخص حافظ دمیاطی ہیں، مطالعہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ امام اعظم صرف ان تابعین کرام سے احادیث روایت کرتے ہیں جو اپنے وقت کے برگزیدہ ترین، عادل اور ثقہ حضرات تھے اور حدیث نبوی کی تصریح کے مطابق خیر القرون کے لوگ تھے، جیسے کہ اسود، علقمہ، عطا، مجاہد، مکحول اور حسن بصری، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین- لہٰذا تمام وہ رواۃ جو امام اعظم ابوحنیفہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ہیں، سب کے سب عادل ثقہ نیک اور برگزیدہ ہیں، ان میں کوئی شخص نہ کذاب ہے اور نہ ہی اس پر کذب کی تہمت لگائی گئی ہے- میرے عزیز ان کی عدالت کے لیے تمہیں یہی کافی ہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے باوجود شدت ورع واحتیاط اور امت محمدیہ کا خاص خیال رکھنے کے، ان حضرات کو اس غرض کے لیے منتخب کرلیا کہ ان سے دینی احکام کو حاصل کریں-

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

''**کل حدیث و جدناہ فی مسانید الامام الثلاثۃ فھو صحیح** '' امام اعظم کی تینوں مسندوں میں ہم نے جو بھی حدیث پائی وہ صحیح ہے-

یہ بات آپ کے ذہن نشیں رہے کہ اس بحث سے قبل امام شعرانی خود یہ تصریح کرچکے ہیں کہ

''**انی لم اجب عن الامام ابی حنیفہ و غیرہ بالصدرو احسان الظن کما یفعل ذالک غیری و انما اجیب عنہ بعد التتبع والفحص** '' میں امام ابوحنیفہ وغیرہ کے متعلق وسعت صدر اور حسن ظن کی بنا پر کوئی جواب دہی نہیں کروں گا، جیسا کہ دوسرے لوگ کرتے ہیں، بلکہ جو کچھ بھی جواب دوں گا وہ تلاش وتتبع کے بعد دوں گا-

امام شعرانی کے اس بیان سے آپ پر روشن ہو چکا ہوگا کہ مسانید امام ابوحنیفہ کے بارے میں جو رائے انہوں نے قائم کی ہے، وہ محض حسن ظن کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ وہ پوری تحقیق اور تتبع کے بعد ہے-

ان مسانید کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کا علم حدیث میں کیا مقام ومرتبہ ہے اور ان متعصبین کی الزام تراشی کس قدر زمینی حقیقت سے دور ہے- ☆☆☆

بقیہ: سعودی حکومت کے نظریات اور عملی کردار

ایک موقع سے سلفی خطیب معراج الدین ربانی سے کسی نے پوچھا کہ مسجدوں میں منارے بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جواب ملا، حرام ہے- سائل نے موقع گنوائے بغیر استفسار کرلیا کہ منارے تو حرمین شریفین میں بھی ہیں؟ جس کے جواب میں ''فضیلۃ الشیخ'' معراج الدین ربانی ''گویا'' ہوئے- شاہ فہد سے پوچھو کہ انہوں نے کیوں بنوائے ہیں- یہ ہے ایک بڑے ہندوستانی سلفی خطیب کا مبلغ علم واختیار جو شب وروز سیدھے سادے عوام کو عقائد وعبادات کو گولیا کھلاتا رہتا ہے- بدقسمتی سے میں مذکورہ سوال وجواب کی مجلس میں شریک تھا، یہ تو خیر کم وبیش آٹھ سال پرانا حادثہ ہے، جو میری نظروں کے سامنے پیش آیا تھا- حال تو یہ ہے کہ برصغیر کے سلفی معاشرہ میں شب وروز اس طرح کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے- ہمارے پاس سلفیوں سے کرنے کے لیے کچھ سوالات ہیں- وہ یہ ہیں کہ کیا واقعی امام ابوحنیفہ عجمی تھے؟ اگر درست مان بھی لیا جائے تو کیا ان کی عجمیت منصب امامت فی الفقہ کے منافی ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ ان کو صرف سات حدیثیں یاد تھیں؟ کیا ابن خلدون کی سات حدیث والی روایت صحیحین میں موجود ہے کہ آپ نے اسے آنکھ بند کرکے تسلیم کرلیا؟ کیا واقعی ہدایہ سیکس کی کتاب ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے، تو یہ باتیں نوجوان سلفی طلبہ کی زبان پر کیسے آتی ہیں؟ کیا یہ سوالات عرب وعجم میں پھیلے ہوئے ملت اسلامیہ کے سواد اعظم اور ائمہ فقہ کے خلاف درون خانہ پکنے والی کھچڑی کی چغلی نہیں کھاتے؟

سلفی برادران کے لیے میری نصیحت نہیں بلکہ ان سے التجا ہے کہ اگر وہ شیخ ابن تیمیہ سے لے کر آج تک کے سعودی اور غیر سعودی علماء ہی کو اپنا مقتدی مانتے ہیں، تو مانیں- ہمارے کہنے سے وہ باز کیوں آئیں گے، لیکن رفع الملام عن الائمۃ الاعلام'' دائمی کمیٹی کے فتاوی اور شیخ سلمان فہد العودہ کی کتاب '' افعل ولاحرج'' اور اس جیسی دوسری کتابوں کا مطالعہ کریں- اسلام، قوانین اسلام، ائمہ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف زبان کھولنے میں محتاط رہیں- اپنے معاشرہ میں احترام اور رواداری کو فروغ دیں- بصورت دیگر اگر ایک اور نئے فرقہ کی بنیاد مقصود ہو تو اس میں دیر نہ کریں- اسلام کے بیٹوں نے اسے انتشار وافتراق کے اتنے زخم دیئے ہیں کہ وہ اس کا عادی ہو چکا ہے- ایک اور زخم کو برداشت کرلے گا- اللہ کی زمین بڑی ہے، جگہ بھی مل جائے گی اور دو چار ہزار ماننے والے بھی مل جائیں گے- لیکن اپنا نیا نام بھی منتخب کرلیں- ملت اسلامیہ پر احسان ہوگا-

مولانا ملک الظفر سہسرامی☆

فقہ حنفی پر غیر مقلدوں کے اعتراضات کا ایک تنقیدی جائزہ

احکام اسلامی کا پہلا سرچشمہ قرآن مقدس ہے اور اسی کے فرمان کے مطابق احکام خداوندی کی تمام تفصیلات اور قرآن کی منشا ومراد کو احادیث کی تجلیات کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دونوں کا محتاج بنایا ہے، ایک داخلی نور دوسرا خارجی، اور بلاشبہ ایک کے بغیر دوسرا ادھورا اور نامکمل۔ داخلی نور کے بغیر خارجی نور سے گوہر مقصود حاصل نہیں ہو سکتا تو دوسری طرف خارجی نور کے بغیر صرف داخلی نور کے ذریعہ منزل کا نشان پالینا بہت دشوار ہے۔ اندھا جو داخلی نور سے محروم ہے وہ خارجی نور کے ذریعہ مقصود حاصل کرنے میں ناکام اور اندھیرے میں ہماری آنکھیں ناکام۔ ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو ہم اندھیرے میں ٹاک ٹویاں مارتے رہ جائیں گے۔ بلاشبہ قرآن خارجی نور ہے اور حدیث داخلی نور ہے، قرآن مقدس آفتاب ہے تو احادیث نبویہ ہماری آنکھوں کا نور، حدیث کے بغیر قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا اور قرآن کے بغیر حدیث کا صحیح فہم نصیب نہیں ہو سکتا۔ اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا احسان عظیم ہے کہ انہوں نے نہ صرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے اپنے نگار خانہ حیات کو سجایا، سنوارا، بلکہ انہیں اپنے مقدس سینوں میں نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ محفوظ رکھ کر آئندہ نسلوں تک منتقل فرمادیا اور اسی طرح ان کے بعد کی نسلوں نے مشکوۃ صدر نبی سے رونما ہونے والی تجلیات میں اپنی دینی ودنیاوی زندگی کی سمت کا صحیح تعین کرنے میں راہنمائی حاصل کی اور پھر انہیں بعد کی نسلوں تک بحفاظت تمام منتقل فرمادیا۔ اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے احادیث رسول کی صیانت وحفاظت میں جو تاریخ ساز اور قابل ذکر کردار ادا کیا ہے وہ یقیناً اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ ایک ایک حدیث کی سماعت کے لیے لمبی لمبی مسافت طے کی جاتی۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تو احادیث کو ضبط تحریر میں لانے کا کوئی باقاعدہ مزاج ومنہاج نہ تھا، بلکہ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس کی ممانعت فرمادی تھی اور یہ حکم دیا تھا کہ آیات قرآنیہ لکھی جائیں، احادیث طیبہ نہ لکھی جائیں، مبادا التباس ہو جائے، لیکن اس عہد مسعود میں بھی جن حضرات کو اپنی یادداشت پر مکمل بھروسہ تھا اور التباس سے بے خوف تھے، وہ آیات قرآنیہ کے ساتھ احادیث نبویہ کو بھی ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام فرمانے لگے۔ ۹۹ھ میں جب حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو انہوں نے ذخیرۂ احادیث کو ضبط تحریر میں لانے کا باقاعدہ نظم فرمایا، چنانچہ انہوں نے حضرت ابوبکر بن حزم رضی اللہ عنہ کو جو مدینہ منورہ میں محکمہ قضا میں خلیفہ کے نائب تھے، احادیث جمع کرنے کی ذمہ داری سونپی اور فرمایا کہ جو احادیث ملیں انہیں لکھ لیں کہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے چلے جانے کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے اطراف وجوانب میں بھی اپنا یہ پیغام روانہ فرمادیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث بھی ملے اسے جمع کرلیا جائے۔ حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی تحریک فن حدیث میں پہلی باقاعدہ کتاب حضرت ابوبکر بن حزم نے تصنیف فرمائی۔ اس کے بعد تو جمع وترتیب اور تصنیف وتالیف کا تاریخ ساز اور خوشگوار سلسلہ دراز ہو گیا اور احادیث کی چھان پھٹک تحقیق وتفتیش روایت ودرایت کی بنیاد پر ہونے لگی۔ محدثین کرام کا امت مسلمہ پر یقیناً یہ احسان عظیم ہے کہ انہوں نے انتہائی محنت ومشقت لگن، جگر سوزی اور دیدہ ریزی کے بعد احادیث صحیحہ کا ذخیرہ ہمارے لیے بہم فرمایا، اب ہم بہت آسانی کے ساتھ ان ذخیرہ احادیث سے اسلامی احکام کے تعلق سے راہنمائی حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن کیا احادیث سے مسائل کا استنباط بھی ہر کس وناکس کا منصب ہے یا..... ع

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں

اگر ایسا ہوتا تو عظیم علمائے محدثین نے ائمہ مجتہدین کی تقلید کی روش اختیار نہ کی ہوتی۔ ظاہر ہے کہ علم حدیث کے تعلق سے ہمارا دائرہ علم جس قدر محدود ہے، اس کے مقابلے میں ان حضرات کا تو علم ومطالعہ اور فکر وآگہی حد درجہ وسیع تھی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے تقلید کا دم بھر کر

☆Chief Editor "Al-Kausar" Quarterly,Baradari. Sasaram(Bihar)

ہمارے لیے تقلید کو ازبس ضروری قرار دے دیا- حد تو یہ کہ وہابیوں کے متفقہ امام علامہ ابن تیمیہ کے تعلق سے غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کا یہ اقرار ہے-"احمد بن الحلیم بن مجد الدین عبد السلام بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن ابی القاسم بن تیمیہ الحرانی ثم الدمشقی الحنبلی صاحب منہاج السنۃ: (ترجمہ: احمد بن حلیم بن مجد الدین عبد السلام بن عبید اللہ بن عبد اللہ ابی القاسم بن تیمیہ حرانی، دمشقی صاحب منہاج السنۃ امام احمد بن حنبل کے مقلد تھے) اگر احادیث نبویہ کی روشنی میں مسائل کا استخراج اور استنباط ہر کسی کے بوتے کی بات ہوتی تو محدثین نے یہ نہ کہا ہوتا"یا معشر الفقہاء انتم الاطباء و نحن الصیاد لۃ" (ترجمہ: اے گروہ فقہاء تم طبیب ہو اور ہم محدثین عطار ہیں) احادیث طیبہ کو فقیہ کے تفقہ کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے، اس کے بغیر فہم حدیث کا دعویٰ کھوکھلا ہے-

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے "تلبیس ابلیس" میں تحریر فرمایا ہے کہ بعض محدثین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمایا "من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلایسقین ماءہ زرع غیرہ ترجمہ: "جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو وہ اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی کو سیراب نہ کرے" تو محدثین کی جماعت جو وہاں موجود تھی، اس نے کہا کہ جب ہمارے باغوں یا کھیتوں سے پانی بچ جاتا ہے، تو اپنا زائد پانی ہم سایوں کے کھیتوں کی طرف چھوڑ دیتے تھے اب ہم اس بات سے توبہ کرتے ہیں اور خدا سے استغفار کرتے ہیں- تفقہ فی الدین کی کمی کے سبب محدثین کرام اس حدیث پاک کا صحیح مطلب اخذ نہ فرما سکے- یہاں تو اجنبیہ عورت کے ساتھ وطی کی ممانعت کا حکم دیا جا رہا ہے یا زانیہ سے نکاح کے بعد وطی سے منع کیا جا رہا ہے- اس طرح کے اور واقعات بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں، جن سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ احادیث طیبہ کا یاد رکھنا اور ہے، مسائل کا استخراج اور- اگر علمائے محدثین نے احادیث صحیحہ کی جمع و ترتیب کا کار عظیم انجام دے کر ہمارے لیے بہت ساری سہولتیں فراہم کر دی ہیں تو یقیناً ان فقہائے کرام اور ائمہ مجتہدین کے احسان سے بھی ملت اسلامیہ سبکدوش نہیں ہو سکتی کہ انہوں نے دین کے مسائل میں صحیح راہنمائی کے لیے راہیں کھول دیں-

فقہ اربعہ میں فقہ حنفی پہ غیر مقلدین کے اعتراضات کی تان کچھ زیادہ ہی ٹوٹی- غیر مقلدین کے علاوہ غیر حنفی مقلدین نے بھی فقہ حنفی کو اپنے اعتراضات کی زد میں رکھا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ فقہ حنفی کی ساری عمارت قیاس اور عقل پر ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اساس احادیث طیبہ پر ہے- مختصر یہ کہ امام ابو حنیفہ، امام یوسف (رحمہما اللہ تعالیٰ) حدیث کی معرفت اور سنت سے استدلال کرنے میں بلند ترین مقام پر فائز تھے- لیکن ان کے مذہب کے بعض علماء نے احادیث کی تلاش اور ان کی تخریج میں کوتاہی کی اور عقلی دلائل پر اکتفا کیا، جس سے لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ اس مذہب کی بنیاد رائے پر ہے- اس لیے یہ کہنا کہ امام ابو حنیفہ قیاس کو اختیار کرتے ہیں اور حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں وہم ہے- بلکہ وہ تمام ائمہ سے زیادہ حدیث کی پیروی کرتے ہیں، جسے شک ہے وہ فقہ حنفی کی کتاب "شرح مواہب الرحمان" دیکھ لے، اس کے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن پاک صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے دلائل پیش کرنے کا التزام کیا ہے، اسی طرح محقق ابن ہمام کی شرح ہدایہ (فتح القدیر) دیکھ لیجیے، انہوں نے ان اعتراضات کا جواب دیا جو ہدایہ پر وارد کیے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کی پیش کردہ احادیث کمزور ہیں اور انہوں نے عقلی دلائل پر اکتفا کیا ہے- جب کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر حدیث کا سماع کیا تھا، ان کے چار ہزار اساتذۂ محترم میں تین سو تابعی تھے- اس وہم کے اسباب میں ایک بات یہ بھی ہے کہ بعض محدثین مثلاً صاحب مصابیح، صاحب مشکوٰۃ اور صاحب ترمذی مذہب شافعی سے تعلق رکھتے تھے، چنانچہ ان حضرات نے اپنے مذہب کے دلائل تلاش و جستجو سے جمع کر کے اپنی کتابوں میں درج کر دیے اور جن احادیث سے احناف استدلال کرتے ہیں، ان کے راویوں پر طعن اور جرح کی- ہدایہ، جو مذہب حنفی کی مشہور و معروف کتاب ہے، اس نے بھی لوگوں کو کسی حد تک اس وہم میں مبتلا کیا کیوں کہ اس کے مصنف علامہ برہان الدین مرغینانی نے اکثر مقامات پر عقلی دلائل اور قیاسات پر بنا رکھی ہے اور ایسی احادیث بطور دلیل لائے جن میں کئی قسم کا ضعف پایا جاتا ہے، ان اقتباسات کی روشنی میں یہ بات عیاں ہے کہ مذہب حنفی کی بنیاد قیاس پر نہیں- خود حضرت امام اعظم ابو حنیفہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: اگر دین رائے سے ہوتا تو میں پیشاب سے غسل واجب کرتا اور منی سے وضو، کیوں کہ پیشاب بالاتفاق نجس ہے اور منی بعض علماء کے یہاں پاک بھی ہے اور میں لڑکی

کو لڑکے سے دوگنی میراث دیتا کیوں کہ لڑکی کمزور ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مذہب حنفی میں بعض احادیث کو بعض پر ترجیح دینے کی روایت بھی ملتی ہے، لیکن یہ ترجیح وہیں پائی جاتی ہے، جہاں موافق قیاس اور مخالف قیاس احادیث پائی جارہی ہوں، ایسی صورت میں موافق قیاس احادیث کو مخالف قیاس احادیث پر ترجیح دی جاتی ہے، اور یہ اصول فقہ کے ضابطے کی روشنی میں ہے، یہ نص کے مقابلے قیاس کو ترجیح دینے کی بات قطعی نہیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احادیث کے مقام ومراتب بہت اونچے تھے، وہ تو حدیث مشہور کے ذریعے کتاب اللہ کے حکم کے نسخ کے قائل تھے، نیز انہوں نے حدیث مرسل، حدیث ضعیف اور صحابی کے قول وفعل تک کو حجت قرار دیتے ہوئے اس کو بالائے طاق رکھا، اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(۱) حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس پانی سے وضو مکروہ ہے، جس میں کوئی تر چیز گر جائے اور اس میں کوئی چیز مخلوط ہو جائے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو ترک فرماتے ہوئے اس حدیث سے استدلال فرماتے ہیں جس کو امام بخاری، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت فرمایا۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ" ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، میں آپ کی صاحبزادی حضرت زینب یا ام کلثوم رضی اللہ عنہما کو غسل دے رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہیں پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل دو اور آخری مرتبہ کافور شامل کرو، چنانچہ اس موافق قیاس حدیث سے استدلال فرماتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ جس پانی کے کسی وصف (رنگ، بو، مزہ) کو کوئی پاک چیز تبدیل کردے تو اس سے وضو کرنا جائز ہے، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پانی سے وضو جائز نہیں۔

(۲) سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم عن الماء یکون فی الفلاة من الارض و ما ینوبه من الدواب والسباع فقال اذا کان الماء قلتین لم یحمل الخبث (ترمذی شریف ابواب الطہارۃ، ص:۱۲۱) ترجمہ: حضرت سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پانی کے متعلق دریافت کیا گیا جو میدانی زمین میں ہو اور اس پر چوپائے اور درندے آتے ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب پانی دو قلے ہیں تو گندگی کو نہیں اٹھاتا، اس حدیث کو ترک فرماتے ہوئے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث سے استدلال فرماتے ہیں، جسے شیخین نے روایت فرمایا ہے عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال لا یبولن احدکم فی الماء الدائم ثم یغتسل منه (مسلم شریف جلد اول ص:۱۳۸) ترجمہ:" تم میں سے کوئی شخص ٹھہرے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کرے، پھر اس سے غسل کرے۔

اول الذکر حدیث کو شیخین نے روایت نہیں فرمایا، نیز اس کی سند میں اضطراب بھی ہے، اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کے زمانے میں ایک حبشی چاہ زمزم میں گر کر مر گیا، حضرت ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے تمام صحابہ کی موجودگی میں کنواں پاک کرنے کا حکم دیا، کسی نے انکار نہ کیا، جب کہ چاہ زمزم میں ہزاروں قلے پانی تھے، لہٰذا امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ پانی اگر جاری نہیں ہے تو نجاست کے گرنے سے قابل وضو وغسل نہیں رہ جاتا، اگر اول الذکر حدیث کو جاری پانی پر منطبق کیا جائے تو دونوں حدیثوں سے تعارض بھی ختم ہوجائے گا۔

(۳) وہ حدیثیں جن میں آیا ہے کہ حیوان کے مرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا انہیں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے ان حیوانات کی موت کے سلسلے میں ترک فرمادیا، جن میں خون نہیں ہوتا اور وہ بخاری کی روایت کردہ اس حدیث سے استدلال فرماتے ہیں کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کے برتن میں مکھی گر جائے تو اسے ڈبو دے پھر نکال کر پھینک دے کیوں کہ اس کے ایک پر میں شفا اور دوسرے میں بیماری ہے، مکھی شفا والے پر سے پہلے بیماری والا پر ڈبوتی ہے۔

(۴) مردے کی حرمت کے عموم پر وارد ہونے والی حدیث کو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ترک فرمایا اور دباغت کے بعد مردار کی کھال کی پاکی کا حکم فرمایا اور امام بخاری ومسلم رحمۃ اللہ علیہما کی روایت کردہ حدیث سے استدلال فرمایا: عن عبد الله بن عباس قال تصدق علی مولاة لمیمونة بشاة فماتت فمر بها رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال هلا اخذتم اهابها فدبغتموه فانتفعتم به فقال انها میتة فقال انما حرم اکلها (بخاری، مسلم) ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضرت میمونہ کی لونڈی کو بکری صدقہ کی گئی جو مر گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر گزرے تو فرمایا کہ تم نے اس کی کھال کیوں نہیں اتاری تم اسے پکا لیتے

اور نفع اٹھا لیتے - کسی صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ مردار بکری ہے، سرکار نے فرمایا صرف اس کا کھانا حرام ہے-

(۵) امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ترک فرمادیا، جس کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا "عن الاسود وھمام عن عائشة فی المنی قالت کنت افرکه من ثوب رسول الله صلی الله علیه سلم (مسلم جلداول ص:۱۴۴) ترجمہ: روایت ہے حضرت اسود اور ہمام سے وہ حضرت عائشہ سے راوی ہیں، منی کے سلسلہ میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی مل دیتی تھی- آپ نے اس حدیث سے استدلال فرمایا ،جس کو امام بخاری، امام مسلم نے روایت سے فرمایا" عن سلیمان بن یسار قال سألت عائشة عن المنی یصیب الثوب فقالت کنت اغسل من ثوب رسول الله صلی الله علیه وسلم فیخرج الی الصلوٰة واثر الغسل فی ثوبه (بخاری جلداول ص:۳۶) ترجمہ: "روایت ہے حضرت سلیمان بن یسار سے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے منی کے متعلق دریافت کیا جو کپڑے کو لگ جائے- فرمانے لگیں کہ میں اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے دھوتی تھی، جس پر نماز کو تشریف لے جاتے حالانکہ دھونے کا اثر آپ کے کپڑے میں ہوتا-

(۶) امام اعظم نے ان احادیث کو ترک فرمادیا، جن میں تین مرتبہ سر کے مسح کی روایت ہے اور وہ حضرت عثمان سے روایت کردہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں: "عن عثمان انه توضأ فافرغ علی یدیه ثلثاً ثم تمضمض واستنثر ثم غسل وجههٗ ثلثاً ثم غسل یده الیمنی الی المرافق ثلثاً ثم غسل یده الیسریٰ الیٰ المرافق ثلثاً ثم مسح براسه ثم رجله الیمنی ثم الیسریٰ ثلثا ثم قال رایت رسول الله صلی الله علیه وسلم توضأ نحو وضوئی هذا ثم قال من توضأ وضوئی هذا ثم یصلی رکعتین لا یحدث نفسه فیهما شئی غفرله ما تقدم من ذنبه (بخاری ص:۲۸) ترجمہ:- حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے وضو فرمایا تو اپنے ہاتھوں پہ تین مرتبہ پانی بہائے پھر کلی کی اور ناک صاف کی، پھر تین مرتبہ چہرہ دھویا، پھر داہنے ہاتھ کو کہنیوں تک تین مرتبہ دھویا، پھر بائیں ہاتھ کو کہنیوں تک تین مرتبہ دھویا پھر سر کا مسح کیا، پھر داہنا پاؤں تین مرتبہ دھویا پھر بایاں پاؤں تین مرتبہ دھویا پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا، پھر سرکار نے فرمایا جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا پھر دو رکعتیں خشوع قلب کے ساتھ ادا کی اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جائیں گے-

(۷) امام اعظم نے ان احادیث کو ترک فرمادیا جن میں نماز اول وقت میں ادا کرنے کی روایت ہے اوران روایتوں سے استدلال فرماتے ہیں، جو نماز ظہر اور فجر کو تاخیر سے ادا کرنے پر دلالت کرتی ہیں-

(۸) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی، اس حدیث سے استدلال فرماتے ہیں: عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اذاشرب الکلب فی اناء احدکم فلیغسله سبع مرات (مسلم جلداول ص:۱۳۷) ترجمہ: جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا پانی پی جائے تو اسے سات بار دھوؤ- چنانچہ مذہب شافعی میں کتے کے چاٹنے پر برتن کا سات بار دھونا اور مٹی سے مانجنا فرض ہے- جب کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا حکم بھی دوسری نجاستوں کی طرح ہے کہ اسکے دھونے میں نہ تعداد مقرر ہے نہ ہی مٹی سے مانجنا لازم بلکہ گندگی اور اس کا اثر دور کرنا لازم ہے- وہ ان روایتوں سے استدلال فرماتے ہیں، جنہیں دار قطنی نے روایت کیا: حضور فرماتے ہیں کہ جب کتا برتن چاٹ جائے تو اسے تین، پانچ یا سات بار دھوؤ- نیز ابن عربی کی مرفوعاً روایت ہے کہ جب کتا برتن چاٹ جائے تو پانی پھینک دو اور برتن تین بار دھولو- دار قطنی نے سند صحیح حضرت عطا سے روایت کیا کہ خود حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا عمل یہ تھا کہ جب ان کا برتن کتا چاٹ جاتا تو پانی گرا دیتے اور برتن تین بار دھو ڈالتے -لہٰذا سات بار کی حدیث منسوخ اور یہ احادیث مذکورہ ناسخ- چوں کہ اولاً اسلام میں کتا پالنا ممنوع اور اس کا قتل کرنا واجب تھا، اس زمانے میں یہ پابندیاں تھیں لیکن جب ضرورتاً کتا پالنے کی اجازت ملی اور اس کا قتل واجب نہ رہا تو سات مرتبہ کا حکم بھی منسوخ ہوگیا- پھر یہ کہ کتا اور سور اگر برتن میں پیشاب کردے تو تین بار دھونے سے برتن پاک ہوجائے گا، اب ظاہر ہے کہ کتے کا لعاب پیشاب سے تو بدتر نہ ہوا-

مذکورہ مثالوں کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی کہ مذہب حنفی کی بنیاد قیاس پر نہیں، قیاس وہیں نظر آتا ہے، جہاں نصوص ا

احادیث موجود نہیں۔ چنانچہ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کے سامنے، جب حدیث شریف آ جاتی تو اس کا اتباع کرتے یا اصحاب کرام اور متقدمین کا کوئی قول آتا تو اس کی پیروی کرتے بصورت دیگر اجتہاد اور رائے سے کام لیتے۔ امام ابوحنیفہ کے تمام تلامذہ اس بات پر متفق ہیں کہ حدیث اگر چہ ضعیف ہو اجتہاد و قیاس سے مقدم اور اعلیٰ ہے۔ ان حقائق کے پس منظر میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر قیاس کو حدیث پر اولیت و تقدم دینے کا الزام غلط ہے اور انہیں صاحب رائے اس معنی میں کہنا حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

مذہب حنفی کو احادیث و روایات کی تائید حاصل ہے، چنانچہ جن حضرات نے اس بحر کی غواصی میں تحقیق و تدقیق کو آلۂ کار بنایا، ان پر یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی، چنانچہ امام طحاوی کے چچا امام مزنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اجلہ شاگردوں میں تھے، فقہ شافعی کے متبحر فقیہ اور عالم تھے، اس کے باوجود وہ احناف کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے، ایک دن امام طحاوی نے ان سے دریافت کیا، سیدی! آج آپ شوافع کے امام و مقتدا اور حجت ہیں۔ لیکن میں نے آپ کو کتب احناف کا بکثرت مطالعہ فرماتے دیکھا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے فرمایا: ان کتابوں میں مجھے ایسی تحقیقات و تدقیقات ملتی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں۔ امام طحاوی عرض گزار ہوئے کہ جب یہ بات ہے تو آپ امام ابوحنیفہ کا مذہب کیوں نہیں اختیار فرما لیتے۔ امام مزنی سخت ناراض ہوئے اور اپنے یہاں سے نکال دیا، برا بھلا کہا اور انہیں بددعا دی، ان کی دعا تو پوری نہ ہوئی، لیکن امام طحاوی کی زندگی ایک زبردست انقلاب سے دو چار ضرور ہوئی، چنانچہ انہوں نے فقہ حنفی کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ شروع کیا تو ان پر اس کی حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی اور پھر انہوں نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کا پٹہ اپنی گردن میں ڈال لیا۔ نیز فقہ حنفی کی تائید میں احادیث کا ذخیرہ جمع فرمایا۔ جس کا نام "شرح معانی الآثار" رکھا۔

فقہ حنفی پر غیر مقلدین کے اعتراضات جہاں ان کے علمی افلاس اور فکری دیوالیہ پن کا کھلا اظہار ہیں تو وہیں فن حدیث پہ ان کی گہری بصارت و بصیرت پر سوالیہ نشان بھی قائم کرتے نظر آتے ہیں۔ فقہ حنفی کے مسائل پر اعتراضات کی بارش برسا کر غیر مقلدین نے فقہائے عظام کی غیر معمولی دینی خدمات پر پانی پھیرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔ لیکن ان اعتراضات کی حیثیت ریت پر محل تعمیر کرنے سے زیادہ نہیں۔ رکوع سجدے والی نماز میں قہقہہ ناقض وضو ہے۔ فقہ حنفی کا یہ مسئلہ ہے، اس سلسلے میں جو استدلال کیا گیا ہے، وہ یہ ہے "ان الصحابۃ کانوا یصلون خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجاء اعرابی وفی عینہ سوء فوقع فی حفرۃ کانت ھناک فضحک بعض الصحابۃ فقال لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم الامن ضحک منکم قھقھۃ فلیعد الوضوء وصلوۃ جمعیا" ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک اعرابی آئے، جن کی بینائی میں کچھ عیب تھی، وہ قریب ہی ایک گڑھے میں گر پڑے تو بعض اصحاب ہنس پڑے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جس شخص نے قہقہہ لگایا ہے وہ نماز اور وضو دونوں کا اعادہ کرے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے، جس پر امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایۂ فقہ حنفی احادیث طیبہ کے خلاف نہیں بلکہ حد درجہ تائید یافتہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس موڑ پر تو عقل کا کھلا تقاضا تھا کہ جس طرح قہقہہ خارج نماز وضو نہیں توڑتا اسی طرح نماز میں بھی وضو نہیں توڑتا لیکن عقل کے اس تقاضے کے خلاف حدیث پاک کے مطابق فتویٰ صادر فرمایا اور اسے صرف رکوع سجدے والی نماز تک ہی محدود رکھا۔ نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوت میں اسے مفسد صلوٰۃ قرار نہیں دیا، چونکہ حدیث پاک میں رکوع سجدے والی نماز میں ہی قہقہہ ناقض وضو قرار دیا گیا ہے۔ ہدایہ میں اس کی وجہ یہ تحریر کی گئی ہے "والاثر ورد فی صلوۃ مطلقۃ فیقتصر علیہ" (ترجمہ: اور حدیث نماز کامل کے بارے میں وارد ہوئی ہے، لہٰذا اسی پر اس کا اقتصار کیا جائے گا) کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ "احادیث نبوی کو قیاس سے رد کرنے کا طریقہ کوفہ ہی میں بنا۔" غیر مقلدین جو خود کو اہل حدیث اور عامل حدیث کہتے ہیں انہوں نے کیوں قیاس کو حدیث پر ترجیح دے کر اپنے دعویٰ اہل حدیث کو مشکوک کر دیا۔

فقہ حنفی کا یہ مسئلہ ہے کہ "انسان اور خنزیر کے سوا جس چمڑے کو دباغت دے دی جائے وہ پاک ہے، ہدایہ میں یہ مسئلہ بایں الفاظ ہے "کل اھاب دبغ فقد طھر الاجلد الخنزیر والآدمی اس سلسلے

میں حدیث پاک ہے "ایما اھاب دبغ فقد طھر" یا "اذا دبغ الاھاب فقد طھر" حدیث پاک کی وضاحتوں کی روشنی میں فقہ حنفی کے اس مسئلے پر اعتراض کی بوچھار کرنے والے ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ان کے اعتراض کا اثر کہاں تک پہنچ رہا ہے؟

کتے، بھیڑیے، گدھے وغیرہ درندوں کو ذبح کرنے سے ان کی کھالیں پاک ہو جاتی ہیں، غیر مقلدین نے اس پر بھی اعتراض کیا ہے۔اس سلسلے میں جو حدیث شریف آئی ہے وہ یہ ہے "ذکوۃ المیتۃ دباغھا، (ترجمہ: مردار کو ذبح کرنا اس کی دباغت ہے) ایک دوسری حدیث مرفوع میں "ذکاۃ کل مسک دباغہ" آیا ہے۔

یعنی ہر چمڑے کو ذبح کرنا اس کی دباغت ہے۔ہدایہ میں اس کی وجہ یہ تحریر ہے "لانہ یعمل عمل الدباغ فی ازالۃ الرطوبات النجسۃ" ترجمہ: ذبح کرنا دباغت کا کام کر جاتا ہے، جس طرح دباغت سے نجس رطوبتیں زائل ہو جاتی ہیں، اسی طرح ذبح سے بھی زائل ہو جاتی ہیں۔

کتے، بھیڑیے وغیرہ کی کھالوں کو دباغت کے بعد استعمال کرنے پر بھی اعتراضات وارد کیے گئے ہیں۔ جب کہ احادیث کریمہ کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ دباغت سے ہر کھال پاک ہو جاتی ہے تو پھر اس کے استعمال پر کیوں کلام کیا جائے گا؟

پتھر، گچ، چونا اور ہڑتال سے بھی تیمم جائز ہے، فقہ حنفی کا یہ مسئلہ بھی طنز کا نشانہ بنا۔ جب کہ ان اشیاء سے تیمم کے جواز کی دلیل بھی ہے ان الصعید اسم لو جہ الارض ت (ترجمہ: صعید روئے زمین کا نام ہے) شرح ہدایہ میں علامہ عینی نے فرمایا "لان الصعید لیس التراب انما ھوو جہ الارض ترابا کان اوصخرا لاتراب علیہ اوغیرہ ترجمہ: کیوں کہ صعید مٹی نہیں بلکہ روئے زمین ہے، جس پر مٹی ہو یا پتھر جس پر مٹی نہ ہو یا اس کا غیر ہو) اس سلسلے میں جو احادیث ہیں وہ یہ ہیں "جعلت لی الارض مسجداً وطھوراً (ترجمہ: میرے لیے زمین کو مسجد اور مطہر بنائی گئی ہے) اس حدیث کے تحت علامہ عینی شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں "ھذا الذی ذکرہ فی الحقیقۃ استدلال لابی حنیفۃ و محمد علی جواز التیمم بجمیع اجزاء الارض لان اللام فیھا للجنس فلا یخرج شئی منھا وکان الارض کلھا جعلت مسجد اوماجعل مسجداھو الذی جعل طھوراً (ترجمہ: دراصل اس میں امام ابو حنیفہ اور امام محمد کی دلیل ہے کہ زمین کے تمام اجزاء سے تیمم جائز ہے، کیوں کہ اس میں "لام" جنس کا ہے، اس لیے کوئی شئی اس سے خارج نہ ہوگی اور کل زمین مسجد بنائی گئی ہے اور جو مسجد بنائی گئی ہے وہ پاک کرنے والی بھی بنائی گئی ہے) زمین کا حصہ مسجد بنایا گیا لہٰذا اس سے تیمم بھی جائز ہوا خواہ ریت، چونا، پتھر وغیرہ کیوں نہ ہو، علامہ عینی کی تائید میں غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن بھوپالی "روضہ ندیہ" میں رقم طراز ہیں: "قال فی القاموس والصعید التراب اووجہ الارض انتھی والثانی ھو الظاھر من لفظ الصعید لانہ ما صعد ای علاوار تفع علی وجہ الارض وھذہ الصفۃ لاتختص بالتراب ویوید ذالک الحدیث "جعلت لی الارض مسجداً و طھوراً (ترجمہ: قاموس میں ہے کہ صعید تراب ہے یا روئے زمین اور دوسرا معنی لفظ صعید سے ظاہر ہے۔ کیوں کہ صعید وہ ہے جو بلند ہوا اور زمین کے اوپر ہو اور یہ صفت یعنی روئے زمین پر ہونا مٹی کے ساتھ مختص نہیں (کہ تیمم اسی کے ساتھ خاص ہو) اور حدیث جعلت لی الارض مسجداً وطھوراً سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے)

پتھر، گچ، چونے اور ہڑتال سے تیمم کا ثبوت نہ صرف حدیث پاک سے ہے بلکہ قرآن مقدس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔اس سلسلے میں قرآن پاک میں "صعید طیب" آیا ہے، جس کا معنی پاک روئے زمین ہے، ظاہر ہے کہ روئے زمین صرف مٹی تو نہ ہوگا، بلکہ کہیں مٹی تو کہیں ریت کہیں پتھر کہیں گچ۔

کوئی عیدگاہ پہنچا، نماز ہو رہی ہے اور اسے خوف ہے کہ اگر میں وضو میں مشغول ہوں گا تو نماز چھوٹ جائے گی تو وہ تیمم کر کے جماعت میں شامل ہو جائے۔فقہ حنفی کے اس مسئلے پر اعتراض کیا گیا ہے، جب کہ یہ بھی حدیث کے مطابق ہے "عن ابن عباس اذا خفت ان تفوتک الجنازۃ و انت علی غیر وضوء فتیمم و صل (ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جب تمہیں نماز جنازہ کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو اور تم بے وضو ہو تو تیمم کر کے نماز جنازہ میں شامل ہو جاؤ) (تخریج زیلعی جلد اول ص:۸۳)

"عن ابن عمر انہ اتیٰ بجنازۃ و ھو علی غیر وضوء فتیمم ثم صلی علیھا (ترجمہ: حضرت سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک جنازے پر تشریف لائے، آپ بے وضو تھے تو آپ نے تیمم

کر کے نماز پڑھی)

دونوں حدیثوں سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اگر نماز جنازہ فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو تیمم کی اجازت ہے، چنانچہ فقہ حنفی میں اس صورت میں تیمم کی اجازت ہے اور چونکہ نماز جنازہ فوت ہو جائے تو اس کا بدل نہیں لہٰذا وہ نماز جس کے فوت ہو جانے پر اسے اصلاً اور خلفاً ادا نہ کیا جا سکے، اس میں بھی تیمم کی اجازت ہوگی، اسی بنیاد پر نماز عیدین کے فوت ہو جانے کے اندیشے کے تحت تیمم کر کے نماز میں شامل ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

ایک بہن کے عدت طلاق (خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن) میں رہتے ہوئے دوسری بہن سے نکاح کرنا حرام ہے، اس پر بھی غیر مقلدوں نے اعتراض کیا ہے، جب کہ جمع بین الاختین قرآن کے حکم کے مطابق حرام ہے اور یہ جمع از روئے نکاح ہو یا عدۃ بہر حال حرام ہے، کیوں کہ قرآن مقدس نے دو بہنوں کو نکاح میں رکھنے سے منع نہیں فرمایا، بلکہ جمع کرنے سے منع فرمایا، جو دونوں بلکہ تینوں شکلوں کو شامل ہے۔ نکاحاً، عدۃً، ملکاً، ہدایہ میں اس تعلق سے وضاحت ہے "ان نکاح الاولیٰ قائم لبقاء احکامہ کالنفقة والمنع والفراش ترجمہ: نکاح اول کے احکام باقی رہتے ہیں، مثلاً نفقہ، منع اور فراش) طلاق کے بعد حقیقتاً نکاح باقی نہ رہی لیکن حکماً تو ہے چنانچہ عدت کے اخراجات مرد کے ذمہ ہیں، عدت کے اندر مرد کے گھر سے عورت کا نکلنا منع ہے اور ثبوت نسب کے لیے وہ عورت اسی مرد کی فراش ہوگی۔ پھر اس مسئلے پر اجماع امت بھی ہے، علامہ ابن الہمام: فتح القدیر میں فرماتے ہیں "قال عبيدة ما اجتمع اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم في شئي كاجتماعهم على تحريم نكاح الاخت في عدة الاخت (ترجمہ: حضرت عبیدہ فرماتے ہیں کہ اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا کسی چیز پر ایسا اجماع نہ ہوا جیسا کہ اس بات پر کہ بہن کی عدت میں اس کی بہن سے نکاح حرام ہے)

فقہ حنفی کا مسئلہ ہے کہ جب ولی نماز جنازہ پڑھے یا اس کی اجازت سے پڑھی جائے تو دوبارہ نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔ غیر مقلدین نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے، چند حدیثیں اس کے خلاف بیان کر کے عوام کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش کی ہے اور یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر نماز جنازہ پڑھی جب کہ امام ابو حنیفہ دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں درمختار میں ہے:" فان صلى غيره اى الولى ممن ليس له حق التقدم على الولى ولم يتابعه الولى اعاد الولى ولو على قبره (ترجمہ: اگر ولی کے علاوہ کسی دوسرے نے نماز جنازہ پڑھی ہو، ولی نے نہ پڑھی ہو تو ولی کو اعادے کا حق ہے گو اس کی قبر پر پڑھے) منحۃ الخالق حاشیہ بحر الرائق میں ہے" لا تعاد الصلوة على الميت الا ان يكون الولى هو الذى حضر فان الحق له وليس لغيره ولاية اسقاطه: (ترجمہ: کسی میت پر دو دفعہ نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔ ہاں! اگر ولی آئے تو اس کا حق ہے، کوئی دوسرا اس کا حق ساقط نہیں کر سکتا۔)

ایک دفعہ نماز جنازہ کی ادائیگی سے میت کا حق ساقط ہو گیا تو جو فرض تھا وہ ساقط ہو گیا، اب اگر دوبارہ پڑھیں تو نفل میں شمار ہوگا اور نماز جنازہ نفلاً مشروع نہیں۔" الفرض يتادى بالاول والتنفل بهاغير مشروع" (جوہرہ)

بحر العلوم "رسائل الارکان" میں لکھتے ہیں: لو صلوا لزم التنفل بصلوة الجنازة و ذا غير جائز (ترجمہ: اگر نماز جنازہ کا اعادہ کریں تو یہ نفل ہوگا اور یہ جائز نہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنازے کی نماز دوبارہ نہیں ادا فرمائی، اگر نماز جنازہ کی تکرار جائز ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تو کسی کی نماز جنازہ دوبارہ ادا فرمائی ہوتی؟ نہ ہی یہ روایت ملتی ہے کہ کسی صحابی پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھ کر اسے دفن کر دیا ہو اور پھر کسی صحابی غیر ولی جو جنازے میں شامل نہ ہو سکے، انہوں نے قبر پر نماز جنازہ ادا کی ہو، اگر نماز جنازہ کی تکرار جائز ہوتی تو کہیں نہ کہیں اس کا سراغ ملتا، روایت تو اس کے برخلاف ہے: ذكر عبد الرزاق عن معمر عن ايوب عن نافع ان ابن عمر قدم بعد توفى عاصم اخوه فسال عنه فقال اين قبر اخى فدلوهٗ عليه فاتاه فدعا له قال عبد الرزاق وبه ناخذ قال و انا عبد الله بن عمر عن نافع قال كان ابن عمر اذا انتهى الى جنازة قد صلى عليه دعا وانصرف و لم يعد الصلوة قال ابو عمر فى التمهيد هذا هو الصحيح المعروف من مذهب ابن عمر من غير مارجه عن نافع وقد يحتمل ان يكون معنى رواية من روى انه صلى الله عليه وسلم انه دعا له لان الصلوة دعا فلا يكون مخالفا لرواية من روى انه دعا ولم يصل (جوہر النقی جلد اص

۲۷۷) ترجمہ: حضرت عبدالرزاق روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے بھائی عاصم کی وفات کے بعد آئے اور دریافت کیا کہ ان کی قبر کہاں ہے؟ لوگوں نے ان کی راہنمائی کی، آپ قبر پر آئے اور ان کے لیے دعا کی- عبدالرزاق کہتے ہیں کہ ہم اسی پر عمل پیرا ہیں، پھر نافع سے روایت کی کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما میت پر نماز جنازہ ہونے کے بعد آتے تو صرف دعا فرماتے اور لوٹ جاتے، نماز جنازہ کا اعادہ نہ کرتے- ابو عمر نے تمہید میں کہا ہے کہ ابن عمر کا مذہب یہی صحیح اور معروف ہے اور جس روایت میں "صلی علیه" آیا ہے اس کی مراد وہی ہے، کیوں کہ نماز جنازہ بھی دعا ہے) علامہ سرخسی نے بھی مبسوط میں تحریر فرمایا ہے: اد سبقتمونی بالصلوٰة علیه فلا تسبقونی بالدعاء لهٗ ترجمہ: اگر مجھ سے پہلے تم نے نماز جنازہ پڑھ لی ہے تو اب دعا تو پہلے نہ کرو- ان روایات سے نماز جنازے کی تکرار کے سلسلہ میں اسلامی مزاج بخوبی سمجھا جا سکتا ہے- اب رہا سوال کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قبر پر نماز جنازہ ادا فرمائی، اس سلسلے میں "جوہر النقی" کی وضاحت ملاحظہ فرمائیں "وانما صلی علیه السلام علی القبر لانه کان الولی (ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر نماز جنازہ اس لیے ادا فرمائی کہ آپ ولی تھے) اور فقہ حنفی کی وضاحت آپ نے ملاحظہ فرمائی کہ اگر ولی نماز جنازہ میں شریک نہ ہو تو اسے اعادے کا حق ہے- حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نماز جنازہ کے پس منظر پر بایں انداز روشنی ڈالی ہے "بعضے از علماء بر آں رفته اند که نماز بر قبر مطلقاً از خصائص حضرت نبوت است صلی الله علیه وسلم چنانکه از حدیث "ان الله ینور ها لهم بصلوتی علیهم" مفهوم می گردد" (ترجمہ: بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ قبر پر مطلقاً نماز پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے اور حدیث "ان الله ینور ها لهم الخ سے مفہوم ہوتا ہے-)

ملا علی قاری نے مرقات میں یہی پس منظر بیان فرمایا ہے" هذا الحدیث ذهب الشافعی الی جواز تکرار الصلوٰة علی المیت قلنا صلوٰتهٗ صلی الله علیه وسلم کانت لتنویر القبر وذا لا یوجد فی صلوٰة غیر فلا یکون التکرار مشروعاً فیها لان الفرض منها یودی مرة (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد ۲، ص: ۳۵۸) ترجمہ: حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث سے نماز جنازہ کی تکرار پر استدلال فرماتے ہیں- ہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تنویر قبر کے لیے تھی اور یہ بات کسی دوسرے کی نماز جنازہ ادا کرنے میں نہیں پائی جاتی، اس سے نماز جنازہ کی تکرار کی مشروعیت ثابت نہیں ہوتی کیوں کہ فرض ایک مرتبہ پڑھنے سے ادا ہو گیا- موطا میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا ہے "فصلوٰة رسول الله صلی الله علیه وسلم برکة وطهور فلیست کغیرها من الصلوٰت (ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز برکت وطہور ہے دوسرے لوگوں کی نماز کی طرح نہیں-

چور کی چوری، شرابی کی شراب نوشی اور زانی کی زناکاری کے گواہوں نے وقوع کے کچھ دنوں بعد گواہی دی تو مجرم کو نہ پکڑا جائے- فقہ حنفی کے اس مسئلہ پر بھی غیر مقلدین نے اعتراض وارد کیا ہے- اس سلسلے میں حدیث مرفوع ہے لاتقبل شهادة خصم ولا ظنین ای متهم (ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ دشمن اور متہم کی گواہی مقبول نہیں) ترمذی میں بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی روایت ہے کہ یتیم کی گواہی مقبول نہیں- احادیث کی روشنی میں فقہ حنفی کے اس مسئلے کو سمجھا جائے تو کچھ بعد نظر نہ آئے گا بلکہ موافق حدیث ہوگا- اگر گواہوں نے بروقت گواہی نہ دی اور عرصہ گزر جانے کے بعد گواہی دی تو اس کی دو شکلیں ہیں یا تو کوئی معقول عذر کی بنیاد پر مثلاً مرض یا کسی حسی اور معنوی کے سبب شہادت دینے سے معذور رہے تو اس صورت میں ان کی شہادت مقبول ہوگی اور مجرم کو گرفتار کیا جائے لیکن اگر کوئی عذر نہ ہو اور شہادت دینے میں تاخیر کی تو اس کے سبب وہ متہم بالفسق ہوں گے اور احادیث سے ظاہر ہے کہ متہم کی گواہی مقبول نہیں-

زانی کو سنگسار کرنے کے وقت پہلے گواہ سنگ باری کریں اگر وہ سنگ باری نہ کریں تو حد زنا ساقط ہو جائے گی، اس پر بھی غیر مقلدوں کا اعتراض ہے- دراصل یہ اعتراض اسلامی تعزیرات کی روح سے ناواقفی کے سبب ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان گرامی سے بخوبی اسے سمجھا جا سکتا ہے "ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم، ترجمہ: جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں سے حد کو روکو- اس حدیث پاک کی روشنی میں اب مسئلہ کو سمجھا جائے، چنانچہ ہدایہ میں جہاں یہ مسئلہ تحریر ہے وہیں اس کی وجہ بھی لکھ دی گئی ہے "لانه دلالة

الرجوع کہ گواہوں کا ابتداءً سنگ باری نہ کرنا ان کے رجوع کرنے پر دال ہے، ممکن ہے شہادت کے وقت زنا کی شہادت تو دے دی لیکن جب سنگ باری کے امتحان آزما مرحلے سے گزرنے کا معاملہ سامنے آیا تو انہوں نے ایک انسان کے قتل کو امر عظیم سمجھا اور اس سے رک گئے ہوں اور انہوں نے اپنی شہادت سے در پردہ رجوع کر لیا ہو۔

فقہ حنفی میں غائبانہ نماز جائز نہیں، یہ اعتراض کرتے ہوئے ایک حدیث بطور استدلال پیش کی جاتی ہے کہ آقائے کائنات ﷺ نے نجاشی پر غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔

علامہ زرقانی نے شرح موطا میں اس کا جواب دیتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے: "اجیب ایضاً بانه کانه بارض لم یصل احد علیه فتعینت الصلوة علیه لذالک فانه لم یصل علی احد مات غائبا من اصحابه و بهذا جزم ابو داؤد و استحسنه الرویانی "(ترجمہ: اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ نجاشی ایسے ملک میں تھا کہ وہاں اس پر کسی نے نماز جنازہ ادا نہیں کی، اس لیے یہ نماز ان پر متعین ہوئی، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے کسی صحابی پر غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ ابوداؤد نے اس پر جزم کیا، رویانی نے اسے بہتر سمجھا۔)

زادالمعاد کے حوالے سے "عون المعبود" میں لکھا ہے "لم یکن من هدیه و سنته الصلوة کل میت غیب فقد مات خلق کثیر من المسلمین وهم غیب فلم یصل علیهم "ترجمہ: حضور ﷺ کا یہ طریقہ نہ تھا کہ ہر میت غائب پر نماز پڑھتے، بہت مسلمان فوت ہوئے لیکن آپ نے کسی کی نماز جنازہ (غائبانہ) ادا نہ فرمائی۔

نجاشی پر غائبانہ نماز پڑھنے پر روشنی ڈالتے ہوئے وہابیوں کے مقتدا امام علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں "کذالک النجاشی هو و ان کان ملک النصاریٰ فلم یعطه قومه فی الدخول فی الاسلام بل انما دخل معه نفر منهم ولهذا لمامات لم یکن هناک یصلی علیه فصلی علیه النبی صلی الله علیه وسلم بالمدینة " (ترجمہ: نجاشی اگرچہ نصاریٰ کا بادشاہ تھا، اس کی قوم نے داخل اسلام ہونے میں اس کی اطاعت نہیں کی بلکہ ان میں سے ایک جماعت اس کے ساتھ داخل اسلام ہوئی، اس لیے اس کی وفات کے بعد وہاں ایسا کوئی شخص نہ تھا جو اس پر نماز جنازہ پڑھے تو حضور ﷺ نے اس پر غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔

ان روایتوں سے نہ صرف یہ کہ غائبانہ نماز جنازہ کے ثبوت کی نفی ہو گئی بلکہ نجاشی پر یہ نماز جنازہ ادا کرنے کی دینی حکمتیں بھی روشن ہو گئیں۔ علامہ ابن تیمیہ نے غائبانہ نماز جنازہ کے سلسلے میں مزید وضاحت کے ساتھ اپنا موقف واضح کر دیا ہے "الصواب أن الغائب ان مات ببلد لم یصل علیه فیه صلی علیه صلوة الغائب کما صلی النبی صلی الله علیه وسلم علی النجاشی لانه مات بین الکفار ولم یصل علیه صلوة الغائب لان الفرض قد سقط لصلوة المسلمین علیه" ترجمہ: درست یہ ہے کہ اگر غائب ایسے شہر میں فوت ہوا کہ اس پر کسی نے نماز جنازہ نہ پڑھی تو غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جائے، جیسا کہ حضور ﷺ نے نجاشی پر غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی کہ وہ کافروں کے درمیان فوت ہوا اس پر کسی نے نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ اگر اس غائب پر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا جائے تو غائبانہ نماز جنازہ نہ پڑھی جائے، کیوں کہ مسلمانوں کے پڑھنے سے فرض ساقط ہو گیا۔

مقام حیرت تو یہ ہے کہ فقہ حنفی کے جن مسائل پر غیر مقلدین کے اعتراضات کی برسات ہوئی ہے ان میں سے بعض مسائل میں ان کا موقف و مسلک بھی وہی ہے، جو علمائے احناف کا ہے۔

اختصار کے پیش نظر ہم ان کے حوالے نقل کرنے سے گریز کرتے ہیں، ویسے اس مختصر جائزے سے انصاف پسند قارئین پر یہ امر روشن ہو گیا کہ فقہ حنفی پر اعتراضات، علمائے احناف پر اصحاب الرائے کے طعنے اور ترک حدیث کے الزام کی حقیقت کیا ہے؟۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا قول فیصل

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اتبعوا السواد الأعظم ولما اندرست المذاهب الحقة الاهذه المذاهب کان اتباعها اتباع السواد الأعظم

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: سواد اعظم کی پیروی کرو۔ چونکہ ان مذاہب اربعہ کے علاوہ بقیہ حق مذاہب باقی نہیں رہے، لہٰذا انہی کا اتباع ہی سواد اعظم کا اتباع ہے"۔

(عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید، مطبع مجتبائی دہلی ۳۳۳،۳۳)

باب

۵

انکشافات

- مولانا فیضان المصطفیٰ قادری ــــــــــــــ غیر مقلدین کی بنیاد کتاب و سنت یا ائمہ مجتہدین سے مخاصمت؟
- وقار احمد ندوی ــــــــــــــ سعودی حکومت کے نظریات اور عملی کردار
- علامہ کامل بسرائی قدس سرہ ــــــــــــــ شہید ناز کی تربت کہاں ہے؟
- سید سیف الدین اصدق ــــــــــــــ تحریک وہابیت ہندوستانی تناظر میں

مولانا فیضان المصطفیٰ قادری☆

غیر مقلدین کی بنیاد
کتاب و سنت یا ائمہ مجتہدین سے مخالفت؟

یہ چار امام کہاں سے آئے؟ ان کی تقلید کا حکم کس نے دیا؟ مذاہب فقہ کا چار میں انحصار کیوں؟ اب ان کے مقابل اجتہاد کیوں نہیں ہوسکتا؟ قول امام کو مانا جائے یا قول رسول کو؟ یہ سب سوالات بہت آسانی سے حل ہوجائیں گے اگر موجودہ دور کے علمی حقائق پر غور کیا جائے اور کسی مخاصمت کا جذبہ دل سے نکال دیا جائے۔ دراصل دین کی تعلیمات پر صحیح عمل، تقلید کے بغیر ممکن نہیں۔ ورنہ عمل پر نہ کبھی مداومت ہوسکے گی نہ استقامت، اور دین میں اجتہادِ مطلق کا کوئی تصور نہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی کا مقلد ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کوئی نیا سوال ہوتا تو آپ وحی کا انتظار فرماتے، اور فرماتے، اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوحٰی اِلَیَّ۔ آپ نے مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے دو ذریعے عطا کیے کتاب اور سنت، دور صحابہ میں کتاب اور سنت کو ہی محور اجتہاد قرار دیا گیا، دونوں میں حکم نہ ملا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے مشورے سے صورت مسئلہ طے کی اور جو متفقہ فیصلہ ہوتا وہ اجماع امت قرار پاتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو قرآن وحدیث میں حکم نہ ملتا تو صرف انھیں پر اکتفانہ کرتے بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں میں تلاش کرتے اور یہی طرز عمل حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تھا۔ (۱) ائمہ مجتہدین نے بھی اپنی دست رس کے مطابق اپنے پیش روفقہائے صحابہ وتابعین کے فیصلوں پر اعتماد کیا۔ لیکن ان ائمہ مجتہدین نے پہلے تو مسائل کو حل کرنے کے لیے قرآن وحدیث سے اصول مستنبط کیے، پھر ان اصول وقواعد کی روشنی میں زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو مدون کرکے علم فقہ کی شکل دیدی۔ ان کے مرتب کردہ اصول چونکہ اصول ہیں اس لیے زندگی کا کوئی گوشہ یا پہلو اُن سے خارج نہ ہوگا، اور وہ قرآن وحدیث سے مستنبط ہیں اس لیے قرآن وحدیث ہی کے اصول قرار پائیں گے۔ علم فقہ کی بنیاد ڈالنے والے امام اعظم ابوحنیفہ ہیں۔ ان کے دور میں، اور ان کے بعد بہت ائمہ مجتہدین ہوئے، مثلا امام اوزاعی، امام سفیان ثوری، امام اسحٰق بن راہویہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ، لیکن ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی کی فقہ پوری مدون نہ ہوسکی، وَ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ، اس وجہ سے اُن کی فقہ کو اپنی زندگی میں کوئی کیسے نافذ کرتا؟ دوسری طرف ائمہ اربعہ کی فقہ وفتاوی کی خدمت کرنے والے بہت ہوئے، تو ان پر عمل درآمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور سارے عالم اسلام میں یہ چار فقہی مذاہب پھیل گئے۔ جس امام کے فیصلے جہاں تک پہنچ سکے وہاں کے لوگوں نے انہی کی اتباع کی، گویا مختلف ذرائع سے جس کی جس تک رسائی ہوئی وہ اسی کا پیروکار ہوا۔ کوئی حنفی ہوا، کوئی شافعی ہوا، کوئی مالکی ہوا، کوئی حنبلی ہوا، اب جو حنفی ہے وہ کسی اور امام کی تقلید کیسے کرتا جس کے سارے فیصلے اسے دستیاب نہیں ہیں۔

ان ائمہ مجتہدین کے فیصلوں کو ماننا اور ان پر عمل کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ ان کے فیصلے قرآن وحدیث واجماع امت کے اصول شرع پر مبنی ہیں۔ نہ یہ کہ ان اصول سے ہٹ کر خود ان کے ذاتی اقوال۔ اگر اس کا کوئی شائبہ بھی ہوتا تو ائمہ اربعہ مرجع انام نہ بنتے۔ ان کے اخلاص ووفور علم، قوت فیصلہ، استحضار علمی اور معیار تحقیق کی بنیاد پر ہی قوم نے ان پر اعتماد کا اظہار کیا اور جوں جوں علم گھٹتا گیا یہ اعتماد بڑھتا چلا گیا جو تقلید کی صورت اختیار کرگیا، امانت علم جوں جوں اٹھتی گئی اور آنے والا زمانہ گزرے ہوئے زمانے سے ابتر ہوتا گیا، مسلمانوں نے کسی ایک امام کی تقلید کا التزام کرلیا اور علماء نے مسلمانوں پر ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید واجب قرار دی۔ اور سارا عالم اسلام ان چار کی امامت پر متفق ہوگیا۔ مشہور مورخ ابن خلدون اپنے دور آٹھویں صدی ہجری کے بارے میں عالم اسلام میں تقلید ائمہ کے بارے میں لکھتے ہیں: وَقَدْ صَارَ اَهْلُ الْاِسْلَامِ الْیَوْمَ عَلٰی تَقْلِیْدِ هٰؤُلَاءِ الْاَئِمَّةِ الْاَرْبَعَةِ (۲) آج سارے مسلمان ان چار ائمہ کی تقلید پر گامزن ہوگئے۔ بالآخر تاریخی طور پر حق انھیں چار میں منحصر ہوگیا، کیونکہ ساری امت نے اس پر اتفاق کیا، اور امت باطل پر کبھی اتفاق نہ کرے گی (اِنَّ اللّٰہَ

☆20000 Saums Rd Apt # 11205 Katy TX-77449 U.S.A

لَایَجْمَعُ اُمَّتِی عَلٰی ضَلَالَۃ)اوران میں سے کسی ایک کی اتباع کرنے کی بجائے کوئی اور راہ چلنے والا "وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَاتَوَلّٰی" کا مصداق قرار پائے گا۔کیونکہ اب قرآن وحدیث کے احکام پر عمل کی یہی ایک واحد ممکنہ صورت ہے۔اب نہ صحابہ رہے نہ تابعین، نہ تبع تابعین رہے نہ ائمہ مجتہدین، اخلاص کا دور بھی گیا، امانت علم بھی اٹھالی گئی، جولوگ موجود ہیں ان میں اگر اخلاص عمل ہو تو نجات کے لیے یہی کافی ہے، اور خود ان کے کرنے کے کام بے انتہا۔ورنہ آج تو ہر جگہ افتا کی میشنری قائم ہے، کہیں مفتی وقت کے پیچھے مجبوری بولتی ہو، کبھی دولت، کہیں عوام یا انتظامیہ کا دباؤ، کہیں سیاسی حالات، کہیں مسلکی تعصب، کہیں کچھ، کہیں کچھ، جس کو تھوڑی سی عربی آگئی تو قرآن وحدیث پڑھ پڑھ کر جو منھ میں آتا ہے بکتا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بہت سارے امور تحقیق وتفتیش سے متعلق رکھے ہیں، سیاسی قوت واستحکام، انتظامی امور، معاشی واقتصادی وسائل کا فروغ، عقلی علوم، نو پیدا فقہی مسائل، ان میں جس قدر داد تحقیق دیا جائے کم ہے۔لیکن یہ ضروری کام چھوڑ کر ہم اس چکر میں پڑجائیں کہ آخر امام ابوحنیفہ نے کس بنیاد پر اس مسئلے میں یہ فیصلہ کیا، امام شافعی نے ایسا کیوں کہا؟ امام مالک کی دلیل کتنی مضبوط ہے؟ امام احمد بن حنبل کے فیصلوں میں کتنی قوت استدلال ہے؟ ذرا معلوم تو کریں کہ کس کی دلیل مضبوط ہے اسی کے فیصلے کو مان لیا جائے؟ اور (بایں مبلغ علم) کسی کے استدلال میں کمزوری پائیں تو اسے ترک کردیں، جی ہاں، مجتہدین کو یہی حق حاصل ہے۔ان کے لیے کچھ ضروری نہیں کہ اپنے پیش رو محقق کا فیصلہ یونہی مان لیں، یہی وجہ ہے کہ امام ابویوسف وامام محمد بن حسن شیبانی، امام زفر وامام عبداللہ بن مبارک وغیرہ اصول شرع میں تو امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہیں مگر مسائل میں تقلید نہیں کرتے بلکہ خود تحقیق کرتے ہیں۔اور جس قدر زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے، تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اور سلسلۂ تحقیقات کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔نہ یہ کہ نشانۂ تحقیق انھیں امور کو بنایا جائے جو یگانۂ روزگار ماہرین کے ذریعہ فیصل ہو چکے ہوں، پھر تو سلسلۂ تحقیقات کو آگے کہاں بڑھایا گیا؟ بلکہ گھوم پھر کر ہم وہیں پہنچ گئے جہاں سے سفر شروع ہوا تھا۔اسی لیے ہر دور کے ذی فہم وبصیرت علما کی ذمہ داری ہے کہ اس دور کے نو پیدا مسائل پر تحقیق کریں اور اپنی اس تحقیق میں گزشتہ ماہرین کی تحقیقات سے استفادہ کریں، دنیا جس قدر بڑھتی جائے گی مسائل بڑھتے جائیں گے، جس قدر مسائل ائمہ اربعہ کے سامنے تھے اس سے زیادہ مسائل اگلے دور میں سامنے آئے اور یہ مسائل بڑھتے ہی جائیں گے۔کیوں نہ بڑھتے ہوئے مسائل کو ہی اپنی جولانگاہ فکر وتحقیق بنایا جائے۔پھر یہ کون سی خدمت علم ودین ہے کہ اپنے حصے کے کام پر توجہ دینے کی بجائے اپنے پیش رو ائمہ کے کاموں پر بنام تحقیق تنقید کا بازار گرم کیا جائے؟

آخر امام کی اطاعت کا حکم تو رب نے دیا ہے۔فرمان الٰہی ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء ۵۹) اور اولوالامر میں فقہاء اور علما بھی داخل ہیں، عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ ھُمْ اَھْلُ الْفِقْہِ وَالدِّیْنِ (ابن کثیر) وَعَنْ جَابِرٍ وَمُجَاھِدٍ ھُمْ اَھْلُ الْقُرْآنِ وَالْعِلْمِ وَقَالَ الضَّحَّاکُ یَعْنِی الْفُقَھَاءَ وَالْعُلَمَاءَ فِی الدِّیْنِ (قرطبی)۔اب ذرا سوچو تو سہی اطاعت کیا ہوتی ہے، کیا یہ اطاعت ہے کہ جس کی اطاعت کی جائے پہلے اس کے دلائل دیکھ اور سمجھ لیے جائیں، مضبوط و مستحکم ہوں تو اطاعت کی جائے ورنہ نہیں، اگر دلائل کی بھرپور سمجھ اور اس کی بنا پر فیصلہ کرنے کی اہلیت ہوتی تو پھر خود ہی مطاع ہوگا نہ کہ مطیع۔بلکہ ان ائمہ کے دلائل کی پرکھ رکھتا ہو، صحیح کو سقیم سے الگ کرسکتا ہو تو پھر تو ان کا بھی امام ہوا۔اب ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ ایسا کون ہے؟ کس نے ان کے دلائل کا تجزیہ کیا ہے؟ اگر نہیں، تو تم کو تو اطاعت اولوالامر کرنی تھی نہ کہ اتباع ہوائے نفس، کہ جو مسئلہ اچھا اور آسان لگے اسے لے لو اور جو مشکل لگے اسے چھوڑ دو۔نفس کا حال نہیں معلوم؟ جو فیصلہ اچھا لگے گا اس کے دلائل بھی خوب بھلے معلوم ہوں گے۔دل کی اتھاہ گہرائی سے برجستہ داد پر داد نکلے گی اور جو مسئلہ مشکل لگے گا عقل عیار اس کے دلائل میں کہیں نہ کہیں کوئی سقم یا کھوٹ نکال لے گی۔آخر نفسانیت کا دور تو بہت پہلے شروع ہو چکا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَایَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا یَّنْتَزِعُہٗ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰکِنْ یَّقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰی اِذَا لَمْ یُبْقِ عَالِمًا اِتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسًا جُھَّالًا فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا (۳) اللہ تعالیٰ علم یوں نہ اٹھائے گا کہ لوگوں کے سینوں سے کھینچ لے بلکہ علما اٹھالیے جائیں گے حتی کہ جب علما باقی نہ بچیں گے لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنائیں گے، ان سے مسائل پوچھے جائیں گے تو وہ بے علم فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں

کو بھی گمراہ کریں گے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يُّرْفَعَ الْعِلْمُ وَيَظْهَرَ الْجَهْلُ ،قیامت کی نشانی یہ بھی ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا اور جہالت عام ہو جائے گی۔

(ترمذی ابواب الفتن)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی پندرہ نشانیاں بیان فرمائیں جن میں آخری نشانی یہ ہے: وَيَلْعَنَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا ۔اس امت کے اگلے لوگ اپنے پچھلوں کو برا کہیں گے۔ (۴)

خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ يَاْتِي مِنْ بَعْدِهِمْ قَوْمٌ يَتَسَمَّنُوْنَ وَيُحِبُّوْنَ السِّمَنَ يُعْطُوْنَ الشَّهَادَةَ قَبْلَ اَنْ يُّسْاَلُوْهَا وَفِي رِوَايَةٍ يَخُوْنُوْنَ وَلَا يُؤْتَمَنُوْنَ رَوَاهُ عِمْرَانُ بْنُ حُصَيْنٍ (۵) اچھے لوگ میرے عہد کے ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں پھر وہ جو ان کے بعد آئیں، پھر ان کے بعد ایسی قوم آئے گی جو ریاکار اور شہرت پرست ہوگی، بن مانگے گواہی دیں گے، امانتداری کے بجائے خیانت کریں گے۔

ہاں ان ائمہ اربعہ کا زمانہ دوسرا اور تیسرا زمانہ ہے۔امام ابوحنیفہ تو تابعی ہیں اور دوسرے ائمہ تبع تابعین سے ہیں۔امام ابوحنیفہ کا عہد ۸۰ھ تا ۱۵۰ھ ہے۔امام مالک بن انس کا ۹۳ھ تا ۱۷۹ھ ہے، امام شافعی کا ۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ ہے اور امام احمد بن حنبل کا دور ۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ ہے۔یعنی یہ ائمہ اسی دور کے ہیں جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درجہ اعتبار دیا ہے۔

کہتے ہو کہ صحابہ کرام تو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی نہ تھے، بھلے آدمی! وہ کیوں ہوتے جب ان کے درمیان منبع شریعت موجود ہے، وہ تو صحابہ تھے ہمیں بھی صحابہ ہونا چاہیے؟ وہ تو انصار ومہاجرین، اصحاب بدر واصحاب بیعت رضوان تھے، بتاؤ اب ویسا ہی بننے کی کیا صورت ہے؟

اگر کہو، کوئی حنفی ہے تو کسی دوسرے امام کے فیصلوں کی اتباع کیوں نہیں کرسکتا؟ ہاں! اگر وہ مجتہد ہوگا تو بلاشبہ اسے ایک امام کے فیصلوں کی اتباع ضروری نہ ہوگی، بلکہ اس کے لیے تقلید منع ہے، اور اگر مجتہد نہیں تو جن مسائل پر عمل کر رہا ہے آخر کس وجہ سے انہیں چھوڑے گا؟ اگر دوسرے امام کے مسائل اسے زیادہ قوی اور مدلل محسوس ہوئے تو اس کا یہ احساس کس قدر قوی اور مبنی بر حقیقت ہے؟ یہ بات ائمہ مجتہدین کے حق میں ثابت ہو چکی، لیکن ذرا سوچو یہ احساس کہیں وسوسۂ شیطان تو نہیں؟ کہ رب نے فرمایا" وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ" پھر تو احساس جو کہے اس کی موافقت ضروری ہے، اگر کہو بعض باتیں ایک امام کی مان لیں بعض دوسرے کی، یہ تمہارا منصب نہیں، ائمہ ترجیح اور اصحاب تمیز جو دلائل پر تفصیلی نظر رکھتے ہیں وہ ائمہ کرام کے اقوال میں ترجیح وتمیز کرتے ہیں کہیں فرمایا' عَلَيْهِ الْفَتْوٰى، کہیں فرمایا' وَبِهٖ يُفْتٰى، کہیں' وَهُوَ الصَّحِيْحُ'۔

اور تحقیق مسائل کے لیے کوئی خود کو یا کسی ماہر کو ائمہ اربعہ کے درجے کا محقق ہونے کا دعویٰ کرے تو کیا اجتہاد کے لیے جن علوم میں مہارت اور جن امور میں دست رس ضروری ہے وہ اس میں موجود ہیں؟ مثلاً مانا کہ قرآن جو ان ائمہ کے سامنے تھا من وعن وہ ہر ایک کو میسر ہے۔لیکن کیا احادیث کے وہی وسائل اور وہی رواۃ، تحقیق سند حدیث کے وہی ذرائع یا ان سے بہتر ذرائع، اور تفتیش کے وہی یا بہتر وسائل اور اخلاص کا وہی یا اس سے بہتر ماحول میسر ہے؟ بعد کے دور میں احادیث کا سب سے معتبر ذریعہ صحاح ستہ تو خود مقلدین کی تالیف ہے۔خصوصاً بخاری ومسلم، انہیں دو کتب کو علم حدیث کا سب سے معتمد ترین ذریعہ مان کر ان ائمہ اربعہ کے فیصلوں کی تحقیق شروع کریں تو خود امام شافعی (جن کی فقہ کی موید حدیثیں اس میں جمع کی گئی ہیں) کے متعدد فیصلے کمزور ہوئے جاتے ہیں۔خود امام بخاری جو لاکھوں صحیح حدیثوں کے حافظ تھے صحیح بخاری میں صرف ساڑھے چار ہزار حدیثیں جمع کیں، آخر کیا چیز انھیں مجبور کرتی کہ ان کے مذہب فقہ کے خلاف جو احادیث ہوں وہ بھی درج کرتے۔انھوں نے ساری صحاح جمع کرنے کا التزام تو نہ کیا تھا۔لامحالہ ماننا پڑے گا کہ تحقیق حدیث کے جو ذرائع ان کو میسر تھے وہ اب یقیناً عنقا ہیں۔ذرا غور کریں اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی واضح ہدایت دی ہو تو وہ سننے والوں کے لیے بالکل قابل عمل اور مطلوب تھی، اسی حدیث کے مطابق صحابہ نے، تابعین نے، ائمہ مجتہدین نے فتوے دیے، لیکن آگے چل کر سلسلہ سند میں کوئی ضعیف راوی آ گیا تو اب اس راوی کی وجہ سے وہ حدیث ضعیف ہوگئی، اب تو احکام میں وہ قابل عمل نہ ہوگی۔لہٰذا اگر تقلید نہ کرو تو اس حدیث کی بنیاد پر کسی امام نے جو حکم دیا تھا اب تم اسے رد کرو گے حالانکہ حقیقتاً وہ مطلوب تھا۔

نہ جانے کہاں سے یہ خیال آیا کہ کسی معین امام کی تقلید کرنا اسے رب بنانا ہے۔ کبھی مشرکین سے متعلق آیات کو مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں کبھی یہود ونصاریٰ سے متعلق آیات کو، حالانکہ معاملات میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: جب ایک حدیث صحیح مل جائے تو اس پر عمل کرے نہ کہ قول امام پر۔ قول امام کے خلاف قول خدا وقول رسول ملے پھر بھی قول امام کو ہی ماننا شرک ہے۔ بھلے آدمی! جس امام کا قول معصیت ہو اس کی تقلید کا کون قائل ہے؟ اور ان ائمہ اربعہ میں کا کون سا قول معصیت یا داعی الی المعصیت ہے؟ ذرا نشاندہی تو کرو۔ اب آیتیں اور حدیثیں پیش کرو گے، مگر مطلب خود بھی نہ سمجھو گے۔ چلو ذرا امام ابوحنیفہ ہی کا کوئی قول دکھاؤ جو داعی الی معصیۃ الخالق ہو۔ اگر حدیثیں پیش کرو جو بظاہر مسلک حنفی کی مخالف ہیں، تو تمہارے بھی ایسے فتوے ہیں جن کے خلاف حدیثیں موجود ہیں۔ اب مطلب بتانا شروع کرو گے، تو ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں۔ یوں تو مسئلہ کبھی حل نہ ہوگا۔ کہو کہ اگر باصلاحیت ہوں تو خود کا اپنا اجتہاد کیوں نہیں کر سکتے؟ اور امام ابوحنیفہ سے اختلاف کیوں نہیں کر سکتے؟ جی ہاں، بالکل کر سکتے ہیں، اور ائمہ مجتہدین اس کے اہل تھے، یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے بعد ان کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی نے فقہ سیکھ کر اور ان کی کتابوں سے استفادہ کر کے امام شافعی نے امام ابوحنیفہ کی تقلید کیے بغیر اجتہاد کیا اور بیشمار مقامات پر اختلاف کرتے ہوئے بھی حق بجانب رہے۔ امام احمد بن حنبل کا زمانہ تو اور بعد کا ہے۔ انھوں نے بھی صرف پیش رو ہونے کی بنا پر ان ائمہ کی تقلید نہ کی، بلکہ خود اجتہاد کیا اور سب سے اختلاف بھی کیا، خود امام ابوحنیفہ کے شاگردوں نے اصول کی حد تک ہی اپنے امام کی تقلید کی ہے، مسائل میں تو اپنے اجتہاد کو پوری جولانیت دی ہے اور ساری امت نے ان کے اجتہاد کو تسلیم کیا۔ نہیں دیکھتے کہ اصحاب افتا اپنے امام کے قول کی اندھی تقلید نہیں کرتے، بلکہ مختلف وجوہِ فتاویٰ کی بنا پر کبھی قول امام ابو یوسف پر فتویٰ دیتے ہیں کبھی قول امام محمد بن حسن پر فتویٰ دیتے اور عمل کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں قولِ امام کے خلاف بھی ہو سکتے ہیں۔ دیکھو حرمت خمر تو بالاتفاق مطلقاً حرام اور نجس ہے، لیکن کھجور، کشمش، شہد اور جو وغیرہ کی نبیذ ہلکی پکا کر بنائی جائے اور اس میں جوش بھی آ جائے تو اس کی حرمت امام ابوحنیفہ نے حد اسکار سے مشروط رکھی، قلیل اگر مسکر نہ ہو بلکہ مقوی علی العبادت ہو تو حرج نہیں۔ اور فرمایا پوری دنیا کی دولت مجھے دی جائے کہ میں اسے حرام کہہ دوں تو نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اس میں شبہہ ہے اور اگر ساری دنیا کی دولت مجھے دی جائے کہ میں اس سے ایک قطرہ پی لوں تو ہرگز نہ پیوں کیوں کہ اس میں شبہہ ہے۔ مگر قول امام محمد تو اس کی مطلقاً حرمت کا ہے، جس میں قلیل وکثیر کا فرق نہیں اور فتویٰ امام محمد کے قول پر ہے۔ (۶)

کسی شخص کی موت کے وقت اس کی زوجہ حاملہ ہو تو حمل کے لیے بھی میراث ہوتی ہے اگر وہ زندہ پیدا ہو جائے، لہٰذا حمل کے لیے میراث سے حصہ باقی رکھا جائے گا۔ اب کس قدر حصہ باقی رکھا جائے؟ امام ابوحنیفہ کے نزدیک چار بیٹوں کا حصہ باقی رکھا جائے گا کیونکہ نہیں معلوم پیٹ میں کتنے بچے ہیں، اور امام ابو یوسف کے نزدیک ایک بیٹے کا۔ اور فتویٰ امام ابو یوسف کے قول پر ہے۔ وهذا هو الحق وعليه الفتوىٰ (۷)

تکبیر تشریق کا وقت امام ابوحنیفہ کے نزدیک یوم عرفہ کی فجر سے دسویں کی عصر تک ہے، جب کہ صاحبین کے نزدیک اس کا وقت یوم عرفہ کی فجر سے آخر ایام تشریق کی عصر تک ہے۔ اور فتویٰ صاحبین کے قول پر، وَبِقَوْلِهِمَا يُعْمَلُ وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ (۸)

اگر کہو اپنے امام کے مذہب کے دائرے ہی میں رہے، اس سے تو تجاوز نہ کیا۔ تو تمہیں نہیں معلوم، دیکھو زوج مفقود الخبر کا مسئلہ، کہ کسی خاتون کا شوہر غائب ہو جائے اور اس کا کوئی پتہ یا نشان نہ ملے تو قول امام ابوحنیفہ ستر سال تک انتظار کرنے کا ہے کہ اس دور میں وہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اور قول امام احمد بن حنبل مسئلہ کو دار القضا میں درج کرانے کے بعد چار سال تک انتظار کرنے کا ہے۔ اس کے بعد بحکم قاضی اس شوہر کو میت قرار دے کر عدت کے بعد عورت کسی اور سے نکاح کر سکتی ہے۔ پھر قول امام سے عدول کر کے علما نے قول امام احمد بن حنبل پر ہی فتویٰ دیا۔ ملاحظہ کرو کتب رسم المفتی جن میں قول امام سے عدول کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ پھر بتاؤ، کہاں کس نے کس کو رب کا درجہ دیا؟ لیکن تم چاہو کہ قول امام سے عدول کا حق ہر ایک کو مل جائے تو "فَاسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" کا کیا ہوگا؟ اگر کہیے قول امام سے عدول کی ایک دو مثالوں سے کام نہ چلے گا بلکہ ان کی بندگی کا اعتراف تو جب ہو جب خاصی مقدار میں ان سے اختلاف کیا جائے، ہاں ہر مسئلے میں اختلاف تو آپ بھی نہیں کر سکتے،

ذرا بتاؤ تو ان کی بندگی کے اعتراف کے لیے ان سے کتنے مسائل میں اختلاف درکار ہے؟ اور کون کون اختلاف کرسکتا ہے؟ کتنے بڑے دارالعلوم کا مدرس، یا کتنے بڑے دارالافتاء کا مفتی ہونا چاہیے؟ یا کتنی بڑی مسجد کا امام ہونا چاہیے؟ یا عرب کے کس خطے سے اس کا تعلق ہونا چاہیے؟ اگر کہو، بس دلائل پر نظر رکھنے والا ہو اور قرآن وحدیث کا ماہر ہو، تو ذرا بتاؤ تو ائمہ اربعہ کی تقلید کے خلاف بات کرتے ہی شیخ ابن تیمیہ، شیخ ابن قیم، امام شوکانی اور شیخ البانی وغیرہ کا نام کیوں لینے لگتے ہو، تمہیں تو قرآن وحدیث پیش کرنی تھی۔ جب ان کی تحقیق کا حوالہ دیا ان کے مقلد ہوئے یا نہیں؟ ذرا دل سے کہنا، کسی مقام پر ان شیوخ سے علمی غلطی ہوئی یا نہیں، اگر نہیں تو تمہارے اصول کے خلاف ہے کہ نہیں یا معصوم عن الخطا یہ بھی نہیں، اور غلطی ہوئی تو ان کی تقلید ترک کیوں نہ کی؟ بجائے اس کے کہ تم اس سے عدول کرتے تمہاری دنیا میں تو ان کی ہر بات کو حقیقت ثابتہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ مثلاً حدیث لَاتَشُدَّ الرِّحَالَ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَۃِ مَسَاجِدَ مَسْجِدُ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِیْ ھٰذَا وَمَسْجِدُ الْاَقْصٰی۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کسی نبی یا ولی کی قبر کی زیارت کے لیے حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس پر حاضری کی نیت سے سفر کرنا ممنوع ہے۔ اب ذرا ہوش سنبھالو اور غور کرو اس حدیث پاک میں استثنا مفرغ ہے کیوں کہ مستثنیٰ منہ محذوف ہے، اب یہاں محذوف مستثنیٰ منہ عام مانتے ہو یا خاص۔ اگر مکان یا بلد وغیرہ عام مقدر مانو تو معنی ہوگا کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ کہیں کا سفر نہ کرو۔ پھر تم دنیا بھر کے جو سفر کرتے ہو اس کا کیا ہوگا؟ کس قدر حرام کا ارتکاب کرتے ہو! اور اگر محذوف مستثنیٰ منہ خاص ہو تو مفہوم بالکل واضح ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی "لَاتَشُدَّ الرِّحَالَ اِلٰی مَسْجِدٍ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَۃِ مَسَاجِدَ" تو یہاں دنیا کی ساری مساجد مستثنیٰ منہ ہوں گی اور یہ تین مسجدیں مستثنیٰ۔ کیونکہ ان تینوں مسجدوں میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے، باقی مسجدوں میں نماز پڑھنے کا ثواب برابر ہے، پھر اپنی یا اپنے علاقے کی مسجد کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں صرف نماز پڑھنے کے قصد سے سفر کرنا کون سی عقلمندی ہے، جب کہ حدیث کثرۃ خطیٰ سے بھی اپنے علاقے کی مسجد کو ویران کرنے کی اجازت نہیں۔ اب بولو، یہاں قبور انبیا وصالحین اس ممانعت میں کہاں سے داخل ہوں گی۔ حالانکہ یہ زیارت تو شرعاً مطلوب ہے کُنْتُ نَھَیْتُکُمْ عَنْ زِیَارَۃِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْھَا فَاِنَّھَا تُذَکِّرُ الْآخِرَۃَ۔ حدیث شدرحال سے غیر علمی استدلال کر کے تم حاضری روضہ انور سے منع کرتے ہو، اور رب تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ جَاءُوْکَ" جس میں حیات وممات کی کوئی قید نہیں، اور حکم سارے مسلمانوں کو، یعنی رب کا حکم ہے مسلمانو! گناہ کرو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور تم کہتے ہو وہاں سفر کر کے مت جاؤ۔ اب رب کے حکم کی بجائے شیخ ابن تیمیہ کی بات مانی تو انہیں رب کا درجہ دیا یا نہیں؟ اور سفر شرعی کی بات بھی خوب کہی، حج کے موقع پر حجاج کرام کو شیخ ابن باز کی جو تصانیف حج وعمرہ کے متعلق دی جاتی ہیں ان میں شیخ ابن باز لکھتے ہیں کہ "مسجد نبوی میں نماز کے ارادے سے مدینے جائے اور جائے تو قبر رسول کی زیارت بھی کر لے، خاص زیارت کی نیت سے مدینے کا سفر نہ کرے۔" یہ زیارت کی تھوڑی سی گنجائش جو نکالی ہے اس پر دراصل حدیث رسول "مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ" نے تمہیں مجبور کیا، اب بتاؤ حج کے سارے ارکان تو مکہ مکرمہ میں پورے ہو جاتے ہیں، اسی لیے حدیث کے کلمات "مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ" میں زیارت کو حج میں داخل نہیں فرمایا، اس حدیث پاک میں صرف زیارت کا ذکر ہے، نہ کہ مسجد نبوی میں نماز کا (وہ الگ مستقل عبادت ہے) اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا فاصلہ اتنا ہے کہ متفقہ طور پر یہ سفر سفر شرعی ہے۔ اور حدیث میں ذکر صرف زیارت کا ہے، لہٰذا اس حدیث کا واضح مفہوم یہ ہوا کہ جو میری قبر کی زیارت کے لیے حج کے بعد سفر شرعی نہ کرے وہ ظالم ہے۔ اور رسول پر ظلم کا انجام "وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (توبہ ۶۱)" اور تم کہتے ہو کہ زیارت کے لیے سفر نہ کرے، مسجد نبوی میں نماز کے لیے سفر کرے اور ساتھ میں زیارت بھی کر لے۔ ان غیر مقلدین نے اللہ ورسول کے واضح احکام کے خلاف اپنے علما کی تقلید کا پٹہ اپنی گردنوں میں ڈال رکھا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کی تقلید شرک ہے۔

تقلید ائمہ کے خلاف جو باتیں پر کشش بنا کر کہی جاتی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ عمل بالکتاب والسنۃ ہونا چاہیے نہ کہ عمل بما قال الامام، بھلا تمہیں یہ بات کیسے سمجھ میں آئے گی کہ قولِ امام، قولِ خدا وقولِ رسول کا شارح ہے، نہ کہ اس کا مقابل۔ یہی مان کر ساری امت ان کے اقوال پر عمل کرتی ہے نہ کہ ان کے اپنے ذاتی اقوال مان کر۔ تم جو

قولِ امام کو قولِ خدا و رسول کے مقابل قرار دیکر عمل بالحدیث کی بات کرتے ہو،بتاؤ کیا ساری احادیث پر عمل ممکن ہے؟اگر روایات متعارض ہوئیں' پھر کیا ہوگا؟تطبیق نہ ہو سکے تو ترجیح کے عمل کے بغیر کیسے عمل ہوگا ؟اسی لیے دورِ صحابہ میں جسے ناسخ منسوخ کا علم نہ ہو وہ فتویٰ دینے کا مجاز نہ تھا۔سچ کہا کہ صرف انبیاء معصوم عن الخطا ہیں باقی ہر ایک سے غلطی ہو سکتی ہے،اسی لیے ہر مجتہد کا ماننا ہے کہ اس کا اجتہاد جو فیصلہ کرے وہ صواب ہے لیکن اس میں احتمالِ خطا ہے،اگر عند اللہ بھی صواب ہو،تو کیا خوب! مجتہد کو دونا اجر ملے گا،اور ایک روایت میں ہے کہ اسے دس نیکیاں ملیں گی،اور اگر عند اللہ خطا ہو،پھر بھی اسے اجر ملے گا،اس کی گرفت نہ ہوگی،ملاحظہ ہو حدیث شریف۔

جَاءَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم خَصْمَانِ يَخْتَصِمَانِ فَقَالَ لِعَمْرٍو اِقْضِ بَيْنَهُمَا يَا عَمْرُو فَقَالَ اَنْتَ اَوْلٰى بِذٰلِكَ مِنِّي يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاِنْ كَانَ، قَالَ فَاِذَا قَضَيْتُ بَيْنَهُمَا فَمَا لِي؟ قَالَ اِنْ اَنْتَ قَضَيْتَ بَيْنَهُمَا فَاَصَبْتَ الْقَضَاءَ فَلَكَ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَاِنْ اَنْتَ اِجْتَهَدْتَ فَاَخْطَأْتَ فَلَكَ حَسَنَةٌ. (۹)

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو آدمی کوئی مسئلہ لے کر آئے تو آپ نے حضرت عمرو بن العاص سے فرمایا،کہ ان کے مابین فیصلہ کرو، عرض کی: یارسول اللہ مجھ سے زیادہ اس کے آپ حق دار ہیں،فرمایا:اگر چہ ایسا ہے،عرض کی: میں فیصلہ کروں تو میرے لیے کیا اجر ہے؟فرمایا:اگر تم ان کے مابین فیصلہ کرو اور درست کرو تو تمہارے لیے دس نیکیاں ہیں، اور اگر تمہارے فیصلے میں خطا ہو جائے تو تمہارے لیے ایک نیکی ہے۔"

دوسری حدیث میں ہے: اِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَاَصَابَ فَلَهُ اَجْرَانِ وَاِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ فَاَخْطَأَ فَلَهُ اَجْرٌ وَاحِدٌ. یعنی جب فیصلہ کرنے والا اجتہاد سے فیصلہ کرے اور وہ فیصلہ درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہے،اور اگر اس کا فیصلہ خطا ہو تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔(۱۰)

اگر مجتہد سے خطا ہو جائے تو بھی اس کو ثواب ہے،ثابت ہوا کہ ائمہ مجتہدین کی خطا قابل گرفت نہیں۔خطا پر جب ان کی گرفت نہیں تو ان کے اجتہاد پر عمل کرنے والے کی گرفت کیوں ہوگی؟۔اور اجر تو آخرت میں ملے گا تو ان خطاؤں کا عقدہ بھی وہیں کھلے گا،کہ کس سے خطا ہوئی، کس سے نہیں،ابھی سے کیوں خطائیں مان بیٹھیں،خطا سے پہلے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صواب کی بات فرمائی تھی،اسے ہی پہلے مان کر عمل میں یکسوئی پیدا کی جائے جو عین مطلوب ہے۔

تقلید بالامام کی بجائے عمل بالحدیث کی بات کرتے ہو اور خود بھی کتنی حدیثوں پر عمل نہیں کرتے،ہاں ائمہ کے فیصلوں کے خلاف کوئی حدیث مل جائے تو اس پر عمل کرنے میں بڑا لطف آتا ہے،کسی تعصب یا جذبہ مخاصمت سے بے نیاز ہو کر جب پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر احادیث پر غور کرو گے تو اندازہ ہوگا کہ تقلید بالامام ہی عمل بالحدیث ہے۔ورنہ بڑی بڑی غلطیاں کرو گے،بلکہ ان ائمہ سے تو خطاؤں کا امکان تھا تم سے تمرد و سرکشی ہوئی جاتی ہے۔

یہاں امریکہ میں بہت سی مسجدوں کے امام عرب ہیں،میرے ایک کرم فرما ڈاکٹر نسیم صاحب ایسی ایک مسجد میں نماز کے لیے گئے اور امام صاحب سے اجازت لے کر اذان و اقامت کہی،حسب معمول کلمات اقامت بھی اذان کی طرح دو دو بار ادا کیے،امام صاحب نے انھیں نماز کے بعد بیٹھا لیا کہ آپ سے ایک بات کرنی ہے۔پھر تھوڑی دیر میں بخاری شریف (انگریزی ترجمے کے ساتھ) لاکر کتاب الاذان کھول کر حضرت انس بن مالک کی یہ روایت دکھائی "عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ اُمِرَ بِلَالٌ اَنْ يَّشْفَعَ الْاَذَانَ وَيُوْتِرَ الْاِقَامَةَ" (۱۱) اور کہا اس کا انگریزی ترجمہ پڑھو اس میں کیا لکھا ہے،یعنی اقامت ایک ایک بار ہونی چاہیے،ڈاکٹر صاحب نے کہا،ہم حنفی ہیں،ہم یوں ہیں کہتے ہیں،بولے،حنفی ہوں یا شافعی،یہ حدیث کیا کہتی ہے؟ساتھ میں ایک علمی دہشت گردی کا جملہ بھی جڑ دیا"میں چیلنج کرتا ہوں کہ حدیث کی کسی کتاب میں کوئی دکھادے کہ کلماتِ اقامت بھی اذان کی طرح دو دو بار ہیں۔ڈاکٹر صاحب جب شام میں میرے پاس آئے تو اس معاملے کا ذکر کیا،میں نے کہا،معلوم ہوتا ہے صاحب دو رکعت کے امام ہیں۔کتب حدیث کی انہیں ہوا بھی نہیں لگی،فقہ تو دور کی بات ہے۔اولاً تو میں نے ڈاکٹر صاحب کو اس حدیث کے حوالے سے مطمئن کیا،پھر مختلف کتب صحاح سے کلمات اقامت کے دو دو ہونے پر بلا تبصرہ نو روایتیں نقل کر کے بھیج دیں۔اور کہہ دیا کہ یہ دے کر کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں معروف سے نہی کا نہیں بلکہ منکر سے نہی کا حکم دیا ہے۔اور یہ حدیثیں دیکھ کر مطلب بتانا شروع کریں تو فوراً مجھے فون

کریں۔ اگر اس حدیث کا حوالہ دینے کی بجائے کسی مذہب فقہ کی تقلید میں ایک ایک بار اقامت کی حمایت اور عمل کیا ہوتا تو جان چھوٹ جاتی، اب حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہو تو سنو، اس میں اقامت کے لیے وتر کا لفظ بیان عدد میں صریح نہیں، وتر کا معنیٰ 'ایک' ہے ہی نہیں بلکہ ایک، تین، پانچ، سات، سب پر 'وتر' صادق آتا ہے، تو کلمات اقامت کا ایک ایک بار ہونا اس حدیث سے کیسے ثابت کرو گے؟ جب کہ حضرت ابومحذورہ کی روایت بیان عدد میں بالکل صریح ہے "وَعَلَّمَنِی الاِقَامَةَ سَبعَ عَشرَةَ کَلِمَةً" (۱۲) اب تم کو بخاری ومسلم چھوڑ کر دیگر کتب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جہاں اقامت کے لیے فرادیٰ فرادیٰ کا لفظ ملے، تو وہاں تو مثنیٰ مثنیٰ کی بھی روایتیں ملیں گی حالانکہ بخاری کی حضرت انس کی حدیث کے مقابل حضرت عبداللہ بن زید کی روایت بھی ہے جسے ترمذی نے تخریج کی "کَانَ اَذَانُ رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ شَفعاً شَفعاً فِی الاَذَانِ وَالاِقَامَۃِ" آخر کس حدیث پر عمل کرو گے؟ اور کیوں؟ دراصل حدیثوں کے حوالے سے اگر اذان واقامت کی پوری تاریخ پر نظر ہو تو اندازہ ہوگا کہ اس باب میں حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت ابومحذورۃ کی روایات اصل ہیں، نہ کہ حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ بن عمر کی، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، اور ظاہر ہے کہ اقامت کے، مثل اذان ہونے یا مثنیٰ مثنیٰ ہونے کے بارے میں اول الذکر صحابہ کی، اور ایک ایک بار ہونے کے بارے میں موخر الذکر صحابہ کی مرویات ہیں۔ (ملاحظہ ہو کتب صحاح کتاب الاذان) اب ذرا سوچو کہ ایک روایت میں ایک ایک بار کلمات اقامت کہنے کا ذکر ہو دوسری روایت میں دو دو بار کہنے کا، تو احتیاط تو اسی میں ہے کہ دو دو بار کہہ لیے جائیں، کیونکہ ایک ایک بار کہنے سے دو والی روایات بالکل متروک ہو جائیں گی، جب کہ دو بار کہنے سے ایک والی روایات پر بھی یک گونہ عمل ہو جائے گا کیونکہ علم الاعداد کے اعتبار سے 'دو' میں 'ایک' داخل ہے۔ اور یوں بھی کسی کو ایک بار کہنے کو کہا جائے، وہ دو بار کہہ دے تو یہ اضافہ ہوگا نہ کہ حکم کی خلاف ورزی یا تبدیلی۔

اس موقع پر ایک اور غیر مقلد سے راقم کی گفتگو ملاحظہ کریں۔ میں ایک بار کچھ بچوں کو نماز کی تربیت دے رہا تھا، اس میں درود ابراہیمی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام مبارک کے ساتھ 'سیدنا' کا اضافہ کر کے بتایا، جو حدیث پاک میں نہیں ہے۔ اس پر ایک صاحب نے جنہیں قرآن وحدیث کے علم کا غرہ تھا، اعتراض کیا کہ یہاں 'سیدنا' کا اضافہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ دعا اللہ سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت نازل فرما، تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو 'سیدنا' نہیں کہنا چاہیے، ہاں اس کے علاوہ سید المرسلین کہہ سکتے ہیں۔ میں نے کہا، علامہ شامی نے ردالمحتار میں 'سیدنا' کے اضافے کو مستحب لکھا ہے، لانہ ادخل فی الادب"۔ بولے ہمیں کسی ایک کی تقلید نہیں کرنی چاہیے، میں نے کہا، پھر کیسے عمل کیا جائے؟ بولے، جس پر علما کا اجماع ہو اس پر عمل کرنا چاہیے، میں نے کہا علما کا اجماع کیسے معلوم ہوگا؟ بولے آپ نے ابن تیمیہ کی کتب پڑھیں؟ میں نے کہا: ہم ان کی تقلید نہیں کرتے، لیکن ذرا بتائیں یہ درود ابراہیمی سنت ہے یا واجب؟ بولے نماز کا حصہ ہے۔ میں نے پھر کہا: سنت ہے یا واجب؟ بولے نماز کا حصہ ہے۔ میں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام التحیات میں بھی ہے اور درود ابراہیمی میں بھی، لیکن التحیات واجب ہے اور درود ابراہیمی سنت ہے، ہم نے فرائض وواجبات میں کچھ اضافہ نہ کیا کہ یہ مقام مقام اتباع ہے، اور سنتِ درود ابراہیمی میں نام اقدس کے ساتھ 'سیدنا' کہنا ہی ادب واحترام اور ایمان کا تقاضا ہے۔ حبر الامت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے التحیات سکھانے کے بعد فرمایا "اِذَا قُلتَ ھٰذَا فَقَد تَمَّت صَلَاتُکَ" تو نماز تو پوری ہو چکی ہے اب درود شریف میں نام اقدس کے ساتھ سیدنا کا اضافہ کیا جائے تو کیا حرج ہے؟ بولے حدیث میں تو نہیں، میں نے کہا حدیث تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، وہ خود کو کیسے 'سیدنا' کہتے؟۔

آخر اس سمجھ کو کیا کہا جائے جو اضافہ کو خلاف ورزی یا تبدیلی سمجھتی ہو، مثلاً دس دینے کو کہا، نو دیے تو خلاف ورزی کی، گیارہ دیے تو خلاف ورزی کہاں؟ وہ تو اکسٹرا کریڈٹ کا مستحق ہے، ہاں بیانِ حصر ہو تو بات دوسری ہے۔ ذرا اصول تو یاد کرو کہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہے، کیا خبر واحد سے کتاب اللہ کی خلاف ورزی یا اس کی تبدیلی جائز ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت کے بارے میں 'جس کا مفاد یہ ہے کہ مطلقہ ثلاثہ کو سکنیٰ اور نفقہ نہ

ملے گا' فرماتے ہیں "لَاادَعُ کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّۃَ نَبِیِّنَا بِقَوْلِ امْرَأۃٍ لَاادْرِیْ اَحَفِظَتْ اَمْ نَسِیَتْ" تو ثابت ہوا کہ اضافہ وزیادتی نہ حکم کی تبدیلی ہے نہ خلاف ورزی، بلکہ جنس مطلوب سے ہو تو مرغوب ہے۔

تقلید ائمہ سے روکنے کے لیے کہتے ہو کہ 'صرف انبیائے کرام معصوم عن الخطا ہیں باقی سب سے خطا کا صدور ہو سکتا ہے، گویا تمہارے نزدیک امکان خطا، وقوع خطا کو مستلزم ہے۔ پھر تمہیں کو اپنے اقوال میں خاطی کیوں نہ کہا جائے۔ تجربہ یہ ہے کہ اکثر اچھی بات کسی غلط مقصد کے لیے استعمال کرتے ہو مثلاً یہاں ائمہ کی خطا ثابت کرنے کے لیے انبیاء کو معصوم عن الخطا مانا اور جب انبیاء کا ذکر آئے گا تو وہاں یہ بات بھول جاؤ گے۔ اور وہاں قرآن وحدیث پڑھ پڑھ کر انبیائے کرام کی طرف' خطاؤں اور بھول کی لمبی فہرست منسوب کر دو گے، اور ان پر حملہ کرنے کے لیے اللہ وحدہ لاشریک کی عظمت وقدرت کا حوالہ دو گے۔

حدیث گزری کہ یہ قیامت کی نشانی ہے کہ بعد کے لوگ اپنے بزرگوں کو برا بھلا کہیں گے۔ دور جدید میں اکابر کو گالی دینے کا نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے۔ جس کو برا بھلا کہنا ہو اس کو اس سے بڑے کے مد مقابل لاکر اسے جو چاہو بول دو، لوگ کچھ کہہ بھی نہ سکیں گے اور دل کی بھڑاس بھی نکل جائے گی۔ ائمہ مجتہدین کو بولنا ہو تو انبیا سے تقابل کرتے ہو اور انبیا کو بولنا ہو تو اللہ تعالیٰ کے مد مقابل لاکر جو چاہو بولو، یوں تو کوئی کسی کو بول سکتا ہے۔ عموماً غیر مقلدین کے توصیفی جملے بھی اعتراف عظمت کی بجائے کسی کی ہتک حرمت کے لیے ہوتے ہیں۔

جو خود سمجھتے ہیں اسی کو دین کہتے ہیں اور جب صحیح حدیثوں کی وجہ سے معاملہ پھنستا ہے تو تھوڑا سا اعتراف کر لیتے ہیں مثلاً بخاری کی حدیث اصحاب غار کی بنیاد پر اتنا مانا کہ اعمال کو خدا کی بارگاہ میں وسیلہ بنایا جا سکتا ہے، کیونکہ ان تینوں افراد نے اپنے اعمال کے ہی وسیلے سے دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی، لیکن بارگاہ الٰہی میں کسی شخصیت کا وسیلہ درست نہیں'۔ حالانکہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کی حدیث تمہارے نزدیک بھی صحیح ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے ہی دعا کی تعلیم ہے "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُکَ وَاَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ" (۱۳) اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی دعا میں بھی بطور وسیلہ شخصیت ہی کا تو ذکر ہے نہ کہ اعمال کا، دیکھو بخاری شریف کتاب الاستقاء' اِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَانَ اِذَا قُحِطُوْا اِسْتَسْقٰی بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ اِنَّا کُنَّا نَتَوَسَّلُ بِنَبِیِّنَا فَتَسْقِیْنَا وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِعَمِّ نَبِیِّنَا فَاسْقِنَا قَالَ فَیُسْقَوْنَ"۔ صریح حدیث کے خلاف بولتے ہو، اور دعوی ہے عمل بالحدیث کا۔

چند مصری حضرات مجھے بریلوی سمجھ کر میری مسجد میں آئے اور مختلف سوالات میں ایک سوال وسیلہ کا بھی کیا، میں نے کہا: قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ" بولے یہ تو اعمال ہیں، میں نے کہا، یہاں ذکر نہ تو اعمال کا ہے نہ شخصیات کا، اگر اعمال کا وسیلہ مطلوب ہے تو انبیا کا وسیلہ تو اور زیادہ مطلوب ہوگا کیوں کہ سورہ ماعون نے بتایا کہ بعض لوگوں کی نماز ہی انہیں جہنم میں لے جائے گی، تو بارگاہ الٰہی میں ہمارے اعمال کی مقبولیت کی ہمارے پاس کوئی ضمانت نہیں، لیکن انبیا بہر حال مقبول ہیں ورنہ وہ نبی کیوں ہوتے۔

جمع بین الصلاتین کا مسئلہ بھی عمل بالحدیث کا اہم موضوع رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے "جَمَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلّم بَیْنَ الظُّھْرِ وَالْعَصْرِ وَبَیْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِالْمَدِیْنَۃِ مِنْ غَیْرِ خَوْفٍ وَّلَامَطَرٍ (۱۴) اور ابوداؤد شریف میں متعدد واقعات بیان فرمائے جن میں دوران سفر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع بین الصلاتین فرمائی۔

اس جمع بین الصلاتین کا کیا معنی سمجھتے ہو؟ دو نمازوں کو ایک نماز کے وقت میں ملا کر پڑھ لینا، یہ کہاں سے ثابت ہوگا؟ حج کے علاوہ کہاں اس کی صراحت ملتی ہے؟ اگر ایسا کریں تو قرآن پاک کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی، اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا (نساء ۱۰۳) یعنی ہر نماز وقت کا فریضہ ہے، یوہیں حدیث امامت جبریل کے آخری جملہ "اَلْوَقْتُ لَکَ مَا بَیْنَ ھٰذَیْنِ الْوَقْتَیْنِ" کی بھی مخالفت ہوگی۔ نہ صرف اسی قدر بلکہ ان تمام حدیثوں کو ترک کرو گے جن میں بے وقت نماز پڑھنے اور جان بوجھ کر نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کرنے پر وعید شدید بیان کی گئی ہے۔ حالانکہ تم تو عمل بالحدیث کے قائل تھے تمہارے لیے بڑی آسانی تھی کہ اس جمع بین الصلاتین کو اس معنی پر محمول کرتے جس کی تفصیل خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت ضرورت حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کو بتائی تھی۔ 'یعنی ظہر کی نماز آخر وقت میں پڑھنا اور عصر اول وقت میں، جو بظاہر جمع ہے، لیکن حقیقتاً اپنے اپنے

وقت میں ہے۔ حضرت حمنہ بنت جحش کی روایت کا آخری حصہ یہ ہے۔

فَاِنْ قَوِیْتِ عَلٰی اَنْ تُؤَخِّرِیَ الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِی الْعَصْرَ فَتَغْتَسِلِیْنَ وَتَجْمَعِیْنَ بَیْنَ الصَّلَاتَیْنِ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَتُؤَخِّرِیْنَ الْمَغْرِبَ وَتُعَجِّلِیْنَ الْعِشَاءَ ثُمَّ تَغْتَسِلِیْنَ وَتَجْمَعِیْنَ بَیْنَ الصَّلَاتَیْنِ فَافْعَلِی وَتَغْتَسِلِیْنَ مَعَ الْفَجْرِ فَافْعَلِی وَصُوْمِی اِنْ قَدَرْتِ عَلٰی ذٰلِکَ. (۱۵)

تراویح کی بیس رکعات پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پڑھ پڑھ کر واویلا مچا رکھا ہے تا کہ نیک کام جس قدر کم ہو سکے اچھا ہے، جو حدیث پیش کی اس کے الفاظ پر بھی غور نہ کیا کہ وہ کس سلسلے کی ہے، تراویح کی صرف اصل' حدیث مرفوع سے ثابت ہے، لیکن باقاعدہ تراویح کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد سے شروع ہوا، جو حضرت اُبی بن کعب کی امامت میں بیس رکعتوں پر مشتمل تھی، اور اسکا ذکر حدیث کی متعدد کتب میں ہے۔ (ترمذی، موطا، بیہقی) رہی بخاری شریف کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت جو تمہارا مبلغ استدلال ہے، مَاکَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَزِیْدُ فِی رَمَضَانَ وَلَافِی غَیْرِهٖ عَلٰی اَحَدَ عَشَرَ رَکْعَةً یُصَلِّی اَرْبَعاً فَلَاتَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ ثُمَّ یُصَلِّی اَرْبَعاً فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ ثُمَّ یُصَلِّی ثَلَاثاً'' (۱۶) 'فِی رَمَضَانَ وَلَافِی غَیْرِهٖ' سے تمہیں اندازہ نہ ہوا کہ یہ اس نماز کے بارے میں فرماتی ہیں جو رمضان اور غیر رمضان سب میں پڑھتے تھے، اور وہ بلا شبہ صلاۃ اللیل ہے، کیا تراویح' غیر رمضان میں بھی پڑھتے تھے؟ یہ تو تہجد تھی جسے اندرون خانہ ادا فرماتے، اسی لیے اس کی راوی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں، اور امام بخاری نے اس روایت کو تہجد کے باب میں بیان کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تراویح میں تو بڑا مجمع شامل ہو گیا تھا، جس کے وجوب کے خدشے سے تیسرے دن آپ نے وہ نماز ترک فرمادی تھی، حالانکہ تہجد ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔ یہ ہے عمل بالحدیث، کہاں کی بات کہاں لگائی، یہ ہے ائمہ سے مخاصمت، کیوں کہ آٹھ رکعات تراویح تو کسی امام کی دریافت نہ تھی، واقعی تم نے کمال کر دیا۔ حضرت امام مالک کے نزدیک تو چھتیس رکعات تھیں، اور اہل مدینہ کا عمل اکتالیس رکعات پر تھا جسے حضرت اسحٰق بن راہویہ نے بھی اختیار کیا تھا، (۱۷) بھلا ادھر کیوں جاتے، جس قدر گنجائش نکلتی رہے نکالتے رہو، اور جب پھنس جاؤ تو مان لو، اسی حالت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا 'اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ' اپنے دل سے فتویٰ پوچھو۔ الحمد للہ ہمارا مذہب ہی ہماری چوائس ہے، اور تمہارا مذہب تو تمہاری مجبوری، لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ. وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِکَ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی سَائِرِ الْاَئِمَّةِ الْمُجْتَهِدِیْنَ، آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ.

حوالے

(۱) تاریخ فقہ اسلامی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۶۱
(۲) بحوالہ مقیاس الحنفیت ۱۷۴
(۳) صحیح البخاری کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم
(۴) ترمذی ابواب الفتن
(۵) ترمذی ابواب الفتن
(۶) درمختار کتاب الاشربہ
(۷) المبسوط للسرخسی کتاب الفرائض باب حمل المیراث
(۸) فقہ العبادات علی المذهب الحنفی، کتاب الصلاۃ فصل صلاۃ العیدین
(۹) مسند امام احمد، مسند الشامیین، بقیة حدیث عمرو بن العاص
(۱۰) صحیح البخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة باب اجر الحاکم اذا اجتهد فاصاب او اخطأ، والجامع الصغیر باب حرف الالف
(۱۱) رواہ البخاری ومسلم
(۱۲) ابو داؤد کتاب الاذان.
(۱۳) ترمذی کتاب الدعوات
(۱۴) ترمذی باب ماجاء فی الجمع بین الصلاتین
(۱۵) ابو داؤد کتاب الطهارة باب من قال اذا اقبلت الحیضة تدع الصلاۃ
(۱۶) بخاری ابواب التہجد
(۱۷) ترمذی، قیام رمضان

☆☆☆

وقار احمد ندوی ☆

سعودی حکومت کے نظریات و عملی کردار اور برصغیر کے غیر مقلدین

برصغیر کے بے چارے سلفی کیا ہیں، کچی مٹی کے دیئے تھے، جن میں مٹی تیل ڈالنے کے بجائے پٹرول ڈال کر روشن کرنے کی کوشش کی گئی۔ نتیجہ ظاہر تھا، بجائے اس کے کہ خود روشن ہوتے اور گرد وپیش کے ماحول کو روشن کرتے خود اپنے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ جب پٹرول ختم ہوگا اور شعلے بجھ جائیں گے، سیاہی کی اتنی تہہ جم چکی ہوگی کہ غیروں کے لیے ان کی شناخت مشکل ہوگی اور وہ خود اپنے وجود سے گھن محسوس کریں گے۔ برصغیر کے نابالغ وخام فکر سلفی معاشرے کی طفلانہ شوخی حد ادب سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ نومولود کے ناف کا زخم سوکھ نہیں پاتا ہے اور وہ اپنے باپ کا قد ناپنا شروع کر دیتا ہے کہ باپ ہی تو ہیں۔ اللہ یا اللہ کے رسول تھوڑی ہیں جو ان کی ہر بات مان لی جائے۔

جواں سال وجواں فکر صحافی خوشتر نورانی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے راقم سطور کو جام نور کے خصوصی نمبر میں قلمی شرکت کے قابل سمجھا۔ جس عنوان کے تحت مجھے لکھنے کا حکم ملا ہے وہ مشکل کم اور دلچسپ زیادہ ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ معاشرے کے ہر طبقہ میں دیکھا اور محسوس کیا جاتا ہے کہ کسی بھی طبقہ کا دو اشرافیہ گروہ جب کسی مسئلہ میں آمنے سامنے ہوتا ہے تو اپنے مقام ومرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے ایک دوسرے کے خلاف زبان استعمال کرتا ہے، جبکہ اس کے حاشیہ بردار، نمک خوار چیلے، چمچے اپنی اوقات چھپا نہیں پاتے اور مغلوب الغضب ہو کر ایسی بازاری زبان استعمال کرتے ہیں، جنہیں سن کر خود ان کے آقائے نعمت شرمائے بغیر نہیں رہ پاتے۔ سعودی سلفی حکومت اور علماء کے مقابلہ میں برصغیر کے سلفیوں کا حرف بہ حرف یہی حال ہے۔

بات صدیوں پرانی ہے، وادیٔ شام کے شیخ تقی الدین بن تیمیہ اور صوفی بن قیم الجوزیہ کے غیر تقلیدی فقہی سلسلہ کی خلافت جب صحرائے نجد کے شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی تک پہنچی، اس زمانہ میں خانوادۂ آل سعود کے مورث اعلیٰ سعود کے انتقال کے بعد خطۂ نجد پر ان کے بیٹے محمد کی حکومت تھی۔ حاکم نجد محمد بن سعود اور شیخ نجد محمد بن عبد الوہاب نے ایک دوسرے کا بھرپور ساتھ نبھایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ابن سعود کی حکومت کے ساتھ ساتھ خطۂ نجد میں غیر تقلیدی مزاج ورجحان کو بڑی تقویت ملی۔ ۱۷۶۵ء میں محمد بن سعود کے انتقال کے بعد عبد العزیز بن محمد نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس نے کم وبیش اڑتیس (۳۸) سال حکومت کی۔ اس کی حکومت نجد سے نکل کر الأحساء، قطیف، شام کے مضافاتی علاقے، عراق، یمن اور حجاز مقدس تک پھیل گئی۔ ۱۸۰۳ء میں اس کے انتقال کے بعد سعود بن عبد العزیز نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور دس سال حکومت کرنے کے بعد ۱۸۱۳ء میں اس کا انتقال ہوگیا اور حکومت اس کے بیٹے عبد اللہ بن سعود کو منتقل ہوگئی۔ عبد اللہ بن سعود کی حکومت کے چار سال ہی مکمل ہوئے تھے کہ مصر کے حاکم محمد پاشا نے اپنے بیٹے محمد علی کی قیادت میں نجد پر یلغار کرنے کے لیے ایک لشکر روانہ کر دیا۔ عبد اللہ بن سعود اپنے اور شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے خاندان کے ساتھ گرفتار ہو کر خلافت عثمانیہ کے دار السلطنت آستانہ پہنچا دیا گیا، جہاں عبد اللہ قتل کر دیا گیا اس طرح آل سعود کی نجدی حکومت کا پہلا دور ۱۸۱۷ء میں ختم ہوگیا، یہ دور کم وبیش پچپن (۵۵) سالوں کو محیط ہے۔

خطۂ نجد پر آل سعود کی حکومت کا دوسرا دور ۱۸۳۰ء سے شروع ہو کر ۱۸۸۸ء تک جاری رہا۔ اس دوران ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۳ء تک تقریباً پانچ سال کے لیے وہ حکومت سے بے دخل رہے۔ اس دور میں آل سعود کے تین شہزادوں نے حکومت کی، جن کے نام اور دور اقتدار بالترتیب اس طرح ہیں۔ فیصل بن ترکی نے ۳۱ سال، عبد اللہ بن فیصل نے (۲۱) اکیس سال جبکہ عبد الرحمٰن بن فیصل نے تقریباً ڈیڑھ سال حکومت کی۔ ۱۸۸۸ء میں حائل کے حاکم محمد بن رشید نے خلافت عثمانیہ کی زیر سرپرستی نجد پر حملہ کیا۔ حاکم نجد عبد الرحمٰن بن فیصل جان بچا کر افراد خاندان کے ساتھ قطر چلے گئے، وہاں سے بحرین گئے اور بالآخر کویت میں جا کر مقیم ہوگئے، عبد الرحمٰن بن فیصل کی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ آل سعود کے نجدی اقتدار کا دوسرا دور بھی ختم ہوگیا، یہ دور بھی کم وبیش چوون (۵۴) سالوں تک جاری رہا۔ ریاض (نجد) چھوڑنے کے وقت عبد الرحمٰن بن فیصل کے ساتھ

☆Chandan Patti, Darbhanga, Bihar

ان کا ایک بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا، جس کا نام عبدالعزیز تھا اور اس کی عمر اس وقت کم و بیش بارہ (۱۲) سال تھی- عبدالعزیز بھی اپنے باپ کے ساتھ کویت میں مقیم تھا لیکن وہ اپنے آباء و اجداد کی حکومت کو بہر حال واپس لینا چاہتا تھا، یہی وجہ ہے کہ جب وہ تقریباً پچیس (۲۵) سال کا ہوا تو اس نے ۱۹۰۲ء میں کمال جواں مردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف ۶۵ آدمی کے ساتھ ریاض پر حملہ کر دیا اور کامیاب بھی ہو گیا، ریاض کے گورنر عجلان کو قتل کر کے اس پر قبضہ کر لیا، اس طرح عبدالعزیز بن عبدالرحمن آل سعود نے کم و بیش چودہ (۱۴) سال بعد خانوادۂ آل سعود کے تیسرے دور حکومت کی بنیاد ڈال دی، اس کے بعد حکومت کے رقبہ کو وسیع کرتا گیا، یہاں تک کہ کویت، شام، عراق، یمن اور بحرین کے حدود تک اپنی حکومت کو وسعت دینے اور حرمین شریفین کو اپنی حکومت میں شامل کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں یعنی ریاض پر قبضہ کرنے کے پورے تیس (۳۰) سال بعد "المملكة العربية السعودية" کے قیام کا اعلان کر دیا، اس تیسرے یعنی موجودہ دور حکومت میں عبدالعزیز بن عبد الرحمن کے بعد اس کے چار بیٹے، سعود، فیصل، خالد اور فہد حکومت کر چکے ہیں، جبکہ پانچواں بیٹا عبداللہ برسر اقتدار ہے-

سعودی عرب کا رقبہ بارہ لاکھ پچیس ہزار مربع میل ہے اور اس کی آبادی تقریباً دو کروڑ ساٹھ لاکھ ہے، جس میں تقریباً ساٹھ لاکھ غیر ملکی تارکین وطن شامل ہیں جو روزگار کے سلسلہ میں وہاں مقیم ہیں، ہندوستان کے باشندے سب سے زیادہ ہیں، جن کی تعداد پندرہ لاکھ سے متجاوز ہے، اس کے بعد بنگلہ دیش کے دس لاکھ، پاکستان کے نو لاکھ، فلپائن کے آٹھ لاکھ، مصری ڈھائی لاکھ، فلسطینی ڈیڑھ لاکھ، لبنانی سوا لاکھ، سری لنکن پچاس ہزار، دیگر عرب افریقی ممالک کے تقریباً پچاس ہزار اور یورپ و امریکہ کے کم و بیش پچاس ہزار افراد یہاں آباد ہیں، جو وہاں کے شہری نہیں ہیں، لیکن مجموعی تعداد میں شامل ہیں، اس طرح ایک کثیر ثقافتی معاشرہ وہاں پروان چڑھ رہا ہے- لیکن کثیر مذہبی معاشرہ کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے-

غیر ملکی باشندوں کے علاوہ ان کی حقیقی آبادی تقریباً دو کروڑ ہے، جس میں پندرہ فی صد شیعہ مذہب کے لوگ شامل ہیں، بیشتر شیعہ ملک کے مشرقی صوبے میں ہیں، البتہ مدینہ منورہ میں بھی ان کی کچھ آبادی ہے، شیعہ مذہب کے اسماعیلیہ فرقہ کے لوگوں کی بہت بڑی تعداد نجران میں آباد ہے، سعودی عرب کا مشرقی صوبہ جسے منطقہ شرقیہ کہا جاتا ہے، تیل کی دولت سے مالا مال ہے، اس صوبہ کا مشہور شہر دمام ہے، اس کے علاوہ دوسرے چھوٹے شہروں میں قطیف، الأحساء، ابقیق، ہفوف، جبیل، راس تنورہ اور الخبر وغیرہ قابل ذکر ہیں- جیسا کہ میں پچھلے سطور میں ذکر کر آیا ہوں کہ شیعوں کی بیشتر آبادی مشرقی صوبہ میں ہے، یہی وہ مذکورہ بالا شہر ہیں، جہاں شیعوں کی تعداد پچاس فی صد سے بھی زیادہ ہے، ملک میں کثیر مذہبی معاشرہ نہ ہونے کی بڑی مثال کے طور پر ان شیعی آبادی والے شہروں کو پیش کیا جا سکتا ہے، مذکورہ شہروں میں صرف القطیف اور الأحساء دو ایسے شہر ہیں جہاں آپ کو شیعوں کی چند مساجد نظر آ جائیں گی لیکن امام باڑے کہیں نہیں ملیں گے، امام باڑے ہیں لیکن ان کا رجسٹریشن امام باڑوں کے نام پر نہیں دیا گیا ہے بلکہ شخصی عمارتوں کو امام باڑوں کی شکل میں نوحہ خوانی اور ماتم کے لیے استعمال کی اجازت دے دی گئی ہے، شیعوں کے دینی مدارس اور ان کی مذہبی کتابوں کی دوکانیں آپ کہیں نہیں پائیں گے، قارئین کی معلومات میں اضافہ کے لیے میں نے یہ باتیں نقل کر دی، اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں-

گزشتہ سطور میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ مختلف ادوار میں آل سعود نے خطہ نجد اور بعض وقت دور دراز علاقوں پر بھی کم و بیش ایک سو دس سال حکومت کی- اقتدار کے اس دورانیہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی وہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے فکر و اعتقاد سے دستبردار نہیں ہوئے، نتیجتاً سیاست اور غیر تقلیدی فکر کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا، آل سعود کی حکومت مضبوط ہوتی تو وہ فکر بھی پھولنے پھیلنے لگتی اور حکومت کمزور یا ختم ہوتی تو وہ بھی رخت سفر باندھ لیا کرتی تھی، کیوں کہ خلافت عثمانیہ کے عقائد و افکار مسلم امہ کے اعصاب پر چھائے ہوئے تھے، آل سعود کے موجودہ دور اقتدار کے ساتھ غیر تقلیدی فکر پھر سے زور پکڑنے لگی اور خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد اس کے لیے میدان صاف ہو گیا- آل سعود کی حکومت جیسے جیسے مضبوط ہوتی اور پھیلتی گئی، غیر مقلدین بھی اپنے پاؤں پسارتے چلے گئے، خاص طور سے پچھلی صدی کی چوتھی دہائی کے بعد جب دولت کی ریل پیل ہوئی تو غیر مقلدین کے وارے نیارے ہو گئے- ہمارے برصغیر کے غیر مقلدین نے تو لگتا ہے پٹرول کی صراحیاں صاف کر دی ہیں کہ جب وہ بولتے ہیں تو آگ اگلتے ہیں، بایں ہمہ سعودی عرب کی حکومت اور وہاں کے علما کا فقہی مزاج برصغیر کے سلفیوں سے قابل لحاظ حد تک الگ اور احترام و

رواداری پر مبنی ہے، تفصیل کے لیے مطالعہ کا تسلسل جاری رکھیے۔

راقم الحروف کے محدود مطالعہ و مشاہدہ کی روشنی میں سعودی عرب عصر حاضر میں دنیا کا واحد ایسا ملک ہے جس کا نام کسی ایک خاندان سے منسوب ہے، وہاں کا نظام بادشاہت اور اس کے آئین کی اساس قرآن و سنت ہے، حکومت کا فقہی مذہب حنبلی ہے، تاہم قانونی طور پر جج حضرات حنفی، شافعی اور مالکی مذہب پر اعتماد کر کے فیصلہ صادر کرنے کے مجاز ہیں۔

باوجود اس کے کہ سعودی حکومت کا دستور فقہ حنبلی کو اپنا نمائندہ مانتا ہے یا اپنی فقہی اساس قرار دیتا ہے، عملاً پورا نظام سلفی ہے۔ ارباب اقتدار اور علماء کا طبقہ نہ تو اپنے آپ کو حنبلی کہتا ہے اور نہ ہی لکھتا ہے بلکہ سلفیت سے منسوب کرتا ہے، البتہ حنبلی فقہ سے قربت عیاں و بیاں ہے، اس کے بالمقابل دوسرے تین مکاتب فقہ حنفی، شافعی اور مالکی کے ساتھ ناروا رویہ کی ایک موٹی سی مثال یہ ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بشمول ریاض، دمام اور جدہ جیسے بڑے شہروں میں ایک بھی ایسی مسجد نہیں ہے جس کا امام غیر سلفی ہو، جبکہ نرمی اور رواداری کے الفاظ کا استعمال اگر مناسب ہو تو وہاں نرمی اور رواداری کا یہ عالم ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب فقہ پر عمل کرنے میں مکمل آزاد ہے۔ گویا معاشرہ اپنی اجتماعی ہیئت و ماہیت میں حکومت کی اسلامی تفاسیر کا یا فقہی تعبیر کا مکمل پابند ہے، جبکہ فرد اپنی انفرادی حیثیت میں مکمل آزاد۔

نصاب تعلیم کچھ ایسا مرتب کیا گیا ہے کہ پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک شعبہ خواہ میڈیکل یا انجینیرنگ کا ہی کیوں نہ ہو اسلامیات کا مضمون لازمی طور پر اس میں داخل ہے اور طبعی طور پر فقہ حنبلی ہی پڑھایا جاتا ہے۔ البتہ جامعات میں تخصص کے طلبہ کو دیگر سنی مکاتب فقہ سے روشناس ہونے کا موقع مل ہی جاتا ہے، اسی طرح دوسرے طلبہ کا فقہ حنبلی پر انحصار و ارتکاز بھی کلاس روم تک ہی محدود ہے، کلاس روم سے باہر چند قدم کے فاصلے پر کالج یا اسکول کی لائبریری میں تمام سنی مکاتب فقہ کی چھوٹی بڑی، معروف و غیر معروف ساری کتابیں انہیں بہ آسانی دستیاب ہوتی ہیں اور مطالعہ پر کسی طرح کی کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ نیز سرکاری لائبریریاں اور سرراہ کتابوں کے بڑے بڑے تجارتی مراکز امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور ان کے علاوہ دیگر اکابر فقہا کی تصانیف اور ان کے فضائل و مناقب پر مشتمل کتابوں سے بھرے پڑے ہیں، حاصل یہ ہے کہ سعودی حکومت وہاں کے علما اور بیشتر عوام نظریاتی طور پر سلفی ضرور ہیں لیکن دیگر مکاتب فقہ کے فقہاء و ائمہ کو وہ احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں، ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں، ان کے مذاہب کے مطابق فتاویٰ دیتے ہیں اور عوام کو بھی ان کا احترام سکھاتے ہیں، اس سے قبل کہ میں اپنے ان دعووں کی دلیل کے طور پر "اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والفتوى" کے چند فتاویٰ نقل کروں قارئین کو بتادوں کہ یہ

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية و الفتوى

فتویٰ اور علمی تحقیقات کی دائمی کمیٹی کی حیثیت سعودی حکومت اور عوام کے نزدیک کیا ہے اور اس کی کتنی اہمیت ہے، سعودی حکومت نے ۷ رجب ۱۳۹۱ھ میں قرارداد نمبر ۱۳۷ کے ذریعہ اکابر علما کا ایک بورڈ قائم کیا۔ جس کا نام "هيئة كبار العلماء بالمملكة العربية السعودية" (سعودی عرب کے اکابر علما کا بورڈ) رکھا، اس بورڈ کا صدر وزیر کے مرتبہ پر فائز ہوتا ہے اور وہی سعودی عرب کا مفتی عام بھی ہوتا ہے، شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کے انتقال کے بعد مذکورہ بورڈ کے صدر اور سعودی عرب کے جنرل مفتی شیخ عبدالعزیز عبداللہ بن محمد آل شیخ ہیں، مذکورہ بالا فتویٰ اور علمی تحقیقات کی کمیٹی اس اکابر علماء بورڈ کی ذیلی کمیٹی ہے، علماء بورڈ کے ہی چند اراکین پر یہ کمیٹی مشتمل ہوتی ہے، البتہ بورڈ کے کسی رکن کو فتویٰ اور علمی تحقیقات کی کمیٹی کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے بادشاہ کی منظوری ناگزیر ہے۔

مذکورہ کمیٹی کی ذمہ داری عقائد، عبادات اور شخصی معاملات میں عوام الناس سے کے استفتاء کا جواب دینا ہے، اس کے ذریعہ جاری کیا گیا، فتویٰ تب ہی معتبر ہوتا ہے جب کم از کم تین فقہا اس کی تحقیق میں شامل ہوں اور کمیٹی کے اراکین کی اکثر تعداد میں نے اس کی توثیق کر دی ہو، اگر موافق و مخالف کی تعداد برابر ہوتی ہے تو کمیٹی کے صدر کا رجحان فیصلہ کن ہوتا ہے۔ ذیل میں تحقیق و فتویٰ کی کمیٹی کے چند فتاوی ملاحظہ فرمائیں۔

فتاوى اللجنة الدائمة (الجزء رقم: 2 الصفحة رقم: 243) السؤال الثانى من الفتوى رقم (1361)

س: (2) ماهى السلفية و ما رايكم فيها؟

ج: (2) السلفية: نسبة الى السلف، والسلف: هم صحابة رسول الله صلى الله عليه وسلم وأئمة الهدى من أهل القرون الثلاثة الاولى رضى الله عنهم الذين شهد لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم بالخير فى قوله: خير الناس قرنى ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم، ثم يجئ اقوام تسبق

شهادة احدهم يمينه ويمينه شهادته، رواه الامام احمد فى مسنده والبخارى و مسلم- والسلفيون: جمع سلفى نسبة الى السلف، وقد تقدم معناه وهم الذين سارواعلى منهاج السلف من اتباع الكتاب والسنة والدعوة اليهماو العمل بهما، فكانوا بذالک أهل السنة والجماعة وبالله التوفيق، وصلى الله على نبينا محمد، وآله وصحبه وسلم

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء

عبد الله بن قعود (عضو) ☆ عبد الله بن غديان (عضو) ☆ عبد الرزاق عفيفى (نائب رئيس اللجنة) ☆ عبد العزيز بن عبد الله بن باز (الرئيس)

ترجمہ:-دائمی کمیٹی کے فتاویٰ جلد ۲ ص: ۲۴۳ فتویٰ ۱۳۶۱ کا سوال نمبر ۲

سوال:-سلفیت کیا ہے اور اس کے بارے میں آپ حضرات کی کیارائے ہے؟

جواب:-سلفیت : سلف سے منسوب ہے اور سلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور پہلی تین صدیوں کے وہ ائمہ رشد وہدایت ہیں، جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر کی گواہی دی ہے، آپ کا ارشاد ہے :''تمام لوگوں میں بہتر میری صدی کے لوگ ہیں، پھر اس کے بعد والی صدی کے، پھر اس کے بعد والی صدی کے، ان کے بعد ایسی قومیں آئیں گی جس کی شہادت اور قسم ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں گی''-اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں اور بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے-

اور''السلفیون''، سلفی کی جمع ہے جو کہ سلف سے منسوب ہے، سلف کی توضیح گزر چکی ہے، قرآن وسنت کے متبعین، اس کی دعوت دینے والے اور اس پر عمل کرنے والے اسلاف کے پیروکاروں کو سلفی کہا جاتا ہے، بایں طور وہ بھی اہل سنت ہی ہوئے و بالله التوفيق وصلى الله على نبينا محمد و آله وصحبه وسلم-

علمی تحقیقات اور فتوی کی دائمی کمیٹی

عبداللہ بن قعود (رکن) ☆ عبداللہ بن غدیان (رکن) ☆ عبدالرزاق عفیفی (نائب صدر) ☆ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز (صدر)

مذکورہ بالا فتوی کا یہ پہلو ملحوظ رہے کہ قابل اتباع اسلاف کرام کا بشارت یافتہ تین صدیوں تک پھیلا ہوا ہے اور جو ان کی پیروی کرے گا وہ سلفی کہلانے کا مستحق اور اہل سنت ہے-اب آئیں ذرا یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا اسلاف کے عمومی مفہوم میں خصوصی طور پر ائمہ اربعہ اور ان کے مذاہب فقہ کے بارے میں سعودی عرب کے اکابر علما کیا فرماتے ہیں-

فتاوى اللجنة الدائمة (الجزء رقم : ۵ ،الصفحة رقم :۵۷-۵۶) الفتوى رقم ۱۵۹۱

س: كيف ظهرت المذاهب الأربعة و كيف سوغوا لانفسهم الاجتهاد دون الناس وما الدليل على انه يجب اتباع مذهب واحد فقط من المذاهب الأربعة؟

ج: الحمد لله وحده والصلاة والسلا على رسوله وصحبه و بعد:

المجتهدون من الفقهاء كثير و خاصة فى القرون الثلاثة التى شهد لها الرسول صلى الله عليه وسلم بالخير، وقد اشتهر من بينهم على مر السنين اربعة -ابو حنيفة النعمان بن ثابت فى العراق و ابو عبد الله مالک بن انس الاصبعى فى المدينة المنورة و ابوعبد الله محمد بن ادريس الشافعى القرشى عالم قريش و فخرها في بغدادثم فى مصر، و ابو عبد الله احمد بن محمد بن حنبل الشيبانى امام اهل الحديث وقدو تهم و فقيه اهل العراق فى زمانه

و اسباب شهرتهم كثيرة منها انتشار مذهبهم فى البلد الذى نشاواوارتحلوا اليه على مقتضى السنة الكونية كابى حنفية و احمد رحمهما الله فى العراق و مالک فى المدينة والشافعى فى مكه و مصر، و منها نشاط تلاميذ هم و من أخذ بمذهبهم و بنى على اصولهم و اجتهاد هم فى الدعوة الى مذهبهم في بلاد هم اوالبلاد التى رحلوا اليها كمحمد بن الحسن وابى يوسف مثلا فى العراق و ابن القاسم واشهب فى مصر و سحنون فى المغرب، والربيع بن سليمان فى مصر و تلاميذ الامام احمد في الشام والعراق وغيرهما، و منها تبنى الحكام للمذهب ولعلمائه وتوليتهم اياهم المناصب كالقضاء والافتاء وفتحهم المدارس لهم واغداق الخير

علیھم من اوقاف وغیرھا—ولم ید ع احد منھم الی مذھبه ولم یتعصب له ولم یلزم غیره العمل به أو بمذھب معین انما کانوا یدعون الی العمل بالکتاب والسنةویشرحون نصوص الدین و یبینون قواعده ویفرعون علیھا ویعتون فیما یسالون عنه دون أن یلزموا أحدا من تلامیذھم أو غیر ھم بارائھم بل یعیبون علی من فعل ذلک و یامرون ان یضرب برائیھم عرض الحائط اذا خالف الحدیث الصحیح ویقول قائلھم (اذا صح الحدیث فھو مذھبی رحمھم الله جمیعا)

ولا یجب علی احد اتباع مذھب بعینه من ھذه المذاھب بل علیه أن یجتھد فی معرفة الحق ان أمکنه او یستعین فی ذلک با الله ثم بالثروة العلمیة التی خلفھا السابقون من علماء المسلمین لمن بعدھم ویسروالھم بھا طریق فھم النصوص وتطبیقھا ومن لم یمکنه استنباط الاحکام من النصوص ونحوھا لامر ما عاقه عن ذلک سأل اھل العلم الموثوق بھم عما یحتاجه من احکام الشریعة لقوله تعالی: سورة النحل الآیة ۴۳"فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون" و علیه ان یتحری فی سواله من یثق به من المشھورین بالعلم والفضل والتقوی والصلاح— وبا الله التوفیق وصلی الله علی نبینا محمد و اله و صحبه وسلم—

اللجنة الدائمة للبحوث العلمة والافتاء

عبد الله بن قعود (عضو) ☆ عبد الله بن غدیان (عضو) ☆ عبد الرزاق عفیفی (نائب رئیس اللجنة) ☆ عبد العزیز بن عبد الله بن باز (الرئیس)

ترجمہ: دائمی کمیٹی کے فتاوی: جلد۵، صفحہ:۵۶-۵۷ فتوی ۱۵۹۱

سوال:- چاروں مذاہب کیسے وجود میں آئے، دوسرے لوگوں سے قطع نظر انہوں نے اجتہاد کو اپنے لیے کیسے جائز سمجھا، نیز اس کی کیا دلیل ہے کہ چار مذاہب میں سے کسی ایک کی پیروی واجب ہے؟

جواب:- تمام تعریفیں اللہ رب العلمین کے لئے اور درود وسلام اس کے رسول پر، ان کے آل اور اصحاب پر، وبعد، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی جن تین صدیوں کے خیر کی بشارت فرمائی تھی، ان میں بہت سے صاحب اجتہاد فقہاء پیدا ہوئے، جن میں چار وقت کے گزرنے کے ساتھ مشہور ہوئے، ابوحنیفہ نعمان بن ثابت عراق میں، ابو عبداللہ مالک ابن انس الاصبحی، مدینہ منورہ میں، ابوعبداللہ محمد بن ادریس الشافعی، بغداد اور مصر میں اور ابوعبداللہ احمد بن حنبل الشیبانی عراق میں-

ان کی شہرت کے بہت سے اسباب ہیں- ان میں سے ایک یہ ہے کہ جن ملکوں یا خطوں میں پرورش پائی اور جن جن مقامات کے سفر کیے وہاں ان کا مذہب فطری طور پر پھیل گیا- جیسے ابوحنیفہ اور رحمۃ اللہ علیہما عراق میں، مالک مدینہ میں اور شافعی مکہ اور مصر میں، دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے تلامذہ نے اور دوسرے اہل علم جنہوں نے ان ائمہ کے اصول کو اپنے اجتہاد کی بنیاد بنایا اپنے اپنے ملکوں میں اور جہاں جہاں کے سفر کئے وہاں ان کے مذہب کو پھیلاتے چلے گئے، جیسے محمد بن حسن، اور ابو یوسف نے عراق میں، ابن قاسم اور اشہب نے مصر میں، سحنون نے مراکش میں، ربیع بن سلیمان نے مصر میں اور امام احمد کے تلامذہ نے شام اور عراق وغیرہ میں- تیسرا سبب یہ ہے کہ حکمرانوں نے کسی مذہب اور اس کے علماء کو اپنایا، انہیں قضاء افتاء کے عہدے دیئے، ان کے لیے مدارس قائم کیے اور ان پر اوقاف وغیرہ سے دولت کا منہ کھول دیا-

ان ائمہ میں سے کسی نے نہ تو اپنے مذہب کی دعوت دی اور نہ ہی اس کے لیے ان میں تعصب پیدا ہوا اور نہ ہی انہوں نے اپنے مذہب یا کسی متعین مذہب پر عمل کرنے کے لیے کسی کو مجبور کیا- وہ حضرات قرآن وحدیث پر عمل کی دعوت دیتے تھے- اور جو کچھ پوچھا جاتا تھا اس کے بارے میں فتاوٰی دیا کرتے تھے، لیکن اپنے شاگرد یا ان کے علاوہ کسی اور کو اپنا موقف تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتے تھے، بلکہ ایسا کرنے والے کو برا سمجھتے تھے اور وہ حکم دیتے تھے کہ اگر ان کا موقف حدیث صحیح کے خلاف ہو تو اسے دیوار پر مار دو، انہیں میں سے کسی کا قول ہے "صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے" اور ان سب پر رحمتوں کی بارش فرمائے-

بایں ہمہ ان مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کا اتباع کسی پر فرض نہیں ہے- بلکہ اگر ممکن ہو تو ضروری ہے کہ حق کی شناخت کے لیے اجتہاد کرے- یا اس سلسلہ میں اللہ سے مدد چاہے اور علمائے اسلام نے بعد میں آنے والوں کے لیے جو علمی ذخیرہ چھوڑا ہے اور نصوص کے فہم اور اس کی تطبیق کو آسان فرمایا ہے، اس سے استفادہ کرے اور جس کے لیے کسی سبب نصوص سے احکام کا استنباط ممکن نہ ہو وہ قابل اعتماد اہل علم سے اپنی ضرورت کے شرعی احکام پوچھ لے- اللہ تعالی نے سورۂ نحل آیت نمبر ۴۳

میں فرمایا ہے "اگر تمہیں معلوم نہیں ہے تو جاننے والوں سے پوچھ لو" اور اس کے لیے ضروری ہے کہ قابل اعتماد علم وفضل میں مشہور صاحب صلاح وتقویٰ کی تلاش کرے۔ اللہ ہی سے توفیق ہے، اللہ صلوٰۃ وسلام بھیجے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر، ان کے آل اور اصحاب پر۔

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء

عبد اللہ بن قعود (رکن) ☆ عبد اللہ غدیان (رکن) ☆ عبد الرزاق عفیفی (نائب صدر) ☆ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز (صدر)

مذکورہ بالا فتویٰ کی روشنی میں قارئین کی توجہ ہم تین نکات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، پہلا نکتہ یہ ہے کہ چاروں ائمہ فقہ خیر سے معمور پہلی تین صدیوں کے ہیں، دوسرا نکتہ یہ ہے انہوں نے نصوص دین کی توضیح وتشریح کی، قواعد متعین کیے اور اجتہاد فرمایا جبکہ تیسرا اور آخری حلقہ یہ ہے کہ ان میں متعین طور پر کسی ایک کی تقلید واجب نہیں ہے۔ فتویٰ کی عبارت "ولا یجب علی احد" یاد رکھنے کی چیز ہے، اس سے اگلا فتویٰ سمجھنے میں مدد ملے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال رہے کہ سلفی مکتب فقہ میں واجب اور فرض ہم معنی ہیں۔

فتاوی اللجنة الدائمة (الجزء رقم : ٥ الصفحة رقم: ٦٣) الفتوى رقم ١٢٥٤٨

س: قرأت فی کتاب الف فی لغتنا حیث یقول مؤلفه ان موقف الائمة لاصحاب المذاهب فی الاسلام ابو حنیفة، احمد، مالک، والشافعی وغیرهم کموقف بولس فی دین المسیح اذ یصرفون الناس من الحقیقة الی اهوائهم مع وجود الادلة الوارده عن النبی صلی الله علیه وسلم وفجاء وابارائهم بـ... هذه الادلة، فما هوا الرد علیه؟ ویقول ان مقلد هم و تابعهم کفار حیث یتبعون الناس ویترکون ما قاله النبی صلی الله علیه وسلم-

ج: الحمدالله وحده والصلاة والسلام علی رسوله و آله وصحبه و بعد:

اولا: ان ائمة المذاهب الاربعة وهم ابو حنیفة و مالک والشافعی واحمد بن حنبل من فضلاء اهل العلم و من اتباع النبی صلی الله علیه وسلم و من اهل الاجتهاد والاستنباط للاحکام الشرعية من ادلتها التفصیلیة وما قاله المؤلف المذکور من انهم یصرفون الناس عن الحقیقة ویتبعون أهواء هم کذب وبهتان علیهم ولیس مقلدهم بکافر فان الانسان اذا لم یکن من اهل المعرفة بالاحکام واتبع احد المذاهب الاربعة فانه لاحرج علیه فی ذلک وقد صدر منا فتویٰ فی المذاهب الأربعة هذا نصها: وبالله التوفیق وصلی الله علی نبینا محمد وآله وصحبه وسلم-

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء

عبد الله بن قعود (عضو) ☆ عبد الله بن غدیان (عضو) ☆ عبد الرزاق عفیفی (نائب رئیس اللجنة) ☆ عبدالعزیز بن عبد الله بن باز (الرئیس)

ترجمہ:- فتاوی اللجنة الدائمة جلد ۵، ص: ۶۳ فتویٰ ۱۲۵۴۸

سوال:- میں نے اپنی زبان میں تالیف کی گئی ایک کتاب پڑھی ہے۔ جس کا مؤلف کہتا ہے کہ اسلام میں اصحاب مذاہب ائمہ ابو حنیفہ اور شافعی وغیرہ کا کردار عیسائی مذہب کے پادریوں جیسا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دلائل موجود ہوتے ہوئے اپنی آراء پیش کرتے ہیں اور عوام کو حقیقت سے پھیر کر اپنی خواہش کا غلام بناتے ہیں تو اس کا جواب کیا ہے؟ اور وہ کہتا ہے کہ ان اماموں کی پیروی کرنے والے کافر ہیں، کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک فرمان کو چھوڑ کر دوسروں کی پیروی کی۔

جواب:- تمام تعریفیں صرف اللہ کے لیے ہیں اور صلوٰۃ وسلام ہو اس کے رسول پر، ان کی آل اور ان کے اصحاب پر بے شک مذاہب اربعہ کے ائمہ فضلائے اہل علم میں ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں اور احکام شرعیہ کا استنباط اس کے ادلہ تفصیلیہ کے ذریعہ کرنے والوں میں سے ہیں۔ مذکورہ کتاب کے مصنف نے جو بات کہی ہے وہ حقائق سے پھیرتے ہیں اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے کراتے ہیں وہ ان کی ذات پر جھوٹ اور بہتان ہے۔ ان کا مقلد کافر نہیں ہے۔ کیوں کہ جب انسان احکام کی معرفت کا اہل نہ ہو اور چاروں مذاہب میں سے کسی ایک کی پیروی کرے تو ایسا کرنے میں اس کے لیے کوئی حرج نہیں ہے۔ ہم نے مذاہب اربعہ کے بارے میں ایک فتویٰ دیا ہے، جس کی عبارت یہ ہے .... (زیر ترجمہ فتویٰ میں اس سے قبل مذکور فتویٰ کی پوری عبارت مذکور ہے، جس کی طرف یہاں

اشارہ کیا گیا ہے- چوں کہ میں اسے پیش کر آیا ہوں اس لیے اسی حد پر اکتفا کیا، جس سے اس فتوی کے سوال کا جواب ہو رہا تھا-)

میں قارئین کو جس مقام پر پہنچا کر اپنا یہ تحریری سفر آگے بڑھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پہلے فتویٰ کے رو سے سارے ائمہ اسلاف کی فہرست میں ہیں- دوسرے فتویٰ کے مطابق وہ نصوص دین سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کی متعین طور پر تقلید واجب نہیں ہے، جس کا سیدھا مطلب ہے- ورنہ انہیں ''لا یجب لاحد'' کے بجائے ''لا یجوز لأحد'' کہنے سے کون روک سکتا تھا- اگر کسی غبی کے لیے یہ عبارت نا قابل فہم تھی تو تیسرے فتویٰ نے وہم کا سارا بھرم توڑ کے رکھ دیا اور یہ کھلا اعلان کر دیا کہ مقلدین نہ صرف یہ کہ کافر نہیں ہیں بلکہ تقلید میں کوئی حرج بھی نہیں ہے-

تقلید کے باب میں علمائے سعودی عرب کے موقف کی مکمل وضاحت اور اپنی طرف سے اتمام حجت کے طور پر بلا تبصرہ تین فتاوی اور نقل کروں گا- جن میں سے دو میں سعودی علما نے تقلید سے متعلق اپنے موقف کی وضاحت کی ہے اور تیسرے میں ائمہ اربعہ کو شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے- ساتھ ہی یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ سعودی علماء سلفی ہیں- میں انہیں مقلد ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں- میری کوشش عوام کو باور کرانے کی حد تک ہے کہ برصغیر کے سلفی غیر سلفی مسلمانوں اور ائمہ فقہ کے خلاف جس ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہیں، وہ انہیں کی قسمت ہے- سعودی سلفی علماء اس میں شریک نہیں ہیں- سلفی ہونے کے باوجود احترام و رواداری کی بیش بہا روایت کو اگر وہ اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہتے تو ان کے لیے ناممکن نہیں تھا- لیکن ہر برادری اپنی قسمت لے کر پیدا ہوتی ہے-

فتاوی اللجنة الدائمة الجزء رقم: ۵، الصفحة رقم ۲۹ السوال الرابع من الفتوى رقم ۴۱۷۲

س: ما حكم التقيد بالمذاهب الاربعة واتباع اقوالهم على كل الاحوال والزمان؟

ج: الحمد لله وحدہ والصلاة والسلام على رسوله وآله وصحبه وبعد: أولا: المذاهب الأربعة منسوبة الى الأئمة الأربعة الامام أبى حنيفة والامام مالك والامام الشافعى والامام احمد، فمذهب الحنيفة منسوب الى ابى حنيفة وهكذابقية المذاهب-

ثانيا: هؤلاء الأئمة أخذوا الفقه من الكتاب والسنة وهم مجتهدون فى ذلك، والمجتهد اما مصيب فله اجران اجر اجتهاده واجر اصابته واما مخطى فيوجر على اجتهاده ويعذر فى خطئه، ثالثا: القادر على الاستنباط من الكتاب والسنة يأخذ منهما كما أخذ من قبله ولا يسوغ له التقليد فيما يعتقد ان الحق بخلافه، بل يأخذ بما يعتقد أنه حق ويجوز له التقليد فيما عجز عنه واحتاج اليه، رابعا: من لاقدرة له على الاستنباط يجوز له أن يقلد من تطمئن نفسه الى تقليده و اذا حصل فى نفسه عدم اطمئنان سال حتى يحصل عنده اطمئنان، خامسا: يتبين مما تقدم أنه لا تتبع أقوالهم على كل الاحوال ولا زمان: لانهم قديخطئون بل يتبع الحق من اقوالهم الذى قام عليه الدليل - وبالله التوفيق وصلى الله عليه على نبينا محمد وآله وصحبه وسلم-

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء

عبد الله بن قعود (عضو) ☆ عبد الله بن عديان (عضو) ☆ عبد الرزاق عفيفى (نائب رئيس اللجنة) ☆ عبد العزيز بن عبد الله بن باز (الرئيس)

ترجمہ:- مذاہب اربعہ کی تقلید اور ہر حال اور ہر زمانہ میں ان کے اقوال کی پیروی کا کیا حکم ہے؟

جواب:- الحمد لله وحده والصلوة والسلام على رسوله وآله وصحبه: و بعد-- اولا: چاروں مذاہب چار امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل سے منسوب ہیں، مثلا حنفی مذہب ابو حنیفہ سے منسوب ہے اور اسی طرح دوسرے مذاہب- **ثانیا:** ان ائمہ نے کتاب وسنت سے فقہ اخذ کیا ہے، اور وہ اس میں مجتہد ہیں- ایک مجتہد اگر اپنے اجتہاد میں درست ہے تو اس کے لیے دو اجر ہیں- ایک اس کے اجتہاد کا اور دوسرا اس کی اصابت رائے کا اور اگر غلط ہے تو اس کو اجتہاد کا ایک اجر ملے گا اور خطا معاف ہو جائے گی- ثالثا: کتاب وسنت سے مسائل کے استنباط پر قادر شخص کتاب وسنت سے ہی مسائل اخذ کرے گا، جیسا کہ اس کے پیش رووں نے کیا ہے- اور اس کے لیے ایسے مسائل میں تقلید جائز نہیں ہے، جن میں اس کا اعتقاد ہو کہ

حق اس کے خلاف ہے- بلکہ جس کے حق ہونے کا اعتقاد ہو اس کو قبول کرے گا اور اس کے لیے تقلید ایسے مسئلہ میں جائز ہوگی، جس کے استنباط سے وہ عاجز ہے اور اسے اس کی ضرورت ہے- رابعاً: جس شخص کو مسائل کے استنباط پر قدرت نہ ہو اس کے لیے جائز ہے کہ جس سے اس کا دل مطمئن ہو اس کی تقلید کرے- اور اس کے دل میں عدم اطمینان کی کیفیت ہو تو سوال کرے، یہاں تک کہ اسے اطمینان حاصل ہو جائے- خامساً: مذکورہ بالا سطور سے واضح ہے کہ ان ائمہ کی ہر حال اور ہر زمانہ میں تقلید نہیں کی جائے گی اس لیے کہ ان سے کبھی خطا بھی سرزد ہوتی ہے- بلکہ ان کے ایسے اقوال حقہ کی پیروی کی جائے گی، جن پر دلیل قائم ہو- و بالله التوفيق ، وصلى الله على نبينا محمد و آله و صحبه وسلم

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء

عبد اللہ بن قعود (رکن) ☆ عبد اللہ غدیان (رکن) ☆ عبد الرزاق عفیفی (نائب صدر) ☆ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز (صدر)

فتاوى اللجنة الدائمة (الجزء رقم : 5، الصفحة رقم: 30) السؤال الثاني من الفتوى رقم 11296

س: ما حقيقة التقليد وما أقسامه مع بيان الحكم؟

ج: الحمد لله وحده والصلاة والسلام على رسوله و آله و صحبه وبعد : ا -ذكر علماء الأصول تعريفات لبيان حقيقة التقليد منها قول بعضهم التقليد هو قبول قول القائل وهو لا يدري مستنده، وذهب بعضهم الى أن التقليد قبول قول القائل بلا حجة، واختار أبو المعالى الجويني تعريف التقليد بأنه اتباع من لم يقم باتباعه حجة ولم يستند الى علم- وهذه التعاريف متقاربة والعلماء الاصول فيها مناقشات ترجع الى الصناعة المنطقية ولكن القصد هنا بيان حقيقة التقليد على وجه التقريب -ب-أما أقسامه مع بيان حكم كل قسم فكما يلي:

1-تقليد من عنده أهلية الاجتهاد غيره من العلماء بعد ما تبين له الحق بالأدلة الثابتة عن النبى صلى الله عليه وسلم فهذا لا يجوز له تقليد من خالفه فيما وصل اليه بالاستدلال بالاجماع 2-تقليد من توافرت فيه أهلية الاجتهاد غيره من المجتهدين قبل أن يصل باجتهاد الى الحكم الشرعى، فهذا لا يجوز له تقليد غيره فيما ذهب اليه الشافعي وأحمد وجماعة رحمهم الله وهو الأرجح لقدرة على الوصول الى الحكم الشرعى بنفسه فكان مكلفا بالاجتهاد ليعرف ما كلفه الشرع به لقوله تعالى: فاتقوا الله ما استطعتم ولما ثبت من قول النبى صلى الله عليه وسلم: اذا امرتكم بامر فاتوا منه ما استطعتم 3-تقليد العاجز عن البحث فى الأدلة واستنباط الأحكام منها عالما قد توافرت فيه أهلية الاجتهاد في أدلة الشرع فهذا جائز، لقوله تعالى: لا يكلف الله نفسا الا وسعها ولقوله سبحانه: فاسألوا أهل الذكر ان كنتم لا تعلمون ونحوها من النصوص الدالة على رفع الحرج ولصيانة المكلف عن التخبط فى الاحكام والقول على الله بغير علم 4-تقليد من يخالف الشرع الاسلامي من الأباء والسادة والحكام عصبية أو اتباعا للهوى وهذا محرم بالاجماع ،وقد ورد في ذمه كثير من نصوص الكتاب والسنة الخ:

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء

عبد الله بن غديان (عضو) ☆ عبد الرزاق عفيفى (نائب رئيس اللجنة) ☆ عبد العزيز بن عبد الله بن باز (الرئيس)

ترجمہ :- فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ- جلد نمبر ۵، صفحہ نمبر ۳۰

فتویٰ نمبر: ۱۱۲۹۶ کا سوال نمبر ۲

سوال :- تقلید کی حقیقت اور اس کے اقسام کیا ہیں؟ اور اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب :- الحمد الله وحده والصلوة والسلام على رسوله وآله و صحبه وبعد: (الف) تقلید کی حقیقت بیان کرنے کے لئے علمائے اصول نے اس کی متعدد تعریفیں ذکر کی ہیں- ان میں سے بعض کا قول یہ ہے کہ تقلید، قائل کے قول کو سند جانے بغیر قبول کر لینے کا نام ہے- اور بعض اس طرف گئے ہیں کہ بغیر دلیل قائل کا قول قبول کر لینے کو تقلید کہتے ہیں- اور ابو المعالی الجوینی نے تقلید کی اس تعریف کو پسند کیا ہے کہ ایسے شخص کی پیروی کرنا جس کی پیروی پہ کوئی حجت قائم نہ ہو اور اس کی کوئی علمی بنیاد بھی نہ ہو- یہ تمام تعریفات تقریباً

ملتی جلتی ہیں- اس سلسلہ میں علماء اصول کے منطقی مباحثے ہیں- لیکن یہاں تقریبی حد تک حقیقت تقلید کا بیان مقصود ہے-

(ب) رہا اقسام کے ساتھ اس کے حکم کا بیان تو حسب ذیل ہیں:

(۱) اجتہاد کی اہلیت کے حامل ایسے شخص کے لیے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت دلائل کے ذریعہ حق واضح ہو چکا ہو، دوسرے علماء کی تقلید بالا جماع جائز نہیں ہے جنہوں نے اس کی ایسے مسئلہ میں مخالفت کی ہے، جس تک وہ استدلال کے ذریعہ پہنچا ہے-

(۲) اپنے اجتہاد کے ذریعہ حکم شرعی حاصل کرنے سے پہلے اہلیت اجتہاد کے حامل شخص کا کسی دوسرے مجتہد کی تقلید کرنا امام شافعی اور امام احمد رحمہا اللہ کے نزدیک جائز نہیں- اور یہی راجح ہے- کیوں کہ وہ خود حکم شرعی معلوم کرنے کا اہل ہے، شرع کی معرفت کے لیے اجتہاد کا مکلف ہوا- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے-" جہاں تک ہو سکے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے" جب میں کسی بات کا حکم دوں تو مقدور بھر اسے بجالاؤ"-

(۳) دلائل میں غور وفکر کر کے ان سے احکام شرع کا استنباط کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے والے شخص کا کسی ایسے عالم کی تقلید کرنا ،جس کے اندر ادلۂ شرعیہ میں اجتہاد کی اہلیت ہو، جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" اللہ کسی پر اس کی اوقات سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا" اور" اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل علم سے پوچھ لو" اور اس طرح کے دوسرے نصوص کے سبب جو پریشانی کو دور کرنے اور مکلف کو احکام کی معرفت کے لیے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے سے بچانے والے ہیں اور اللہ کی ذات پر بغیر علم کلام کرنے سے محفوظ رکھنے والے ہیں-

(۴) عصبیت یا نفسانی خواہشات کی پیروی میں آباء واجداد، سیاستدانوں اور جاگیرداروں یا حکمرانوں کی تقلید کرنا اجماعی طور پر حرام ہے- اور اس سلسلہ میں کتاب وسنت کے اندر بہت سارے نصوص موجود ہیں- (اس فتویٰ میں تقلید کی چوتھی حرام شکل سے متعلق بہت سی آیات واحادیث مذکور ہیں، جنہیں موضوع سے متعلق نہ ہونے اور طوالت کے کے پیش نظر ذکر کرنے سے گریز کیا ہے)

اللجنة الدائمہ للبحوث العلمیة والافتا

عبد اللہ بن غدیان (رکن) ☆ عبد الرزاق عفیفی (نائب صدر) ☆ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز (صدر)

فتاوى اللجنة الدائمة (الجزء رقم: ٥، الصفحة: ٣٢-٣٣) السوال الثالث من الفتوى رقم(١٢٩٦١)

س ٣: من يقول ان التقليد كفر، مطلقا و فسق و شرك و ينسبو ن الى الائمة الاربعة الكفر والضلال فماذ حكمه وهم يقولون هذا رأي علماء الحرمين والمملكة السعودية والكويت.

ج: الحمد الله وحده والصلاة والسلام على رسوله وآله وصحبه...... وبعد:

١- ليس كل تقليد كفرا با طلاق أوفسقا أو شركا، بل الصواب أن في حكمه تفصيلا يعرف من الجواب على السوأل الثاني فيما تقدم. ليس من علماء الحرمين مكة والمدينة ولا من سائر علماء المملكة السعودية من يذم أئمة الفقهاء مالكا وأبا حنفية والشافعي واحمد بن حنبل ونحوهم من علماء الفقه الإسلامي ولا من يزدريهم، بل المعروف عنهم أنهم يوقرونهم ويعرفون لهم فضلهم وان لهم قدم صدق في خدمة الاسلام وحفظه وفهم نصوصة وقواعده وبيان ذلك وابلاغه والجهاد في نصره والذود عنه و دفع الشبهة عنه وابطال ما انتحله المنتحلون وابتدعه المفترون فجزاهم الله عن الاسلام والمسلمين خيرا. يدل على موقف علماء الحرمين وسائر علماء المملكة السعودية من الأئمة الأربعة موقف تكريم وتقدير عنايتهم بتدريس مذاهبهم ومؤلفاتهم في المسجد الحرام بمكة المشرفة والمدينة المنورة وسائر مساجد المملكة السعودية وفي جامعاتها وعنايتهم بطبع الكثير من كتبهم وتوزيعها و نشرها بين المسلمين في جميع الدول التي بها مسلمون، وبا الله التوفيق و صلى الله وسلم وبارك على عبده ورسوله نبينا محمد و على اله و صحبه وسلم-

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء

عبد الله بن غديان(عضو) ☆ عبد الرزاق عفيفي(نائب رئيس اللجنة) ☆ عبد العزيز بن عبد الله بن باز(الرئيس)

ترجمہ:-فتاویٰ اللجنة الدائمة جلد ۵، صفحہ ۳۲-۳۳، فتویٰ ۱۱۲۹۶ کا سوال ۳

سوال:-ایسے لوگوں کا کیا حکم ہے جو یہ کہتے ہیں کہ تقلید کفر مطلق ہے، فسق ہے اور شرک ہے، نیز ائمہ اربعہ کی طرف کفر وضلال منسوب کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ علما حرمین، مملکت سعودیہ عربیہ اور کویت کا یہی موقف ہے؟

جواب:-الحمد الله وحده، والصلاة والسلام على رسوله و آله وصحبه و بعد: ہر تقلید کفر مطلق یا فسق یا شرک نہیں ہیں- بلکہ اس کے حکم میں تفصیل ہے، جسے سابقہ سوال (۲) سے سمجھا جا سکتا ہے-علمائے حرمین مکہ اور مدینہ اور مملکت سعودی عرب کے علماء میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ائمہ فقہا مالک، ابوحنیفہ، شافعی اور احمد بن حنبل اور ان جیسے دیگر فقہ اسلامی کے علماء کی مذمت یا ان کی توہین کرتا ہو، بلکہ ان کے بارے میں یہی مشہور ہے کہ وہ ان کی تعظیم کرتے ہیں، ان کے فضل کا اعتراف کرتے ہیں، یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ انہوں نے اخلاص کے ساتھ اسلام کی خدمت کی، اس کی حفاظت پر کمر بستہ رہے-اس کے نصوص اور اصول کو سمجھا، اس کو بیان کیا اور اس کی تبلیغ کی، اس کو غالب کرنے کے لیے جہاد کیا اور اس کا دفاع کیا-اس سے شبہات کو دور کیا اور من گھڑت کرنے والوں کا قلع قمع کیا، تو اللہ ان سب کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے-

علمائے حرمین اور سعودی عرب کے سارے علماء کا موقف ائمہ اربعہ کے تعلق سے تعظیم وتکریم کا موقف ہے اور اس دعوی کی دلیل یہ ہے کہ ان ائمہ کے مذاہب اور ان کی تالیفات مسجد حرام مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، مملکہ کی دوسری تمام مساجد اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں- ان کی بہت سے کتابوں کی طباعت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ساری دنیا میں جہاں جہاں مسلمان رہتے ہیں تقسیم کیا جاتا ہے-وبالله التوفيق و صلى الله وسلم وبارک علی عبده و رسوله نبينا محمد وعلى آله وصحبه وسلم-

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء

عبد اللہ بن غدیان (رکن) ☆ عبد الرزاق عفیفی (نائب صدر) ☆ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز (صدر)

زیر نظر فتوی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے میرا مختصر تبصرہ یہ ہے کہ سائل نے ائمہ کی تکفیر وتفسیق کرنے والے کا حکم بھی پوچھا تھا لیکن نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر اس کا جواب نہیں دیا گیا- غالباً سعودی علماء کی یہی بے جا ناز برداری ہے، جس نے برصغیر کے سلفی طبقہ کی مجرمانہ شوخی کو اس حد تک گستاخ بنا دیا ہے کہ اب ائمہ سے بڑھ کر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین بھی اس کی زد میں ہیں-

مثال کے طور پر تراویح کے مسئلہ کو لے لیجیے، برصغیر کے سلفی نہ صرف (۲۳) تئیس رکعات کو بدعت کہتے ہیں بلکہ کتابچہ اور پمفلیٹ کی شکل میں اسے چھاپ کر عوام میں تقسیم کرتے ہیں-ایسا ہی ایک کتابچہ دس سال پہلے مجھے ممبئی میں ملا تھا-جس کے مؤلف مولوی ہارون سلفی نے جو مدنپورہ سلفی مسجد کے اس وقت امام تھے، عوام کو باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ بیس رکعت تراویح بدعت ہے-اس کے جواب میں ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے یا احادیث وآثار سے دلائل لانے کے بجائے سعودی عرب کے اکابر علما بورڈ کے معزز ممبر شیخ صالح بن فوزان عبد اللہ الفوزان کی کتاب "اتحاف اهل الايمان بدروس شهر رمضان" کی عبارت نقل کر دینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں-وہ فرماتے ہیں: واما من يقول: ان الزيادة على احدى عشر ركعة فى التراويح بدعة فهو قول مجازف فيه، وقائله لا يعرف ضابط البدعة، وقد حكم على فعل الصحابة بانه بدعة، ولاحول ولاقوة الا بالله، وهذا من شؤم التسرع و القول على الله بلا علم"

ترجمہ:- جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ گیارہ رکعت سے زیادہ تراویح بدعت ہے وہ من گھڑت ہے اور ایسا کہنے والا بدعت کے ضابطہ سے ناواقف ہوتے ہوئے صحابہ کے عمل کو بدعت قرار دیتا ہے-لاحول ولاقوۃ الا باللہ- یہ جلد بازی کا برا انجام اور بغیر علم کے اللہ کی ذات پر کلام کرنا ہے-اس مسئلہ کی مزید توضیح کرتے ہوئے شیخ صالح الفوزان لکھتے ہیں: "اما العشرون الأول فالأفضل لمن يطيل الصلوة أن يقتصر على ثلاث عشرة ركعة أو احدى عشر ركعة و من يخفف أن يصلى ثلاثا و عشرين ركعة"-ترجمہ: رمضان المبارک کے پہلے بیس دنوں میں جو لوگ نماز کی رکعتیں لمبی کرتے ہیں ان کے لیے افضل ہے کہ وہ تیرہ (۱۳) رکعت پڑھیں یا گیارہ (۱۱) رکعت پڑھیں اور جو رکعت لمبی نہیں کرتے ان کے لیے افضل ہے کہ وہ تئیس (۲۳) رکعت پڑھیں- مصنف موصوف نے اپنی مذکورہ کتاب میں شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی

اوران کے بیٹے شیخ عبداللہ کے فتوی بھی نقل کیے ہیں ملاحظہ ہو-

(۱)سئل الشیخ محمد بن عبد الوهاب رحمه الله عن عدد التراويح فأجاب: الذي استحب أن تكون عشرون ركعة-

ترجمہ:- شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ سے تراویح کی رکعات کے عدد کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک بیس رکعت مستحب ہے-

(۲)وأجاب ابنه الشيخ عبد الله رحمهما الله : الذي ذكره العلماء رحهم الله أن التراويح عشرون ركعة

ترجمہ:-اوران کے بیٹے شیخ عبداللہ نے جواب دیا کہ علماء رحمہم اللہ نے بیس رکعت ذکر کیا ہے- اس موضوع پر شیخ صالح الفوزان نے بڑی تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ تراویح کی تعداد متعین طور پر نصوص میں وارد نہیں ہے- البتہ اگر رکعت طویل ہوگی تو تعداد کم ہو جائے گی اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث پر عمل کرتے ہوئے گیارہ رکعات پر اکتفا کیا جائے گا اور اگر رکعات خفیف ہوں گی تو تعداد بڑھ جائے گی جو امام مالک کی روایت کے مطابق چھتیس (۳۶) رکعت بھی ہوسکتی ہے اور امام ابوحنیفہ، شافعی اور احمد بن حنبل کے مذہب کے مطابق بیس رکعت بھی ہوسکتی ہے اور اسحاق بن ابراہیم کے مذہب کے مطابق اکتالیس (۴۱) رکعت بھی ہوسکتی ہے، جسے ابی بن کعب نے روایت کیا ہے- حاصل بحث یہ ہے کہ شیخ صالح الفوزان کی مذکورہ کتاب میں برصغیر کے سلفیوں کی آٹھ رکعت والی تراویح کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے- شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کے فتوی کی ایک کاپی بھی میرے پاس ہے جس میں شیخ ابن باز نے تراویح کی تعداد متعین نہ ہونے کی بات کہتے ہوئے بیس رکعت کو مستحب اور گیارہ یا تیرہ رکعت کو افضل قرار دیا ہے- تاہم آٹھ رکعت کا کہیں ذکر نہیں ہے، حرمین شریفین کے بشمول سعودی عرب کی دیگر بہت سی مسجدوں میں بیس رکعت تراویح ہوتی ہے، جبکہ بہت سی مسجدوں میں وتر سمیت گیارہ یا تیرہ رکعت ہوتی ہے، واضح رہے کہ سلفی مکتب فکر میں وتر ایک رکعت ہی ہے- تین رکعت اگر پڑھتے ہیں تو دو رکعت کے بعد سلام ضرور پھیرتے ہیں- لہٰذا اگر مجموعی صورت حال کا جائزہ لیں تو جن مسجدوں میں گیارہ رکعت تراویح ہوتی ہے وہاں تراویح آٹھ رکعت ہی شمار کی جاتی ہے- باقی دو سنت اور ایک وتر- بایں ہمہ فتاوی میں تراویح کے آٹھ رکعت ہونے کا کہیں ذکر نہیں ہے-

میرے پاس ایک کتاب ہے، جس کا نام ہے "کیف تعالج مریضک بالرقية الشرعية" آپ اپنے مریض کا شرعی تعویذ سے کیسے علاج کریں"- اس کتاب کے مصنف سعودی عرب کے مشہور سلفی عالم شیخ عبداللہ بن محمد اسدحمان ہیں، یہ کتاب پانچ بڑے علماء کی تقاریظ کے ساتھ چھپ کر منظر عام پر آئی ہے- جن میں سے دو شیخ عبداللہ بن سلیمان المنیع اور شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن الجبرین کبار علماء بورڈ ہیں، جبکہ دیگر تین علماء شیخ ناصر بن عبدالکریم العقل، شیخ محمد بن عبدالرحمن الخمیس اور شیخ عبدالحسن بن ناصر العبیکان بھی جید علماء میں شمار کیے جاتے ہیں- زیر نظر کتاب چھپنے سے پہلے شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کو پڑھ کر سنائی جا چکی ہے، اس کتاب کے آخر میں شیخ عبداللہ بن سلیمان المنیع کا ایک رسالہ بھی ملحق ہے، جس کا نام ہے "الابانة في التمييز بين الطب الشرعي وخرافة الكهانة"-

مذکورہ کتاب میں حسد، نظر، جادو اور اس کے علاوہ دیگر نامعلوم ولا علاج امراض کے علاج کے لیے قرآنی آیات وادعیہ ماثورہ پڑھ کر مریض کے بدن پر پھونکنے یا پانی پر دم کر کے اس کو پینے اور غسل کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں- آیات وأدعیہ کی تاثیر بے نظیر کے یہ علماء اس قدر قائل ہیں کہ شرعی تعویذات کی انہوں نے نہ صرف اجازت دی بلکہ اس کے رواج کے ختم ہو جانے پر اپنی تشویش کا اظہار بھی کیا ہے اور حکومت سے درخواست کی ہے کہ ہر ہسپتال میں رقیہ شرعیہ کا ایک کاؤنٹر کھولنا چاہیے، جہاں سے لا علاج سے پریشان حضرات شرعی تعویذ حاصل کر سکیں- نیز ان معاملات میں صالح جن کی خدمات حاصل کرنے کا جواز بھی شیخ ابن تیمیہ کے حوالہ سے مذکور ہے-

اس میں شک نہیں کہ رقیہ شرعیہ دینے والے کے لیے مصنف نے بڑی معقول شرائط رکھی ہیں ،مثلاً یہ کہ اس کے عقائد درست ہوں، پابند شرع ہو، شرعی تعویذ میں کوئی ایسی بات شامل نہ ہو، جو عقیدۂ توحید کے منافی ہو، شرعی تعویذ دینے والے کا عقیدہ ہو کہ شافی صرف اللہ پاک کی ذات ہے اور یہ کہ جو کچھ وہ دے رہا ہے، اس میں بھی اس ذات پاک نے تاثیر رکھی ہے، نیز تعویذ استعمال کرنے والے کا عقیدہ بھی یہی ہو کہ شفا صرف اللہ کی قدرت واختیار میں ہے، وغیرہ وغیرہ- ان تمام

شرائط سے کسی بھی اہل علم کو ہرگز اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس کتاب کے ذکر سے میرا مقصد تعویذ گنڈوں کی تجارت کرنے والوں کے لیے سند جواز فراہم کرنا نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ سعودی عرب کے اکابر علماء رقیہ شرعیہ کی طرف اجازت ہی نہیں دیتے بلکہ اس کی طرف لوگوں کو مائل کرتے ہیں، گویا ایک سنت مردہ ہو گئی تھی، جس کے احیاء کی کوشش کر رہے ہیں، یہاں تک کہ حکومت سے ہسپتالوں میں اسپیشل کاؤنٹر کھولنے کی سفارش کر بیٹھے، جبکہ برصغیر کے سلفیوں کا یہ حال ہے کہ ان کے سامنے رقیہ شرعیہ کا نام بھی لیا جائے تو وہ ایسے بدکتے ہیں، جیسے امریکی صدر یا عوام کے سامنے کسی نے اسامہ بن لادن کا نام لے لیا ہو۔

ہم بدعت کی شناعت سے نہ تو غافل ہیں اور نہ ہی اس کے منکر۔ لیکن احادیث وآثار سے ثابت متواتر العمل متوارث مسائل ومعتقدات کو بدعت کے خانہ میں ڈالنے والے افراد کے خلاف تعزیرات شرع کی کن دفعات کے مطابق مقدمہ چلایا جائے اور کیا کیا سزائیں تجویز ونافذ کی جائیں؟ برصغیر کے سلفی ارباب علم وفضل سے ہمارا سوال ہے۔

ہم اپنے مضمون کا اختتام ان معروضات کے ساتھ مناسب خیال کرتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمان سلفی ہیں۔ لیکن وہ کبھی اتنے بڑے نہیں ہوئے اور مذاہب فقہ یا ائمہ فقہ کا دامن کبھی اتنا تنگ نہیں رہا کہ وہ اس میں سمانہ سکیں۔ ضرورت صرف نخوت وپندار علم کو توڑنے کی تھی۔ اور یہی ہوتا آیا ہے، کبھی بھی اہل سنت کے متقدمین ومتاخرین غرور علم کا شکار نہیں ہوئے۔ ہمارے ایک سے زیادہ اساتذہ اور احباب سلفی ہیں، جن کے ساتھ ہماری نشست وبرخواست ہے۔ اگر ان تک میری تحریر پہنچے اور آبگینۂ دل کو ٹھیس لگے تو میری گزارش ہے کہ کڑوروں تقلید کے قائل مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی ٹیس کو محسوس کریں آپ کا درد کم ہو جائے گا۔ ہم نے تو صرف برصغیر کی سلفی جماعت کے اجتماعی مزاج کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً ان میں کچھ معتدل مزاج علماء وعوام بھی ہیں جنہیں تکلیف پہنچی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں ۔لیکن سلفیوں کی جانب سے تو مقلد مسلمانوں، ان کے امام اور عبادات کے بعض ارکان کی نشاندہی کر کے ایسی دلخراش باتیں کہی جاتی ہیں، جن سے شرافت کا ضمیر چھلنی ہو جاتا ہے، بطور مثال عرض کر دیں کہ رفع یدین، قرأت خلف الامام، احرام نماز (ہاتھ سینہ پر باندھنا یا ناف پر)، نمازوں کے اوقات، تراویح اور وتر کی رکعات من جملہ ان مسائل کے ہیں جو حنفی اور سلفی کے مابین مختلف فیہ ہیں، اپنے مسائل پر تشدد کے ساتھ عمل پیرا ہونے کے باجود کوئی حنفی عالم مذکورہ بالا مسائل میں سلفی موقف کو بدعت کہنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ احناف کا موقف یہی رہا ہے کہ وہ مرجوح یا خلاف اولی ہیں اور بس، اس کے برخلاف سلفی موقف یہ ہے کہ انہیں ہر وہ عمل بدعت لگتا ہے جسے وہ نہیں کرتے۔ تراویح کی بیس رکعت، وتر کی تین رکعت، اقامت میں شہادتین کا اعادہ، نماز کی حالت میں ناف پر ہاتھ باندھنا، آمین بالسر، عدم رفع یدین اور ان کے علاوہ وہ دوسرے تمام عمل جنہیں وہ نہیں کرتے ہیں، انہیں یا تو وہ ضعیف احادیث سے مستنبط یا بدعت قرار دیتے ہیں۔ علم وانصاف کا خون تو تب ہوتا ہے جب یہ اسلام کے بھٹکے ہوئے آہو اور ناخواندہ عوام مسلمان کے نادان دوست حدیث کے اجمالی مفہوم سے بے بہرہ عوام کو ضعیف اور صحیح حدیث کا فرق بتاتے ہیں کہ ضعیف کہتے ہیں کمزور اور بوڑھی حدیث کو۔ کاش انہیں کوئی بتانے والا ہوتا کہ صحت وضعف کا معیار جسے محدثین کرام نے قائم کیا ہے وہ سراسر فنی اور تکنیکی ہے۔ اس سے نفس حدیث کی صحت وضعف متعین نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ اجتہاد میں اسے معیار بنا کر موقف متعین کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ رسول گرامی وقار محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہو اگر وہ مقام نبوت اور مزاج اسلام کے خلاف نہ ہو تو اپنی اہمیت میں برابر ہے اسے کمزور یا بوڑھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چہ جائیکہ وہ احادیث جن سے ائمہ کرام نے مسائل کا استنباط کیا ہے، ان میں بھی خاص طور سے امام ابوحنیفہ نے جو کہ عہد نبوت سے اقرب ترین امام ہیں۔

پھر بھی اگر صحیح اور ضعیف احادیث کا ذکر کرنا ہی ٹھہرا تو ان جاہلوں کے سامنے ذکر کرنے کا کیا مطلب نکلتا ہے، جن کے ذہن میں ضعیف کا لفظ سنتے ہی جذبہ تحقیر انگڑائیاں لینے لگے۔ کیا یہ کلام رسالت مآب کی توہین نہیں ہے؟ کیا انہیں اتنا سمجھا دینا کافی نہیں ہے کہ ہم جو کرتے ہیں وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے، البتہ ان کا عمل بھی صحیح ہے۔ علم وتحقیق کی اس سے بڑی تہی دامنی اور کیا ہو سکتی ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کسی بھی عمل کو بدعت قرار دے دیا جائے۔ مقام حیرت ہے کہ ایک ایسی قوم جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالی نے انہیں کسی چیز کے حلال یا حرام کرنے کا اختیار نہیں دیا تھا، اعلان کرے کہ "التحليل والتحريم حق الله" حلال وحرام کرنا اللہ کا حق ہے، لیکن خود اپنے لیے حق میں سیندھ لگانے کا اختیار محفوظ رکھے۔ ——— بقیہ: صفحہ ۲۱۴ پر ملاحظہ کریں

علامہ کامل سہسرامی قدس سرہٗ

شہیدِ ناز کی تربت کہاں ہے؟

کاروان عقیدت کی پیہم جستجو کے باوجود متاع عشق ومحبت کا نام ونشان نہیں ملتا- جدا، طائف، ریاض، دمام اور مکہ کی صاف ستھری چوڑی کشادہ اور چکنی سڑکوں پر دندناتی ہوئی صبارفتار تیز کاریں، کاروں میں قیمتی قالین، جدید طرز کے مکانات، سر بفلک ایر کنڈیشنڈ عمارتیں، عمارتوں کے اندر ٹیلی ویژن، ریفریجیٹر، شاندار صوفے، ایرانی قالین اور آرام وآسائش کی تمام جدید سہولتیں اس بات کا اعلان کر رہی ہیں کہ تیل کی بے اندازہ دولت نے ان عربوں کی زندگی اور رہائش کو بے حد شاہانہ اور شہروں کو بہت ترقی یافتہ بنا دیا ہے- ایک سیاح جب ان سڑکوں سے گزرتا ہے تو کچھ دیر ٹھہر کر یہ ضرور سوچتا ہے کہ یہ ریگستان عرب کا کوئی خطہ ہے یا یورپ کے جدید ترین شہر کا کوئی حصہ؟

بے پناہ دولت کے مالک سعودی حکمران جہاں اپنے ملک کی مادی ترقی اور عوام کے طرز معاشرت اور انداز زندگی کو مغربی ممالک کے دوش بدوش اور شانہ بشانہ کرنے کی جدوجہد میں مسلسل مصروف عمل ہیں، وہیں یہ حکمراں موسم حج کی سہولت، زائرین کی راحت اور ہر سال آنے والے حاجیوں کے آرام کے خیال سے بھی غافل نہیں-اونٹوں کے زمانے کے سفر اور آج کے سفر میں زمین وآسمان کا فرق ہے، آج سفر کی تمام تر سہولتیں محض دولت ہی کی نہیں بلکہ حکمرانوں کی بھی رہین منت ہیں-

جدہ میں وسیع ترین مدینۃ الحجاج کی تعمیر، کمشنر کی تیز رفتار کارکردگی، میٹھے پانی کی فراوانی، سواریوں کی سہولتیں، ہر قسم کی تیز رفتار گاڑیاں پھر مکہ معظمہ میں حرم کی توسیع، جدید انداز کی بے حد خوبصورت اور پر شکوہ تعمیر، ملٹی اسٹوریز عمارتیں، بلند مینار، جا بجا قالینوں کے فرش، تیز روشنی کے ان گنت بلب، ہر لحہ صفائی کا التزام، تقریباً ہر دروازے کے قریب وضو خانے، انہی سے متصل سیکڑوں استنجا خانے اور بیت الخلاء، صفاء اور مروہ کے ربع ربع میل کے طویل راستے پر کشادہ اور حسین تر ہال کی تعمیر، آنے جانے کی الگ الگ راہیں، پھر اس میں ضعیف، کمزور اور مجبور حجاج کا جداگانہ راستہ، منیٰ اور عرفات تک جانے والے راستے میں متعدد کشادہ سڑکیں، قدم قدم پر شفا خانے، بارونق گلیاں، قابل دید بازار اور اس طرح کی بہت ساری دوسری سہولتوں اور حسن انتظام پر سعودی حکومت یقیناً لائق تحسین ہے- ہفتوں کا تھکا ہارا مسافر جب اپنے لیے اتنی ساری سہولتوں اور حرم کی جدید ترین تعمیر کو دیکھتا ہے تو سفر کی کلفتوں کو بھول جاتا ہے-

زیارت بیت اللہ، طواف کعبہ اور دیگر ارکان وزیارت سے شادکام ہونے والے خوش نصیب زائر کی نگاہ چمن زار عقیدت کو تلاش کرتی ہے، مشام روح خوشبوئے وفا کی جستجو کرتی ہے، دل کی دنیا متاع گرانمایہ کے دیدار کی تمنا کرتی ہے اور جذبۂ عشق، یوسف گم گشتہ کا متلاشی ہوتا ہے- نگاہوں کی عقیدتیں اپنے اس انمول سرمائے کو کشادہ سڑکوں پر بارونق بازاروں میں، حسین گلیوں میں، سر بفلک عمارتوں میں اور ایک ایک مقام پر ڈھونڈتی ہیں- لیکن حیف صد حیف! کہ تمام تر تلاش ساری جستجو اور غریب الوطن عقیدتوں کی ہزار آبلہ پائی کے باوجود وہ متاع گم شدہ، وہ سرمایہ عقیدت، وہ مرکز احترام جس کا براہ راست تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے تھا، نہیں ملتا- جسمانی آرام وآسائش کا اہتمام کرنے والی حکومت سے عقیدتیں ہر سال سوال کرتی ہیں اور قیامت کی صبح تک سوال کریں گی کہ آخر وہ متاع عقیدت کہاں گئی؟ وہ سرمایہ محبت کیا ہوا؟ کیا ہوا ان نایاب تبرکات کا؟ مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہاں گیا؟ مولد فاطمہ کہاں گیا؟ دار ارقم کہاں گیا؟ باب ام ہانی کہاں گیا؟ قبہ خدیجۃ الکبریٰ کہاں گیا؟ تبرکات کی دنیا کیسے ختم ہوگئی؟ کہاں غائب ہوگئی؟ اور کیسے مٹادی گئی؟ مکہ کے بازارو! تم بتاؤ، بلند عمارتو! تم کچھ کہو، حرم کی دیوارو! تمہی کوئی نشاندہی کرو، ذمہ دار حکمرانو! تم ہی کچھ بولو عشق وایمان کی امانت میں کس نے خیانت کی ہے؟ کس نے کی ہے یہ خیانت؟ لیکن افسوس کہ عقیدتوں کی پکار اور محبتوں کی دریافت پر خاموش مایوسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا- جانے والے خوش نصیب حاجیو! اگر ہو سکے تو اس یوسف گمشدہ کو تم بھی تلاش کرنا اور اگر

کہیں مل جائے تو تشنہ کامان زیارت کی جانب سے عقیدتوں کی نذر اور محبتوں کا سلام پیش کرنا۔ لیکن پتا بتانے کے باوجود تحقیق ہے کہ تمہاری تلاش و جستجو بھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔

لیے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہید ناز کی تربت کہاں ہے؟

مولد النبی:۔ وہ مقدس و بابرکت مکان جہاں فخر آدم، تاجدار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت طیبہ ہوئی تھی، جہاں فرشتے اور سید الملائکہ دست بستہ اولین سلامی کے لیے حاضر ہوئے تھے، جہاں حوران بہشتی خدمات پر مامور کی گئی تھیں، جہاں حضرت مریم، حضرت ہاجرہ، حضرت آسیہ پیغام مبارک وسلامت کے لیے آئی تھیں، جہاں نبی کریم نے شیر خوارگی کے چند دن گزارے تھے، جہاں سے ان کے عہد طفولیت کی بہت ساری یادیں وابستہ ہیں، جس زمین نے بچپن کے ننھے ننھے قدم پاک کو چوما، جن در و دیوار نے اس کے دست کرم کا شرف حاصل کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ مقدس مکان شعب بنی عامر میں واقع تھا جو حرم سے دو سو قدم کے فاصلے پر واقع ہے۔ تین کمروں پر مشتمل یہ مکان زمین سے ڈیڑھ میٹر کی بلندی پر واقع تھا، جس میں چند زینوں پر چڑھ کر اندر داخل ہوا جاتا تھا۔ مکان کے ایک کمرے میں بطور نشان ایک قبہ اور کمرے کے وسط میں ذرا سی گہرائی تھی، یہی وہ مقام تھا، جہاں سے آفتاب نبوت طلوع ہوا تھا۔ لیکن آج مولد پاک اور اس مقدس زیارت گاہ کے دیدار کے لیے ترستی ہوئی نگاہوں کو مایوسیوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اگر کوئی خوش بخت تلاش و جستجو اور رہبری و رہنمائی کے سہارے اس سرزمین تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو وہاں کوڑے کرکٹ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

مولد فاطمہ: یہ مکان حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا تھا، یہ وہ مقدس اور باعظمت مکان تھا، جس میں نزول وحی کے بعد سب سے پہلے سرکار تشریف لائے تھے اور کمبل اوڑھانے کی فرمائش کی تھی۔ یہیں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک کمرے میں عبادت فرمایا کرتے تھے۔ یہیں قرآن کی آیتیں نازل ہوتی تھیں، یہیں جبریل امین سلامی کو حاضر ہوا کرتے تھے، یہیں سیدہ خاتون جنت پیدا ہوئی تھیں، یہیں ایک الماری میں ان کی چکی بطور تبرک بھی موجود تھی، یہی گھر اسلام کی ابتدائی تبلیغ کا مرکز تھا، سو سال قبل کی تاریخ آج بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ محلہ دارالجو کے نشیب میں چار کمروں پر مشتمل خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا بابرکت مکان مرجع خلائق تھا۔ جس کی دیوار پر سنگ مرمر کی لگی تختی پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ تھی۔

حضرت فاطمہ زہرہ بتول سیدۃ نساء العالمین بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر کا حکم سیدنا مولانا مفروض الطاعت امیر المومنین ناصر الدین نے اس کے منافع اور پیداوار کو پہلے اس کے مصالح پر پھر اس مقام نبوی کے مصالح پر حسب رائے متولی و نگرانی کار خالصۃ لوجہ اللہ وقف کیا جو شخص اس میں تغیر و تبدل کرے اس پر خدا کی لعنت اور کرنے والوں کی لعنت قیامت تک ہو۔ ۶۰۴ء کتابت (عربی عبارت کا ترجمہ)

اس عظیم تاریخی تبرک کو تلاش کرنے والے مکہ کی ایک ایک گلی میں تلاش کرتے ہیں لیکن اس بابرکت مکان کا ملنا تو کجا کوئی اس کا پتا و نشان بتانے والا نہیں ملتا۔

دار ارقم:۔ یہ محترم مکان حضرت ارقم مخزومی رضی اللہ عنہ کا تھا جو تاریخی روایت کی بنیاد پر کوہ صفا کی بائیں جانب محلہ دارالخیز ران کی ایک گلی میں واقع تھا۔ یہ وہ زیارت گاہ تھی، جس میں کفاران مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر سرکار نے اقامت فرمائی تھی، یہیں سے اسلام کی خموش تبلیغ کا کام ہوا کرتا تھا، یہی وہ زمین تھی جس پر بندگان خدا ظالموں کے شر سے چھپ کر خدائے واحد کی بارگاہ میں سجدہ کیا کرتے تھے۔ قتل رسول پر آمادہ عمر کو اسی مکان میں دولت ایمان کا لازوال خزانہ ملا تھا اور یہیں سے اہل حق کا قافلہ خانہ کعبہ کی سرزمین پر سجود نیاز کی نذر پیش کرنے گیا تھا اور ڈنکے کی چوٹ پر نماز با جماعت کی ابتدا ہوئی تھی، اس مرکز عقیدت کو دریافت کرنے والوں کی زبان میں کانٹے پڑ جاتے ہیں لیکن کوئی رہنمائی کرنے والا نہیں ملتا۔ اور حد تو یہ ہے کہ مکہ جغرافیے تک میں اس مکان کے وجود کا نشان نہیں ملتا۔ حالانکہ تاریخ کے صفحات پکار رہے ہیں کہ دارالخیز ران میں حضرت ارقم کا وہ مکان تھا جس کی مشرقی دیوار پر مندرجہ ذیل عبارت کا کتبہ تھا۔

بسم اللہ...... بھ...... امن گھروں میں جن کے متعلق خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ بلند کیے جائیں گے، ان میں خدا کا نام لیا جائے گا اور صبح و شام ان میں خدا کی تسبیح پڑھی جائے گی، یہ رسول اللہ کے چھپنے کی جگہ اور خیز ران کا مکان ہے، اسلام کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ اس کی تجدید عمارت کا حکم امین الملک نے خالصۃً لوجہ اللہ دیا اور خدا نیکی کرنے

والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ (ترجمہ)

قبۂ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا: ۔ مکہ کا قبرستان جس کا نام جنت المعلیٰ ہے، اسی کے مشرقی دروازے کے قریب ام المومنین زوجہ سید المرسلین کی قبر انور اور قبر انور پر ایک مختصر لیکن خوبصورت سا قبہ تھا۔ ہم سارے مسلمانوں پر تو اسلام کا احسان ہے۔ لیکن بلاشبہ اسلام پر سیدہ خدیجہ کا احسان ہے، یہ وہ طیبہ طاہرہ خاتون تھیں، جنہیں بیوگی کے باوجود میرے سرکار نے اپنی زوجیت کا شرف عطا فرمایا۔ نزول وحی کے بعد جنہوں نے سب سے پہلے سرکار کی زیارت فرمائی۔ کمبل اوڑھایا اور تسکین کی باتیں کیں، سب سے پہلے حضور کی رسالت پر ایمان لا کر عورتوں میں اولین اسلامی خاتون کا اعزاز حاصل کیا۔ جن کی بے شمار دولت کی ایک ایک پائی اسلام کے لیے وقف ہوئی اور جن کا سرمایہ آڑے وقتوں میں اسلام کے کام آیا۔ جن کے شوہر رسول خدا، جن کی صاحبزادی فاطمہ زہرا، جن کے داماد شیر خدا، جن کے نواسے حسن مجتبیٰ اور حسین شہید کربلا تھے۔ حیف! آج ان کی مقدس قبر کا پتا و نشان نہیں ملتا۔ جنت المعلیٰ کے مشرقی حصے میں منہدم شدہ قبے کا ڈھیر ملتا ہے۔ توڑ پھوڑ کا مزاج نظر آتا ہے۔ عظمت و تقدس کی دھجیاں بکھری دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اس عظیم المرتبت خاتون جن کے تلووں کی دھول مل جائے تو گنہگاروں کی نجات ہو جائے، ان کی قبر کے نشانات نہیں ملتے اور مشتاق زیارت ترستی ہوئی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے سائے میں فاتحہ پڑھ کر زخمی جذبات کے ساتھ واپس ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔

باب ام ہانی: ۔ دنیا جانتی ہے کہ معراج کی رات سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ہانی کے گھر تشریف فرما تھے، یہیں جبریل امین نے حاضر بارگاہ ہو کر سلام کے بعد دیدار الٰہی اور معراج کا مژدہ سنایا اور چلنے کی درخواست کی۔ حضور یہاں سے حرم شریف تشریف لائے، پھر شق صدر وغیرہ کے بعد ستر ہزار فرشتوں کے جلو میں حرم کعبہ سے مسجد اقصیٰ تک کے لیے روانہ ہوئے۔ خانۂ ام ہانی سے چل کر جس دروازے کے ذریعے حضور نے حرم پاک میں قدم رکھا اس دروازے کا نام اسی مناسبت سے باب ام ہانی رکھ دیا گیا تا کہ عقیدت مند نظر جب اس پر پڑے تو واقعہ معراج کی یاد تازہ ہو۔ حضرت ام ہانی کی عظمت و تکریم سے دل معمور ہو اور عقیدت و محبت کا چمن زار ایک نئی بہار سے ہم کنار ہو۔ لیکن نیاز مند آنکھیں حرم پاک کے ایک ایک دروازے کو دیکھتی ہیں، اس پر لکھی عبارتوں کو بار بار پڑھتی ہیں لیکن کسی دروازے پر باب ام ہانی لکھا نہیں ملتا۔ پیہم تلاش و جستجو اور دریافت کے بعد پتا چلتا ہے کہ وہ دروازہ جس پر باب عبد العزیز لکھا ہے، وہی دراصل کبھی باب ام ہانی تھا۔ اگر انصاف دنیا سے ختم نہیں ہو گیا اور ضمیر مردہ نہیں ہو گئے تو میں پوچھنا چاہتا ہوں اور عوامی عدالت میں استغاثہ پیش کر کے فیصلہ قلب لینا چاہتا ہوں۔ ایک زائر کا قدم جب حرم کی سرزمین پر پڑھتا ہے تو اس کی نگاہ شوق عشق و ایمان کے مرکزوں کو تلاش کرتی ہے، اسلاف کی یادگاروں کو ڈھونڈتی ہے یا کسی عبد العزیز کو؟ کاروان محبت ہر قدم پر اپنے مقدس محبوب کی نشانیوں کو تلاش کرتا ہے یا پھر ان کے چہیتوں کی یادگاروں کو؟ اور جب صورت حال یہ ہے تو پھر فیصلہ دیجیے کہ یہ سب کچھ آباء پرستی کی بدترین بدعت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس طرح کی اور بہت سی یادگاریں ہیں اور نشانیاں ہیں جو تاریخ کے صفحات پر تو ملتی ہیں لیکن مکہ معظمہ کی سرزمین پر ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔

مکہ کے بارونق بازاروں میں دنیا کے ہر ملک کی چیزیں بکتی ہیں۔ ہر قسم کا سامان ملتا ہے۔ لیکن نہیں ملتا تو مولد النبی نہیں ملتا، مولد فاطمہ نہیں ملتا، دار ارقم نہیں ملتا، قبہ خدیجہ نہیں ملتا، باب ام ہانی نہیں ملتا اور تہذیب کی چمک، تمدن کی روشنی اور دولت کی فراوانی میں یہ یادگاریں اس طرح دبائی گئی ہیں جیسے واقعات کی دنیا میں ان کا کوئی وجود تھا ہی نہیں۔

آج عقیدتوں کی دنیا ارباب اقتدار سے سوال کرتی ہے کہ کیا مولد نبی کی دیواریں لائق توقیر نہ تھیں، اس کی زمین محبتوں کی بوسہ گاہ نہ تھی، مولد فاطمہ کے بام و در قابل تکریم نہ تھے، خدا کے آخری نبی کا عبادت خانہ اور وحی الٰہی کا مقام نزول باعث عزت نہ تھا۔ کیا اسلام کی اولین خاتون کا قبہ قابل تکریم نہ تھا۔ کیا ام ہانی کا نام لائق التفات نہ تھا؟ اگر تھا اور یقیناً تھا تو ان مقامات مقدسہ کی بقا اور تحفظ کا معقول و مناسب انتظام کیوں نہیں کیا گیا؟ حرم کی توسیع پہ کروڑوں اور اربوں خرچ کرنے والوں سے کوئی دریافت کرے کہ وہ عمارتیں کیوں منہدم ہوئیں؟ وہ نشانیاں کیوں زمین بوس ہوئیں؟ وہ مآثر کیوں بے نام و نشان ہوئے؟ کیا ان یادگاروں کا تحفظ ممکن نہ تھا؟ کیا ان کی خمیدہ دیواروں کو چند ریال کے سہارے کھڑا نہیں رکھا جا سکتا تھا؟ کیا چودہ سو سال پرانی دھول مٹیوں کو دبیز شیشوں سے ڈھانک کر محافظ کا حق ادا نہ کیا جا سکتا تھا؟

بقیہ: صفحہ ۱۷۸ پر ملاحظہ کریں

مولانا سید سیف الدین اصدق☆

تحریک وہابیت: ہندستانی تناظر میں

ہندوستان میں اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ عرصۂ دراز تک یہاں مسلمان ایک تھے۔ مذہب ایک تھا، عقیدہ و مسلک میں یکسانیت تھی۔ وہ اتحاد و اتفاق کی دولت سے مالا مال تھے۔ اختلاف و انتشار کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ ہاں! جب مغلوں کا دور شروع ہوا تو وقتاً فوقتاً شیعان علی نے ہندوستان کا رخ کیا اور اپنے قدم جمائے لیکن جب بھی ان کے نظریات کے فتنے نے سر اٹھایا تو علمائے اہل سنت نے ان کی سرکوبی میں ذرا کوتاہی نہ فرمائی چنانچہ اگر مجدد الف ثانی نے "ردّ روافض" کے نام سے رسالہ لکھا تو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے "المقدمۃ السنیۃ لانتصار الفرقۃ السنیۃ" کے نام سے اس کا عربی ترجمہ فرمایا۔ پھر ردّ شیعت میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی گئی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی معرکہ آرا تصنیف "تحفۂ اثنا عشریہ" کی خدمت کو کون فراموش کرسکتا ہے جب مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا اور ہند کی سرزمین پر انگریزوں نے اپنے ناپاک پنجے گاڑے تو دین بیزاری، آزاد خیالی اور گمراہی و بے راہ روی کی ایک ہوا چل پڑی۔ جماعت غیر مقلدین ہی کے ایک نامور پیشوا مولوی محمد حسین بٹالوی اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔

اے حضرات! یہ مذہب سے آزادی اور خودسری و خود اجتہادی کی تیز ہوا یورپ سے چلی ہے اور ہندوستان کے ہر شہر و بستی و کوچہ و گلی میں پھیل گئی ہے جس نے غالباً ہندوؤں کو ہندو اور مسلمانوں کو مسلمان رہنے نہیں دیا۔ حنفی اور شافعی مذہب کا تو کیا پوچھنا ہے۔ (اشاعۃ السنۃ جلد ۱۹۔شمارہ ۸۵، ص ۲۵۵)

یعنی یہ ہوا خود بخود نہیں چلی بلکہ ایک خاص پلاننگ کے تحت انگریزوں کی طرف سے چلائی گئی تھی۔ جس کے لئے عظیم ولی اللّٰہی خاندان کے چشم و چراغ شاہ اسماعیل دہلوی کو منتخب کیا گیا۔ جنھوں نے اپنے حنفی آباو اجداد اور اساتذہ کے برعکس رفع یدین شروع کیا تو اہل دہلی نے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ ان کے عم محترم شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے رفع یدین سے ممانعت فرمائی تو فوراً جواب میں حدیث پڑھ دی کہ "جو شخص میری امت کے فساد کے وقت میری سنت کو اپنائے اس کے لئے سو شہید کا اجر ہے۔" محدث چچا نے اس کٹ حجتی اور بیباکی پر فرمایا: "بابا ہم تو سمجھے تھے کہ اسماعیل عالم ہو گیا مگر وہ تو ایک حدیث کا معنی بھی نہ سمجھا۔ یہ حکم تو اس وقت ہے جب کہ سنت کے مقابل خلاف سنت ہو اور ما نحن فیہ (زیر بحث مسئلہ) میں سنت کا مقابل خلاف سنت نہیں، بلکہ دوسری سنت ہے، کیوں کہ جس طرح رفع یدین سنت ہے، یوں ہی ارسال بھی سنت ہے۔

(حکایات اولیا۔ دار الاشاعت کراچی۔ ص: ۱۲۰)

یہ آزادی اور بڑھی تو تقویۃ الایمان کی صورت میں سامنے آئی۔ انبیاء اور اولیا کی شان میں ایسے نازیبا کلمات استعمال ہوئے کہ الامان و الحفیظ" اہل دانش سمجھ گئے کہ زبان امپورٹ کی ہوئی ہے۔ انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں امپورٹ، زبان میری ہے بات ان کی"۔

دہلی کے مشہور نقش بندی مجددی عالم و شیخ طریقت حضرت شاہ ابوالحسن زید فاروقی (متوفی ۱۹۹۳ء) تحریر فرماتے ہیں:

اس کتاب (تقویۃ الایمان) سے مذہبی آزاد خیالی کا دور شروع ہوا۔ کوئی غیر مقلد ہوا، کوئی وہابی بنا، کوئی اہل حدیث کہلایا، کسی نے اپنے کو سلفی کہا ائمۂ مجتہدین کی جو منزلت اور احترام دل میں تھا وہ ختم ہوا۔ معمولی نوشت و خواند کے افراد امام بننے لگے۔ اور افسوس اس بات کا ہے کہ توحید کی حفاظت کے نام پر بارگاہ نبوت کی تعظیم و احترام میں تقصیرات کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ (تقویۃ الایمان اور مولانا اسماعیل دہلوی۔ شاہ ابوالخیر اکیڈمی چتلی قبر دہلی۔ ۶، ص: ۹)

شاہ اسماعیل دہلوی کی اس رسوائے زمانہ کتاب پر ایک طوفان برپا ہو گیا۔ باز پرس ہوئی، مناظرے ہوئے، ان گنت کتابیں رد میں لکھی گئیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ کسی نے سنایا تو چہرہ سرخ ہو گیا، فرمایا اگر بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو "تحفۂ اثنا عشریہ" کا سا جواب اس کے ردّ میں بھی

☆Raza Jama Masjid,Taslatai Nagar,Barve Marg Road,Chembur,Kurla(E)Mumbai-71

لکھتا -(تفصیلات: انوار آفتاب صداقت، از قاضی فضل احمد لدھیانوی-مطبوعہ کریمی پریس لاہور)

دوسری طرف ان تمام معاملات سے بے نیاز ہو کر اسمٰعیل دہلوی اپنی ڈگر پر بڑھتے ہی رہے-بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا اصول پر شہرت و ناموری بھی ان کے قدم چومتی رہی، برٹش گورنمنٹ اسے غیر معمولی اہمیت دے رہی تھی۔ کتابیں مفت تقسیم ہو رہی تھیں۔لندن میں اس کا انگلش ترجمہ ہو رہا تھا۔ (ملاحظہ فرمائیں: العلامہ فضل حق خیرآبادی- از ڈاکٹر قمر النسا عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن- مقالات سرسید-مجلس ترقی ادب لاہور-جلد ۹ ص ۱۷۸)

صاحب تقویۃ الایمان کی انگریز نوازی اب ایسی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ رہی جس پر تعجب کیا جائے۔ انگریزی حکومت کی محبت میں سعودی حکومت کی طرح وھابی اسٹیٹ کے قیام کے لئے تو سرحد کے غیور خوش عقیدہ حنفی پٹھانوں سے لڑتے ہوئے انھوں نے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیا۔اعلیٰ حضرت شاہ احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے خوب فرمایا ہے:

وہ وہابیہ نے جسے دیا ہے لقب شہید و ذبیح کا یا
وہ شہید لیلیٰ نجد تھا، وہ ذبیح تیغ خیار ہے

یہاں پر جناب پروفیسر فیاض کاوش کی اس تحریر پر نظر ڈالتے چلیں تو بہتر ہوگا جو معلومات و دلچسپی سے خالی نہیں-'' لکھتے ہیں: ''شیخ نجدی نے عرب میں ''امیر سعود'' سے مل کر مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ان کے مال و متاع کو مباح کہہ کر لوٹ لیا-

یہاں سید احمد بریلوی نے مولوی اسماعیل دہلوی سے مل کر ہندوستان میں وہی خونی ڈرامہ کھیلا جسے نجدیوں نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ ہر عقل مند یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہ سازش انگریز اور صرف انگریز کی تیار کردہ تھی جس پر عمل کرانے کے لئے فرنگیوں کو دو کارندے نجد میں مل گئے تھے۔ ایک محمد بن عبدالوہاب نجدی۔ دوسرا امیر سعود اسی طرح انگریزوں کو دو ایجنٹ ہند میں بھی میسر آ گئے۔ ایک سید احمد رائے بریلوی۔ اور دوسرا مولوی اسمٰعیل دہلوی۔ یہاں بھی دو۔ وہاں بھی دو۔ یہ مماثلت بھی دیدنی ہے۔عرب میں ''شیخ نجدی'' نے بے ادبی رسول کا جو ہنگامہ برپا کیا تھا۔ وہی کارنامہ ''شیخ ہندی'' نے یہاں انجام دیا۔ شیخ نجدی نے کتاب التوحید لکھ کر عظمت مصطفےٰ کے نورانی مینار گرائے، تو ''شیخ ہندی'' نے ''تقویت الایمان'' لکھ کر توہین مصطفےٰ کے شیطانی ہتھیار سجائے- وہاں عرب میں بھی نجدی شمشیر سے خون مسلم بے دریغ بہایا گیا- یہاں ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی گردن پر ''اسمٰعیلی خنجر'' آزمایا گیا- جس طرح ابن عبدالوہاب نجدی نے اقتدار و حکومت کے بل بوتے پر کتاب التوحید'' کا عملی نفاذ کیا- بالکل اسی طرح مولوی اسمٰعیل نے ''تقویت الایمان'' کے عمل اور حتمی نفاذ کے لئے اقتدار و حکومت کا سہارا لیا- جس طرح ابن عبدالوہاب نجدی نے ان مسلمانوں کو قتل کیا جنھوں نے اس کی بدعقیدگی کو تسلیم نہیں کیا تھا- بالکل اسی طرح مولوی اسمٰعیل نے بھی اپنے وہابیانہ عقائد کے نفاذ کے مخالف مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام کیا۔ جس طرح عرب میں برطانیہ کی سازش سے ''ترکی خلافت کا زوال ہوا'' اور وہابی سعودی سلطنت مستحکم ہوئی- بالکل اسی طرح ہندوستان میں برٹش پلان کے تحت مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا اور سرحد میں انگریز کے زیر سایہ وہابی اسٹیٹ قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ (ننگ دین ننگ وطن۔مکتبہ نظامی بھیونڈی، ص: ۶۳ تا ۶۴)

اس موضوع پر تفصیلی جائزہ کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا۔

۱- حقیقت افسانۂ جہاد، سید نور محمد قادری- ۲- حقائق تحریک بالاکوٹ، شاہ حسین گردیزی- ۳- سید احمد شہید کی صحیح تصویر، وحید احمد مسعود بدایونی- ۴- امتیاز حق، راجا غلام محمد- ۵- تاریخ تناولیاں، سید مراد علی- ۶- ننگ دین ننگ وطن، پروفیسر فیاض کاوش-

جماعت غیر مقلدین کے پہلے امام شاہ اسمٰعیل دہلوی دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے دو اہم کارنامے تو انجام دے ہی گئے۔ اول تو یہ کہ افتراق بین المسلمین کا ایسا بیج بویا جس کے ثمرات آج پورے برصغیر میں پائے جا رہے ہیں- معروف عالم دین مولانا احمد رضا بجنوری دیوبندی کہتے ہیں کہ ''افسوس ہے کہ اس کتاب (تقویۃ الایمان) کی وجہ سے مسلمانان ہند و پاک جن کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ ہے اور تقریباً نوے فیصد حنفی المسلک ہیں، وہ دو گروہ میں بٹ گئے۔ (انوار الباری جلد ۱۱۔ص: ۱۰۷۔ناشر العلوم بجنور)

ہفت روزہ خدام الدین لاہور کے سابق مدیر محمد سعید الرحمن علوی لکھتے ہیں: دعویٰ اہل حدیث ہونے کا ہے، لیکن حالات یہ ہیں کہ نیچریت، انکار حدیث، قادیانیت سمیت اکثر و بیشتر فرقوں کے بانی غیر مقلدیت کے بطن سے پیدا ہوئے۔ (مقدمہ: اہل حدیث اور انگریز۔ص: ۳)

دوم یہ کہ مقدس ترین ہستیوں کی شان میں ہرزہ سرائیوں اور گستاخیوں کا جو انھوں نے دروازہ کھولا تھا وہ پھر بند نہ ہو سکا۔ آج ہر چوک اور چوراہے پر یہ معائنہ کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کا نام لے کر کوئی بھی ایرا غیرا بڑی سی بڑی شخصیتوں کی شان میں کچھ بھی کہہ گذرنے میں ذرا باک محسوس نہیں کرتا۔ یوں تو دیوبندیت اور غیر مقلدیت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور اقتصادیات میں دونوں کا تقریباً اتفاق بھی ہے، لیکن اس کے باوجود دیوبندی جماعت کی مشہور شخصیت مولانا اشرف علی تھانوی کے غیر مقلدین سے متعلق تاثرات قابل مطالعہ ہیں۔ یہاں موضوع کے اعتبار سے ملاحظہ فرمائیں: ایسے ہی اکثر غیر مقلد ہیں، حدیث کا تو نام ہی نام ہے۔ محض قیاسات ہی قیاسات ہیں، اپنے ہی مقلد ہیں، حدیث کی تو ہوا بھی نہیں لگی، اور ایک چیز کا تو ان میں نام و نشان نہیں، وہ ادب ہے، نہایت ہی گستاخ و بے ادب ہوتے ہیں جو جس کو چاہتے ہیں کہہ ڈالتے ہیں، بڑے جری ہیں اس باب میں اور بزرگوں کی شان میں گستاخی کرنے والا بڑے ہی خطرے میں ہوتا ہے سوء خاتمہ کا"۔(افاضاتِ یومیہ۔ جلد ا۔ ص ۳۰۹)

ایک جگہ لکھتے ہیں: اکثر پکے محب دنیا ہیں، بزرگوں سے بدگمانی اس قدر بڑھی ہوئی ہے، جس کا کوئی حد و حساب نہیں اور اس سے آگے غضب یہ ہے کہ بدزبانی تک پہنچے ہوئے ہیں۔ ادب اور تہذیب ان کو چھو بھی نہیں گئے۔ ہاں بعضے محتاط بھی ہیں۔ وقلیل ماھم۔ (اور وہ بہت تھوڑے ہیں)(افاضاتِ یومیہ۔ جلد ا، ص ۲۲۲)

موجودہ دور میں خود کو سلفی کہنے والے اس فرقے کی بے ادبی و دریدہ دہنی سے بزرگانِ دین، ائمۂ مجتہدین اور سلف صالحین ہی کی شخصیات مجروح نہیں ہوئیں بلکہ مقدس صحابہ کرام اولو العزم انبیاء و مرسلین یہاں تک کہ اللہ رب العزۃ جل شانہٗ کی ذات و صفات بھی محفوظ نہ رہی ہیں۔ مندرجہ ذیل سطروں میں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان کے کتب و رسائل کے حوالے سے کچھ نمونے بخوف طوالت بلا تبصرہ پیش کر رہے ہیں۔

آپ اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر ان عقائد کو دیکھیں اور پوری انصاف کریں کہ اگر ایمان اسی کا نام ہے تو پھر زندیقی کسے کہتے ہیں:

کیوں کفر کی جانب کھینچے ہے برہمن
اس کام کے لیے تو مسلمان بہت ہیں

بارگاہ خداوندی میں: مولوی اسمٰعیل دہلوی لکھتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کو جہت اور مکان سے پاک اور منزہ سمجھنا حقیقی بدعت ہے۔(ایضاح الحق الصریح، ص: ۳۵ تا ۳۶ مطبوعہ فاروق دہلی)

(۲) مشہور غیر مقلد مصنف و قلم کار قاضی عبدالاحد خان پوری نے اپنے فرقہ کے امام مولوی ثناء اللہ امرتسری کا عقیدہ لکھا ہے کہ: "رب تعالیٰ اپنے مثل پیدا کرنے پر قادر ہے"۔(الفیصلۃ الحجازیہ، ص: ۲۳)

مزید لکھتے ہیں: مولوی ثناء اللہ امرتسری اللہ عزوجل کی ہزاروں مثلیں قرار دیتا ہے۔(الفیصلۃ الحجازیہ، ص: ۸)

(۳) مولوی عبدالستار دہلوی کا فتویٰ ہے: "خدا کو ہر جگہ ماننا معتزلہ وجہمیہ وغیرہ فرق ضالہ کا باطل عقیدہ ہے۔"
(فتاویٰ ستاریہ، ص: ۸۴، جلد ۲)

(۴) مولوی اسماعیل دہلوی کا خیال ہے: "غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو کہ جب چاہے کر لیجیے، یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے۔" (تقویۃ الایمان۔ ص: ۲۰ مطبوعہ دہلی)

(۵) پس لا نسلم کہ کذب مذکور محال بمعنے مسطور باشد الی قولہ الا لازم آید کہ قدرتِ انسانی زائد از قدرتِ ربانی باشد۔ (رسالہ یک روزی فارسی، ص: ۱۷۔ مطبوعہ ملتان از مولوی اسمٰعیل دہلوی)

ترجمہ: تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کا جھوٹ محال بالذات ہو ورنہ لازم آئے گا کہ انسانی قدرت رب تعالیٰ کی قدرت سے زائد ہو جائے گی۔ مولوی ثناء اللہ امرتسری نے بھی لکھا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے پر قادر ہے کہنا عین ایمان ہے"
(اخبار اہل حدیث، امرتسر۔ ص: ۲، ۲۷/اگست ۱۹۱۵ء)

دربار رسالت میں:- (۱) سب انبیا و اولیا کے سردار پیغمبر خدا ﷺ تھے۔ اور لوگوں نے انہیں کے بڑے بڑے معجزے دیکھے۔ انہیں سے سب اسرار کی باتیں سیکھیں۔ اور سب بزرگوں کو انہیں کی پیروی سے بزرگی حاصل ہوئی۔ تو اس لئے انہیں کو اللہ صاحب نے فرمایا کہ اپنا حال لوگوں کے آگے صاف بیان کر دیں تاکہ سب لوگوں کو حال معلوم ہو جاوے۔ سو انھوں نے بیان کر دیا کہ بلکہ مجھ کو نہ کچھ قدرت نہ کچھ غیب دانی۔ میری قدرت کا حال تو یہ ہے کہ اپنی جان تک کے بھی نفع نقصان کا مالک نہیں تو دوسرے کا تو کیا کر سکوں۔(تقویۃ الایمان، ص: ۲۴)

(۲) جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں۔ (تقویۃ

الایمان۔ص:۴۲،مؤلفہ اسماعیل دہلوی)

(۳) شفیع محمد شفیع کی ''خالص توحید'' کی یہ جارحانہ عبارت دیکھیے: اگر اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشکل کشا ہوتے تو کیا کسی کافر کی طاقت ہوتی کہ دندانِ مبارک شہید کر کے چلا جاتا۔(ص:۴۷)

(۴) مولوی اسماعیل غزنوی اہل حدیث کے ذرا قلم کے تیور دیکھیں:

جو کوئی یارسول اللہ (صلعم) یا ابن عباس یا عبدالقادر جیلانی یا کسی اور بزرگ مخلوق کو پکارے یا اس کی دہائی دے۔ اس پکارنے سے اس کا مدعا دفع شر یا طلب خیر ہو یعنی ایسے امور میں امداد حاصل کرنا ہو جو خدا کے سوا کسی اور کے اختیار میں نہیں ہیں مثلاً کسی بیمار کا تندرست کرنا یا دشمن پر فتح حاصل کرنا یا کسی دکھ سے محفوظ رہنا وغیرہ تو ایسے امور میں خدا کے سوا کسی دوسرے سے امداد طلب کرنا شرک ہے، جو لوگ ایسا کریں وہ مشرک ہیں۔ شرک اکبر کے مرتکب ہیں۔ اگرچہ ان کا عقیدہ یہی ہو کہ فاعلِ حقیقی فقط رب العزت ہے اور ان صالحین سے دعا کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ ان کی سفارش سے مراد برآئے گی۔ گویا یہ ایک واسطہ ہیں۔ یعنی ان کا فعل بہرحال شرک ہے اور ایسے لوگوں کا خون بہانا جائز ہے اور ان کے اموال کا لوٹ لینا مباح ہے۔ (تحفہ وہابیہ،ص:۵۹)

(۶) اخبار اہلحدیث امرتسر ۸؍جنوری ۱۹۴۳ء میں حضور اکرم ﷺ سے منسوب کرتے ہوئے یہ شعر لکھتا ہے کہ:

سب انسان ہیں واں جس طرح سر افگندہ
اسی طرح ہوں میں بھی اک اس کا بندہ

(۷) ''جان لینا چاہیے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے''۔(تقویۃ الایمان،ص:۱۴)

(۸) سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مولوی اسمٰعیل دہلوی کی کتاب ''صراط مستقیم'' کی اس ایمان سوز عبارت کو پڑھیں اور فیصلہ فرمائیں کہ یہ ''صراط مستقیم'' ہو سکتی ہے؟: (نماز میں) زنا کے وسوسہ سے اپنی بیوی کی مجامعت کا خیال بہتر ہے۔ اور شیخ یا اسی جیسے بزرگوں کی طرف خواہ رسالتماب ہی ہوں اپنی ہمت (خیال) کو لگا دینا اپنے بیل اور گدھے کی صورت میں مستغرق ہونے سے زیادہ برا ہے۔

(ترجمہ: صراط مستقیم، فارسی،ص:۸۶،مطبوعہ دہلی)

(۹) اس شہنشاہ (اللہ) کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن وفرشتہ، جبرئیل اور محمد ﷺ پیدا کر ڈالے''۔(تقویۃ الایمان،ص:۳۱،مطبوعہ دہلی)

پیشوائے غیر مقلدین شاہ اسمٰعیل دہلوی کے اس عقیدے سے ختم نبوت کے انکار کا دروازہ کھلا اور قادیانیت کے فتنے نے سر نکالا۔

(۱۰) حافظ عبداللہ روپڑی کی ذرا بے باکی ملاحظہ فرمائیں: ''نبی پاک ﷺ دوسروں کا قرض اتارنے کے لئے حرام مال کو بھی استعمال میں لاتے رہے ہیں''۔(بکرادیلوی،ص:۳۱)

اسے آزاد خیالی، بے راہ روی، بے دینی کے سوا اور کیا نام دیا جائے کہ ان ہی علمائے غیر مقلدین میں سے کسی نے حضرت آدم کی خلافت کا انکار کیا۔ کسی نے حضرت ابراہیم کے معجزات کا رد کیا۔ کسی نے حضرت داؤد و یوسف، اور حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہم الصلاۃ والتسلیم کے معجزات جھٹلائے۔ غرض یہ کہ سلف سے ناطہ توڑ کر سلفی کہلانے والی اس جماعت کے جس فرد کے دل میں جو سمایا وہ کہہ گذرا اور اس ہوائے نفسانی کو ہی عین ایمان سمجھ بیٹھا۔

تفسیر السلف، تفسیر ثنائی، اربعین، اصلاح عقائد، الحق الیقین، القول الفاصل، عیون زمزم، نظر حذیم، العطر البلیغ علمائے غیر مقلدین کی مذکورہ کتابوں کا مطالعہ حقیقتِ حال کو آئینہ کرے گا۔

شان صحابہ میں: - جانثاران نبوت، نجوم فلک ہدایت، حاملین محبت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وہ مقدس وپاک بازہستیاں ہیں جن کو رسول پاک ﷺ کے فیض صحبت میں رہنے کی عظیم ترین سعادت نصیب ہوئی اور جنھوں نے جمال جہاں آرا کو اپنی آنکھوں سے بار بار دیکھا۔ جنھوں نے اللہ ورسول کی رضا کے لئے اپنا تن من دھن لٹا دیا۔ جنھوں نے دین کی کھیتی کی آبیاری اپنے خون سے کی۔ جنھوں نے اعلائے کلمۃ اللہ ورسول کی رضا کے لیے لازوال و بے مثال قربانیاں دیں، جن کی تعریف وتوصیف قرآن وحدیث کے صفحات کرتے ہوں، جنھیں معیار حق اللہ ورسول بتاتے ہوں۔ ان کی شان عظمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

(۱) پھر اگر وہ (یہود و نصاریٰ) اسی طرح ایمان لائیں جیسا تم (صحابہ کرام) ایمان لائے ہو جب تو وہ ہدایت پاگئے اور روگردانی کریں تو بڑے ضدی ہیں۔(البقرہ، آیت:۱۳۷)

(۲) اور جو رسول کی مخالفت کرے راہِ حق کے واضح ہو جانے کے بعد اور (صحابۂ کرام) مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ اختیار کرے ہم

اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے جو بری جگہ ہے۔ (النساء ۱۱۵)

اس طرح کی متعدد قرآنی آیات، اصحابی کالنجوم انا و ماآنا علیہ و اصحابی جیسی مشہور احادیث سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عقائد و اعمال دونوں میں معیار حق ہیں اور شریعت اسلامیہ میں ان کے اقوال وافعال حجت ہیں۔

لیکن اعلیٰ کی تقلید سے آزاد ہو کر غیر مقلدیت کے دعویٰ کا دم بھرنے والوں نے تمام نص ناطق کو دور کنار کرتے ہوئے کس طرح ادنیٰ کے قلادہ کو اپنے گلے کا طوق بنا رکھا ہے اور صحابہ کرام کی بلند پایہ جماعت سے متعلق ان کے فکری انحطاط کا کیا عالم ہے آیئے ان دلسوز مناظر کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) نواب صدیق حسن بھوپالی لکھتے ہیں:

''علامہ شوکانی در مؤلفاتِ خود ہزار بار می نویسد کہ در موقوفاتِ صحابہ حجت نیست''۔ (دلیل الطالب، ص: ۲۱۷ بحوالہ تعارف علمائے اہل حدیث، ص: ۱۴۳) یعنی علامہ شوکانی اپنی تالیفات میں ہزار مرتبہ لکھتے ہیں کہ صحابہ کا قول حجت نہیں، کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''صحابہ کا اجتہاد امت میں سے کسی فرد پر بھی حجت نہیں''۔ (حرف الجادی ص ۱۰۱، ۲۰۷۔ بحوالہ تعارف علمائے اہل حدیث، ص: ۱۴۳ مطبوعہ دیوبند)

(۲) نواب وحید الزماں صاحب اہل حدیثوں کے اعمال و ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

ولا یلتزمون ذکر الخلفاء ولا ذکر سلطان الوقت لکونه بدعة؛ (ہدیۃ المہدی، جلد ۱- ص ۱۱۰- بحوالہ تعارف علمائے اہل حدیث)

''اہل حدیث خطبہ جمعہ میں خلفائے راشدین اور بادشاہ وقت کے ذکر کا التزام نہیں کرتے کیوں کہ یہ بدعت ہے''۔

(۳) اس امت کے بہت سے بعد میں آنے والے علما عوام صحابہ سے افضل تھے علم میں، معرفت الٰہی میں اور سنت کے پھیلانے میں، اور یہ ایسی بات ہے جس کا کوئی بھی عقلمند انکار نہیں کرسکتا۔ (ترجمہ عربی ہدیۃ المہدی جلد ۱ ص: ۹۰، بحوالہ تعارف علمائے اہل حدیث، ص: ۱۵۱)

(۴) نواب وحید الزماں صاحب کی قلمی جسارت اور بڑھی تو لکھ مارا: اس سے معلوم ہوا کہ کچھ صحابہ فاسق ہیں جیسا کہ ولید (ابن عقبہ) اور اسی کے مثل کہا جائے گا معاویہ (بن ابی سفیان) عمرو (بن عاص) مغیرہ (بن شعبہ) اور سمرۃ (بن جندب) کے حق میں، (کہ وہ بھی فاسق ہیں) (معاذ اللہ من ذالک) (نزل الابرار، جلد ۲، بحوالہ تعارف علمائے اہل حدیث، ص: ۱۵۲)

(۵) قاری عبدالرحمٰن پانی پتی غیر مقلدین کے ایک مشہور امام ''مولوی عبدالحق بنارسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق بنارسی نے ہزار ہا آدمی کو عمل بالحدیث کے پردہ میں قید مذہب سے نکالا اور مولوی صاحب نے ہمارے سامنے کہا کہ عائشہ حضرت علی سے لڑکر مرتد ہوگئی اگر بے توبہ مری تو کافر مری (العیاذ باللہ) اور صحابہ کو پانچ پانچ حدیثیں یاد تھیں ہم کو سب کی حدیثیں یاد ہیں۔ صحابہ سے ہمارا علم بڑا ہے، صحابہ کو کم علم تھا۔'' (کشف الحجاب، ص: ۲۱۔ بحوالہ تعارف علمائے اہل حدیث، ص: ۱۵۴)

تعارف علمائے اہلحدیث کے مؤلف انوار خورشید صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ: ''موجودہ دور میں غیر مقلدین میں سے سب سے زیادہ جن صاحب نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم پر سب وشتم کیا اور جی کھول کر دشنام دہی اور دیدہ دہنی کی ہے وہ حکیم فیض عالم کے نام سے معروف ہیں، اس زمانہ کے خوارج میں موصوف کو خاص مقام حاصل ہے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، تقریباً ہر کتاب میں اسلاف کو ہدف تنقید بنایا ہے، یہ کتابیں اس قدر مذموم و مسموم ہیں کہ پڑھنے سے بھی طبیعت منقبض ہوتی ہے، افسوس صد افسوس کہ غیر مقلدن کے ہاں حکیم صاحب کو خوب پذیرائی حاصل ہے اور یہ غیر مقلدین کے بے نظیر و مایہ ناز محقق کہلاتے ہیں۔ اس موقع پر حکیم صاحب کی کتابوں سے کچھ حوالے ذکر کیے جاتے ہیں تاکہ صحابۂ کرام و اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم اور دیگر اسلاف امت کے متعلق غیر مقلدین کے بے نظیر محقق کی ذہنیت کا آپ کچھ اندازہ کرسکیں۔''

(تعارف اہل حدیث، ص ۱۵۵، مطبوعہ دیوبند)

اس کے بعد حکیم صاحب کے سب وشتم اور تبرے بازیوں کے جو نمونے پیش کیے گیے ہیں، خدا کی پناہ! اپنے ایمان کی خیر منانی پڑتی ہے کہ کہیں اس کا مطالعہ ہی محرومی کا باعث نہ بن جائے۔ بہر حال اتنی تفصیل کے بعد اب اس بات کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب سید الانبیاء اور ان کے مقدس رفقا کی بارگاہ میں ڈھٹائی کا یہ عالم ہے تو دیگر بزرگان دین اور سلف صالحین سے متعلق ان کے تیور کیا ہوں گے۔ فقیہ

حنفی، علمائے احناف بالخصوص حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تو انہیں ازلی بیر ہے۔ ان دشنام طرازیوں میں فیض عالم صاحب ہی کی تخصیص نہیں ہے بلکہ یہ غیر مقلدیت ہفوات و ہرزہ سرائیوں کا ایک ایسا اکھاڑہ ہے جس میں ہر ایک دوسرے پر بازی مارنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ علامہ عبدالحکیم صاحب شرف قادری تحریر فرماتے ہیں:

مولانا جامی اور مولانا رومی رحمہا اللہ تعالیٰ کی عظمت و ولایت کا ایک جہان معترف ہے، مگر اہل حدیث انہیں کن القاب سے یاد کرتے ہیں؟ مولوی نور محمد کی تصنیف شہباز شریعت کا مطالعہ کیجیے، وہ لکھتے ہیں:

یہ جامی کتا بھوکیا اندر تخفے کفراں والے
جو جامی، رومی دے پچھ لگ اوہ کافر سڑن منہ کالے
مثنوی رومی دے وجہ جامی شارح چک چلایا
ہلکیاں کتیاں والے چکوں رکھیں شرم خدایا

یاد رہے کہ علامہ اقبال پیر رومی کے اس قدر عقیدت مند ہیں کہ اپنے کلام میں جابجا ان کے ارشادات کا تذکرہ کرتے ہیں اور مولانا جامی کی عظمتوں کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

کشتۂ انداز ملّا جامیم   نظم و نثر او علاج خامیم

اللہ تعالیٰ بزرگان دین کی بے ادبی و گستاخی سے محفوظ رکھے۔ (شیشے کے گھر باب دوم اندھیرے سے اجالے تک، ص:۲۳۰) (مطبوعہ رضا اسلامک فاؤنڈیشن بھیونڈی)

پنجابی زبان کے ان اشعار میں گستاخیوں کے آثار مترشح ہیں کہ وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔

دعوت فکر:۔ اگر معاملہ صرف عمل بالحدیث تک کا ہوتا تو بات اتنی تشویش ناک نہ ہوتی مگر قرآنی آیت ''صراط الذین انعمت علیہم'' جو صراط مستقیم ہے اگر اسی سے کنارہ کشی کا اعلان کر دیا جائے تو پھر نتیجہ ان ہی صورتوں میں ظاہر ہوگا۔ یقین نہ آئے تو امام اہل حدیث مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب سے ہی ان کے فرقے کا تعارف سن لیں:

''یہ فرقہ اہل حدیث بجز پیغمبر ﷺ کسی صحابی (ابوبکر، عمر فاروق، علی مرتضیٰ، عثمان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کسی تابعی (حسن بصری، زہری، سعید بن المسیب وغیرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین) کسی امام (ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کسی صوفی (جنید بغدادی، شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کسی مولوی زندہ یا مردہ کا محض مقلد نہیں ہے اور اسی وجہ سے اس گروہ کا نام ان کے مخالفوں نے لامذہب و غیر مقلد رکھا ہوا ہے۔ (اشاعۃ السنۃ جلد ۹ شمارہ ۳ ص:۲۰۷، بحوالہ شیشے کے گھر باب دوم اندھیرے سے اجالے تک) (ص ۳۱۲، مطبوعہ رضا اسلامک فاؤنڈیشن بھیونڈی)

اس پر طرّہ یہ کہ وہابی ازم نے اسے نیم چڑھا کریلا بنادیا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوستان میں غیر مقلدیت و وہابیت باہم بقول شاعر:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (ہاں! اس میں کوئی شک نہیں فروغ وہابیت میں علمائے دیوبند کا نمایاں رول رہا ہے مگر میری سمجھ کے مطابق ان کے جملہ افکار میں کلیۃً اتفاق نہیں یا تو پھر تضاد و تذبذب کے وہ شکار ہیں۔ یہ ایک مکمل موضوع ہے)۔ اور وہابی فکر کہاں پہنچا کر دم لیتی ہے اس پریکٹیکل (Practical) سے گذر چکے مولانا ابوالکلام آزاد سے بہتر اسے کون بتا سکتا ہے۔ اس لیے یہ کہانی ان ہی کی زبانی سنیے:

والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ گمراہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت پھر نیچریت، نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل جو الحادِ قطعی کی ہے اس کا وہ ذکر نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ نیچریت ہی کو الحادِ قطعی سمجھتے تھے۔ لیکن میں اسے تسلیم کرتے ہوئے اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل الحاد ہے، اور ٹھیک مجھے یہی پیش آیا۔ سرسید مرحوم کو بھی پہلی منزل وہابیت ہی کی پیش آئی تھی۔ (آزاد کی کہانی، ص:۳۰۹ بحوالہ خطرات کے بادل، ص:۱۹، مطبوعہ نعیمیہ دہلی)

آج کا یہ دور ریسرچ و تحقیق، تلاش و تتبع اور تفکر و تدبر کا ہے۔ بلند نظری اور روشن خیالی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ افتراق و تفریق سے بچ کر کامیابی کی راہیں ڈھونڈی جا رہی ہیں...... اگر یہ درست ہے تو وقت آگیا ہے اب کشادہ قلبی اور وسعت ظرفی کے ساتھ اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ راہِ ائمۂ مجتہدین اور طریقۂ سلف صالحین نہ یہ کہ صراط الذین انعمت علیہم کا مصداق ہے، قوم و ملت کے دین و ایمان کے تحفظ کا ایک مستحکم و بابرکت قلعہ ہے بلکہ یہی اتحاد و اتفاق بین المسلمین کی مضبوط اور لمبی ڈوری بھی ہے۔ سواد اعظم کی اس ڈوری کو چھوڑ کر مسلکی اتحاد کی دہائیاں دینے والے یا تو احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں یا پھر منافقت کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ ☆☆☆

اجتہاد و تقلید

جام نور دہلی کا خصوصی شمارہ

کچھ کتاب کے بارے